محترم قارئین

اگر آپ کو ہماری یہ کتاب اچھی لگے تو ہماری حوصلہ افزائی کے لیے

Google پر جا کر **Urdu Novels** سرچ کر کے ہماری ویب سائٹ

www.urdusoftbooks.com کو ایک مرتبہ وِزٹ کر لیں

اگر آپ کو ہماری ویب سائٹ Google کے پہلے پیج پر نظر نہ آئے تو

دوسرے یا تیسرے پیج پر چیک کر لیں،

وہاں آپ کو مزید اچھی کُتب ڈاؤن لوڈ کرنے کو ملیں گی۔ شُکریہ

Page 3 of about 5,540,000 results (0.91 seconds)

Urdu Novels Archives - Download Free Pdf Books
pdfbooksfree.pk/category/urdu-novels/
Ambar Naag Maira Maut Ka Taaqub Ki Wapsi series contains 100 complete **novels**. All **novels** of this series promote amazing historical fiction stories for [...].

Urdu Novels | Urdu Books and Urdu Novels - Urdu Soft Books
www.urdusoftbooks.com/2017/03/urdu-novels.html
4 days ago - **Urdu novels** are one of the most favorite entertainment of indo-Pak culture. Urdu speaking people in all around the world are very likely read ...

Download urdu novels free | Tune.pk
https://tune.pk/video/2391074/download-urdu-novels-free
http://urdunovels.webs.com Free download **urdu novels** for free of various writers.urdu romanvi nivels, tareekhi novels, islamic book, historic novels, jasoosi ...

Urdu Novels - OLX.com.pk
https://www.olx.com.pk/all-results/q-urdu-novels/
English dictionary,english **novel** & **urdu** lughat feroz sons. Books & Magazines » Education & Training Karachi. Rs 600. 7 Apr ...

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

پیارے محمود رگا ض

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ------ 700 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 6000 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 7000 روپے

مستقل سلسلے

مئی 2017

جلد 40 شمارہ 2

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37-اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37-اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

لوگ دنیا میں آتے ہیں، چلے جاتے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا مقام، اپنی جگہ ہوتی ہے۔ اس کے چلے جانے سے وہ جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ اس سے متعلق لوگ ہمیشہ اس کی کمی کو محسوس کرتے ہیں۔ اسے یاد کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو دوسروں کی بھلائی اور فلاح کے لیے کام کرتے ہیں۔ ان کی کمی کو ایک زمانہ محسوس کرتا ہے۔

محمود ریاض صاحب کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی، جس کے پرچوں کے ذریعے خواتین کی تخلیقی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ انہوں نے خواتین میں بیداری کی نئی لہر پیدا کی۔ جہاں انہوں نے خواتین کو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا حوصلہ دیا۔ وہاں یہ آگہی بھی دی کہ ان پر کون سے فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انہوں نے بڑے دلچسپ اور خوبصورت انداز میں کہانیوں اور افسانوں کے ذریعے انہیں اچھے برے کا شعور دیا اور خود پر اعتماد کرنا سکھایا۔ ان کی آواز ان دور دراز علاقوں تک بھی پہنچی جہاں آج بھی خواتین پر علم کے دروازے بند ہیں۔

اور یہ ریاض صاحب کی نیک نیتی اور خلوص تھا کہ سولہ سال گزر جانے کے باوجود ان کو بھول نہیں پائے ہیں۔ ان کا کام انہیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ ان کی روشن کی ہوئی شمعیں آج بھی ذہنوں کو دلوں کو روشن کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

کرن کا دسترخوان،

کرن کو آغاز سے اب تک اس لحاظ سے ایک منفرد مقام حاصل ہے کہ اس نے ہمیشہ نئی راہ کا انتخاب کیا ہے۔ ایک نئی جہت سے روشناس کرایا اور ایسے سلسلے شروع کیے ہیں جو دیگر پرچوں سے ہٹ کر ہیں۔

"کرن کتاب" کا سلسلہ بھی ایسی ہی انفرادیت تھی۔ کرن واحد پرچہ ہے جو ہر ماہ کرن کے شمارے کے ساتھ مفید اور معلوماتی موضوعات پر "کرن کتاب" مفت دیتا ہے اور یہ سلسلہ بڑی باقاعدگی سے جاری ہے۔ اب ہم نے سوچا ہے کہ اس سلسلے کو قارئین کے لیے مزید مفید اور کارآمد بنایا جائے۔

کچن اور خواتین لازم و ملزوم ہیں۔ کچن اور دسترخوان کی رونق خواتین کے دم سے ہے۔ کچن آباد ہو تو گھر کے سب لوگ شاد رہتے ہیں۔

"آج کیا پکائیں" یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ اس ماہ سے کچن سے متعلق "کرن کا دسترخوان" کرن کے شمارے کے ساتھ مفت دیا جائے گا۔ کرن کا دسترخوان میں کھانے پکانے کی نت نئی ترکیبوں کے ساتھ مختلف سبزیوں اور پھلوں کی افادیت اور کچن سے متعلق مضامین شامل ہوں گے۔

"کرن کا دسترخوان" میں قارئین کی شمولیت کے لیے ہم نے کچن سے متعلق ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ انعامی سلسلہ ہے۔ آپ اس سلسلے میں حصہ لے کر انعام حاصل کر سکتی ہیں۔

"کرن کا دسترخوان" پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیں کہ یہ تبدیلی آپ کو کس حد تک پسند آئی ہے۔

اس شمارے میں،

- بیاد محمود ریاض، "مدر ڈے" پر شاہین رشید کا سروے،
- اداکار "نعمان اعجاز" سے شاہین رشید کی ملاقات، اداکارہ "مایا علی" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"
- اس ماہ سدرہ متول کے "مقابل ہے آئینہ"، آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول "من مورکھ"
- مصباح علی سید، نادیہ احمد اور بشریٰ ماہ کے مکمل ناول، نشا محسن علی، حیا بنت عاصم اور ایمان قاضی کے ناولٹ،
- بشریٰ احمد، ستل عزیز، شہزاد، شاذیہ ستار نایاب اور سادیہ یاسر کے افسانے اور مستقل سلسلے،

کرن کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

پوشیدہ وہ یوں میری نگاہوں سے رہا ہے
خالق مرے اندر، مری شہ رگ میں بسا ہے

انسان کا سر اس کی حضوری میں جھکا ہے
جو نقش گر نقشہ ہر صبح و مسا ہے

محدود مری عقل ہے ناقص مری سوچیں
قسمت سے مرے لب پہ مگر حمدِ خدا ہے

جو شے بھی ہے، وہ قبضہ قدرت میں ہے اس کے
وہ مالک و مختار، ازل سے ہے، سدا ہے

دل میرا صدف، اس میں ہیں یہ حمد کے موتی
اس قادرِ مطلق سے یہی میری دعا ہے

سوچیں بھی سمیٹ اپنی، ترا خالق و مالک
محمود یقیں کر کہ تجھے دیکھ رہا ہے

راجا رشید محمود

مجھ سے ستم کشِ غمِ ہجراں کے سر پہ بھی
چادر ترے کرم کی برابر تنی رہی

راہِ طلب میں گرچہ تھا صحرائے مشکلات
تیرے سحابِ لطف کی چھاؤں گھنی رہی

تیری توجہات کی برکات کے طفیل
امت کی بات سارے جہاں میں بنی رہی

تیری سخا نے سب کا بھرا دامنِ مراد
خود تیری ذاتِ پاک غنی تھی، غنی رہی

واجد ثنائے خواجہ کا ارمان ہی رہا
کوتاہیِ بیاں ہی رکاوٹ بنی رہی

ولی محمد واجد

بیادِ محمود ریاض

تجھے روئے گا زمانہ برسوں

صدف آصف

کبھی کبھی قلم اٹھانے کے بعد کچھ تحریر کرنا ایک مشکل امر ہو جاتا ہے کیوں کہ جس انسان کے بارے میں لکھنے کا ارادہ باندھا گیا ہو کوئی لفظ اس ذات کا احاطہ نہیں کر پاتا۔ ایسی ہی ایک اعلا پائے کی شخصیت محمود ریاض صاحب کی بھی ہے۔ جن سے کبھی ملاقات تو نہیں ہو سکی، پھر بھی کرن، شعاع اور خواتین سے تعلق ہونے کی وجہ سے ان کی ذات، ملاقاتوں کے احوال اور بھی کافی کچھ پڑھنے کو ملا اور جب بھی ایسا کچھ پڑھا دل میں عقیدت و احترام کا جذبہ جاگ اٹھا۔

مسکراتا چہرہ، ماتھے پر بکھرے بال، اور عینک سے جھانکتی روشن آنکھیں محمود ریاض صاحب کی تصویر دیکھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ پیکرِ محبت، شفقت اور ہمت و حوصلے کی ایسی مثال رہے ہوں گے، جنہیں لوگوں کے ذہنوں کو مسخر کرنے کا فن بھی آتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنی ذات میں ایک شہرِ بے مثال کہلائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خواب تو بہت ساری آنکھیں دیکھتی ہیں، مگر دنیا میں ایسی باکمال ہستیاں بہت کم پائی جاتی ہیں، جو اپنی محنت اور لگن کے بل پر ان خوابوں میں حقیقت کا رنگ بھر دیں۔ محمود ریاض صاحب کا شمار بھی ایسے چیدہ چیدہ لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے اپنے سپنوں کو حقیقت کا روپ دے ڈالا۔

جس زمانے میں ذرائع ابلاغ کو ایسی آزادی حاصل تھی اور نہ ہی ترقی کی اتنی منازل طے ہو پائی تھیں، اس دور میں ریاض صاحب جیسی عہد ساز شخصیت نے ایک جراٰت مندانہ قدم اٹھایا۔ قدرے گھٹن زدہ ماحول میں خواتین کے لیے پرچے کا اجرا نہایت ہی مثبت عمل ثابت ہوا، جس میں چھپنے والی تحریروں میں شوخی و شگفتگی کے ساتھ ادب و شائستگی کا کمال امتزاج نظر آتا تھا، اس کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی معاشرتی مسئلہ زیرِ موضوع بنتا، جس میں عورت کی عظمت کو بھی اجاگر کیا جاتا۔

اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سچائیوں کے متلاشی نے عزم کا پیکر بن کر جب اس نئی راہ پر تنہا قدم رکھا تو انہیں بہت ساری مشکلوں اور کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اس کے باوجود وہ کبھی بھی رکاوٹوں سے گھبرا کر پلٹ جانے والوں میں سے نہیں تھے، اپنی منزل کی جانب گامزن رہنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے پیچھے چلنے والوں کو بہت ساری

آسانیاں فراہم کریں، اور پھر فرد سے فرد ملتے گئے اور قافلہ بنتا چلا گیا، اس کا اعتراف "چاند نگر گروپ آف پبلی کیشنز" سے وابستہ تمام مصنفات کریں گی، جو اس قافلے میں شامل رہیں اور سمجھتی ہیں کہ انہوں نے محمود ریاض صاحب کے جانے کے بعد جیسے اپنا محسن، شفیق استاد اور غمگسار دوست کھو دیا ہو، اسی لیے ان کے جانے کا صدمہ آج بھی دلوں میں تازہ ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمود ریاض صاحب نے جس وقت ایک نئے پرچے کے اجرا کے ذریعے خواتین کی ذہنی تربیت کی ٹھانی ہوگی، تو انہیں تعریفوں کے ساتھ تنقید کا سامنا بھی رہا ہوگا۔ تاہم مرد ہو کر صنف نازک کی مسلمہ حیثیت کو معاشرے میں منوانا اس دور کے حساب سے بہت بڑی بات تھی۔ اس عمل میں نیک نیتی شامل تھی، جب ہی خواتین کی ان جرائد کو وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس میں تاحال اضافہ ہو رہا ہے۔ زندگی میں کچھ کر دکھانے کی لگن نے ہی ان کے ہاتھوں سے لگائے گئے، اس شجر کو قد آور درخت کی شکل میں قائم و دائم رکھا ہے، جس کے سائے سے بہت سوں نے فیض اٹھایا۔ جس کی ایک مثال ڈراموں کی دنیا پر چھائی ہوئی، ڈائجسٹ رائٹرز بھی ہیں۔

ریاض صاحب کے الفاظ آج بھی زندہ ہیں، جو ہر ماہ ان کے تینوں پرچوں میں ڈھل کر قارئین کے ذوق کی تسکین بنتے ہیں۔ آج یہ ادارہ جس مقام پر ہے، اس میں ریاض صاحب، ان کے بیٹوں اور اس سے منسلک ایک ایک فرد کی محنت کا پسینہ شامل ہے۔

ہر رشتہ خون کا نہیں ہوتا، کچھ رشتے دل کے بھی ہوتے ہیں، خواتین، شعاع اور کرن نے اپنے قارئین سے ایسا ہی ایک رشتہ بنائے رکھا اور اس وقت کی بہت ساری لڑکیاں جو اب ذمہ دار شادی شدہ خواتین بن چکی ہیں، انہوں نے اپنا شوقِ مطالعہ نئی نسل کی بچیوں میں منتقل کر دیا ہے تاکہ تفریحِ طبع کے ساتھ سادہ انداز میں ان کی تربیت کا کام بھی ہو سکے، اس کا کریڈٹ بھی ان کے ادارے کو جاتا ہے۔

محمود ریاض صاحب کی لگائی گئی کونپل، کھل کر پھول بن چکی ہے، اسی لیے تینوں پرچے ادب کے گلستاں میں کھلنے والے وہ خاص پھول ہیں، جو دیکھنے والی آنکھ کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ ان کے قائم کردہ ادارے نے جہاں پرانے لکھنے والوں کو عزت بخشی، وہیں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی اور یہ ہی شاید محمود ریاض صاحب کی خواہش بھی رہی ہوگی۔

محمود ریاض صاحب کی مضبوط اور قد آور شخصیت اس وقت کمزور ہوتی چلی گئی ہوگی جب "چاند نگر" پر پے در پے دل کو چیر دینے والے سانحے گزرے۔ آسمان ادب کے درخشاں ستارے، ابن انشاء جیسے بھائی کا چلے جانا، وہ کس عزم کے ساتھ گر گر کر پھر اٹھتے ہوں گے اور اس کے بعد دو ہنستے کھیلتے جوان بیٹوں کا اپنی آنکھوں کے سامنے چلے جانا۔ کسی بھی باپ کے لیے اس سے بڑا المیہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ شاید بیٹوں کی جدائی کا دائمی روگ انہیں اندر سے چاٹ گیا۔ جب ایسے غم سہنے پڑیں تو پہاڑ بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی شام ہوتی ہے، جانے والے چلے جاتے ہیں، مگر اپنے پیچھے یادیں چھوڑ جاتے ہیں، ایسی ساعتیں چھوڑ جاتے ہیں، جو ہمیشہ روشن رہتی ہیں، کبھی بھی مدھم نہیں پڑتیں، جینے والوں کے ساتھ جینا آساں ہوتا ہے تاہم، مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا، مگر کچھ لوگ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ محمود ریاض صاحب ہم میں نہ ہوتے ہوئے بھی موجود ہیں، کرن، شعاع، اور خواتین سے پیار کرنے والا ہر شخص ان کی محبتوں کا قرض دار ہے۔ اللہ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین

جب میں ماں بنی

عورت جب تخلیق کے عمل سے گزر کر اپنی اولاد۔۔ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے سینے سے لگا کر اس کے نرم نرم گالوں پہ پیار کرتی ہے تو حقیقتاً" یہ اس کی زندگی کے بہترین اور قابل فخر لمحات ہوتے ہیں ۔۔ اور اس دن اسے زندگی کی اصل خوب صورتی نظر آرہی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت مکمل ہی اس دن ہوتی ہے جب وہ "ماں" بنتی ہے "ماں" بننا اور پھر "ماں" کہلوانا عورت کی اولین خواہشات میں سے ایک خواہش ہوتی ہے۔ "مدرز ڈے" کے موقع پر "ماں" کے رتبے پہ فائز ہونے والی خواتین کے ان لمحات کو ہم نے قلم بند کیا ہے۔ جب وہ پہلی بار "ماں" بنی تھیں۔ اس حوالے سے ہمارا سوال تھا کہ "جب میں ماں بنی؟"

ماں بننے کا احساس

شاہین رشید

ربیعہ اکرم : ۔ پروگرام منیجر ایف ایم 101

واہ کیا خوب صورت احساسات تھے جب میں ماں بنی تھی۔ ماں بننے کا جو ایک اعزاز' جو شرف اور جو عزت اور جو اللہ نے عطا کیا وہ یقیناً" ایک عورت کے لیے تکمیل وجود کا باعث بنتا ہے اور الحمد للہ میں اپنی شادی کے ٹھیک گیارہ ماہ بعد "ماں" بن گئی تھی

30 دسمبر 1993ء میں میری شادی ہوئی اور 22 نومبر 1994ء میں میری پہلی اولاد جو کہ بیٹی ہے رحمت بن کر ہماری گود میں آئی یقیناً" بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اور ہمارے گھر میں بھی رحمتوں کا نزول ہوا اور اولاد کے حصول کے لیے بالکل بھی انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جب ہماری شادی کی پہلی سالگرہ تھی تو ہماری بیٹی "وفا" ہماری گود میں تھی اور پھر تقریباً" ڈھائی سال کے بعد اللہ نے ہمیں بیٹا دے کر ہماری فیملی کو مکمل کر دیا۔۔۔ اور جب ماں بنی تو سچی بات بتاؤں کہ اس زمانے میں "آپریشن" کا بہت زیادہ رواج نہیں تھا۔۔ اور مجھے سیزرین کے پروسس سے گزرنا پڑا تو وہ میرے لیے ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا اور جب میں ہوش میں آئی تو بہت تکلیف میں اور غصے میں تھی تو جب نرس نے مجھے میری بیٹی لا کر دی تو میں نے کہا کہ "اس نے مجھے بہت تکلیف دی ہے" لیکن جب اللہ کسی چیز سے نواز رہا ہوتا ہے تو پھر انسان کو آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔۔ اور ماں تخلیق کے اس عمل میں جس تکلیف اور کرب سے گزرتی ہے اس کے بعد جو راحت اسے اولاد کی صورت میں ملتی ہے وہ یقیناً"

بہت سے اچھے احساسات و جذبات کو جنم دیتی ہے۔

غزالہ رشید : ۔ رائٹر

میرا بیٹا میری پہلی اولاد اب ماشاءاللہ اٹھارہ سال کا ہو گیا ہے اور اٹھارہ سال پہلے والے احساسات میں کبھی نہیں بھول پاؤں گی اور میں تو یہ بات ضرور کہوں گی کہ دنیا کی سچی، اچھی اور پکی محبت ماں کی اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور یہ بات ہمیں اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب ہم خود ماں بنتی ہیں "حسن بن نصیر" میرے بیٹے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجھے شادی کے چھ سال بعد اولاد کی نعمت سے نوازہ، اور جب حسن ہوا تو بے ساختہ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ "سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اس دعا کے بعد!

حسن سے پہلے تین بار میں تکلیف دہ مراحل سے گزری، امید بندھتی تھی اور پھر ٹوٹ جاتی تھی۔ اور جب اولاد ہونے میں دیر ہو جائے تو بہت سے لوگ بہت دل توڑنے والی باتیں کرتے ہیں... تو میں بہت اپ سیٹ رہتی تھی تب میری امی مجھے کہتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اولاد دے کر بھی آزماتا ہے اور اولاد نہ دے کر بھی آزماتا ہے اور جب چھ سال کے بعد حسن پیدا ہوا تو اس وقت کے تاثرات تو لفظوں میں بیان کیے جا سکتے ہی نہیں... کہ اتنی مایوسی کے بعد جب اپنی گود میں حسن کو دیکھا تو سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ خوشی کا اظہار کس طرح کروں... یہ جو خوب صورت ذمہ داری اللہ نے مجھے سونپی تھی اس کے بعد تو میں ہر معاملے میں احتیاط برتنے لگ گئی کہ حسن کی تربیت میں کوئی غلط بات نہ شامل ہو جائے۔ مجھے سونف چھالیہ کھانے کی عادت تھی وہ چھوڑ دی کہ کہیں حسن کو بھی عادت نہ پڑ جائے ماں کو بہت باعمل بننا پڑتا ہے... اور مزے کی بات بتاؤں کہ حسن کے بعد جب ہماری شادی کی سالگرہ آئی تو میری بھتیجی نے ہی ایک ہوٹل میں ہماری ٹیبل بک کرائی اور کہا کہ آپ کی سالگرہ ہے آپ دونوں ہی جائیے گا تو میں نے بے ساختہ کہا "اتنے سالوں کے بعد تو حسن آیا ہے اس کو کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں" میں نے حسن کے ساتھ ایک ایک لمحے کو انجوائے کیا اور کر رہی ہوں... اللہ اسے سلامت رکھے (آمین)۔ اولاد بہت بڑی نعمت ہے اور جتنا شکر کروں کم ہے ماں بننے کے بعد بہت عاجزی آجاتی ہے۔

تحریم زبیری : ۔ آرٹسٹ

بہت ہی مختلف سے احساسات تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ وہ جذبات اور وہ احساسات جو اس وقت تھے ان

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں ۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

کو لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہی نہیں ہے.... یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اللہ نے اتنی بڑی خوشی دے دی ہے۔ اور الحمد للہ شادی کے پہلے ہی سال اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت یعنی بیٹی سے نواز دیا تھا.... شکر ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ اور اس بات کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب کسی کو اولاد کے لیے پریشان ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں.... میں خوش قسمت ہوں کہ میرے رب نے مجھے انتظار نہیں کرایا۔

شیریں انور : - شیف

الحمد للہ' اللہ تعالیٰ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مجھے بہت ہی پیاری بیٹی "سائرہ" دی جو کہ میرے لیے ایک خزانہ ہے۔ میرے لیے سب کچھ ہے اور آج تک میری دوست کی طرح ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے بیٹی عطا کی تو بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ بہت زیادہ اچھا لگا' اللہ کا کروڑوں احسان ہے اور ایک بات ضرور کہنا چاہوں گی کہ جب آپ کی اپنی اولاد ہوتی ہے تب آپ کو اپنی ماں کی بہت زیادہ قدر ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں کہ جب میرے بچے ہوئے اس وقت سے لے کر آج تک مجھے اپنی ماں بہت یاد آتی ہیں ہر موقع پر' ہر چھوٹی بڑی خوشی میں اور پریشانی میں نہ صرف ماں کی یاد آتی ہے بلکہ ان کی قدر بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ میری ماں کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے.... جس طرح انہوں نے ہماری پرورش کی ہمیں لکھایا پڑھایا میں نے بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے الحمد للہ بچیوں کو پڑھایا لکھایا اور انہیں اپنے گھر کا کیا۔ اللہ تعالیٰ سب بچیوں کو ان کے گھروں میں آباد رکھے اور سب بچوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنی ماں کا حق ادا کریں۔

فائزہ حسن : - آرٹسٹ

میں 26 سال کی تھی جب میری بیٹی پیدا ہوئی۔ میری شادی 2007ء میں ہوئی اور 2008ء میں میری بیٹی "جہاں آرا" پیدا ہوئی۔ پہلے بچے کی دفعہ چونکہ مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تو پہلے بچے نے یعنی بچی نے بہت تنگ کیا.... رات کو سو نہیں پاتی تھی' خاصی پریشانیاں ہوئیں' کیونکہ یہ ایک نئی چیز روٹین میں آئی تھی.... اچھی بھی لگتی تھی مگر تھوڑا غصہ بھی آتا تھا کہ باہر آنا جانا' کام' سب بہت کم ہو گیا تھا.... پر وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو گیا.... اور پھر جب بیٹا پیدا ہوا' تو سب چیزیں بہت آسانی سے ہینڈل کرلیں .... جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو ہر وقت پیار سے زیادہ مجھے اس کا خیال رکھنے کی فکر زیادہ ہوتی تھی کہ بچے بول تو سکتے نہیں کہ انہیں کیا ہو رہا ہے یا کیا چیز چاہیے۔ کیوں رو رہے ہیں.... خیر۔ ماشاء اللہ اب بیٹی 8 آٹھ

سال کی اور بیٹا چھ 6 سال کے ہیں اور میں ان کی کمپنی انجوائے کرتی ہوں۔

کنیز فاطمہ :- بیوٹیشن

جب میں پہلی بار ماں بنی اور نرس نے بچہ میرے ہاتھوں میں دیا اور میری نظر اس پر پڑی تو یہ دنیا کا سب سے خوب صورت احساس تھا۔ ماں بننے پر جو خوشی ہوئی اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ عورت کے لیے ماں اور اولاد کے رشتے کے آگے کوئی رشتہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صائمہ قریشی :- آرٹسٹ

جب میں پہلی بار ماں بنی اور میں نے اپنی اولاد اپنے بیٹے کو دیکھا تو مجھے ایسا لگا کہ اس سے زیادہ اچھی چیز اس سے زیادہ پیاری کوئی چیز اللہ مجھے نہیں دے سکتا اس دنیا میں۔۔۔ اتنی زیادہ انمول اتنی زیادہ قیمتی اور اتنی خوب صورت چیز سے مجھے نوازہ۔۔۔ بس کچھ عجیب سے احساسات تھے۔ میں جب اسے دیکھتی تو بے ساختہ ذہن میں آیا کہ یہ میری اولاد ہے۔۔۔ گھنٹوں اسے دیکھتی رہتی تھی، چومتی رہتی تھی، پیار کرتی رہتی تھی ۔۔۔ ماشااللہ میرے تین بیٹے ہیں اور جب میری اولاد ہوئی میرے احساسات وہی ہوتے ہیں، جو پہلے بچے کے وقت تھے۔ مگر پہلے بیٹے کے وقت جو ایکسائیٹمنٹ تھی جو احساسات تھے وہ لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہیں۔ میں تو بس "دسن" سی ہو گئی تھی کہ میں ماں بن گئی ہوں۔۔۔ اور سچ بات تو یہ ہے کہ اولاد سے بڑھ کر کوئی نعمت ہے ہی نہیں۔

ثمیرا حسن :- آرٹسٹ

میری شادی بہت چھوٹی عمر میں ہوئی تھی۔ میں اس وقت صرف 14 سال کی تھی اور آج کل تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی کی شادی 14 سال میں ہو جائے ۔۔۔ تو میں 14 سال کی تھی اور میٹرک کا امتحان دے رہی تھی ۔۔۔ تو جب میں پندرہ سال کی ہوئی تو میرا بیٹا پیدا ہوا۔ اور اس کے اگلے دن اسپتال سے جا کر میں

نے میٹرک کے پیپر دیے تھے۔ تو کھیلنے والی عمر میں ہیں
ماشا اللہ ماں بھی بن گئی۔ میرے ماشا اللہ دو بیٹے ہیں
اور ماشا اللہ دونوں ہی بہت پیارے ہیں۔ تو بڑا بیٹا گورا
چٹا اور ہری آنکھوں والا تھا تو اتنی کم عمری میں جب بیٹا
گود میں آیا تو لگا کہ کوئی گڈا آ گیا ہے۔ اور ماں بننے کا
احساس تو بہت خوب صورت ہوتا ہے۔ عجیب سا فخر
اور اطمینان ہوتا ہے۔۔۔ اور میرا دوسرا بیٹا پھر "قریباً"
ساڑھے تین سال کے بعد ہوا' اب میرے بیٹے ماشا
اللہ جوان ہیں اور میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتی ہوں تو
کوئی مانتا ہی نہیں کہ میں ان بچوں کی ماں ہوں۔ میری
دعا ہے کہ اللہ سب کو صحت و تندرستی والی اولاد عطا
کرے۔

صباحت بخاری :۔ ہوسٹ + آرٹسٹ

"ماں" بننا دنیا کی حسین ترین' خوب صورت نعمت
کہہ سکتے ہیں اور ماں بننے کے جو احساسات ہیں وہ تو
بہت ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔ میری اولاد ذرا دیر
سے ہوئی اور اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت ہوگی۔ اور
مجھے اللہ تعالیٰ نے پہلی اولاد میں ہی پیارا' بہت ہی
کیوٹ سا شہزادہ دیا۔ اور آپریشن سے ہوا تو میں نے
بہت تکلیف برداشت کی۔ مگر بیٹے کے گود میں آتے
ہی میں ساری تکلیف بھول گئی اور میری دعا ہے کہ
جن لوگوں کے پاس اولاد نہیں ہے اللہ تعالیٰ انہیں بھی
اولاد کی نعمت سے نوازے اور صحت و تندرستی اور
زندگی والی اولاد عطا کرے۔ مدرز ڈے کے موقع پر یہ
ضرور کہوں گی جن

لوگوں کی ماں حیات ہے وہ اپنی ماں کی بہت قدر اور بہت
خدمت کریں۔ کیونکہ یہ نعمت بار بار نہیں ملتی اور میں
یہاں ایک قصہ ضرور کوڈ کرنا چاہوں گی کہ جب حضرت
موسیٰ علیہ اسلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے تھے تو ان
کی والدہ جائے نماز بچھا کر دعا کیا کرتی تھیں' کیونکہ
انہیں پتا تھا کہ ان کا بیٹا بہت غصے والا ہے اور جب وہ
ایک پیغمبر کے طور پر اللہ سے ہم کلام ہوتے تھے تو
تھوڑے سخت الفاظ استعمال کیا کرتے تھے' مگر اللہ
تعالیٰ حضرت موسیٰ کی ماں کی دعاؤں کی وجہ سے ان کی
ہر غلطی کو معاف کر دیا کرتے تھے اور جب حضرت
موسیٰ کی ماں کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ان کے بعد جب
حضرت موسیٰ کوہ طور پر اللہ سے ہم کلام ہونے گئے تو
اللہ تعالیٰ نے فرمایا "موسیٰ اب ذرا دھیان سے بات
کرنا کہ اب تمہارے پیچھے تمہاری ماں کی دعائیں
نہیں ہیں۔" تو اولاد دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو اور ان
کی مائیں حیات ہوں تو ماں کی دعائیں بچوں کو محفوظ
رکھتی ہیں۔۔۔ تو سب اپنی ماں کا خیال رکھیں اور ان
سے بہت پیار کریں خود بھی خدمت اور پیار کریں اور
دوسروں سے بھی ان کی عزت کروائیں۔
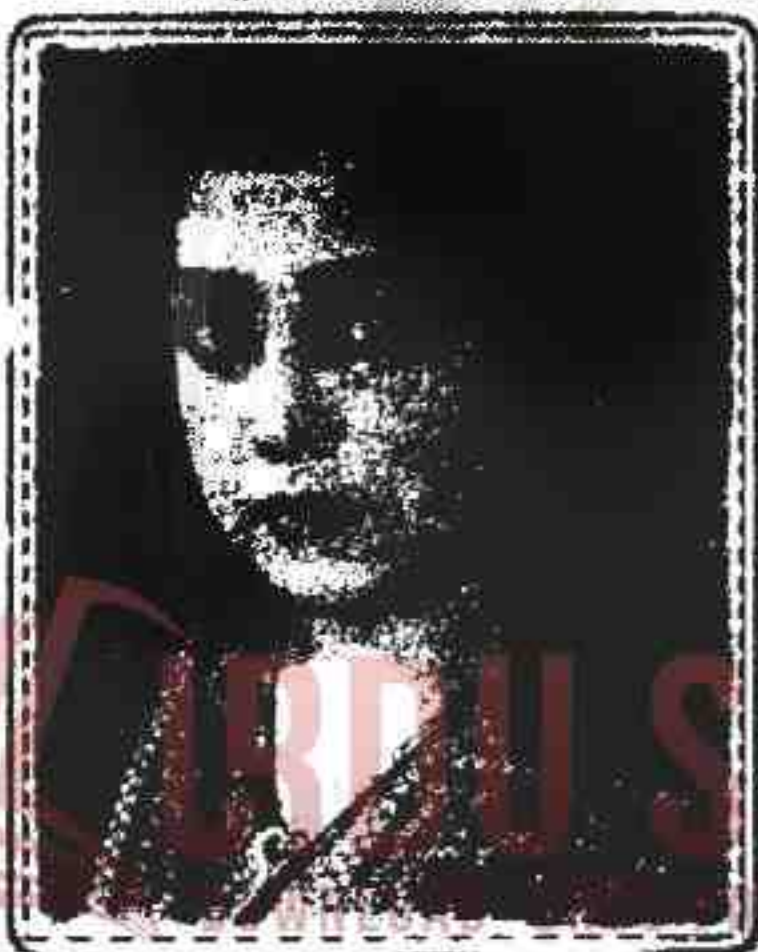
فضیلہ قیصر :۔ آرٹسٹ

شادی کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کرم کردیا تھا۔ 1994ء میں شادی ہوئی اور 1995ء میں ماشاء اللہ احمد صاحب اس دنیا میں تشریف لے آئے اور ماں بننے کا احساس ہی عجیب سا ہوتا ہے۔ ایک چھوٹا سا پیارا سا گڈا جب میری گود میں آیا تو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ میرے وجود کا حصہ ہے۔

اور جب اپنی اولاد ہو جاتی ہے تب ماں باپ کی محبت کا احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ جو ہمارے لیے سوچتے ہیں اور جو ہمیں نصیحت کرتے ہیں وہ ہماری بہتری کے لیے ہی ہوتی ہے وہ ہمیں اچھا دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے وہ ہمارے لیے پریشان بھی ہوتے ہیں اور پہلی بار کیا عورت تو جتنی بھی بار "ماں" بنتی ہے اسے ایک نیا احساس ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ماں کے اندر ایسے جذبات ڈالے ہیں کہ جن کی بدولت وہ اپنی اولاد کو پالتی ہے اور اس کی خاطر ہر تکلیف کو برداشت کرتی ہے قربانیاں دیتی ہے اور ماں بننا بہت اعزاز کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ ہر شادی شدہ عورت کو اس اعزاز سے نوازے۔ (آمین)

عائشہ جہاں زیب:۔ ہوسٹ خبرناک

"ماں" کا لفظ میں نے اپنے منہ سے ادا کیا تھا، لیکن اس بات کا احساس ہی بہت حسین اور دلفریب تھا کہ اب مجھے بھی کوئی ماں کہے گا اور جب پہلی بار میں نے نو ماہ کی تکلیف کے بعد اپنے بیٹے کو اپنی گود میں اٹھایا تو وہ وقت اور میں اور میرا بیٹا جیسے "تھم" گئے تھے۔۔۔ میرا ٹائم پیریڈ بہت مشکل تھا اور میرے بیٹے کے بارے میں ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ پیدائش کے بعد اسے کچھ پرابلمز ہو سکتے ہیں۔۔۔ مگر اللہ کا کرم ہو گیا۔۔۔ بیٹے کو گود میں لینے کے بعد مجھے اپنے مکمل ہونے کا احساس ہوا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پوری کائنات رک گئی ہو، وہ معصوم نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں اس کی نازک پتلی پتلی انگلیوں کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی، ڈر کے مارے اسے سینے سے نہیں لگا رہی تھی کہ اسے کچھ ہو نہ جائے، کیونکہ وہ بہت کمزور تھا اس وقت کی خوب صورت فیلنگز کو کسی دریا کی طرح کوزے میں بند تو کیا جا سکتا ہے لیکن ایکسپریس نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ یہ وہ احساس ہے کہ جو شاید سب کچھ پا کے بھی انسان کو نہیں ملتا۔۔۔ اور سب کچھ کھو کر بھی اگر اولاد پاس ہو تو یہ احساس کہیں نہیں جاتا۔۔۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے شادی کے پہلے سال ہی اولاد کی نعمت سے نواز دیا تھا اور اس معاملے میں میں کافی خوش قسمت رہی۔۔۔ اور چونکہ پہلی اولاد بیٹا ہے تو اس وقت کی خوشی مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔۔۔ بیٹے کی وجہ سے سب لوگ ایکسایٹڈ تھے اور چونکہ سیزرین تھا تو مجھے میرا بیٹا پیدائش کے بارہ گھنٹے کے بعد دکھایا گیا اور میں نے بیٹے کو دیکھنے کے لیے بہت زیادہ شور مچایا کہ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور مجھ سے میرا بچہ چھن گیا ہے۔۔۔ میں اتنا روئی اور اتنا واویلا مچایا کہ اسپتال کے آئی سی یو میں ایک طوفان برپا تھا۔۔۔ اور مجھے تب تک سکون نہیں آیا جب تک میں نے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسے اپنے بازوؤں میں نہیں لے لیا۔۔۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اپنے بیٹے کو اپنی "آغوش" میں لینے کے بعد اسے پیار کرنے کے بعد، اسے اپنے سینے سے لگانے کے فوراً بعد میں غنودگی میں چلی گئی اور بچہ واپس نرسری میں لے گئے۔۔۔ تو اس لمحے کا احساس آج بھی مجھے یاد ہے۔

Watch Us On
YouTube

خالص شہد کی پہچان
Health Care Club

چہرے کی جھریوں کا
بہت ہی آسان علاج
YouTube
Health Care Club

نازلی نصر :- آرٹسٹ

جب میری شادی ہوئی تو اس وقت شوبز میں میرا عروج تھا اور یہ 1994ء کا زمانہ تھا۔۔۔ دسمبر میں میری شادی ہوئی اور فروری میں اللہ نے اپنا کرم کردیا تھا۔۔۔ مگر ان دو ماہ میں میں جب تک امید سے نہیں ہوئی میرے سسرال والوں کی طرف سے ایک پریشر تھا کہ میں امید سے کیوں نہیں ہو رہی۔۔۔ خیر امید سے ہوگئی، خوشی تو ہوئی' مگر میں اتنی جلدی بے بی نہیں چاہتی تھی کیونکہ میں پہلے ایڈجسٹ ہونا چاہتی تھی۔ مگر ہمارے معاشرے میں اکثر لوگوں کی یہ سوچ ہے کہ شادی کے دوسرے مہینے ہی بچہ ہو جانا چاہیے۔ مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔۔۔ امید کے پانچویں مہینے میں اللہ نے یہ خوشی واپس لے لی۔ جبکہ ان پانچ مہینوں میں بچے کے لیے خوب تیاری کی۔ امریکہ بھی گئی۔ تو خاندان میں اکثر لوگوں نے کہا کہ "ہائے پیدائش سے پہلے کچھ تیاری نہیں کرنی چاہیے" اور پھر جب سچ مچ ایسا ہو گیا تو مجھے سب بہت برے بھی لگتے تھے۔ خیر۔۔۔ پھر جب دوبارہ امید ہوئی۔۔۔ اور جب اللہ نے مجھے بیٹے سے نوازہ تو اس وقت کے احساسات ایسے تھے کہ وہ دنیا کے کسی اور رشتے میں آ ہی نہیں سکتے اور اولاد کے وہ احساسات نہیں ہوتے اپنے ماں باپ کے لیے جو ماں باپ کے اولاد کے لیے ہوتے ہیں۔ ماں باپ تو اپنے منہ کا نوالہ بھی اپنے بچوں کو دے دیتے ہیں۔۔۔ اور میں اپنے بچوں کے لیے بہت زیادہ حساس ہوں جس کی وجہ سے مجھے ڈانٹ بھی پڑتی ہے اپنے شوہر سے کہ کچھ اپنا بھی خیال رکھ لیا کرو۔۔۔ اور میں اپنے بچوں سے کہتی ہوں کہ میں تو تمہارے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتی۔۔۔ ماشاء اللہ سے میرے دونوں بچے اس وقت امریکہ میں پڑھ رہے ہیں۔۔۔ بس میں چاہ رہی ہوں کہ آپ یہ ضرور لکھیں کہ جو مائیں اس طرح کا پریشر دیتی ہیں کہ لڑکی آتے ساتھ ہی امید سے ہو جائے وہ غلط کرتی ہیں کہ ہم صرف اس لیے شادی نہیں کرتے کہ ہمیں بچہ پیدا کرنا ہے' ہم جانتے ہیں ہمیں فیملی بنانی ہے لیکن میاں بیوی کو ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع تو دیں انہیں ذہنی طور پر تیار تو ہونے دیں۔۔۔ بس بچہ پیدا کرالو اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ کہ یہ اتنی جلدی کیوں ہوا۔

شگفتہ بھٹی

ماں بننے کی خوشی بھلا کیسے نہیں ہوتی بڑے بیٹے کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں ہم مالی طور پر کرائسس سے گزر رہے تھے۔ کیونکہ بابر اگرچہ بزنس مین تھے مگر بزنس ان سے سنبھل نہیں رہا تھا تو اکثر نقصانات ہو جاتے تھے بڑے۔ اور جاب کرنا انہیں پسند نہیں تھا اور میں بھی جاب نہیں کر رہی تھی۔۔۔ تو جب امید سے ہوئی تو بہت خوش تھی اور ایسی کوئی خواہش نہیں تھی کہ پہلا بیٹا ہو اور بیٹا نہ ہوا تو کوئی مسئلہ ہو گا۔۔۔ تو خوشی میری ادھوری تھی کہ ہمارا ہاتھ بہت تنگ تھا۔۔۔ اور پھر ڈلیوری بھی آپریشن سے ہوئی جس کا خرچ اس زمانے میں بھی بہت تھا۔۔۔ تو بیٹا ہوا' سب بہت خوش تھے' میں بھی خوش تھی مگر۔۔۔ خوشی نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔۔۔ میں تھوڑی بجھ سی گئی تھی کیونکہ مجھے یہ فکر تھی کہ اسپتال کا بل کیسے Pay ہو گا۔ خیر پھر اللہ نے ساری مشکلیں آسان کردی۔ اور اولاد جیسی نعمت ملنے پر اللہ کا بہت شکر ادا کیا۔

لہجے میں بات کرتے ہیں۔۔۔ انٹرویو بہت کم دیتے ہیں بلکہ یوں سمجھیں کہ دیتے ہی نہیں ہیں اور بھی دیں تو ایک نشست میں نہیں۔ کیونکہ ان کی مصروفیات بہت زیادہ ہیں یہ انٹرویو بھی تھوڑا لیا گیا ہے اور تھوڑا تحقیقاتی ہے۔ کیونکہ لوگ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔

پاکستان کے سینئر اور ہر دل عزیز فنکار نعمان اعجاز 14 فروری کو لاہور میں پیدا ہوئے۔۔۔ ابتدائی تعلیم بھی لاہور سے ہی حاصل کی اور قائداعظم لاہور کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی۔۔۔ گزشتہ 26 سال سے اس فیلڈ سے وابستہ ہیں اور بہترین اداکاری کے ذریعے سب کے دلوں میں گھر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت پاکستان نے 2011ء میں انہیں "پرائڈ آف پرفارمنس"

نعمان اعجاز سے ملاقات

شاہین رشید

شوبز میں اگر کوئی ورسٹائل فنکار کہلانے کے لائق ہے تو وہ صرف دو ہی فنکار ہیں "ایک "نعمان اعجاز" اور دوسرے "فیصل قریشی" ان دونوں کے کام میں بہت ورائٹی اور بہت انفرادیت ہیں۔۔۔ اور ایک اچھا فنکار اسی وقت اسکرین پہ نظر آتا ہے جب اس کا پہلا کام دوسرے کام سے مختلف ہو۔۔۔ ہر رول میں ہر روز نظر آنے والے فنکاروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

نعمان اعجاز جب جب اسکرین پر نظر آئے ایک نئے اور منفرد رول کے ساتھ۔ حال ہی میں ان کے تین ڈرامے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔۔۔ ان میں دو آن ایئر ہیں اور ایک کچھ ہی عرصہ پہلے اختتام پذیر ہوا ہے۔ جس کا نام "احساس" تھا۔ آن ایئر میں "بھائی" اور "خان" بہت اعلا ہیں۔ نعمان اعجاز تھوڑے سے کم گو ہیں مگر ہمیشہ اچھے

سے نوازا۔

* "شوبز میں کیسے آئے۔۔۔ شوق لایا یا اتفاقاً" آ گئے آپ؟"

☆ "مجھے اس فیلڈ میں میرا شوق مجھے لے کر آیا۔۔۔ اتفاقاً" نہیں آیا۔ مجھے نیوز ریڈر بننے کا شوق تھا۔ ہاں اداکاری میں اتفاقاً" آیا اور جب آیا تو نیوز ریڈر بننے کا شوق ایک طرف رہ گیا اور اداکاری کی فیلڈ میں اس طرح آیا کہ 1998ء میں مجھے ثمینہ پیرزادہ کے ساتھ ایک پلے میں چھوٹا سا رول دیا گیا جس میں مجھے صرف ایک ڈائیلاگ بولنا تھا۔ وہ شاید اچھا بول گیا کہ اس کے بعد مجھے ڈرامہ سیریل "دشت" میں اچھا رول مل گیا۔۔۔ بس پھر اتنا مزا آیا کہ میں نے اس فیلڈ کو بطور پروفیشن اپنا لیا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اس فیلڈ

کے ذریعے مجھے عزت، شہرت اور دولت سب کچھ عطا کیا ہے۔"

* "آپ نے لاء کی ڈگری لی... کام آئی... اور جب اس فیلڈ میں آئے تو گھر والوں نے اعتراض کیا؟"

☆ "ڈگری لاء کی ہو یا کوئی سی بھی، تعلیم بھی رائگاں نہیں جاتی ہر موقع پر ہر فیلڈ میں کام آتی ہے اور میرے بھی کام آ رہی ہے آپ کسی بھی فیلڈ میں ہوں تعلیم بہت ضروری ہے... گھر والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بس اس شرط کے ساتھ اداکاری کی اجازت دی کہ میں اپنی تعلیم کو راستے میں نہ چھوڑوں بلکہ اسے ہر حالت میں مکمل کروں... اور میں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔"

* "اداکاری کی صلاحیت اگرچہ خداداد ہوتی ہے... مگر پھر بھی آپ کو یہ کام مشکل لگا یا آسان؟"

☆ "یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں کوئی کام آسان نہیں ہوتا... مگر میں سمجھتا ہوں کہ اداکاری سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ یا شاید میں سمجھتا ہوں کیونکہ میں اداکاری میں اپنا بہ100 دینے کے لیے، بہت زیادہ محنت کرتا ہوں۔ بعض سین تو اتنی زیادہ پرفارمنس اور پرفیکشن مانگتے ہیں کہ ان کو کس طرح کرنا ہے، سوچتے ہوئے میری راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میرے ناظرین بھی مجھ سے مایوس نہیں ہوئے ہیں۔"

* "پھر تو ڈرامہ سیریل "خان" میں خان کا رول کرتے ہوئے بھی مشکل پیش آئی ہوگی؟"

☆ "میں اپنے ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کر لیتا ہوں... اور اس کردار کے لیے ڈائریکٹر کا میرا انتخاب اس بات کا ثبوت ہے کہ اسے میری صلاحیتوں پہ اعتبار و اعتماد ہے... اور مجھے اس "رول" کا بہت اچھا فیڈ بیک آیا ہے، ناظرین بہت پسند کر رہے ہیں میرے اس کردار کو، میری پرفارمنس کو۔"

* "اس کردار کے لیے آپ نے فوراً "حامی بھرلی؟"

☆ "میں نے گہری نظر سے اس کا مطالعہ کیا۔ اپنے اردگرد کے سیاست دانوں کو دیکھا... اور بہت قریب سے دیکھا ان کے رہن سہن اور بول چال کو دیکھا ان کے تلخ و شیریں لہجے کو دیکھا اور پھر پوری کوشش کی کہ میں بھی آج کے دور کا سیاست دان لگوں... اور شکر ہے کہ میں کامیاب ہوا کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا مجھے

فیڈ بیک بہت اچھا مل رہا ہے۔"

* "آپ کے کردار کے مختلف روپ کہہ لیں یا شیڈز کہہ لیں جو اس کردار میں ہیں۔۔۔ آپ کو مزا آرہا ہے؟"

☆ "بالکل بہت مزا آرہا ہے۔۔۔ بہت دل و جان سے میں اس کردار کو کررہا ہوں اور سچ مانیے کہ میں نے اس کردار کو کرنے کے لیے بہت زیادہ محنت کی ہے اور بالکل اپنے آپ کو اس میں سمو دیا۔"

* "اس سے پہلے ملنے والے کرداروں کے بارے میں کیا کہیں گے جیسے "میرا سائیں" آپ نے کیا تھا؟"

☆ "میرا سائیں" بھی ایک منفرد رول تھا اور مشکل بھی تھا اور مجھے ایسے ہی مشکل اور چیلنجنگ رول کرنے میں مزا آتا ہے۔۔۔ اور چونکہ میں اپنا ہر کردار دل سے کرتا ہوں اس لیے ڈائریکٹرز حضرات مجھ پر اعتبار کرکے ایسے کردار دیتے ہیں جو واقعی مشکل ہوتے ہیں۔"

* "ایسے کردار کرنے کے بعد اصل زندگی میں کچھ فرق آتا ہے کیا؟"

☆ "وقتی طور پر ہی آتا ہوگا۔ ویسے مجھے نہیں محسوس ہوتا کہ مجھ میں کچھ چینج آتا ہوگا۔ میں عام زندگی میں عام انسان ہی ہوں۔ سب لوگوں کی طرح۔۔۔ لوگ مجھ سے بہت عزت اور پیار سے ملتے ہیں اور یہ سب پیار محبت میرا سرمایا ہے۔۔۔ لوگ میرے کام کو پسند کرتے ہیں یہ میرے لیے بہت بڑا تحفہ ہے لوگوں کی طرف سے۔"

* "دیگر فنکاروں کی طرح آپ ہر وقت اسکرین پہ نظر نہیں آتے اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

☆ "وجہ یہ ہے کہ میں کردار لیتے وقت یہ ضرور دیکھتا ہوں کہ اس میں اداکاری کا مارجن کتنا ہے اور یہ میرے لیے کتنا چیلنجنگ ہے اور تب ہی میں کردار قبول کرتا ہوں۔ ورنہ آپ یقین کریں کہ آفرز تو بہت ہوتی ہیں۔ مگر اب میرا بھی ایک معیار ہے اور انفرادیت ہے۔ ہر کردار قبول نہیں کرسکتا جو کردار کرتا ہوں۔ بہت دل کے ساتھ، اپنے اوپر طاری کرکے اور اس کردار میں اپنے آپ کو سمو کر پھر جب محنت کا صلہ ملتا ہے تو تعریف ہوتی ہے۔ لوگ سراہتے ہیں تو سمجھیے کہ محنت وصول ہوجاتی ہے۔"

* "آپ نے فلم بھی کی۔۔۔ مزید کیا ارادے ہیں؟"

☆ "مزید ارادے نیک ہیں۔ میں نے 2008ء میں مہرین جبار کی فلم "رام چند پاکستانی" میں کام کیا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصہ قبل میں نے مہرین جبار کے ساتھ ایک ڈرامہ کیا تھا "جیکسن ہائٹس" کے نام سے اور اب مجھے امید ہے کہ فیوچر میں بھی مہرین جبار کے ساتھ کام کرنے کا مزا آئے گا یا موقعہ ملے گا اور آج کل سیریل "خان" کے علاوہ فلم "میدان" میں مصروف ہوں۔ بہت اچھا رول ہے میرا اس میں اور جس طرح "رام چند پاکستانی" میں مجھے کام کرکے اچھا لگا تھا اور لوگوں نے مجھے پسند کیا تھا اسی طرح "میدان" بھی بہت کامیاب ہوگی ان شاء اللہ فلم سچے واقعات پر مبنی ہے اور گوہر رشید اس میں اہم رول کررہے ہیں۔

* "اپنی پاکستانی فلموں کا فیوچر کیا دیکھتے ہیں؟"

☆ "سچ بات تو یہ ہے کہ ہم صرف ڈراموں پر توجہ دے رہے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا ڈرامہ بہت اچھا ہے۔ اگر ہم انڈیا کی نقل کرتے ہوئے اپنی فلمیں بنائیں گے تو پھر ہم کامیابی کی زیادہ امید نہ رکھیں۔۔۔ ہمیں اپنی الگ پہچان کے ساتھ فلمیں بنانی چاہئیں اور فلم میں کام کرنے کے لیے مجھے ذاتی اطمینان چاہیے۔"

* "بہت کام آپ نے کیا۔۔۔ بہتر اور بہترین کے کہیں گے؟"

☆ "بہتر تو چھوڑیں۔۔۔ بہترین کی بات کریں۔۔۔ ان میں "من و سلویٰ" "میرا سائیں" "الو برائے فروخت نہیں" "وحشت" "یہ زندگی" "نجات" اور "بڑی آپا" اور حالیہ کچھ عرصہ قبل ریلیز ہونے والے ڈرامے جن میں "خان" بھی شامل ہے۔ ان میں کام کر کے اچھا بھی لگا اور اطمینان بھی ملا۔۔۔ اور "سنگ مرمر" بھی۔"

* "آج کل کے دیگر ڈراموں کے بارے میں کیا کہیں گے آپ؟"

☆ "آج کل۔۔۔ ڈراموں کے موضوعات میں بہت زیادہ یکسانیت آگئی ہے۔ خاندانی جھگڑے اور ناجائز تعلقات جیسے موضوعات پر ڈرامے بن رہے ہیں۔ پہلے چاروں صوبوں کے ڈرامے ہوتے تھے' وہاں کی روایات اور ثقافت کو پیش کیا جاتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے اب عورت کو بہت زیادہ مظلوم دکھایا جا رہا ہے اس لیے اب ڈرامے بہت زمانے تک یاد بھی نہیں رہتے' سوائے چند ایک کے جب کہ گزرے دور کے ڈرامے آج تک یاد ہیں۔ مرد کے موضوع پر بہت کم ڈرامے لکھے گئے ہیں جبکہ زیادہ لکھے جانے چاہئیں۔"

* "مطلب یہ کہ آپ آج کل کے کام سے مطمئن نہیں ہیں؟"

☆ "ایسا نہیں ہے کہ سب کام برا ہی ہو رہا ہے بہت

اچھا کام بھی ہو رہا ہے۔ مگر اس کا تناسب کم ہے۔۔۔ سرد کھوسٹ" کاشف نثار اور مہرین جبار جیسے اچھے ڈائریکٹرز بہت ایمانداری اور احسن طریقے سے اپنا کام کر رہے ہیں۔۔۔ دیگر لوگ بھی کر رہے ہیں۔۔ مگر بہت اچھا کام کرنے کی ضرورت ہے اور شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک بندے نے اپنے آپ کو کئی کئی کاموں میں الجھایا ہوا ہے۔"

* "مطلب یہ کہ ڈائریکٹر کو صرف اپنا کام کرنا چاہیے۔۔۔ پروڈیوسر کو اپنا۔۔۔ فنکار کو اپنا۔"

☆ "بالکل۔۔۔ سب کو اپنے شعبے تک محدود رہنا چاہیے۔"

* "زندگی میں جو کچھ ملا آسانی سے ملا۔۔۔ یا بہت جدوجہد کرنی پڑی؟"

☆ "زندگی میں کچھ بھی بہت آسانی سے نہیں ملتا اور انسان کا فیوچر اور انسان کا کیریئر کبھی بھی اس کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔۔۔ اس لیے سب کچھ پانے کے لیے بہت محنت کرنا پڑتی ہے اور میں نے بھی بہت جدوجہد کی آج جس مقام پر ہوں اس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر اللہ نے مجھے میری جدوجہد کا صلہ مجھے دیا۔۔ مجھے میری سوچ سے زیادہ دیا اس لیے میں بہت اچھی اور بہت مطمئن زندگی گزار رہا ہوں۔ انسان کے اختیار میں کچھ نہیں۔۔۔ اللہ ہی اس کے لیے راستے ہموار کرتا ہے اور میرے رب نے میرے لیے بھی راستے ہموار کیے۔"

* "بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ خدا ہی راستے ہموار کرتا ہے۔۔ سیاست سے لگاؤ ہے آپ کو۔۔۔ تھوڑی ہلکی پھلکی باتیں بھی ہو جائیں؟"

☆ "اس حد تک کہ میں اس سے باخبر رہ سکوں اور جس طرح اللہ تعالیٰ انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے راستے ہموار کرتا ہے اسی طرح ان شاء اللہ ہمارا ملک بھی ایک دن بہت ترقی کرے گا۔ بہت آگے تک جائے گا۔ یہ میرا یقین ہے۔"

* "شادی آپ کی پسند سے ہوئی؟ بتائیے کہ کتنے بچے ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

☆ "جی شادی پسند سے ہوئی۔ بیگم کا نام رابعہ ہے۔ اور میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے ایک اچھی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی بیگم ملی اور ماشاء اللہ سے میرے تین بیٹے ہیں جو ماشاء اللہ پڑھ رہے ہیں۔"

* "اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟"

☆ "جی الحمدللہ۔۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے نوازہ ہوا ہے بڑا کرم ہے اس کا ہم پر۔"

* "مصروف رہتے ہیں۔۔۔ گھر کو پراپر ٹائم تو نہیں دے پاتے ہوں گے؟"

☆ "ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ میں گھر کو ٹائم نہیں دے پاتا۔ بالکل دیتا ہوں۔۔۔ چاہے کتنا بھی مصروف ہوتا ہوں مگر اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتا۔۔ بچوں کے ساتھ خاصا وقت گزارتا ہوں اور ان کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتا ہوں گو کہ بچے سمجھ دار ہو گئے ہیں مگر باپ کا جو فرض ہوتا ہے اسے احسن طریقے سے نبھاتا ہوں۔"

* "بچوں کی تربیت میں کن باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے؟"

☆ "سب سے بڑی بات یہ کہ بچوں کو کوئی نصیحت کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھیں کہ جس بات کی آپ نصیحت کر رہے ہیں اس پہ آپ خود عمل کر رہے ہیں یا نہیں۔۔۔ آپ اپنے عمل سے اپنے بچوں کی تربیت کریں۔۔۔ پھر آپ ان سے کچھ کہیں گے تو وہ نہ پلٹ کر جواب دے سکیں گے نہ آپ پر تنقید کر سکیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے نعمان اعجاز صاحب سے اجازت لی۔

میری بھی سنیے

مایا علی

شاہین رشید

1 "نام؟"
"مایا علی۔"

2 "پیدائش؟"
"27 جولائی۔"

3 "شہر؟"
"اپنا لاہور۔"

4 "تعلیم؟"
"ماسٹرز ماس کمیونکیشن۔"

5 "بہن بھائی؟"
"دو ہی ہیں۔"

6 "والدین؟"
"ماشاء اللہ حیات ہیں۔ امی ہاؤس وائف ہیں ابو بزنس مین ہیں۔"

7 "پہلا پروگرام؟"
"ہم سب امید سے ہیں۔ بس انٹری ہوئی تھی اور پھر ماڈلنگ کی۔ پھر ڈرامے اور یوں سلسلہ چلتا چلا گیا۔"

8 "صحافی نہ بن سکی؟"
"ماسٹرز کر کے صحافت میں صحافی تو بن گئی مگر پریکٹس نہ کر سکی کیونکہ شوبز کی دنیا نے زیادہ متاثر کیا۔"

9 "شوبز کے راستے دشوار تھے؟"
"جی۔ دشوار اس لحاظ سے کہ میرے ابو بالکل بھی راضی نہیں تھے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔"

10 "میں افسردہ رہتی تھی؟"
"جب میرے اس فیلڈ میں آنے کے بعد میرے ابو نے مجھ سے بات چیت بند کر دی تھی۔"

11 "مجھے پسند نہیں؟"
"صبح سویرے اٹھنا۔"

12 "مجھے اچھا لگتا ہے؟"
"دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا۔ ہلا گلہ کرنا موج مستی کرنا۔"

13 "مجھے یاد آتے ہیں؟"
"کالج اور یونیورسٹی کے دن بہت یاد آتے ہیں۔ بہت اچھا دور تھا طالب علمی کا۔ گولڈن پیریڈ کہہ سکتے ہیں۔"

14 "شاپنگ کرتی ہوں؟"
"اپنی فیملی یعنی اپنے گھر والوں کے ساتھ کہ انہی کے ساتھ شاپنگ کرنے کا مزا بھی آتا ہے۔"

15 "زندگی کے بارے میں میرا نظریہ؟"

"کہ زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اس کو بھرپور انداز میں انجوائے کرکے گزارنا چاہیے۔"

16 "گھر میں ہوتی ہوں تو؟"

"تو کھانا بھی پکاتی ہوں اور گھر کے کام بھی کرتی ہوں کہ مجھے صاف ستھرا گھر اچھا لگتا ہے اور اپنے ہاتھ سے کھانا پکانا بھی اچھا لگتا ہے۔"

17 "بچپن کی یادگار شرارت؟"

"لوگوں کے گھروں کی بیل بجا کر بھاگ جانا... ویسے سچ بتاؤں یہ عادت ابھی بھی برقرار ہے... جب موقع ملتا ہے بیل بجاتی ہوں... مگر اب میں بھاگتی نہیں بلکہ آرام سے چلتی رہتی ہوں کہ کسی کو کیا معلوم کہ میں نے ایسا کیا ہے۔" (قہقہہ)

18 "جھوٹ کب بولتی ہوں؟"

"نہیں بولتی... سچ میں نہیں بولتی ہے۔ جو دل میں ہوتا ہے کہہ دیتی ہوں۔ دیر ہو جائے تو صاف صاف بتا دیتی ہوں کہ اس وجہ سے دیر ہوئی ہے۔"

19 "شادی؟"

"بھلا یہ بھی کوئی سوال ہے۔ جب ہونی ہو گی ہو جائے گی۔ ابھی تو اپنے اس فنی سفر میں بہت آگے تک جانا ہے۔"

20 "میں خیال رکھتی ہوں کہ؟"

"کہ خواہ کوئی بھی تقریب ہو یا سیٹ پہ جانا ہو... وقت پر پہنچ جاؤں... تاکہ کسی کو میرا انتظار نہ کرنا پڑے۔"

21 "میوزک پسند ہے؟"

"میوزک سے بہت سے لگاؤ ہے خود بھی گنگنا لیتی ہوں اور میوزک وہی سنتی ہوں جو کانوں کو بھلی لگے۔ کسی خاص گلوکار کو پسند نہیں کرتی جو اچھا گائے وہ ہی اچھا لگنے لگتا ہے۔"

22 "گھر میں ہوتی ہوں تو؟"

"کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتی بلکہ ہنستی ہنساتی رہتی ہوں... اور میرے گھر والوں کو میرا یہی روپ بہت پسند ہے۔"

23 "اس فیلڈ کی پہلی ناکامی؟"

"ایک ہی بار ناکام ہوئی، وہ بھی جب، جب میں نے ٹی وی تیوز کے لیے آڈیشن دیا تھا... بس اس کے بعد سب بہتر ہوتا چلا گیا۔"

24 "سر پر سوار نہیں کرتی؟"

"کسی بھی ناکامی کو، کسی بھی پریشانی کو، اور نہ ہی ہمت ہارتی ہوں۔ بلکہ اللہ سے اچھے کی امید رکھتی ہوں اور اچھا ہی ہوتا ہے۔"

25 "ایک خبر جس نے مجھے حیران کر دیا؟"

"کہ میرا شمار پاکستان کی ٹیلنٹ بھری اداکاراؤں میں ہوتا ہے... جبکہ میں تو اپنے آپ کو معمولی اداکارہ ہی

سمجھتی ہوں۔"

26 "کن کے ساتھ کام کرکے انجوائے کیا؟"

"حمزہ علی عباسی' عثمان خالد بٹ' ہر رشید' عائشہ خان ان کے ساتھ کام کرکے بہت انجوائے کیا اور جو مجھے بہت پسند ہیں اور جن کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں ان میں سجل علی' صنم سعید اور آمنہ شیخ کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہوں۔"

27 "رائٹر کو ترجیح دیتی ہوں یا کردار کو؟"

"میں ہمیشہ کردار کو ترجیح دیتی ہوں.... اور اسکرپٹ پڑھتی ہوں۔ پھر لیس کرتی ہوں۔"

28 "وقت سے پہلے کیا ملا؟"

"عزت' شہرت.... کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دو سال کے قلیل عرصے میں اتنی زیادہ پاپولر ہو جاؤں گی کہ ہر جگہ میرے چرچے ہوں گے مجھے میری اوقات سے زیادہ میرے رب نے دیا ہے۔"

29 "ایک بات جو گرہ میں باندھ لی؟"

"مجھے صنم بلوچ کی ایک بات نے بہت متاثر کیا۔ اس نے کہا کہ جب بھی تمہیں کوئی رول آفر ہو تو اپنے رول کا ضرور مطالعہ کرنا اگر رول جاندار لگے اور کہانی اسٹرونگ لگے تب کردار قبول کرنا۔"

30 "میں فراموش نہیں کرسکتی؟"

"اپنی زندگی میں آئی دو شخصیات کو ایک اپنی ماں کو جنہوں نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے میرا بہت ساتھ دیا اور دوسری شخصیت FAH ہے۔ جو میری ایک آواز پر.... لبیک کہتے ہیں۔"

31 "مجھے یقین ہے لیکن؟"

"مجھے یقین ہے کہ جو ملتا ہے قسمت سے ملتا ہے۔ مگر اپنی قسمت کو پانے کے لیے میں بہت محنت کرتی ہوں۔"

32 "میں معذرت کرلیتی ہوں؟"

"جب مجھے کسی فلم میں آئٹم سونگ کرنے کی پیشکش ہوتی ہے۔"

33 "میں سوچتی ہوں؟"

"کہ چاہے پوزیٹو رول کرو یا نگیٹو.... لوگ تنقید کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں.... مظلوم کرو تو بے چاری اور بولڈ کرو تو توبہ توبہ کرتے ہیں۔"

34 "اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟"

"تو شادی کرکے بچے پال رہی ہوتی.... ہاہاہاہا۔"

35 "میں نقصان اٹھاتی ہوں؟"

"ہمیشہ سچ بولنے پر.... اس لیے اب سچ بولنے سے ڈرنے لگی ہوں۔"

36 "خراب ملکی حالات کا ذمہ دار کون ہے؟"

"سو فیصد ہمارے سیاست دان ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو ہمارا ملک بھی دیگر ممالک کی طرح خوش حال اور خوب صورت ہوسکتا ہے۔"

37 "میں نے جب نیوز کے پروگرام دیکھے تو؟"

"تو مجھے اندازہ ہوا کہ لوگوں کی حکومت سے کوئی ڈیمانڈز نہیں سوائے اس کے کہ ان کو بنیادی سہولتیں

مل جائیں۔ جیسے گیس پانی اور بجلی اور یہی بنیادی سہولتیں ہمارے حکمران دیتے ہیں۔"

38 "سیاست سے میری دلچسپی؟"

"جیسی ہماری سیاست ہے۔ ویسی سیاست سے تو بالکل بھی دلچسپی نہیں ہے۔"

39 "مجھے فخر ہے کہ؟"

"کہ اس فیلڈ کے مختصر عرصے میں میں نے ایسے کردار کیے ہیں جو بہت کم فنکاراؤں کے حصے میں آتے ہیں۔"

40 "رول جو مجھے پسند ہیں؟"

"چیلنجنگ منفرد اور کامیڈی۔"

41 "ایک عہد جو اپنے آپ سے کیا؟"

"جب میرے والد مجھے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے تو میں نے ان سے وعدہ کیا اور اپنے آپ سے عہد کیا کہ میں اپنے والد کے اعتماد کو کبھی نہیں توڑوں گی۔"

42 "کون سا کردار میری شخصیت کے قریب تھا؟"

"میرا ایک کردار تھا "زارا" کا وہ مجھے اپنی شخصیت کے بہت قریب لگتا تھا۔"

43 "دل کے قریب جو کردار تھا؟"

"وہ "منو" کا کردار تھا۔"

44 "ڈراموں میں اور فلم میں کیا فرق ہونا چاہیے؟"

"فلم فل تفریح ہو کہ آپ سینما ہاؤس میں جائیں تو تو Sad اسٹوری دیکھ کر روتے ہوئے باہر نہ نکلیں بلکہ فلم انجوائے کریں۔ جبکہ ڈراموں میں ہمارے معاشرتی مسائل کو پیش کرنا چاہیے۔"

45 "جب سنڈریلا کا کردار کیا تو؟"

"بہت اچھا لگا۔ کیونکہ مجھے اس طرح کے تخیلاتی کردار کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔"

46 "میری بھی ایک دنیا ہے؟"

"جی۔۔۔ میری بھی ایک دنیا ہے اور بہت آئیڈیل دنیا ہے میری' جہاں میں اپنی خوشیوں کو اپنی خواہشات کو پورا ہوتا ہوا دیکھتی ہوں۔"

47 "لوگ تصوراتی دنیا میں کیوں رہنا چاہتے ہیں؟"

"کیونکہ۔ ہر انسان فینٹیسی پسند ہے اور اس میں رہ کر اسے سکون ملتا ہے۔"

48 "میرے آن ایئر ڈرامے؟"

"جو آج کل آن ایئر ہے وہ دیار دل ہے جو کہ بے حد مقبول ہوا تھا اور آج بھی اسی مقبولیت کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔"

49 "میری آنے والی فلم؟"

"طیفا ان ٹربل۔۔۔ علی ظفر کے ساتھ میرا لیڈ رول ہے۔ مطلب میں ہیروئن ہوں۔"

50 "فضول خرچ ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔ صرف اپنی ضرورتوں کی چیزیں خریدتی ہوں' کیونکہ پیسہ بہت مشکل سے کمایا جاتا ہے۔"

مقابل ہے آئینہ

سدرہ بتول

ادارہ

س : "اصلی نام کیا ہے؟اور گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج : "اصلی نام سدرہ بتول ہے بڑی بہن "بیدی" کہتی ہے دوسری "زیڈ - بی" امی اور ابو سدہ کہتے ہیں۔"

س : "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج : "آئینہ تو جو بھی کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔"

س : "حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟"

ج : "یہی خیال آتا ہے کہ مجھ سے زیادہ حسین تو نہیں ہے لیکن خوب صورت ہے ہاہا۔"

س : "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"

ج : "پرس کی تلاشی لیں تو ٹشو پیپر، انگوٹھی، لپ گلوس، آئینہ، حجاب پن اور اسی قسم کی چیزیں نکلیں گی۔"

س : "بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟"

ج : "اگر آپ رشتہ داروں سے نہیں بچ سکتے تو بھوت بے چارے کو الزام کیوں دیں۔"

س : "مہمان کیسے لگتے ہیں؟"

ج : "اچھے لگتے ہیں مہمان اگر بن بلائے اور وبال جان نہ ہوں تو (ہاہاہا)۔"

س : "کھانے میں کیا پسند ہے؟"

ج : "کھانے میں بریانی، پائن ایپل اور شوارما بہت پسند ہے۔"

س : "اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟"

ج : "حکومت مل جائے تو بے روزگاری اور سفارش اور رشوت کو ختم کروں گی۔"

س : "پسندیدہ شاعر؟"

ج : "میرے والد (نوازش علی ندیم) محسن نقوی، جون ایلیا، علی زریون۔"

س : "مزاجاً" لڑاکا ہیں؟"

ج : "بقول سب کے "بہت زیادہ"۔"

س : "گھر سے باہر جاتے ہوئے کیا کیا چیزیں ساتھ رکھتی ہیں؟"

ج : "صرف ایک والٹ جس میں پیسے ہوں۔"

س : "کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟"

ج : "زندہ دل، وفادار اور وہ لوگ جو دوسروں کی برائیاں نہ کریں میرے سامنے بیٹھ کر۔"

س : "اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟"

ج : "تو زندگی سے ایک ٹینشن کم ہو جاتی ہماری۔"

س : "اللہ پاک کو یاد کرنے کا سب سے بہترین وقت؟"

ج : "جب ہم خدا کو یاد کر رہے ہوتے ہیں وہ وقت خود بخود بہترین بن جاتا ہے۔"

س : "آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج : "کبھی کبھی فضول خرچ بن جاتی ہوں ورنہ کفایت شعار ہوں۔"

س : "کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟"

بقیہ صفحہ 271 پر

آسیہ مرزا

من مورکھ کی بات نہ مانو

عباد گیلانی بلڈ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی بیوی مومنہ کو طلاق دے کر اپنے بیٹے حازم کو اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور دوسری شادی عاطفہ سے کرلیتا ہے۔ حازم اپنی ماں عاطفہ اور بھائی بابر کے ساتھ اچھی زندگی گزار رہا ہوتا ہے' مگر اپنے باپ عباد گیلانی کی بیماری کی وجہ سے فکر مند رہتا ہے۔ جب کہ عاطفہ اور بابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ عباد گیلانی کو اپنی بیماری میں احساس ہوا ہے کہ اس نے حازم کی ماں مومنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ عباد گیلانی مومنہ کے باپ یاور علی کو بلاتا ہے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگتا ہے اور حازم کو خاص طور سے اس کے نانا یاور علی سے ملواتا ہے' مگر حازم اپنے نانا سے مل کر اچھے تاثرات کا اظہار نہیں کرتا' مگر بعد میں اپنے باپ کی خواہش پر ان کے ساتھ اپنے نانا کے گھر جاتا ہے اور اپنی ماں مومنہ سے ملتا ہے۔ ماں سے مل کے تمام شکوے بھول جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

حوریہ مومنہ کی بھتیجی سے بے حد محبت کرتی ہے اور مومنہ بھی اسے بے تحاشا چاہتی ہے' حازم جب حوریہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں حوریہ کے لیے پسندیدگی کے جذبات ابھرتے ہیں اور یہی حال حوریہ کا بھی ہوتا ہے۔ عباد گیلانی حوریہ سے مل کر بہت خوش ہوتا ہے کیونکہ حوریہ میں اسے مومنہ کا عکس نظر آتا ہے اور حازم سے پوچھ کر اس کے نانا یاور علی سے دونوں کی شادی کی بات کرتا ہے۔

حوریہ اپنی دوست فضا سے بہت محبت کرتی ہے' فضا کی ایک امیرزادے سے دوستی ہے اور وہ گھر والوں سے چھپ کر اس سے ملتی ہے۔ حوریہ کو اس بات سے اختلاف ہے' وہ فضا کو بہت سمجھاتی ہے کہ اس راستے پر نہ چلے' مگر فضا نہ مانی اور آخر کار ایک دن محبت کے نام پر بربادی اپنی قسمت میں لکھوا لیتی ہے اور اس بات کا پتا اس کی سوتیلی ماں جہاں آرا کو چل جاتا ہے اور وہ اپنے بھانجے نصیر سے اس کی شادی کرنے کا پروگرام بنالیتی ہے جبکہ فضا اس پر راضی نہیں ہوتی حوریہ کو جب پتا چلتا ہے تو وہ فضا کو سمجھاتی ہے اس امیرزادے کو کہے کہ وہ اس سے شادی کرے اور فضا اس کو مجبور کرتی ہے کہ یہ بات

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات **Green Box** والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

وہ خود اس کو سمجھائے اور فضا کے مجبور کرنے پر جب وہ بابر سے ملتی ہے تو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے بابر سے ہرگز نہیں ملنا چاہیے تھا اور اس بات پہ بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس نے ایک غلط لڑکی کو دوست بنایا۔۔۔ اب آگے

سولہویں قسط

کبھی کبھی آپ بہت اونچائی سے گرتے ہیں اور ایسے خلا میں جہاں ہیبت ناک تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ بابر گیلانی بھی خود کو ایسے ہی خلا میں گرا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے اعصاب کو ترختے ہوئے جیسے خود ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس کی مضبوط انگلیاں موبائل پر اتنی سختی سے جمی تھیں کہ یوں لگ رہا تھا موبائل ابھی تڑخ کر رہ جائے گا۔

حوریہ کے جملے آتشیں گولیوں کی مانند تڑاتڑ اس کے جسم کے آر پار اتر گئے تھے۔ اس کی مسکراہٹ تلوار کی مانند اس کی روح کو اندر سے کاٹ کر گزر گئی تھی۔ اس کی قربت اس کے لمس کی برقی لہریں اور آگ سے بھرے یہ الفاظ سب نے مل کر اسے سن سا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کے وجود پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے صحرا میں ڈھلتی شام پہ اترتا ہے۔

"ہائے بابر!" کسی نے اسے دور سے پکارا تھا اس کے وجود کے سناٹے میں ہلکا سا ارتعاش ہوا۔

اس نے اپنے سامنے رکھی خالی کرسی کو دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے وہ قاتل بیٹھی تھی اور اسے اندر تک زخمی کر کے گئی تھی۔

عجیب ہی زخم لگائے تھے اس نے اس بار وہ مزاحمت بھی نہ کر سکا۔

جوس کا گلاس منہ سے لگا کر ایک ہی سانس میں خالی کر کے میز کی سطح پر دھپ سے رکھ دیا اور سینے سے ایک بھنچی بھنچی سانس کھینچتے ہوئے کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

پارٹی اپنے اختتام پر تھی... مہمان تقریباً جا چکے تھے بس عاظمہ کی فرینڈز لان کے گوشے میں رکھے صوفوں پر بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ حوریہ عباد گیلانی کے کمرے میں چلی آئی۔

"آپ جاگ رہے ہیں پاپا۔" وہ عباد گیلانی کو کھڑکی کے نزدیک وہیل چیئر پر بیٹھے سوچوں میں گم دیکھ کر اندر چلی آئی۔

"آپ بہت جلدی اندر آ گئے۔"

"ہاں اب جسم میں دم نہیں رہا ناں۔ تھکن سی ہونے لگتی ہے۔" وہ وہیل چیئر دھکیل کر صوفوں کی جانب آ گئے۔

"سوچ رہا ہوں، وقت کس طرح انسان کو ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر بنا ڈالتا ہے۔ جس جسم پر انسان اتراتا پھرتا ہے۔ وہ ایک دن ناتواں ہو کر بوجھ کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔"

"آپ اکیلے نہ بیٹھا کریں پاپا۔" حوریہ ان کے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

"نہیں... اکیلا کہاں ابھی کچھ یار دوست اٹھ کر گئے ہیں پاس سے۔" پھر ہلکی سانس بھرتے ہوئے بولے۔ "بے چارے مزاج پرسی کو چلے آتے ہیں۔ اینی وے... تم سناؤ پارٹی کیسی رہی۔ علی شاہ سو گیا کیا؟"

"جی۔"

"اس کی نظر اتار لینا۔" وہ دھیرے سے بولے۔ پھر حوریہ کی اٹھتی نظروں پر دھیرے سے مسکرائے۔

"کیا کروں۔ وہمی ہو گیا ہوں حازم کے جانے کے بعد سے۔" پھر افسردگی سے کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

"اسے بھی نظر لگ گئی۔ شاید میری ہی۔"

امیر علی چائے کے لوازمات سے سجی ٹرالی گھسیٹتا اندر داخل ہوا تو حوریہ نے اس سے پوچھا۔

"پاپا نے کھانا کھا لیا کیا؟"

"جی تھوڑا بہت ہی کھایا ہے۔ چائے منگوائی تھی میں نے سوچا حوریہ بی بی کے ساتھ ہی چائے دوں گا۔ مجھے پتا تھا۔"

تھا آپ ان کے روم میں ضرور آئیں گی انہیں دیکھنے۔"

امیر علی اپنائیت سے کہہ رہا تھا۔

"آپ جو اتنا خیال رکھتے ہیں امیر علی میں تو بس خیریت پوچھ جاتی ہوں اوپر اوپر سے ہی۔" حوریہ امیر علی کو سراہتے ہوئے بولی۔

"ارے اوپر اوپر سے کیوں بی بی آپ تو بہت سا وقت نکالتی ہیں صاحب کے لیے۔" امیر علی مگ میں چائے انڈیلنے لگا۔

اور دونوں مگ ٹرالی پر رکھ کر سلام کرتا کمرے سے چلا گیا۔

حوریہ آج عباد گیلانی کے پاس خاص مقصد کے لیے آئی تھی۔ بابر کے ساتھ پے درپے تلخ کلامیوں کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اسے عباد گیلانی کو اعتماد میں لے کر ساری حقیقت کھول دینی چاہیے۔ وہ لاشعوری طور پر بابر کے مزاج اور اس کی بڑھتی جارحیت سے گھبرا اٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتے وہ اجنبی رنگ اسے وحشت میں دھکیل رہے تھے۔ وہ کم سن یا نادان نہیں تھی کہ آنکھوں سے چھلکتے ان رنگوں کو نہ پہچان پاتی جو جذبات کی وہ شکل ہوتے ہیں جو دلچسپی سے شروع تو ہوتے ہیں مگر ان کا اختتام کسی بھی صورت میں ہو سکتا ہے محبت، عشق یا جنون اور جنون کے ساتھ کوئی بھی خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔

وہ اسے یہیں روک دینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان جذبات کے بہاؤ میں اس کی عزت اور بابر کا جو تھوڑا بہت مان قائم ہے وہ بھی بکھر کر رہ جائے۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" چند لمحے خاموشی کے بعد حوریہ نے کہا تو عباد گیلانی نے چائے کی چسکیاں بھرتے بھرتے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر کپ پرچ پر رکھتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔

"ہاں ضرور کہو ارے تم اتنا سوچتی کیوں ہو۔ ہربات کھل کر کیا کرو۔"

حوریہ نے لحہ بھر تامل کیا۔ اس کی انگلیاں اضطراری انداز میں ایک دوسرے سے لپٹ رہی تھیں۔ پھر وہ انگلی میں پڑے چھلے کو دھیرے دھیرے گھمانے لگی۔

"کیا بات ہے حوریہ۔" عباد گیلانی اسے بغور دیکھ رہے تھے وہ انہیں بے حد الجھی الجھی ہوئی کچھ منتشر ذہن دکھائی دے رہی تھی۔

"بابر کی وجہ سے کوئی پریشانی ہے اس نے کچھ کہہ دیا ہے کیا۔"

انہوں نے کتنا درست اندازہ لگایا تھا حوریہ نے ایک مضمحل سی سانس کھینچی اور ٹھہر ٹھہر کر انہیں ان تمام رازوں میں شریک کرنے لگی جو اس کے دل کے آتش فشاں میں لاوے کی طرح پک رہے تھے اور اسے لگ رہا تھا اب اس کا دل اس لاوے کو زیادہ دیر نہ سہار پائے گا کسی دن پھٹ کر یہ لاوا بہنے لگے گا۔ وہ دھیرے دھیرے بتانے لگی وہ لاوا بہانے لگی۔

عباد گیلانی کے لیے یہ سب کسی شاک سے کم نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

تو نے دیکھی ہے، وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جس کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تم پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تم کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

محبت یکدم عشق میں نہیں بدلی یہ درجہ بہ درجہ آگے کا سفر کرتی ہے۔ پہلے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ میلان اور رجحان بڑھتا ہے پھر محبت کا روپ اختیار کرتی ہے کبھی تو اسی درجے پر رک جاتی ہے تب تک زندگی سہل رہتی ہے قابل برداشت... مگر پھر جب انتہائی سوچوں اور فطری جذبات اور خواہشات کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو یہ عشق سے جنون کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

اور بابر کے سر پر بھی حوریہ کا جنون سوار ہو گیا تھا... اسے لگ رہا تھا ہر گزرتا لمحہ اس کے قدموں کو پیچھے ہٹانے کے بجائے آگے بڑھا رہا تھا۔ جنون کی رستہ خیزی بڑھ رہی تھی۔

اس کے رویے' الفاظ کے نشتر' اس کی نفرت انگیز نظریں اس کے اس جنون کو روکنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ یا شاید اس کے جنون میں اضافہ کا سبب بن رہی تھیں۔

وہ اپنے بیڈ پر لیٹا سگریٹ کے مرغولے آنکھوں کے آگے پھیلائے گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ گزرے دنوں اور آج کا واقعہ پر سوچ رہا تھا۔ حوریہ کے الفاظ اس کے ذہن کی اسکرین پر روانی سے گزر رہے تھے۔

"تم شاید خدا کے خوف سے بھی آزاد ہو۔ مگر یاد رکھنا بابر آزاد سمجھنے اور آزاد ہونے میں بہت فرق ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن کسی کی آہ تمہارے پیروں سے زمین کھینچ لے۔" اس نے یکدم سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور آنکھیں زور سے بند کرلیں۔

ہر مسام سے ٹھنڈ کا احساس پھوٹنے لگا۔ جیسے اندر کوئی جھرجھری سی آئی ہو۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا باپ عباد گیلانی بے بسی اور لاچاری کی تصویر بنا گھومنے لگا۔ اس شخص کو اس نے بے حد کروفر کے ساتھ اکڑی گردن کے ہمراہ اس کوٹھی میں حکم چلاتے' اپنی من مانیاں کرتے دیکھا تھا۔ مگر آج عبرت کی تصویر تھا۔

اس نے حازم کو مرنے کے بعد دلوں میں زندہ دیکھا تھا اس کی محبت میں دلوں کو تڑپتے دیکھا تھا۔

"حازم سے بچھڑ جانے کے باوجود اس کی یادوں سے بچھڑنا ناممکن ہے میرے لیے۔ اس کی محبت ایسے نقش چھوڑ گئی ہے کہ دل کو اب کچھ طلب نہیں رہی۔ بس میں انہی لمحات میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔"

حوریہ کی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ وہ اضطراری انداز میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"ہاں! میں حازم کی محبت تمہارے دل سے نہیں کھرچ سکتا۔ مگر تم اپنے دل میں اتنی گنجائش تو نکال سکتی ہو کہ میں کسی گوشے میں ٹھہر جاؤں۔ کوئی ایک چھوٹا سا کونا۔ تھوڑی سی جگہ۔" وہ کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔

اے سی کی ٹھنڈک کمرے کو حصار میں لیے ہوئے تھی مگر اسے عجیب حبس کا احساس ہو رہا تھا اسے تازہ ہوا کی خواہش ہونے لگی۔ وہ سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لگانے لگا۔

"میں نہیں جانتی بابر۔ کتنی عورتوں کی آہیں تمہارے ساتھ ہیں مگر میں نے فضا کو اپنی آنکھوں سے برباد ہوتے دیکھا ہے۔" وہ فضا کے لیے اس سے کس قدر متنفر ہو چکی تھی۔

"مگر فضا بھی اسی جرم میں برابر کی شریک ہے۔ میں اسے زبردستی اس کے گھر سے نہیں لاتا تھا۔ وہ اپنی رضا اور خوشی سے میری طرف آ رہی تھی۔" بابر نے کتنا احتجاج کیا تھا۔

"تو کیا زمین پر پڑے مال کو غصب کرنے کا حق رکھتے ہو تم۔ نہیں بابر گیلانی! تم اپنے جرم کو اس دلیل سے ختم نہیں کرسکتے۔ تمہارا جرم اتنا بڑا ہے کہ سات پانیوں سے بھی نہیں دھل سکتا۔" حوریہ کی آواز اس کی سماعت پر بوجھ کی طرح پڑی تھی۔ وہ اسے اپنی کنپٹیوں پر اٹھتی ٹیس کا احساس ہو رہا تھا گویا۔ کنپٹیوں کے اطراف رگوں کی بجائے سخت تاروں کا جال بچھا ہوا ہو۔ وہ سگریٹ بجھا کر کرسی پر ڈھیلے انداز میں بیٹھ گیا۔

"میں تم تک آنا چاہتا ہوں حوریہ۔ اب تم ہی بتاؤ میں کس راستے سے آؤں۔ کوئی ایک راہ تو ہوگی میرے جیسے شخص کے لیے بھی۔" اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☼ ☼ ☼

عباد گیلانی کی نظریں زمین میں گڑ کر رہ گئی تھیں' انہیں محسوس ہو رہا تھا وہ حوریہ کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پائیں گے۔ ان کا دل چاہ رہا تھا اس پل زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

"مجھ سے بہت بڑی کوتاہی ہو گئی۔ باپ ہوتے کئی ذمہ داریاں نہ نبھا سکا۔" ان کا لہجہ مغموم تھا۔ "اس گھر کا سربراہ تھا۔ مجھے حازم کے بعد بابر پر کڑی نگاہ رکھنی چاہئے تھی۔ بہت کوتاہیاں ہوئی ہیں مجھ سے عمر بھر۔" وہ کرسی پر ایک اذیت سے بیٹھے رہ گئے اور آنکھیں بند کر لیں جیسے کسی خیال سے نجات پانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ مگر یہ خیال تھا نہ خواب تھا بلکہ حقیقت تھی جو تمام تر سفاکی کے ہمراہ ان کی آنکھوں کے سامنے دھری تھی۔

حوریہ جا چکی تھی ان کے کمرے سے مگر انہیں لگ رہا تھا وہ بابر کا ماضی نہیں بلکہ عباد گیلانی کا ماضی کھول کر گئی ہو۔ انہیں اپنی رگوں میں صدیوں کی تھکن اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہت سی پریشان کن' دل گرفتہ سوچیں انہیں آکٹوپس کی طرح جکڑے ہوئے تھیں۔

کبھی حازم کا خیال پورے رنج کے ساتھ گرفت میں لے رہا تھا' کبھی بابر کا خیال اور حوریہ کی باتیں دل پر آرے چلا رہی تھیں۔

"مسز عثمانی بھی عجیب ہی عورت ہیں بولتی ہیں تو بس منہ پھاڑ کر بولتی ہی چلی جاتی ہیں۔"

عاظمہ باتھ روم سے نکل کر ٹشو پیپر چہرے پر تھپتھپاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں ایک پل تو دل چاہا۔ رکھ کر سنا دوں۔ خود اپنے بہو بیٹے کے پراہلمز چل رہے ہیں ادھر میری بہو کی فکر پڑ گئی ہے انہیں۔"

عباد گیلانی اضمحلال سے آنکھیں موندے ہوئے تھے ذرا سا چونکے "کیسی فکر" بات حوریہ کے حوالے سے تھی ان کا چونکنا ضروری تھا۔

"ارے یہی کہ حازم کے بعد حوریہ کا کیا ہو گا؟ اتنی پیاری لڑکی ہے بابر سے بیاہ دو حد ہوتی ہے ہمارے فیملی میٹرز کو کھلے عام ڈسکس کرنے والی وہ کون ہوتی ہیں۔" وہ گولڈ کے کنگن کلائیوں سے اتار کر دراز میں زور زور سے پھینکنے لگیں۔ گویا سارا غصہ انہی پر نکال رہی تھیں۔ عجیب سی ندامت کے احساس نے انہیں ایک پل خاموش سا کر دیا۔ وہ عاظمہ کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

"یہ تو اچھا ہوا حوریہ نزدیک نہیں تھی ورنہ کتنا ہرٹ ہوتی۔" عباد گیلانی کا دل سینے کی دیوار میں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ کرب سے انہوں نے ایک پل آنکھیں میچ لیں پھر کسی خیال کے تحت چونک کر جلدی سے بولے۔

"تم اس طرح کی بات بابر کے سامنے مت کر دینا۔ بس یہیں کلوز کر دو اس چیپٹر کو۔"

"ہاں۔ میں نے تو مسز عثمانی سے صاف کہہ دیا۔ بابر کی اپنی چوائس ہے وہ اپنا لائف پارٹنر چوز (منتخب) کرنے میں آزاد ہے۔ اینی ویز آپ ابھی تک کیوں جاگ رہے ہیں میڈیسن نہیں کھائی لگتا ہے۔" وہ چپ رہے۔

عاظمہ امیر علی سے بازپرس کرنے کمرے سے نکل گئیں۔ وہ کروٹ بدل گئے۔ نیند اب کہاں آنی تھی' وہ سوچ رہے تھے کہ صبح وہ بابر سے ضرور بات کریں گے اور پہلی فرصت میں حوریہ کو یاور ہاؤس بھیج دیں گے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ بابر علی شاہ کی آڑ میں اپنی کسی خواہشات اور ارادوں کو پورا کرنا چاہ رہا ہے۔ انہیں حوریہ اتنی ہی عزیز تھی جتنا حازم۔ اور مومنہ کے حوالے سے تو وہ ان کے پاس امانت کی طرح تھی۔ وہ خوف زدہ ہو گئے کہ امانت میں کہیں خیانت نہ ہو جائے۔ پہلے ہی اتنے مقروض تھے قرض ادا نہیں کر پائے تھے۔

☼ ☼ ☼

عباد گیلانی سے وہ ساری باتیں کرنے کے بعد حوریہ کو لگ رہا تھا اس کے سینے پر رکھا بوجھ کم ہو گیا ہو۔ وہ گھٹن جو رگ رگ کو کاٹ رہی تھی۔ وہ ختم سی ہو گئی ہو۔ وہ ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی خود کو۔ اسے یقین تھا عباد گیلانی اس مسئلے کو بے حد احسن طریقے سے ہینڈل کریں گے اور اسے قید سے رہائی دلائیں گے۔ گو کہ ان کا اثر رسوخ اور دبدبہ نا ہونے کے برابر رہ گیا تھا مگر اتنا تو وہ جانتی تھی کہ بابر کم از کم بستر مرگ پر پڑے باپ کے حکم کا احترام ضرور کرے گا۔ وہ بے حد پر سکون ہو کر سوئی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو علی شاہ معمول کے مطابق کمرے سے غائب تھا اس نے اٹھ کر کھڑکی کی سلائڈ کھولی۔ نظریں بابر پر پڑیں۔ گیلانی ہاؤس کے ہرے بھرے باغیچے کے گوشے میں بابر جاگنگ کر رہا تھا۔ علی شاہ کو اس نے آرام دہ کرسی پر نیم والٹایا ہوا تھا۔ بابر جاگنگ کرتے کرتے رک کر اسے پیار کرتا پھر جاگنگ میں مصروف ہو جاتا۔ بلیک ٹریک سوٹ میں اس کا سراپا بھی حازم کی مانند تھا دراز قد۔ چوڑے شانے اور چہرے کے نازک حصوں میں تیز سرخی۔

ملازم لڑکا اس کے لیے جوس لے آیا تو وہ کرسی پر بیٹھ کر تولیے سے چہرہ اور سر رگڑنے لگا اور جوس کا گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر ایک ہی سانس میں پی کر کرسی سے اٹھا۔ اسی پل اس کی نظریں کھڑکی کے پاس کھڑی حوریہ پر گئیں۔ دوسرے پل اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ پہلی بار اس نے مسکراہٹ اچھالنے یا ہاتھ کا اشارہ دینے کے بجائے چہرے کا رخ موڑ لیا تھا پھر ملازم سے کچھ کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔ ملازم علی شاہ کو واکر میں ڈال کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔

حوریہ سلائڈ بند کر کے کچھ دیر یونہی سلائڈ کی ٹھنڈی دیوار پر پشت ٹکائے کھڑی رہ گئی۔

علی شاہ سے محبت کا یہ ڈھونگ تم زیادہ عرصہ تک نہیں رچا سکتے بابر۔ اسے سیڑھی بنا کر اپنے مقصد کو کبھی پورا نہیں کر سکو گے۔

"آپ ناشتا کریں گی عاطمہ بی بی ٹیبل پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" نفیسہ اسے دروازہ بجا کر کہہ رہی تھی وہ کمرے سے باہر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ماما۔ میں پاپا کو ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔" بابر تیزی سے عباد گیلانی کے روم سے نکلا تھا۔ اس کے چہرے پہ پریشانی ہویدا تھی۔

"ہی از ناٹ فیلنگ ویل" (وہ ٹھیک محسوس نہیں کر رہے ہیں) عاطمہ گھبرا کر ناشتے کی کرسی سے اٹھی تھیں۔ حوریہ کے قدم بھی وہیں تھم گئے تھے۔ اس نے لرز کر عباد گیلانی کی خواب گاہ کی طرف دیکھا تھا۔

"امیر علی ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔" بابر جاگنگ کے لباس میں تھا اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر بکھرا ہوا تھا وہ اپنے روم کی جانب بھاگا تھا۔

امیر علی عباد گیلانی کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا کمرے سے باہر لایا تھا۔

"کیا ہوا پاپا۔" حوریہ لپک کر ان کی کرسی کے پاس آئی۔ عباد گیلانی نڈھال سے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے ہوئے تھے۔

"میں بھی چلوں گی ہاسپٹل۔" وہ عاطمہ سے کہنے لگی جو نفیسہ کو کچھ ہدایتیں دے رہی تھیں۔ عاطمہ نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"گھبراؤ مت۔ یونہی ذرا سی بگڑ گئی ہے طبیعت۔ میں جا رہی ہوں نا۔ تم علی شاہ کے پاس رہو۔"

"پاپا۔" حوریہ عباد گیلانی کو دیکھنے لگی۔ انہوں نے ذرا سی آنکھیں کھول کر حوریہ کی طرف دیکھا۔ مسکرانے کی کوشش کی مگر ان کے خشک ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھرنے سے پہلے ٹوٹ گئی۔ وہ فقط سر کو خفیف سی جنبش دے کر رہ گئے۔

"امیر علی۔" بابر امیر علی کو آواز دینے لگا۔ وہ کپڑے بدل چکا تھا۔ اس کے قدم بہت تیزی سے باہر کی جانب تھے۔ امیر علی عباد گیلانی کی وہیل چیئر دھکیلتا ہوا باہر کی جانب چلا گیا۔ عاظمہ بھی نفیسہ کے ہاتھ سے اپنا بیگ لے کر چلی گئیں۔

حوریہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ویران لابی کو دیکھنے لگی پھر نڈھال سی کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

فضا کو نصیر اس کے میکے لایا تھا ابا سے ملوانے۔ کئی روز سے ابا کا فون نصیر کو آ رہا تھا۔ وہ فضا سے ملنا چاہتے تھے۔ بتول آپا نے ہی بتایا تھا ابا کی طبیعت خراب رہتی ہے وہ بستر کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

فضا ڈرتے ڈرتے داخل ہوئی تھی مگر جب ابا کی حالت دیکھی اور ابا نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا تو اس کا سارا خوف، دکھ اور رنج میں بدل گیا۔ وہ زار و قطار روتی رہی۔ جہاں آرا نے اسے پانی پلا کر دیا۔

"ابا کی یہ حالت کب سے ہے اماں۔ کیا ہو گیا ہے انہیں یہ علاج کیوں نہیں کروا رہے؟" وہ جہاں آرا کے ہمراہ ایک گوشے میں چلی آئی اور مغموم سی موڑھا کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"بس کئی ہفتوں سے چل رہی ہے۔" وہ بھی افسردہ اور نڈھال سی اس کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گئیں۔ ان کا تنتنا، دبدبہ اور وہ ساری ناگواریت کوئی گزری ہوئی بارش ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اس پل بے حد شکستہ، خستہ حال اور ایک بے بس عورت دکھائی دے رہی تھیں۔

"ڈاکٹر جگر کی خرابی بتا رہے ہیں۔ میں نے بتول آپا کو بتایا تھا اور نصیر نے تو خود رپورٹس دیکھی ہیں بس تجھے فون کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں۔ ابا ہفتوں سے بیمار ہیں اور مجھے خبر تک نہیں۔ کسی نے بھی نہیں بتایا۔ نصیر نے بھی نہیں۔"

"اسے تمہاری پریشانی کا خیال تھا شاید اس لیے۔" جہاں آرا کا لہجہ اداس اور بکھرا ہوا تھا۔ پھر فرش سے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"لو میں بھی کیا اپنا دکھڑا لے کر بیٹھ گئی۔ اتنے عرصے بعد تم میکے آئی ہو چائے تک کا نہیں پوچھا۔" فضا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں روک لیا۔

"آپ نے مجھے فون کیوں نہیں کیا؟" جہاں آرا نے اس کی طرف دیکھا پھر نظریں چرا لیں۔

"میں جانتی ہوں ابا کے علاج کے لیے پیسا نہیں ہے آپ کے پاس۔" وہ دھیرے سے بولی۔

جہاں آرا کی نظریں کچھ اور جھک گئیں وہ فرش کو گھورتی رہ گئیں، سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔ ابھی پچھلے ہفتے ابا کی بائیک بیچ دی تھی اپنی دونوں چوڑیاں بھی بیچ دی تھیں پر اتنے روپوں میں کیا ہو سکتا تھا۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

"کس منہ سے کہتی میں آج تک کیا دیا ہے میں نے تمہیں سوائے نفرت اور کوسنوں کے۔" وہ بے اختیار رو پڑیں۔ فضا نے انہیں سینے سے لگا لیا۔

"فضا دعا کر اللہ تیرے ابو کو بچا لے میری یہ چھت نہ چھن جائے۔ میرا تو کوئی نہیں ہے ان کے علاوہ۔"

"خدا نہ کرے اماں کہ ابا کو کچھ ہو۔" وہ تڑپ سی گئی۔ اس کی نظریں چارپائی پر پڑے ابا کے نحیف سراپے پر اٹھیں اور دل سینے کی دیواروں میں لرز کے رہ گیا۔

"تیرے ابا تو ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں اور پھر غریبوں کی بیماریاں تو ان کی جان لے کر ہی چھوڑتی ہیں۔"

"خدا نہ کرے اماں۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا حوصلہ رکھیں۔"

"مجھے معاف کردو فضا۔" وہ رندھی آواز میں بولیں۔ "بچپن سے لے کر اب تک تیرے ساتھ جو ناانصافیاں کیں۔ میں تم سے اس کی معافی مانگتی ہوں۔"

جہاں آرا تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ فضا انہیں لیے کمرے میں آگئی۔

کبھی کبھی ہمیں اپنے نفس کو خوش کرنے کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ نفس کی خوشی کتنی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے وقت گزرنے کے بعد۔ فضا کو اذیت دے کر ہمہ وقت جلا اور ستا کر کیا ملتا رہا تھا انہیں۔ محض تسکین۔ مگر نفرت اور بغض کبھی دل کو تسکین نہیں دے سکتے نہ یہ گھر آباد کرسکتے ہیں نہ دلوں کو سکون۔ یہ تو گزرے وقت کے بعد محض پچھتاوے بن جاتے ہیں نفرت اور حسد کرنے والے کو ہی جھلساتے رہتے ہیں۔

جہاں آرا نے اسے پہلی بار سچے دل سے بیٹی سمجھ کر سینے سے لگایا تھا۔

"تمہارے لیے میں کبھی اچھی ماں نہ بن سکی۔ بلکہ ماں ہی نہ بن سکی۔ تمہاری رہنما نہ بنی۔ اچھے برے کی تمیز نہ سکھا سکی۔ تمہیں برباد کرنے میں میرا ہی ہاتھ رہا ہے فضا۔"

"بھول جائیں اماں۔ وہ ساری پرانی باتیں۔ میں بھی بھول چکی ہوں۔ تلخ اور تکلیف دہ ماضی کو بھول جانے میں ہی عافیت ہے اماں۔" فضا افسردگی سے مسکرائی پھر ان کا ہاتھ تھام کر اسی افسردگی سے بولی "آپ کے ایک فیصلے نے مجھے دربدر ہونے سے بچالیا۔ مجھے زندگی کی حقیقت اور اس کی سچائیوں سے روشناس کرایا ہے۔ مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑتا۔ چاہے اس کے گناہ آسمان تک بھی پہنچ گئے ہوں۔ وہ معافی کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ معاف کردینے میں ہی انسانیت کی بقا ہے۔ سکون پنہاں ہے اماں۔ میں نے آپ کو سو بار معاف کیا اماں۔۔۔ میرے اللہ نے بھی تو مجھے معاف کیا ہے بار بار۔"

وہ شدت کرب سے رو پڑی۔ جہاں آرا بھی اس کے ہمراہ رو رہی تھیں۔

"میں تو نصیر سے تمہاری شادی صرف اور صرف تمہیں اور دکھی دیکھنے کے لیے کی تھی۔ تم ٹھیک کہتی ہو اللہ اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ اسے تمہیں راحت دینا منظور تھا اس نے تمہارے لیے بتول آپا اور نصیر کو رحمت بنادیا۔ بے شک وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت دے۔"

جہاں آرا کے لہجے کا ٹوٹا پن بکھراؤ فضا کو حقیقتاً تکلیف پہنچا رہا تھا۔ وہ انہیں کھل کر رونے دے رہی تھی وہ شاید ابا کی بیماری پر تنہا لڑتے لڑتے تھک گئی تھیں اور آج فضا کو دیکھ کر انہیں ان کا اپنا کوئی مل گیا تھا۔

"ابا کا علاج میں اور نصیر کرائیں گے آپ پریشان نہ ہوں۔"

گھر جاتے وقت فضا جہاں آرا سے کہہ رہی تھی اور پھر اپنے پرس سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر ان کی مٹھی میں دبادیے۔ وہ ممنون نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"بیٹی ہوں اور بیٹی ہونے کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ابا میری بھی ذمہ داری ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ پیار سے سہلا کر ابا کے پاس چلی آئی۔

وہ تکیے کے سہارے بیٹھے نصیر سے باتیں کررہے تھے فضا نے جھک کر ان کی پیشانی پر بوسہ لیا۔

"تمہارے آنے سے تو میری بدن میں جان پڑگئی۔ دیکھو کیسے بیٹھنے بھی لگا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولے۔ فضا ان کا ہاتھ تھپکنے لگی۔

"اب چلنے پھرنے بھی لگیں گے۔" نصیر ہنس کر بولا۔ "آپ فکر نہ کریں اسے روز آپ سے ملوانے لے کر آؤں گا۔" وہ مسہری سے اٹھتا بولا۔

"میں تمہارا احسان مرتے دم تک نہ بھولوں گا نصیر۔ تم تو میرے لیے بیٹے سے بڑھ کر نکلے۔ خوش رہو آباد رہو!"

"بس آپ کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں دعائیں بہت قیمتی ہوتی ہیں خالو جان۔ یہی زندگی کو سنوار دیتی ہیں۔ بس آپ کی یہی دعائیں ہمیشہ فضا کے سر پر سایا کیے رہیں۔"

نصیر ان کا کندھا تھپک پھر جہاں آرا کو بھی تسلی دے کر باہر نکل گیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے فضا نصیر کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اسے نصیر ایک عظیم شخص دکھائی دے رہا تھا اور وہ خود کو اس کے سامنے بے حد ہلکا اور پست خیال کر رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی محبت بھرا دل، خلوص سے گندھا ہوا وجود انسان کو کتنا خوب صورت بنا دیتی ہے۔ اسے نصیر بھی دنیا کا خوب صورت ترین شخص دکھائی دے رہا تھا ایک ایسا سایہ دار شجر جس کے سائے میں کوئی لمحہ بھر بھی ٹھہر جائے تو آسودگی اور سکون لے کر ہی اٹھتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ یوں ساکت بیٹھی تھی گویا بیٹھے بیٹھے پتھرا گئی ہو۔ اس کے اعصاب پر صحرا جیسا سناٹا طاری تھا جیسے کسی نے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ اسے لگ رہا تھا رگوں میں خون رک رک کر دوڑ رہا ہو۔ سانس ٹھہر ٹھہر کر چل رہی ہو۔

ابھی اس کے سامنے یاور علی لاٹھی ٹیکتے عادل بھائی کے ساتھ باہر نکل کر گئے تھے کال آئی تھی انہیں گیلانی ہاؤس سے کہ عباد گیلانی زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں۔ دعا کی جائے۔ اور مومنہ جاتے ہوئے بھی حوریہ کو کال نہیں کر پائی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے حوصلوں کی چٹانیں اب ایک ایک کر کے گرتی جا رہی ہوں۔ خود کو جوڑے رکھنے کا عمل یکدم بکھر رہا ہو۔

رقیہ بھابھی ہی اسے تھام کر اس کے کمرے میں لے آئی تھیں۔

"لائٹ بند کر کے جائیے گا۔" رقیہ بھابھی پلٹنے لگیں تو وہ دھیرے سے بولی۔ "کوئی خبر آئے تو مجھے نہ سنانا۔ کوئی فون میرے پاس نہ لے کر آنا۔"

رقیہ بھابھی نے اس کے ساکت وجود پر نگاہ ڈالی۔ کچھ کہنے کا ارادہ کیا پھر کچھ سوچ کر چپ رہ گئیں اور خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئیں۔ اپنے پیچھے احتیاط سے دروازہ بند کر گئیں۔

میرے کمرے میں اتر آئی ہے خموشی پھر سے
سایہ شام غریباں کی طرح
شورش دیدہ گھر کی طرح
موسم رنج بیاباں کی طرح
کتنا بے تعلق ہے یادوں کا ہجوم
جیسے ہونٹوں پہ فغاں بستہ
جیسے لفظوں کا گھن لگ جائے
جیسے روٹھے ہوئے رستوں کے
مسافر چپ چاپ

جیسے مرقد کے سرہانے کوئی
خاموش چراغ
جیسے سناں سے مقتل کی صلیب
جیسے کجلائی ہوئی شب کا نصیب!

☼ ☼ ☼

بابر آئی سی یو میں عباد گیلانی کے پاس تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کبھی آنکھیں کھول رہے تھے کبھی بند کر رہے تھے پھر انہوں نے بابر کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا جسے بابر نے تڑپ کر تھام لیا "ڈونٹ وری پاپا۔ یو ول بی بیٹر سون۔" (آپ جلد ہی بہتر ہو جائیں گے)

وہ ان کا نحیف ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھ میں دبا رہا تھا سہلا رہا تھا تھپتھپا رہا تھا۔

عباد گیلانی کے سوکھے بے رونق لب مسکرانا چاہ رہے تھے مگر مسکرا نہ سکے۔ وہ بابر سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ بہت سی باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔

"حوریہ۔ حوریہ کہاں ہے۔" وہ بولے تو ان کی آواز میں بے پناہ نقاہت تھی۔ جیسے کوئی بہت تھکا ہارا مسافر کہیں رک کر پیاس سے خشک حلق کو محسوس کر رہا ہو۔ پھر ایک خشک بنجر سی سانس بھر کر بولنے کی طاقت پیدا کر رہا ہو۔

بابر نے ان کے بیڈ پر ہی ان کے نزدیک بیٹھ کر ان کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جیسے کوئی بہت ہی ننھا بچہ اپنے کسی پیارے سے چھوٹ جانے سے خوف زدہ ہو گیا ہو۔

"میں حوریہ کو بلواتا ہوں اور علی شاہ کو بھی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"بابر میری ایک خواہش پوری کرو گے۔" وہ اٹک اٹک کر بولنے لگے۔ ان کی آواز اتنی دھیمی تھی جسے وہ بامشکل سن پا رہا تھا۔ ڈاکٹر زمان اندر داخل ہوئے تو بابر انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ ڈاکٹر زمان نے عباد گیلانی کے کندھے پر ہلکے سے تھپکی دی۔

"حوصلہ رکھو۔ تم تو بہت بریو آدمی ہو یار۔ آئی ہوپ یو ول بی بیٹر سون۔" بابر ان کی طرف بڑی آس مندانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا پاپا ریکور (صحت مند) ہو جائیں گے۔ انکل میں۔۔۔"

"وائے ناٹ۔" انہوں نے سر کو اثباتی جنبش دی اور بابر کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے آئی سی یو سے باہر لے آئے۔

نرس عباد گیلانی کی حالت چیک کر رہی تھی۔ پھر انجکشن دینے لگی۔

"پاپا کی حالت مجھے بہت ڈسٹرب کر رہی ہے انکل" بابر کے لہجے میں الجھن، پریشانی، خوف سبھی کچھ تھا۔ ڈاکٹر زمان اس کی کمر تھپکنے لگے۔

"بات یہ ہے بابر کہ تم میرے بہت اچھے دوست کے بیٹے ہو۔ تم ایک سمجھ دار اور میچور لڑکے ہو۔ میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میں زیادہ ہوپ فل (پرامید) نہیں ہوں۔ دیکھو زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔ یقین سے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

بابر گلاس وال سے کمر ٹکا کر سینے پر ہاتھ باندھ کر بے حد مغموم سا کھڑا رہ گیا۔

"عباد اب تک اپنے اسٹیمنا سے جی رہا تھا۔" ٹوٹ تو وہ حازم کے بعد ہی چکا تھا۔ ہاں اور اب تک علی شاہ نے انہیں زندہ رکھا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں۔"

اس کی نظریں گلاس وال کے پار اپنے پاپا کے وجود پر جمی تھیں۔ وہ نیند میں جا چکے تھے۔

وہ یک دم چونکا۔ اسے یاد آیا۔ پاپا اس سے کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا چاہ رہے تھے ۔ یاد آتے ہی وہ بے چین دکھائی دینے لگا۔

"انکل پاپا کب جاگیں گے۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ وہ حوریہ سے بھی ملنا چاہ رہے تھے۔"

ڈاکٹر زمان کے چہرے پر ایک تکلیف دہ رنگ آکر گزر گیا۔ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

"اوکے تم حوریہ کو ہاسپٹل میں بلوالو۔ جیسے ہی جاگ جائے گا وہ مل لے گی۔ ہاں مگر وہ زیادہ باتیں نہیں کر سکے گا۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر وہاں سے چلے گئے مگر بابر گم صم سا گلاس وال کے پار دیکھنے لگا۔

اس کے ذہن کی سطح پر اس کے باپ کی آواز کی بازگشت ٹھوکریں مار رہی تھی۔

"میری ایک خواہش پوری کرو گے بابر۔"

"ہاں پاپا۔ آپ کی ہر خواہش پوری کروں گا۔" وہ جیسے تڑپ کر بولا۔ مگر دوسرے پل گلاس وال کی چمکتی چکنی سطح پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ لمحے صدیاں لگ رہے تھے۔ وقت سرکتا محسوس ہو رہا تھا۔ زندگی جیسے ٹھہری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

مگر ذہن میں عجیب انتشار تھا۔ خوف کا انتشار۔ اتنا قریب تو وہ آج سے پہلے کبھی اپنے باپ سے نہیں ہوا تھا۔ ان کے ہاتھوں کو پیار سے سہلایا تھا نہ ان کے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا۔ ہاں حازم ہمیشہ کسی ننھے بچے کی طرح انہیں سہلاتا تھا پیار کرتا تھا۔ ان کی پیشانی پر بوسہ دیتا تھا۔

آج جب وہ سوئے ہوئے اپنے باپ کی ٹھنڈی پیشانی پر اپنے تپتے ہوئے گرم گرم لب رکھ رہا تھا اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ احساس اس کی روح کو کاٹنے لگا۔

کہ وہ کتنا بدنصیب تھا اس ٹھنڈی چھاؤں کے ہوتے ہوئے وہ اس چھاؤں میں وقت نہ گزار سکا دعاؤں کا یہ سایہ دار شجر ہوتے ہوئے وہ کتنی بددعاؤں کے حصار میں رہا۔

اپنی موج مستیوں میں گم۔ وہ اس وجود کے لیے کبھی چھاؤں نہ بن سکا اور نہ ان کی چھاؤں میں دن گزار سکا۔ لاحاصل، بے معنی، بے مقصد زندگی گزارتے گزارتے کتنی عمر ضائع کر دی۔ کتنے رشتے کھو دیے کتنوں کے اعتبار توڑے۔ شاید قدرت ہم سے ایسی پناہ گاہ اسی لیے چھین لیتی ہے کہ ہم حالات کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔

وہ اپنے ذہن کو نامانوس خلا میں بھٹکتا محسوس کر رہا تھا اس کی نظریں اپنے باپ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بے چینی سے ان کے جاگنے کا منتظر تھا۔ ان کی پلکوں کی ہلکی سی جنبش کا منتظر۔ یکدم عباد گیلانی کے الفاظ اس کے ذہن پر نئی پھونک مارنے لگے۔

"وہ کیا کہنا چاہتے تھے؟ کیا خواہش تھی ان کی؟" اس کا ذہن بے دار ہونے لگا۔ وہ کرسی سے جھٹکے سے اٹھا اور آئی سی یو سے باہر آیا۔ اس کا رخ پارکنگ لاٹ کی طرف تھا اس کے قدم تقریباً" بھاگنے کے انداز میں اٹھ رہے تھے۔ دوسرے لمحے اس کی گاڑی فراٹے بھرتی "نادر ہاؤس" کی جانب گامزن تھی۔

☼ ☼ ☼

اے غم یار شر آج کی شب
لگ چکی تیری سیاہی دل پہ
آ چکی جو تھی تباہی دل پر
زرد بے رنگ نظر آج کی شب

خاک کا ڈھیر ہوئے خواب نگر
آج کی شب
اے غم یار شہر آج کی شب
کم نظر دیکھ ہوا کی آہٹ
کس کی خوشبو میں بسی آتی ہے
کون سا عکس ہے جس کی خاطر
آنکھ آئینہ بنتی جاتی ہے
کس طرح چاند اچانک جھک کر
سرد شاخوں سے لپٹ جاتا ہے
کس طرح رنگ چمن
اک چہرے میں سمٹ جاتا ہے
سیل امواج تمنا کیسے
ساحل دل سے پلٹ جاتا ہے
اور کس طور سے طے ہوتا ہے
لڑکھڑاتے ہوئے تاروں کا سفر... آج کی شب
مجھ کو جی بھر کے اسے یاد تو کر لینے دے
دولت درد سہی جیب تو بھر لینے دے!

ہر آہٹ پر مومنہ کا دل سینے کی دیواروں میں لرز کر رہ جاتا اس کا دل چاہ رہا تھا کوئی اس کی سماعت چھین لے کہ کوئی بری خبر نہ سنائی دے۔

موبائل کو اس نے آف کر دیا تھا دروازہ بند کر کے لاک کر دیا تھا کوئی اسے یہ اندوہ ناک خبر نہ دے۔

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ مگر در حقیقت وہ اپنے اندر کو کھوج رہی تھی۔ اس کی سوچوں میں اس کی اپنی اجاڑ زندگی کا عکس تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنا مستقبل باد صرصر کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ حال کی بد ترین حالت اس کے سامنے کسی بوسیدہ اور خوفناک لاش کی مانند پڑی دکھائی دے رہی تھی۔

ماضی پورے درد کے ساتھ جاں گزیں تھا۔

آج وہ سب دیکھ رہی تھی اندر باہر سے بنا ڈرے 'بنا کسی خوف کے۔ اسے اذیت دے رہا تھا۔ مگر یہ اذیت سہنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سوچنا چاہ رہی تھی۔ کھل کر عباد گیلانی کو سوچنا چاہ رہی تھی۔

"کوئی کسی کی راہ میں بے سبب تو کھڑا نہیں رہتا نا مومنہ۔ تمہارے لیے میں نے اپنی انا کا قتل کیا۔ تمہاری راہ میں بار بار آنے کا مقصد تمہارا حصول ہے کوئی فراڈ کوئی چھٹ نہیں۔" وہ پگھل تو رہی تھی وہ آخری چوٹ لگا رہا تھا۔

"ضد بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ کہنا چاہ رہی تھی مگر اس کے جذبوں کی شدت اسے بوکھلائے دے رہی تھی۔

"آپ جانتے ہیں آپ جیسے بڑے لوگوں کے لیے یہ دل لگی ہوئی تو۔ میری تو پوری زندگی کا معاملہ ہے تباہ ہو جائے گی۔"

"ایسے کیسے تباہ ہونے دوں گا۔ عباد کا دل جس پر آ جائے مرتے دم تک اس کے دل سے نہیں اترے گا۔"

"آپ کو غیب کا علم کیسے ہونے لگا۔ کل کیا ہو گا کون جانتا ہے آپ اتنی دور کی بات کر رہے ہیں۔"

"فی الوقت تو میں خود کو ایسے ہی جذبات سے لبریز محسوس کر رہا ہوں۔" وہ مسکرایا مگر دوسرے پل سنجیدگی سے بولا۔
"یہ سب کہہ دینے کا بڑا آسان سا سفر ہے مگر بات تو یقین کی ہے اور تمہارے یقین کو حاصل کرنے کے لیے شاید مجھے جانے کتنا سفر طے کرنا پڑے گا۔ مگر میں کرنے کو تیار ہوں۔ بولو سال، دو سال، دس سال۔"
وہ حیران رہ گئی۔ وہ امیرزادہ اس کے آگے کیسا ٹوٹا بکھرا پڑا تھا۔
اس کی آنکھوں میں جذبوں کا ایک سمندر موجزن تھا۔ وہ لڑکی تھی اور حساس دل اور چاہے جانے کی فطری خواہش بڑی خاموشی سے بیدار ہو جاتی ہے۔
اور یہ رات مومنہ نے جاگتے ہوئے گزار دی۔ وہ اپنی اس بااصول زندگی سے آج تک مطمئن تھی بس اچانک ہی یہ بے سکونی زندگی میں کہاں سے اتر آئی۔ جیسے کوئی جھیل کی پرسکون سطح پر کنکر مار کر اسے منتشر کر دے۔
محبت ایک مختلف انداز اور الگ سے دل پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اتنی محبتیں سمیٹتے سمیٹتے خیال ہی نہیں آیا کہ مجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے گی۔ اور کسی ایک کی محبت ساری محبتوں پر حاوی ہو جائے گی۔
وہ اپنی سوچ پر مسکرانا چاہ رہی تھی مگر کہیں یہ خوف بھی سر اٹھا اٹھا کر ارادے کو منتشر کر رہا تھا کہ کہیں یہ سب ایک مرد کا ایک عورت کو دھوکا نہ ہو۔ اس کی نسوانیت کو نیچا دکھا کر مردانگی کی تسکین نہ ہو یا محض کوئی شرارت کہ وہ اس کے خول کو توڑنا چاہتا ہو۔ بس پر وہ کسی نے چیلنج کیا ہو۔ یوں بھی اسے ہیرو ٹائپ لڑکوں سے ہمیشہ خوف آتا تھا۔
اس طرح کے خدشات اور خوف زدہ سوچیں اسے پریشان بھی کر رہی تھیں۔ دراصل وہ ہمیشہ احتیاط کا دامن تھام کر چلنے والی لڑکی تھی مگر اب کی بار عباد گیلانی نے اس کی تمام تر سوچوں پر تمام خدشات کو پس پشت ڈال دیا۔ وہ ہار گئی۔
اس کی انگلی میں عباد کے نام کی انگوٹھی جگمگانے لگی۔
"یہ تو بہت قیمتی ہے۔" وہ رنگ میں جڑے ڈائمنڈ پر نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ اس کے سبز آنچل سے اس کے بالوں کی ریشمی لٹ نکل کر اس کے رخسار پر جھول رہی تھی۔
"تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔" عباد کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔
"پتا ہے عباد۔ مجھے قیمتی چیزوں سے ہمیشہ ڈر لگتا ہے۔" اس کے لبوں کی مسکراہٹ گم ہو گئی۔
"مجھے ان کے ٹوٹنے کا کھو جانے کا خوف سا ہو جاتا ہے۔"
"یہ تو بہت بے معنی سی چیزیں ہیں تم سے زیادہ تو نہیں۔" وہ مسکرایا اور دل نشین نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
مومنہ نے اس کی طرف دیکھا۔ پھر میز کی چکنی سطح پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ ایک بوجھل سی خاموشی کے بعد وہ دھیرے سے بولی۔
"مگر جذبے بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ محبت بے معنی نہیں ہوتی۔ خون سے پلتی ہے اور دل سے جڑے یہ جذبے رگ رگ سے لپٹے ہوتے ہیں یہ ٹوٹ جائیں تو دل ٹوٹ جاتا ہے، ہر رگ کٹ جاتی ہے پھر نہیں جڑتا پہلے جیسا نہیں رہتا۔ مجھے کبھی ٹوٹنے مت دینا عباد۔ بکھرنے نہ دینا۔"
عباد گیلانی اس کے نرم ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لے کر یہ یقین دلانے لگا کہ وہ اسے کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا۔

اک بار اور دیکھ کر آزاد کر دے مجھے محسن
کہ میں آج بھی تیری پہلی نظر کی قید میں ہوں

اس نے پلکوں پر بکھرے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے ایک مشکل سی سانس کھینچی اور کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ پھر موبائل اٹھایا اس میں کئی کالز تھیں حوریہ کی۔
اچانک دروازہ زور زور سے بجا۔ اس کا دل کسی خوف سے لرزا اس نے دروازے کی طرف یوں دیکھا گویا یہ دروازہ اس کے دل کا ہو اور کوئی زور زور سے بجا کر کوئی اندوہناک خبر سنانا چاہ رہا ہو۔
''مومنہ۔ دروازہ کھولو۔'' رقیہ بھابھی کی آواز سنائی دی۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔
''دروازہ بند کیوں کیا تھا میں تو ڈر ہی گئی تھی۔'' رقیہ بھابھی دروازہ کھلنے پر سکون کی سانس بھرتے ہوئے بولیں۔
''بابر آیا ہوا ہے تم سے ملنا چاہتا ہے۔''
''بابر۔'' وہ چونکیں۔ ''خیریت تو ہے سب۔''
''ہاں خیریت ہی ہو گی۔ میری تو کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابا جی کے کمرے میں ہے ابا جی مسجد سے لوٹے نہیں ہیں۔ یوں بھی وہ تم سے ملنے آیا ہے۔'' پھر مومنہ کو تذبذب میں دیکھ کر بولیں۔ ''میں نے اس سے کہا بھی کہ مومنہ شاید نہ ملے۔ وہ بہت کم ملتی ہے لوگوں سے۔ مگر وہ مصر ہے۔ کہہ رہا ہے۔ بہت ضروری ہے ان سے ملنا۔ میرا خیال ہے تم مل لو۔ وہ تم سے ملے بغیر نہیں جائے گا۔''
مومنہ نے سر ہلا دیا۔
''میں آتی ہوں۔ آپ بٹھائیں اسے۔''
''حوریہ کا بھی فون آرہا ہے۔ بہت پریشان ہے۔ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ تم نے شاید اپنا موبائل آف رکھا ہے۔'' رقیہ بھابھی پلٹتے پلٹتے بولیں۔ مومنہ نے کوئی جواب نہیں دیا ان کی ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئی۔
''میں چائے وغیرہ بھیجتی ہوں۔'' رقیہ بھابھی باورچی خانے کا رخ کرتے ہوئے بولیں۔ جبکہ مومنہ یاور علی کے کمرے میں چلی آئی بابر انہیں کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر میکانکی انداز میں صوفے سے کھڑا ہو گیا۔ مومنہ نے ہاتھ کا اشارہ دے کر اسے بیٹھ جانے کو کہا۔
''کیسی ہیں آپ۔''
''میں ٹھیک ہوں۔ عاظمہ کو بھی ساتھ لے آتے۔'' وہ اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
''ایکچوئلی میں ہسپتال سے سیدھا آیا ہوں۔ مما کو میں نے زبردستی گھر بھیج دیا تھا وہ صبح سے پاپا کے پاس ہی تھیں۔'' مومنہ نے نظریں جھکالیں۔ بابر انہیں نظریں بچا کر دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولا۔
''آپ پوچھیں گی نہیں پاپا کی کنڈیشن کے بارے میں۔''
مومنہ اضطراری انداز میں اپنی چادر ٹھیک کرنے لگی۔
''حوریہ ہسپتال میں ہے یا کوٹھی میں۔''
''کوٹھی میں۔'' بابر نے ایک عجیب افسردہ سی سانس کھینچی اور صوفے سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مومنہ کی اس بے اعتنائی اور گریز پر کچھ مایوس سا ہونے لگا تھا۔ وہ اس سے بات شروع کرنے کے لیے جیسے الفاظ تلاش کرنے لگا۔
''میں چائے لاتی ہوں۔'' مومنہ کرسی سے اٹھنے لگی کہ وہ جلدی سے بولا۔
''میں اسپیشلی آپ سے ملنے آیا ہوں یہاں۔ آپ پوچھیں گی نہیں کیوں؟'' مومنہ نے اس کی طرف دیکھا۔ بابر کے چہرے پر پھیلا اضطراب انہیں صاف دکھائی دے رہا تھا اس نے ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے سر جھکا لیا۔
''میں جانتی ہوں۔ تم عباد کے حوالے سے بات کرنے آئے ہو مجھ سے بہر حال جو کہنے آئے ہو وہ کہو۔'' ان کے

لہجے میں کھنچاؤ یا کسی طرح کی ناگواری نہ تھی۔ بابر کو حوصلہ سا ہوا۔

"پتا نہیں میں ایموشنل (جذباتی) ہو کر یہاں تک آ تو گیا ہوں مگر سوچ رہا ہوں کہ بات کیسے شروع کروں۔ اور کروں بھی یا نہیں۔" وہ الجھا الجھا سا مومنہ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا "آج حازم ہوتا تو وہ بھی ضرور آپ کے پاس یہ خواہش لے کر آتا۔"

"کیسی خواہش۔" اب کے مومنہ نے ذرا سا الجھ کر اسے دیکھا۔

"ایک غم زدہ، بیمار اور موت کی آہٹیں سننے والے انسان کی آخری خواہش۔"

مومنہ خود آزاری کی کیفیت سے گزرتے ہوئے دھیرے سے کرسی پر بیٹھ گئی..... درد کی کوئی لہر اس کے دل کو کاٹتی ہوئی گزر گئی تھی۔

"میں نے عباد گیلانی کو.... معاف کر دیا ہے۔ حازم سے بھی میں کہہ چکی تھی کہ میں انہیں دل سے معاف کر چکی ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔" پھر افسردگی سے مسکرائی۔

"محبت انسان کو نفرت کرنے ہی نہیں دیتی۔ عجیب جذبہ ہوتا ہے یہ.... ایک بار روح کو باندھ لے تو نفرت کے لیے جگہ بنتی ہی نہیں ہے۔ آپ جتنا بھی نفرت کا ناٹک کر لیں کتنے ہی رنگ چڑھا لیں خود پر مگر گیلی مٹی کی طرح یہ یاد کے ہر جھونکے پر اپنی خوشبو پھینکتی ہے سطح پر۔"

وہ آزردگی کی لپیٹ میں تھی۔ اس کی بھوری آنکھوں کی سطح پر نمی جگمگانے لگی تھی۔ بابر غایت درجہ حیرانگی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"محبت کے قدم بہت مضبوط ہوتے ہیں دھوکا، بے وفائی اسے زخمی کر دیتی ہے پر مارتی نہیں ہے اسے فنا نہیں کر سکتی۔" وہ ایک افسردہ سانس بھر کر کرسی کی پشت سے لگ کر بابر کو دیکھنے لگی جو اس صورت حال پر کچھ الجھ کر رہ گیا تھا ان کے لفظوں کے سحر میں جکڑا ہوا سا تھا۔

"اگر تم یہی خواہش لے کر آئے ہو تو میں کھلے دل سے انہیں معاف کر چکی ہوں۔" وہ سنبھل کر آزردگی کے سحر سے نکلتے ہوئے بولی۔

"نہیں میں کچھ اور خواہش لے کر آیا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ مومنہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ پاپا سے ایک بار مل سکتی ہیں!" وہ چلتا ہوا اس سے ذرا فاصلے پر رک گیا۔ "صرف ایک بار۔"

مومنہ نے تڑپ کر جیسے اسے دیکھا تھا۔ اس کی نظروں میں درد کی کوئی لہر سی اٹھی۔ دوسرے پل وہ نظریں چرا کر ناگواری سے بولی۔

"یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ میرے لیے نامحرم ہیں میرا کوئی تعلق نہیں رہا ہے ان سے۔"

"ان کی آخری خواہش سمجھ لیں۔" بابر کا لہجہ آس مندانہ تھا۔ پھر وہ ملتجی ہو کر بولا۔

"اسے میری ریکویسٹ سمجھ لیں۔ میں پاپا کے لیے آج تک کچھ نہیں کر سکا۔ انہیں کوئی خوشی نہیں دے سکا۔ یہ آخری اور پہلی خوشی دینا چاہتا ہوں۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ صرف ایک بار آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاید دل میں دبی کچھ باتیں آپ سے شیئر کرنا چاہتے ہیں پلیز۔"

"بابر یہ ممکن نہیں ہے۔"

"پلیز مومنہ آنٹی۔ میں زندگی بھر آپ کا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔"

"تم جانتے ہو۔ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور تم مجھے ہی نہیں انہیں بھی گناہ گار کر رہے ہو۔ وہ جس تکلیف سے گزر رہے ہیں یہ تکلیف ایک نامحرم کے ملنے سے ختم نہیں ہو جائے گی ہاں بڑھ ضرور جائے گی۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں ان کی ایک خواہش پوری کر دوں۔

اور یہ خواہش یہی ہے کہ وہ ایک بار خود آپ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ کیا کسی کی دل جوئی کرنا گناہ ہے۔"
مومنہ اذیت کے احساس سے اسے دیکھنے لگی۔ اس پل بابر انہیں حازم کا پرتو لگا۔ لمبا چوڑا باپ کے لیے اس طرح التجا کرتا ہوا منت کرتا ہوا اپنے باپ کی خوشی کی بھیک مانگتا ہوا۔
"کوئی بھی دلیل دے دینے سے یا ہمارے سمجھ لینے سے گناہ ثواب نہیں بن جاتا۔"
"بے شک آپ حجاب کرلیں۔ وہ آپ کا چہرہ نہیں دیکھیں گے۔ بس ان کے لیے یہ احساس ہی کافی ہے کہ آپ خود ان سے ملاقات کو آئی ہیں۔ انہیں دیکھنے آئی ہیں۔" وہ لب کاٹنے لگی۔
"یہ احساس ہی بہت ہوگا ان کے لیے کہ آپ ان سے ملنے آئی ہیں۔ ڈوبنے کے لیے سمندر میں کسی کشتی کی موجودگی کا احساس ہی بڑا سہارا بن جاتا ہے۔ چاہے وہ کشتی اس کی پہنچ سے دور ہو۔ مگر کشتی دیکھ کر مایوسی ٹوٹنے لگتی ہے لہروں سے لڑنے کی طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ کیا آپ ان کے لیے وہ کشتی نہیں بن سکتیں۔"
بابر کے الفاظ مومنہ کے دل پر ضرب کی طرح لگ رہے تھے اس نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا جہاں یاور علی کھڑے تھے وہ کچھ دیر پہلے ہی مسجد سے لوٹے تھے بابر کے جملے انہیں افسردہ کر رہے تھے۔
"مگر یہ تو سراسر دھوکا ہے۔ فریب دینا ہوا۔" مومنہ کا لہجہ اتنا ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا تھا کہ وہ خود بھی اپنے لفظوں کی بے مائیگی کو محسوس کرکے رہ گئی۔
"دھوکا ہی سہی۔ اگر وہ اس فریب اور دھوکے سے ہی بہل جائیں تو آپ کا کیا جائے گا۔" بابر کے لہجے میں تڑپ اصرار منت سبھی کچھ تھا یاور علی اندر چلے آئے اور مومنہ کے نزدیک رک کر اسے دیکھتے ہوئے بولے۔
"تم بابر کے ہمراہ چلی جاؤ۔"
مومنہ نے یاور علی کو یوں دیکھا جیسے وہ اس کی گردن پر کند چھری کی نوک رکھ رہے ہوں۔
"ابا جی۔" اس کے لب کپکپائے۔ احتجاج کی پرزور لہر اس کے دل سے اٹھی مگر اندر ہی اندر توڑ گئی۔ رقیہ بھابھی بھی چائے درمیانی ٹیبل پر رکھ کر دروازے کے پاس جاکر افسردہ سی کھڑی ہوگئی تھیں۔
"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی موت کو ٹال سکتا ہے نہ زندگی چھین سکتا ہے مگر ایک چھوٹی سی تکلیف اٹھا کر کسی کی اتنی بڑی پریشانی کو اگر کم کیا جاسکتا ہے تو ضرور کرلینا چاہیے۔" یاور علی ڈھیلے قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ کے کنارے بیٹھ گئے۔
"تم ایک انسان کو عیادت کو جارہی ہو ایک انسانیت کے ناطے۔" مومنہ چپ کی دہکتی نظروں سے یاور علی کو دیکھتی رہ گئی۔ ادھر بابر کے چہرے پر یاور علی کی حمایت سے مایوسی چھٹنے لگی تھی وہ پرامید نظروں سے مومنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

حوریہ مومنہ کے موبائل پر رابطہ کرنے میں لگی ہوئی تھی پھر رقیہ بھابھی سے رابطہ کیا تو اسے پتا چلا کہ مومنہ بابر کے ہمراہ ہسپتال گئی ہے۔ وہ ششدر رہ گئی۔
"کیا بابر آیا تھا؟"
"ہاں گھنٹہ بھر پہلے بہت اصرار کرکے مومنہ کو ساتھ لے گیا ہے۔"
"پھپھو اس کے ہمراہ چلی گئیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔
"ہاں ابا جی نے بھی سمجھایا اور بابر اپنے پاپا کے لیے بہت فکر مند تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ مومنہ کے پیر پکڑ لے۔ سچ پوچھو تو حوریہ اس لمحے وہ مجھے بالکل حازم کی طرح ہی لگ رہا تھا۔" رقیہ بھابھی نے کہا تو حوریہ کو ذہنی

جھٹکا سا لگا۔ اس کے اندر ناگواریت اتر آئی۔

"ایسا مت کہیں مما۔ حازم سے اس کا کیا مقابلہ۔ وہ حازم جیسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ برا مان گئی تھی۔

"ارے خدانا خواستہ میرا یہ مطلب نہیں ہے میں تو اس وجہ سے کہہ رہی تھی کہ حازم بھی اسی طرح اپنے باپ کے لیے پریشان ہو جایا کرتا تھا اور مومنہ سے ریکویسٹ کرنے لگتا تھا۔ خیر تم ہسپتال جاؤ گی کیا؟"

"پتا نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ مما (عاظمہ) بھی گھر آچکی ہیں بہت اپ سیٹ ہیں مجھے کوئی ٹھیک سے بتا نہیں رہا انکل کی کنڈیشن کا۔ چلیں میں رکھتی ہوں۔ مما (عاظمہ) کے پاس ذرا دیر بیٹھتی ہوں وہ بہت پریشان ہیں۔" اس نے لائن منقطع کردی۔

رقیہ بھابھی نے اسے بابر کے "یاور ہاؤس" آنے اور مومنہ کو ساتھ لے جانے کی خبر سنا کر اسے "حقیقتاً" حیران کردیا تھا وہ اضطراری انداز میں ٹہلنے لگی۔

بابر مومنہ کو عباد گیلانی سے ملوانے لے گیا ہے۔ یہ سب وہ کس جذبے کے تحت کررہا ہے۔ کیا واقعی وہ اپنے باپ کے لیے اتنا حساس ہوگیا ہے۔

اس جیسا بے رحم اور بے حس شخص اتنی حسیات سے کیسے سوچ بھی سکتا ہے۔ وہ بوجھل سی کیفیت میں کمرے سے باہر آئی اور عاظمہ کے روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

عباد گیلانی نے بامشکل آنکھیں کھولیں تو انہیں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک نرس نظر آئی پھر ڈاکٹر زمان دکھائی دیے جو کسی پیشنٹ کے بیڈ کے پاس کھڑے انہیں چیک کررہے تھے۔

"آہ۔" وہ ہلنا چاہ رہے تھے مگر انہیں لگا ہر عضو سے درد کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔ رگ رگ کو جیسے کسی نے رسیوں سے باندھ دیا ہو۔

"بابر۔" ڈاکٹر زمان ان کی آواز پر پلٹے اور ان کے نزدیک آکر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"بابر کہاں ہے۔" وہ بامشکل بول پا رہے تھے۔

"وہ راستے میں ہے بس پہنچنے والا ہے۔" وہ نرمی سے ان کا ہاتھ تھپتھپانے لگے۔

"ابھی آرام آجائے گا تمہیں۔" وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔

"عباد۔" ڈاکٹر زمان نے ان کے نزدیک ہوتے ہوئے دھیرے سے انہیں پکارا "بابر مومنہ کو لینے گیا ہے۔"

عباد گیلانی نے بامشکل پلکیں جھپک کر ایک کرب سے ڈاکٹر زمان کی طرف دیکھا۔ پھولتی ہوئی سانس کے ساتھ یہ لفظ جیسے بامشکل ان کے منہ سے ٹوٹ کر گرا۔ "مومنہ۔"

"ہاں۔" مگر دوسرے پل انہوں نے جلتی آنکھیں بند کرلیں جیسے پلکوں پر منوں بوجھ آگیا ہو۔

"وہ کبھی نہیں آئے گی۔" ان کے بے نور چہرے پر یکدم دھندلاہٹ پھیل گئی وہ بولنا چاہ رہے تھے مگر ان کے اعصاب ان کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ وہ بول نہیں پا رہے تھے لفظ فقط ذہن میں بھاگتے رہے مگر زبان ادا نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ کہنا چاہ رہے تھے۔

"یہ کیا کیا تم نے مومنہ۔ اتنی دیر کردی۔۔۔ اتنا انتظار کروایا اور یہ آنکھیں اب اور انتظار نہیں کرپائیں گی۔"

یکدم ان کی سانسیں تیز تیز چلنے لگیں ڈاکٹر زمان گھبرا کر کرسی سے اٹھے۔ ان کے ہاتھ کی گرفت ڈاکٹر زمان کے ہاتھ پر سے ڈھیلی ہوگئی تھی اور ہاتھ بے دم ہو کر بستر پر ہی رہ گیا۔

ان کی آنکھیں نیم وا تھیں وہ ڈاکٹر زمان کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کررہے ہوں۔ پھر اچانک

کمرے کی ہر چیز ان کی آنکھوں میں دھندلانے لگی۔ ان کے ہونٹ سپید پڑنے لگے۔ آنکھوں میں سناٹا اترنے لگا مومنہ کا تصور ذہن سے اتر گیا۔ وہ موت کی آہٹیں سننے لگے ان کے دل پر بتدریج اس دنیا سے ناطہ ٹوٹنے کا خوف سمانے لگا۔

موت کا ہولناک تصور ان کے گرد تیزی سے جال بن رہا تھا ڈاکٹر زمان کا عکس دھندلا چکا تھا ان کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ یابر نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا تھا۔

"پاپا جاگ گئے انکل۔" اس نے ڈاکٹر زمان کی طرف دیکھا۔ وہ مومنہ کو اپنے ساتھ لانے کی نوید لے کر آیا تھا مگر ڈاکٹر زمان کے چہرے پر نگاہ پڑی تو لپک کر بیڈ کی طرف آیا۔ مگر باپ کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اسے گم صم کر گئیں۔

ڈاکٹر زمان ڈھیلے قدم اٹھا کر بیڈ کے نزدیک آئے اور جھک کر عباد گیلانی کی نیم وا آنکھیں نرمی سے بند کر دیں اور چہرے تک چادر ڈال دی۔

آئی سی یو کے گلاس وال کے پار کھڑی مومنہ کا پورا وجود پتھر کا جیسے ہو گیا تھا وہ ایک ٹک سفید چادر میں ڈھانپے ہوئے وجود کو دیکھے جا رہی تھی۔

"پاپا۔" یکدم یابر کی تڑپتی سسکتی آواز پورے کمرے کی فضا کو مرتعش کر گئی۔

درد اتنا تھا کہ رات دل وحشی نے
ہر رگ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بن مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور تیرے صحن میں گویا
پتا پتا میرے افسردہ لہو میں دھل کر
حسن مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانہ تن میں گویا
سارے دکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھل کر
سلسلہ وار پتا دینے لگیں
رخصت قافلہ شوق کی تیاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی
شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تیری دلداری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا!

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

☼ ☼
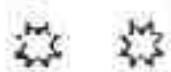
اعتذار

اس ماہ تنزیلہ ریاض کے ناول "راہنزل" کی قسط چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر شامل اشاعت نہیں ہے۔ آپ اگلے ماہ یہ قسط پڑھ سکیں گی۔ ان شاء اللہ

Join Us on Facebook

Get Notificatons of Newly Uploaded Books

Follow below Image to Get Notifications of Newly Uploaded Books

امت العزیز
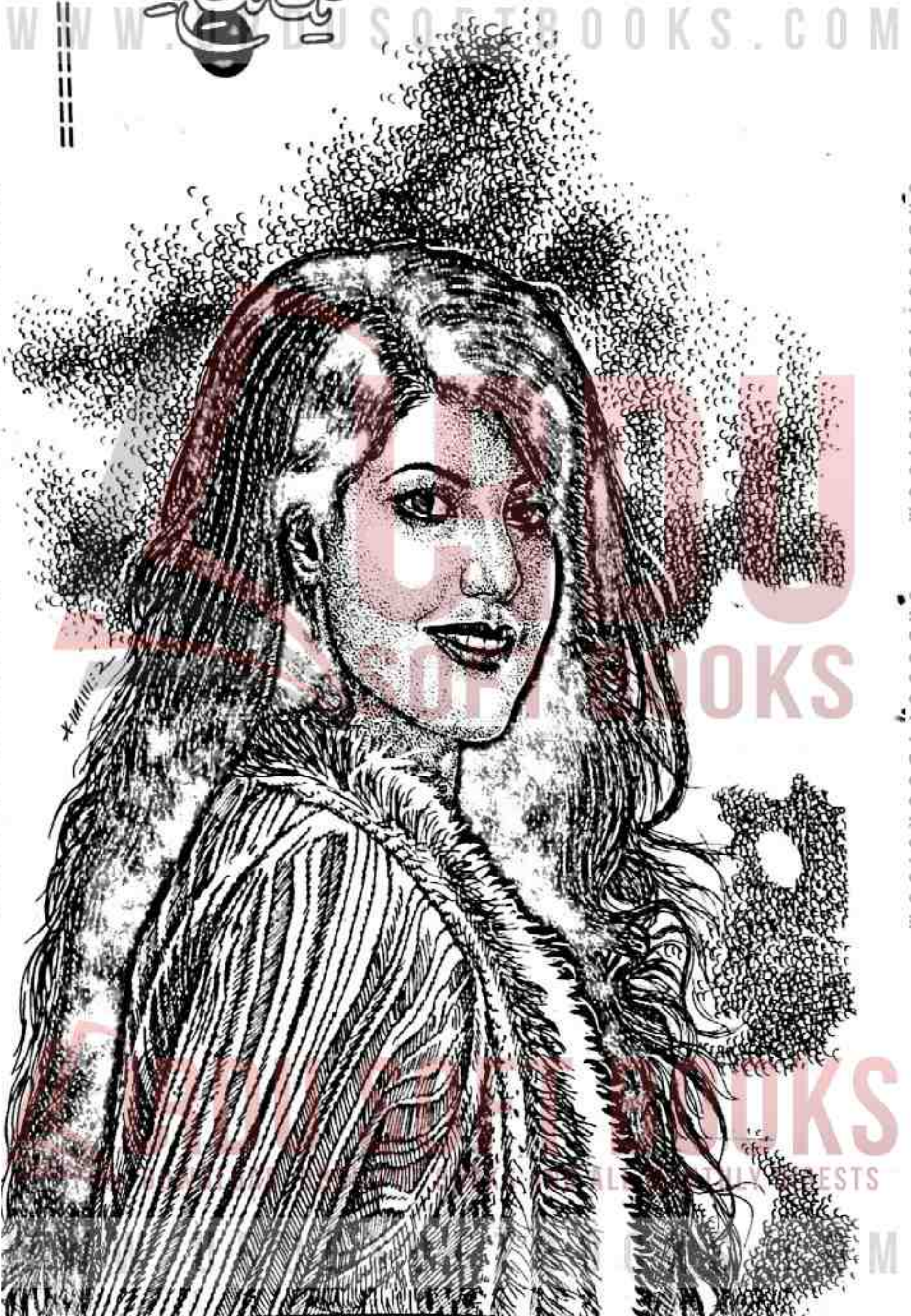
"میری جان بڑی مصیبت میں ہے ڈیئر سمیرہ!" وہ بڑی بے چارگی آمیز تشویش سے اپنے سامنے لکڑی کی اس دیدہ زیب و مضبوط بڑی ساری میز کے دوسری جانب موجود ضرورت سے کہیں زیادہ سنجیدہ صورت بنائے' توجہ سے اس کی بات بلکہ آہ وزاریاں سماعت کرتی۔ سمیرہ رضا سے مخاطب تھا۔ "مجھے تو لگتا ہے جیسے میں کسی جیتی جاگتی لڑکی سے نہیں بلکہ بے حس قسم کے کسی گھڑیال سے محبت کر بیٹھا ہوں اور جس کا کام محض لوگوں کو وقت جتانے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

"جملے کی تصحیح کرلو فاز نعمانی!" وہ پنسل اپنی دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں گھماتی ہوئی زیر لب مسکرا کر بولی (کھل کر مسکرانے کی صورت میں نقص امن کا اندیشہ تھا بلکہ شدید ترین اندیشہ تھا وہ بھی یقینی بہر حال) "لوگوں کو نہیں صرف تمہیں۔"

"جی نہیں!" اس نے بحث کرنے والے انداز میں ٹیبل پر زور سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا' "صرف مجھے نہیں ہر کسی کو۔ تم مان لو سمیرہ رضا۔ تمہاری دوست کے ساتھ کوئی پیچیدہ قسم کا نفسیاتی مسئلہ ضرور ہے ورگرنہ میں نے آج تک اس جیسا کوئی دوسرا انسان نہیں دیکھا جو گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہو' خدا کی پناہ۔" بات کے آخر میں اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر گویا بری طرح نڈھال ہو کر گرا دیا۔

"دیکھو!" وہ بغور اسے دیکھ کر سرعت سے بولی مبادا وہ پھر اپنی لن ترانی' شروع کردے۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ تم سے کس احمق نے کہا تھا کہ تم جیسا ہمیشہ کا بے اصول' بے ترتیب اور قیمتی وقت کا بہترین مصرف اسے بے دریغ ضائع کرنے پر یقین رکھنے والا انسان خود سے قطعاً" متضاد عادات و خصائل کی مالک دوشیزہ پر فوراً" سے پیش تر تن من دھن سے فدا ہو جائے؟"

"دل۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "اس دل نے کہا تھا کہ یہ جو لڑکی زمانے میں سب سے جدا لگتی ہے بس یہی تو وہ منزل ہے جس پر پہنچنے کا تھا جیسے بھٹکے مسافر کو انتظار تھا۔" وہ بولا تو جذب سے تھا مگر نجانے کیوں سمیرہ کو ہنسی آگئی جسے اس نے کھانسی کے لبادے میں بڑی پھرتی اور مہارت سے چھپالیا اور بولی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے تب پھر کیا مسئلہ ہے۔ جب منفرد لڑکی سے دل لگا ہی لیا ہے تب اس کے منفرد قسم کے نخرے بھی اٹھاؤ۔"

"مسئلہ تو سارا یہی ہے۔" وہ پریشانی سے بولا۔ "وہ نازو ادا' نخرے' جذبات جیسے الفاظ سے قطعی فارغ لڑکی ہے۔ اس کے دل و دماغ پر تو ہمہ وقت صرف اور صرف زندگی ہائے شعبہ کے رہنمائے اصول۔"

"شعبہ ہائے زندگی کے رہنما اصول" سمیرا نے اس کے اوندھے جملے کو سیدھا کیا۔

"ہاں۔ ہاں وہی۔" وہ منہ ٹیڑھا کرکے ازحد بے زاری سے بولا۔ "اور کم سے کم وقت کو زیادہ سے زیادہ کیسے استعمال کیا جائے' ٹاپ مسئلے سوار رہتے ہیں۔ اب تم خود بتاؤ اتنی بھاری بھرکم سوچ رکھنے والی لڑکی کے پاس بھلا نازو انداز دکھانے کا وقت کہاں ہوگا اور نہ ہی اس کے نزدیک پیار و محبت کی باتوں کی کوئی اہمیت ہے۔ کوئی بات کرو تو کہتی ہے "میں نے تم سے شادی کرنے کی کمٹ منٹ کرتو لی ہے۔ اب فضول باتوں میں وقت کیوں ضائع کرتے ہو فاز' رات جلدی سویا کرو تاکہ صبح وقت پر آفس پہنچ سکو' دیکھو تم تقریباً" روزانہ ہی لیٹ آفس آتے ہو' وہ تو اگر صدیقی صاحب نہ ہوں تو۔۔۔"

"بس بھائی بس!" اس سے زیادہ برداشت کا یارا کم از کم سمیرہ میں تو نہیں تھا اس لیے وہ سب کچھ بھول بھال اس کے بن بن کر بالکل نثرہ ہی کی طرح ازلی سنجیدگی و بردباری سے بولنے پر یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور چوں کہ وہ تو پھوڑنے بیٹھا تھا اپنے دل کے پھپھولے تو ایسی صورت میں وہی ہوا جو ہو سکتا تھا۔۔۔ جی ہاں۔ وہ سمیرہ سے مکمل خفا ہوگیا۔

"تمہیں مذاق لگ رہا ہے یہ سب؟" وہ بے حد ناراضی سے بولا تو ہنستی ہوئی سمیرہ کے لب اپنی سابقہ پوزیشن پر بمشکل تمام لوٹنے میں کامیاب ہو کر

بولے۔

"مذاق بالکل نہیں لگ رہا۔" اس نے سرعت سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔ "بلکہ میں تو یہ سب سن کر بہت تشویش میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ تم دونوں کا ابھی سے یہ حال ہے۔ آگے کی زندگی میں کیا کرو گے تم دونوں؟۔" وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔

"یہی تو تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں میں۔" وہ فکرمندی سے بولا۔ "اس نے ایک عجیب سی شرط لگا دی ہے رشتے کو آگے بڑھانے کی یار!"

"اوہ!" سمیرہ تیزی سے سیدھی ہو بیٹھی۔ "بھلا وہ کیا؟"

"کہتی ہے پورے ایک ہفتے وہ شارپ سیون او کلاک اپنے گھر کے باہر دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اس دوران اگر ایک بھی دن میں وقت پر نہ پہنچ سکا تو بس اسی روز ہمارے رشتے کا دی اینڈ اس کی طرف سے۔" اس نے سنسنی خیز لہجے میں ایک ایسی بات بتائی جو بہرکیف اتنی بھی سنسنی خیز نہیں تھی کم از کم سمیرہ کے لیے تو۔

"ہوں!" سمیرہ نے لب بھینچ کر پرسوچ ہنکارا بھرا۔ "بات تو اس نے بظاہر احمقانہ کی ہے۔"

"ہمیشہ کی طرح۔" وہ دل جلے لہجے میں بولا۔ مگر سمیرہ نے توجہ نہ دی۔

"لیکن در حقیقت اس نے اس بار تمہیں آزمانے کی ٹھانی ہے محترم۔ وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو۔ ہوں! شی از انٹیلی جنٹ۔ یہ تو بہرحال تمہیں ماننا پڑے گا۔" وہ ثمر کو سراہتے لہجے میں بولی۔

"وہاٹ نان سینس یار۔" وہ بدک کر اچھلا۔ "اب تم بھی اس کی بے کار باتوں پر اسے داد دینے لگیں۔ بجائے اسے سمجھانے کے تم اسے سراہ رہی ہو۔ جانتی ہو میرے گھر سے اس کے گھر کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ کیسے پہنچوں گا میں وہاں روز آن ٹائم؟ جبکہ ہمارا تو آفس ہی پانچ بجے آف ہوتا ہے۔ آفس، میرا گھر اور کوچہ جاناں۔ شہر کراچی کے تین مختلف کونوں پر واقع ہیں۔ ٹریفک کا حال تم جانتی ہو۔ میں یہ سب کیسے مینیج کروں گا بھائی؟" وہ حقیقتاً متفکر تھا۔

"کتنا رومانٹک لفظ بولا ہے تم نے اس سڑی ہوئی ثمر کے گھر کے لیے واہ! کوچہ جاناں!" وہ سر دھننے لگی۔ "ایسا کرو تم اسے چھوڑو اور مجھ سے شادی کر لو۔ میں نہ تو اس کی طرح بااصول ہوں نہ گھڑی دیکھ دیکھ کر زندگی گزارنے کی قائل اور تو اور نہ صرف میرا سینس آف ہیومر بہت اچھا ہے بلکہ میرا ذوق بھی ٹھیک ٹھاک رومانوی ہے۔ کیوں؟" وہ آنکھیں گھما گھما کر خواہ مخواہ معصوم بننے کی کوشش میں در حقیقت بے حد چالاک قسم کی عورت دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہارا سینس آف ہیومر بمعہ رومانوی ذوق تمہارے اس بالکڑ ملے نما جعلی ڈاکٹر کو بہت بہت مبارک ہو۔" وہ دانت کچکچا کر بھنائے لہجے میں بولا۔ "میری محبت تو جو ہے اور جیسی بھی ہے صرف وہ سڑیل ٹائم پیس ہی ہے۔"

"جب محبت ہے تو اسے حاصل کرنے کے لیے پاپڑ بھی بیلو مسٹر فراز نعمانی۔ یہ آفاق شے 'زمین والوں' کو سستے داموں نہیں ملا کرتی۔" وہ اس بار گہرے لہجے میں بولی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر فراز نے ایک آخری مرتبہ اس سے پوچھا۔

"تو گویا تم اس مسئلے پر ثمر کے ساتھ ہو؟"

"تم دونوں مجھے عزیز ہو فانی۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں مگر تمہارے رشتے کے بیچ پل نہیں بنوں گی۔ تمہیں اس تک ڈائریکٹ پہنچنا چاہیے فانی۔ اگر ایک بار میرا یا کسی کا بھی سہارا لے لیا تو تمہارا رشتہ کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے تمہیں میرا مخلصانہ اور بالکل مفت مشورہ ہے کہ یا تو اپنی عادتیں سدھار لو یا ثمر کی بگاڑ دو۔ گڈ لک!" وہ اپنی بات مکمل کر کے اپنے سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس کا اجنبی انداز چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ اب بڑی عزت سے یہاں سے دفع ہو جائے تو بہتر ہے۔

سمیرہ کو اب کچھ کہنا بے کار ہی تھا لہٰذا وہ واقعی عزت سے اٹھا'' ایک کھا جانے والی نگاہ بے نیازی سمیرہ پر ڈالی اور اس کمرے سے دفع ہونے کے لیے واپس مڑ گیا۔ سمیرہ کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ کیز پر متحرک تھیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا نیا تماشا کھڑا کر دیا ہے تم نے یار؟" سمیرہ ثمر کے لاؤنج کے صوفے پر براجمان ہو کر چھوٹتے ہی کسی قدر ناراضی سے بولی۔ ثمر اس کے لیے کچن سے پانی لے کر واپس لوٹ رہی تھی۔ اپنی آنکھیں پھیلا کر تعجب سے الٹا اسی سے سوال کرنے لگی۔

"کیسا تماشا سمیرہ؟"

"واہ! ماشاء اللہ۔" سمیرہ اس کے انداز پر جلتا ہی تو گئی۔ "کیا ادائے بے نیازی ہے محترمہ۔ ایک تو اچھے خاصے انسان کے بچے کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے اوپر سے معصومیت کا عالم تو دیکھے کوئی۔" اس نے جھپٹ کر متحیر۔ کھڑی ثمر سے پانی کا گلاس تھاما اور ایک ہی سانس میں خالی کر کے اسے واپس تھما کر تحکمانہ لہجے میں بولی۔ "چائے منگواؤ فوراً۔۔۔ میرے سر میں بہت درد ہو چکا ہے تمہارے اس فاز نعمانی کی کل سے مسلسل دہائیاں سن سن کر۔" اس نے ناسمجھی سے خود کو دیکھتی ثمر کو گھورا۔

"اوہ!" ثمر نے اس بار سر کو دھیرے سے اثبات میں ہلایا جیسے سارا معاملہ سمجھ آ گیا ہو۔ "تو تم فاز کی وکالت کرنے کے لیے آئی ہو۔" وہ بھی سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

"چائے؟" سمیرہ نے چتون تیکھے کیے۔

"زرینہ لا رہی ہے۔" ثمر متانت سے بولی۔

"اوکے!" سمیرہ نے جلدی سے کہا۔ "یعنی اب بحث کی شروعات کی جا سکتی ہے۔"

"کس بات کی بحث بھئی؟" وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"اتنی اچھی تو ظاہر ہے کہ تم ہو نہیں کہ پہلی بار سمجھانے پر ہی کہنا مان جاؤ۔ اس لیے بحث ہی کرنا پڑے گی نا تم سے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"مگر پتا تو چلے آخر بات کیا ہے؟" اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ (اور یہ تجاہل عارفانہ جو کچھ بھی ہوتا ہے موصوفہ اکثر اس سے کام لیا کرتی تھیں۔۔۔ عقل مند جو ٹھہریں!)

"فاز کل آیا تھا لنچ بریک میں میرے پاس۔" اس نے بھی صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔ "بتا رہا تھا کہ اس بار تم نے اسے دق کرنے کا بالکل نیا طریقہ دریافت کر لیا ہے۔"

"وہ یعنی اس نے شکایت کی ہے میری تم سے۔" اس کی نگاہ سے تھوڑا رنج تھوڑا غصہ جھلکا۔

"اوہ نو یار!" سمیرہ نفی میں سر ہلا کر جلدی سے وضاحتی لہجے میں بولی۔ "وہ شکایت کیوں کرنے لگا۔ بس کچھ فکر مند سا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے ڈر ہے کہ اگر وہ کسی دن وقت پر نہ پہنچ سکا تو تم جیسی سخت با اصول لڑکی نے تو اسی روز اس بے چارے شخص کی چھٹی کرا دینی ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو یہ شرط نہ صرف مکمل احمقانہ بلکہ اس کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔ اس بھاگا دوڑی میں اگر اسے خدانخواستہ کچھ نقصان پہنچ گیا تب۔۔۔ تب اس کا ذمے دار کون ہو گا؟" اس کی بات اپنے مخصوص متحمل انداز میں سنتی ثمر کی آنکھوں سے اس بار شدید بے چینی مترشح ہوئی۔

"میرا ارادہ خدانخواستہ اسے نقصان پہنچانے کا تو نہیں ہے سمیرہ۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "میں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا اس جیسا زندگی کو بے فکرے انداز میں جینے والا انسان ذمے داریوں کو اٹھانے کا اہل ہے بھی یا نہیں۔"

"اس کا مزاج تم پہلے سے جانتی ہی تھیں یار۔ اس کے باوجود تم نے اس کی محبت کو قبول کیا تھا تب پھر اس طرح کی آزمائش کا مطلب؟" وہ ٹھنڈے میٹھے طنزیہ پیرائے میں بولی تو ثمر کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

"کیا تمہیں یاد نہیں کہ کس بری طرح سے اس انسان نے مجھے پریشان کر چھوڑا تھا۔ اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟"

"خیر!" سمیرہ نے گویا اپنی ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا۔ "اتنی بے چاری تو تم ہو نہیں جتنی اس وقت بن کر دکھا رہی ہو۔ بہرحال تمہیں سمجھانا میرا فرض تھا۔ آگے مانو نہ مانو تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ یہ آنٹی کہاں ہیں اور تمہاری زرینہ چائے لے کر اب تک نہیں آئی۔ اتنی دیر سے مہمان بیٹھا ہوا ہے یوں ہی سوکھے منہ۔" وہ بات کے آخر میں اسے گھورنے لگی۔

"امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔"

"اوہ ہو۔ ہو۔" سمیرہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تب تو مجھے ان کے کمرے میں ہی جاکر ان کی مزاج پرسی کرلینی چاہیے۔ میں وہیں جارہی ہوں۔ چائے تم وہیں بھجوا کر اگر تمہارے کسی اہم کام کرنے کا وقت نہ ہوگیا ہو تو خود بھی وہیں تشریف لے آنا۔" وہ بے تکان بولتی ہوئی بے تکلفی سے گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ ثمر چند ثانیے وہیں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

"میری ثمر محض آٹھ برس کی تھی جب اس کے والد نے اس کے سامنے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔ جانتی ہو میرا قصور کیا تھا؟ صرف اتنا کہ میں اس شخص سے گھر کے ضروری اخراجات کے لیے کچھ رقم کا تقاضا کررہی تھی۔ غلطی شاید میرے والدین کی بھی نہیں تھی بلکہ میری ہی قسمت کھوٹی تھی جو وہ لڑکے کا بڑا گھربار دیکھ کر ریجھ گئے۔ اس وقت بہرحال زیادہ تر محض لڑکے کا کردار، شرافت اور خاندانی ہونے ہی کو زیادہ اہمیت اور ترجیح دی جاتی تھی اور سچ بات تو یہ ہے کہ بلاشبہ ان میں یہ خصوصیات یکجا تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ حد سے زیادہ لاابالی، بے پروا اور خود پر ذرا سی بھی قدغن برداشت نہ کرنے والے انسان تھے وہ۔ تعلیم ان کی اتنی نہیں تھی۔ پہلے تو میرے سسر مرحوم نے اپنے ساتھ اپنے کاروبار میں لگا رکھا تھا۔ سسر کے بعد ان سے کہاں ہونی تھی اتنی محنت۔ اپنا کاروبار تو نوکری سے زیادہ توجہ اور وقت مانگتا ہے۔ نتیجتاً سارا کاروبار ٹھپ ہوگیا اور اس کے اثرات گھر میں دکھائی دینے لگے۔ ثمر کے والد کو شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزارنے کی عادت تھی اور بیٹا! ساری شاہی روپے پیسے کی مرہون منت ہوا کرتی ہے۔ پیسا ہی نہ رہا تو کہاں کی شاہی اور کیسے ٹھاٹ باٹ۔۔۔؟ اس کمی نے انہیں ذہنی طور پر ابتر کردیا۔ نوکری ملتی تو کچھ روز کرکے چھوڑ دیتے کہ نوکری میں وقت کی پابندی درکار ہوتی ہے اس کے علاوہ بری بھلی بھی سننا ہی پڑجاتی ہے۔ حلال رزق کمانے کو ایسے ہی تو عین عبادت کا درجہ حاصل نہیں۔

بس بیٹا۔ میں نے تو جیسے تیسے گزارہی لی مگر میں نہیں جانتی تھی کہ میری اکلوتی بیٹی کے دماغ پر باپ کی منتشر شخصیت کا اتنا گہرا اثر پڑے گا۔ وہ جیسی بن گئی ہے۔ اسے میری تربیت نے نہیں گھر کے حالات نے بنا ڈالا ہے۔ تم تو اسکول کے زمانے سے سہیلی ہو اس کی۔ جانتی ہو اسے وہ بچپن ہی سے اتنی ہی بے جھک اور بااصول، وقت کی کڑی پابندی کرنے والی لڑکی تھی۔ بہت اچھی اور کامیاب انسانوں والی عادتیں ہیں یہ۔ مگر بیٹا زیادتی تو کسی چیز کی بھی اچھی نہیں ہوتی پھر خارجی اور خانگی زندگی میں کچھ تو فرق ہوتا ہی ہے نا۔ مگر میری بیٹی جیسے یہ فرق ہی بھلا بیٹھی ہے۔" وہ لرزیدہ آواز میں یہاں تک کہہ کر رونے لگیں اور سمیرہ جو ان کے سامنے صوفہ کرسی پر سر جھکائے یاسیت آمیز انداز میں یہ کہانی سن رہی تھی یک دم اٹھ کر ان کے نزدیک آبیٹھی۔

"وہ ہو۔ پیاری آنٹی!" اس نے پیار سے ان کے بہتے آنسو صاف کیے۔ "روئیں تو مت۔ اچھا فکر نہ کریں۔ کرتے ہیں نا کچھ آپ کی ٹائم پیس کے لیے۔" اس نے ان کا تیزی سے سفید بالوں سے بھرتا سر اپنے کندھے سے لگالیا۔

"وہ کیسے فکر نہ کروں بیٹا۔ اس سال پورے پچیس کی ہوجائے گی ماشاءاللہ۔ اب تو نوکری کرتے بھی

اسے چار سال ہونے کو آئے۔ ترقی بھی ہو گئی۔ پھر اب کس بات کا انتظار ہے اسے جو اپنے لیے لائے گئے ہر رشتے کو اس بری طرح ٹھکرا دیتی ہے۔ ایسے کڑے انداز سے لڑکے کی جانچ پڑتال کرتی ہے جیسے شادی نہ کرنی ہو۔ فوج میں بھرتی کروانا چاہ رہی ہو اسے۔" عمرانہ اتنی سادگی سے بولیں کہ سمیرہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"میں نے کہا نا اب آپ بالکل فکر نہ کریں۔" وہ ان کا ہاتھ محبت سے دبا کر بولی۔ "میں آپ کی اس جیلر ٹائپ بیٹی کے لیے ایک ایسا رشتہ لے کر آؤں گی، جو وہ بالکل بھی ٹھکرا نہیں سکے گی۔"

"اچھا! واقعی؟" ان کی نم آنکھیں دلچسپی سے روشن ہو گئیں۔ "کوئی ہے تمہاری نظر میں؟"

"بالکل ہے نظر میں بھی اور دسترس میں بھی (آپ کی بیٹی کے)۔" جملے کا یہ حصہ اس نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا۔ یہ بات بتا کر تو تم نے میری طبیعت ہی بشاش کر دی۔" وہ خوش دلی سے خود کو سنبھال کر بولیں۔ "میں نے بھی تمہیں پریشان ہی کر دیا۔ کوئی چائے پانی بھی پوچھا تمہاری اس بے مروت سہیلی نے تمہیں یا یوں ہی سوکھے منہ بٹھا رکھا تھا؟" اب انہیں نئی فکر سوار ہوئی۔

"سوکھے منہ ہی بٹھا رکھا تھا آنٹی۔" وہ بے چارہ سا منہ بنا کر بولی۔ "چائے لے کر آ تو رہی تھی نجانے کہاں رہ گئی؟"

☼ ☼ ☼

"پھر کیا بات ہوئی تمہاری اس سے؟" وہ آج پھر لنچ بریک میں اس کے کمرے میں براجمان اپنے لنچ کے بجائے اس کا دماغ کھا رہا تھا البتہ آج اس کے انداز میں کسی قدر رازداری ضرور جھلک رہی تھی جیسے اسے پکڑے جانے کا اندیشہ سا لاحق ہو۔

"بنا کچھ میرا؟"

"ہاں بننے تو والا ہے!" وہ سینڈوچ کا کونا دانت سے کتر کر مکمل طمانیت سے بولی۔

"اچھا! کیا؟" وہ پر امید نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ٹھن چکر۔ اور کیا؟" وہ مزے سے بولی تو فاز کے خوب صورت چہرے پر مایوسی در آئی۔

"تو گویا وہ نہیں مانی؟" وہ تاسف آمیز خفگی سے بولا۔

"ہاں۔ وہ تو نہیں مانی۔" وہ ٹشو سے اپنے ہاتھ رگڑتے ہوئے بولی۔ "البتہ تمہارے لیے میرے پاس ایک مخلصانہ مشورہ موجود ہے اور اس کے علاوہ ایک شاندار آئیڈیا بھی۔ بولو پہلے کیا سناؤں؟"

"اس سے پہلے کہ تمہاری وہ سڑیل دوست جو قدرت کی مہربانی سے ہم سے سینئر پوسٹ پر جا چکی ہے یہاں آکر چھاپہ مار کر ہم دونوں کو اپنے خلاف سازشیں کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لے۔ جو بھی بکنا ہے جلدی بک دو۔" وہ دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

"اچھا۔ اچھا۔" وہ جلدی سے بولی۔ "دیکھو مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ تم چونکہ وقت کی پابندی نہیں کر سکو گے لہٰذا بہتر ہے کہ گھر والے جہاں کہتے ہیں شادی کر لو اور۔"

"آئیڈیا۔؟" وہ اسے بری طرح گھور کر بولا۔

"یا تو اپنے سیل فون اور رسٹ واچ میں وقت کو آدھا گھنٹے آگے کر دو۔" "کیوں؟" وہ داد طلب نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"واٹ ربش۔" وہ جو اس سے کوئی پیچیدہ قسم کے آئیڈیے کی توقع کر رہا تھا اتنے بچکانا آئیڈیے پر بھنا ہی تو گیا۔ "اس سے کیا ہو گا بھلا؟"

"یہ لیٹ ہونے سے بچنے کا ایک جادوئی طریقہ ہے جو اکثر خواتین اپنے گھروں میں استعمال کرتی ہیں۔ تم کر کے تو دیکھو پیارے بھائی۔" وہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولی۔ وہ پرسوچ، مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھے گیا۔ بنا کچھ بڑبڑائے۔ یہاں تک کہ بریک کا وقت اور سمیرو کی موت فی الحال تمام ہوئی۔

☼ ☼ ☼

"زبردست واہ جیو میری پیاری بہنا۔ کیا

کمال کا آئیڈیا مرحمت فرمایا تھا تم نے مزا آگیا بلکہ مزا ہی آگیا قسم سے۔" اتنے دن سے مسلسل اداس دکھائی دینے والا فاز آج "مستقلاً" توتے کی طرح ٹیں ٹیں کر رہا تھا۔ (ظاہر ہے اب چڑیا کی طرح چہچہانے سے تو رہا)۔ سمیرہ کے عنایت کردہ بظاہر فضول دکھائی دینے والے آئیڈیے نے تو جیسے فاز کا ہر جگہ لیٹ پہنچنے والا مسئلہ ختم ہی کر چھوڑا تھا اور بنیادی خرابی اس میں ایک یہی تو تھی۔ باقی تو مجموعی طور پر وہ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ اس کے "امتحان" کے چار روز تو بہ احسن و خوبی گزر چکے تھے۔ محض اب تین دن کے فاصلے پر موجود تھی کامیابی اور آج کا یہ پر تکلف لنچ اسی متوقع کامیابی کی خوشی میں فاز نے سمیرہ اور ثمر کو دیا تھا۔ ثمر فریش ہونے گئی ہوئی تھی اسی لیے اسے اپنی "محسنہ" کا شکریہ ادا کرنے کا موقع مل گیا۔

"کیوں مانتے ہو نا؟" وہ تفاخر سے گردن اکڑا کر خوش دلی سے بولی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں بالکل مانتا ہوں۔۔۔ بلکہ میں تو تمہارا معتقد ہو چکا ہوں آئندہ بھی ضرورت پڑی تو۔۔۔"

"نہ بابا۔" وہ بدک کر بولی۔ "آئندہ کے لیے مجھ سے کوئی امید مت رکھنا۔ کیا میں تم لوگوں کے مسائل سلجھانے کے لیے رہ گئی ہوں۔۔۔ تم لوگوں کے چکر میں، میں ڈاکٹر صاحب کو بھی وقت نہیں دے پاتی۔۔۔ کتنا خفا ہو رہے ہیں وہ آج کل مجھ پر۔" وہ اتراتے ہوئے بولی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ثمر واپس چلی آئی۔

"کون خفا ہو رہا ہے تم پر؟" وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آں۔۔۔ ہاں وہ بتا رہی تھی میں فاز کو کہ اریب مجھ سے ناراض ہے آج کل۔۔۔ کہتا ہے عجیب لڑکی ہو تم۔۔۔ کیا اگر تمہاری بیسٹ فرینڈ خدانخواستہ تا عمر کنواری بیٹھی رہے گی تو کیا اس کے چکر میں تم بھی شادی نہ کرو گی؟ میں نے بھی کہہ دیا ہاں۔۔۔ جاؤ نہیں کروں گی۔۔۔ پھر بتاؤ نا ثمر۔۔۔ تم کب کھلا رہی ہو اپنے نکاح کے چھوارے ہمیں۔۔۔ اب تو میں نے اریب کو بھی تمہارے چکر میں ناراض کر دیا ہے۔" وہ آنکھیں تیزی سے پٹپٹا کر بولی تو فاز تو فاز خود اسے بھی اپنی کتر کتر چلتی زبان پر حیرت ہوئی۔

"میرا خیال ہے کہ لنچ آرڈر کر دیا جائے ورنہ ہمیں دوبارہ آفس بروقت پہنچنے میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔" وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مینو کارڈ اٹھانے لگی۔ فاز اور سمیرہ نے بے ساختہ ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور دیکھ کر رہ گئے۔ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے؟

☼ ☼ ☼

"غضب ہو گیا سمیرہ۔" وہ اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی تب ہی فاز کی بوکھلائی ہوئی آواز اسے فون پر سنائی دی۔

"مبارک ہو۔۔۔ کب ہوا؟" وہ دانت پیس کر بولی۔ ظاہر ہے فرصت کے ان لمحات میں اس سدا کے پریشان انسان کا یوں مخل ہونا اسے ناگوار گزرا تھا۔

"نحوست لڑکی میں سنجیدہ ہوں بالکل!" اسے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی آواز سے بھی لگ ہی رہا تھا بے چارے۔

"پر ہوا کیا؟" اس نے متفکر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"پرسوں میں نے اپنے فون کی بیٹری تبدیل کی تھی۔ اس کے بعد امی کے وال کلاک کے مطابق اپنا ٹائم سیٹ کر لیا تھا۔" اس نے سنجیدگی سے بتایا۔

"تو اس میں کون سی قیامت آگئی؟" وہ بری طرح جھلا کر بولی۔ سامنے ٹی وی پر ڈرامے کی اتنی مزے دار قسط جاری تھی۔ ہیروئن پچھلی ہی قسط میں بیوہ ہو گئی تھی۔۔۔ دوسری میں اس کے عاشق نے خودکشی کرنے سے پہلے اس کے منہ پر تیزاب گرا دیا۔۔۔ تیسری میں اس کی شادی دو جوان بچوں کے باپ سے کرا دی گئی اور آج کی قسط میں اس کے سوتیلے بھتیجے کو اس سے زبردست قسم کا عشق لاحق ہو گیا تھا اور ایسے میں اس فاز کے بچے کی بدمزا قسم کی کال نے سارا انٹرٹینمنٹ تباہ کر ڈالا اگر وہ کہیں موجود تھا تو۔

"قیامت ہی آگئی ہے سمجھو سمیرہ۔" وہ از حد

روہانسی آواز میں بولا۔ "میں تمہاری اس شدید قسم کی گھڑی نما دوست کے ہاں تین دن آدھ گھنٹہ لیٹ جاتا رہا ہوں۔"

"او نو۔" وہ جو بیر پسارے بیٹھی تھی یکلخت سیدھی ہو گئی۔

"اب کیا ہو گا؟" وہ بے حد فکر مندی سے بولی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او خدایا۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آپا رہا اب تک کہ میں تمہارے تمام جملہ حقوق اپنے نام کروانے میں کامیاب ہو چکا ہوں جاناں۔" حجلہ عروسی میں داخل ہونے کے بعد فاز نے کوئی ساتویں مرتبہ یہ جملہ اسی طرح کے جوش و خروش و سرخوشی سے دہرایا تھا جیسا کہ پہلی مرتبہ۔ پورے کمرے کو آج اس نے سجایا نہیں تھا' اپنے ارمان نکال کر در و دیوار پر آراستہ کر دیے تھے جیسے اور کیوں نہ کرتا؟ جسے چاہا آج وہ مجسم حقیقت بنی مقابل موجود تھی۔ سرخ و بادامی رنگ کے بھاری کامدار سوٹ میں پور پور وہ اسی کے لیے تو سجائی گئی تھی۔ یہ احساس ہی بڑا دل آویز تھا فاز کے لیے۔

"ایک بات کو کب تک دہراؤ گے فاز؟" وہ مدہم لہجے میں دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

"جب تک تم میری حیرانی دور نہیں کرو گی تب تک۔۔۔" فاز نے اس کا حنائی ہاتھ تھام کر سرخ دہری کھنکتی چوڑیوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ سمٹ سی گئی۔

"کیسی حیرانی؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ بالفاظ دیگر تجاہل برتا۔۔۔ ایک مرتبہ پھر۔

"میں تو تمہارے آخری امتحان پر پورا بھی نہیں اتر سکا تھا۔" وہ ہلکے سے ہنسا۔ "پھر بھی تم نے مجھے شرف قبولیت بخش دیا۔۔۔ کیسے؟" وہ اب براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا اور ان آنکھوں میں محبت۔۔۔ تمہارا پا لینے کی آسودگی کے علاوہ بھی کوئی رنگ تھا اور وہ تھا خلوص کا رنگ۔۔۔ صد ہا شکر جسے وہ بروقت پہچان گئی تھی۔

"کیوں کہ میں نے تمہاری اور سمیرہ کی اس روز والی گفتگو سن لی تھی فاز۔۔۔ کہ جس روز وہ تمہیں اپنی گھڑی آدھا گھنٹہ آگے کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔" اس کے احمریں لبوں پر مزا لینے والی مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔

"اوہ نو!" فاز نے بے اختیار اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چہرے پر چمکتے تمام تر لطیف جذبات کی جگہ خجالت نے لے لی۔ "وہ تو بس یوں ہی۔۔۔ دراصل بات کچھ یہ۔۔۔" اس نے بے ربط سے جملوں کا سہارا لے کر بات بنانی چاہی مگر ثمر نے نرمی سے اسے ٹوک دیا۔

"نہیں فاز۔۔۔ تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اگر میں اس روز تم دونوں کی باتیں نہ سن لیتی تو شاید میں اپنے اس موقف پر ہی قائم رہتی کہ جو شخص وقت کی قدر کرنا نہیں جانتا پھر وہ کسی کی بھی قدر نہیں کر سکتا۔۔۔ مگر تم نے مجھے غلط ثابت کر دیا فاز۔۔۔ اس روز تمہارے لہجے سے جھلکتی فکر و تشویش نے مجھے اپنا اسیر بنا چھوڑا۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

"کیا مشرقی محبوبہ ملی ہے ہمیں صاحب۔" ثمر کے اقرار نے اسے اندر تک طمانیت آمیز مسرت سی بخش دی تھی۔ وہ ہلکا پھلکا سا ہو کر دوبارہ شوخی پر مائل دکھائی دینے لگا۔ "جس نے اقرار محبت کیا بھی تو حجلہ عروسی میں بیٹھ کر۔ واہ رے! فاز نعمانی تمہاری قسمت کہ محبوبہ ملی بھی تمہیں تو بس ایک رات کی۔۔۔ کل صبح جو بے دار ہو گی۔۔۔ وہ تو میری بیوی ہو گی ناں۔" وہ بولا کچھ اس انداز سے کہ ثمر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

وقت اور پر خلوص محبتوں کی قدر کرنا کامیاب لوگوں کا وصف ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ثمر فاز نعمانی واقعی اب ایک کامیاب شخصیت تھی۔۔۔!

☼ ☼

ناول

سنو ہاں جاؤ

ام ایمان قاضی

"دیکھا بی بی آپ نے اس لڑکے کو سر چڑھانے کا نتیجہ۔ پڑھایا لکھایا ہر فرمائش پوری کی۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر خیال رکھا اس کا اور سب سے بڑھ کر اپنا جگر کا ٹکڑا اس کے حوالے کر دیا اور یہ صلہ دے رہا ہے اس کا وہ مجھے کہ برادری میں مجھے منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا اس نے۔" حاکم علی سخت غصے میں بڑی بہن سے مخاطب تھے۔ بی بی نے چند لمحے بغور ان کے غصے کو دیکھا جو ہاتھ پشت پر باندھے کبھی ٹہلنے لگ جاتے اور کبھی بی بی کے سامنے رک کر حیدر کو سخت سنانے لگتے۔

"حاکم بھائی! حیدر سلجھا ہوا، باادب بچہ ہے۔ اس نے کبھی آپ سے بدتمیزی نہیں کی، نہ ہی کسی ایسی بات کا سوچا جو کہ آپ کا سر جھکانے کا سبب بنے۔ جتنا اس کی زبانی مجھے پتا چلا ہے، تو غلطی آپ کے منشی کی لگتی ہے۔ وہ آپ کا خاص بندہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ کسی غریب کی زمین، جائیداد ہتھیا لے۔ رمضان جس کی زمین پر منشی نے قبضہ کر کے اپنے جانور رکھ لیے ہیں، روتا ہوا حیدر کے پاس شکایت لے کر آیا تھا، جب آپ دوسرے گاؤں کسی پنچایت کے لیے گئے تھے۔ آپ موجود نہیں تھے، سو اس نے پوری تحقیق کر کے ہی رمضان کی زمین منشی کے قبضے سے چھڑا کر اس کے حوالے کی اور منشی کو آئندہ ایسے کسی غلط اقدام سے باز رکھا، اس میں آپ کا اتنا غصہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسا ہو تو ابھی چھوٹا ہے، بہت دیر ہے اسے ان معاملات کو سمجھنے کے لیے حیدر کی تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ اسی نے ہی آپ کے ساتھ یہ سارے معاملات دیکھنے ہیں، پھر ابھی کیوں نہیں؟"

"آپ کی پوری زندگی اس چار دیواری میں گزری ہے بی بی۔ اس لیے کچھ نہیں جانتیں اور حیدر کب رہا ہے یہاں جو یہاں کے طور طریقے جان سکے۔ اسے ابھی نہیں پتا کہ کیسے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ کتابیں بہت کچھ سکھاتی ہیں، پر سب کچھ نہیں سکھاتیں۔ زندگی گزارنے کے لیے اس کو برتنا پڑتا ہے، تب اس کی سمجھ آتی ہے۔ یہ کتابی باتیں، یہ سچ جھوٹ کے قصے کتابوں میں اچھے لگتے ہیں۔ ابھی اس سے کہیں کہ صرف عیش کرے بس۔ ابھی میں زندہ ہوں۔ اس گاؤں میں کیا، کب اور کیسے دیکھنا ہے، یہ سب مجھ پر چھوڑ دے ان۔ کمی کمین لوگوں کو ہم سر پر بٹھانے لگے تو کل سڑک پر لے آئیں گے یہ ہمیں۔ ان کو ان کی اوقات یاد دلائے رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ارے وہ زمین کون سی رمضو کے باپ، دادا نے خریدی تھی۔ ہمارے باپ، دادا ہی دان کر گئے تھے۔ اب ہماری مرضی ہے، ہم واپس لیں یا کسی اور کو دیں، اسے بھی خالی ہاتھ نہیں رہنے دیا، تھوڑا بہت دے دیا ہے۔" اب وہ بی بی کے پاس بیٹھے۔ انہیں زندگی گزارنے کے وہ اسرار و رموز بتا رہے تھے جن پر ساری زندگی خود عمل پیرا رہے تھے اور حیدر کو بھی اپنے نقش قدم پر چلتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے، جو اس کے مزاج اور فطرت سے یکسر مختلف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چچا، بھتیجا میں کبھی کبھار ٹھن بھی جاتی تھی۔

حیدر شہر میں یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ کچھ اس

کی ساری عمر گزری ہی ہاسٹلز میں تھی۔ تو گھر آنے پر کسی بھی مظلوم کے ساتھ ظلم و زیادتی کی سن گن حیدر کے کانوں میں پڑتی تو وہ حتی الامکان اس کا مداوا کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ بعض دفعہ چاچا حاکم علی اس کے سامنے تو چپ رہ جاتے گویا اس کی بات سے متفق ہوں، مگر اس کے ہاسٹل واپس لوٹتے ہی کرتے اپنی مرضی تھے۔

حیدر علی اور صوفیہ ان کے بڑے مرحوم بھائی کی نشانیاں تھے جن کے والدین ان کے بہت بچپن میں ایک حادثے میں گزر گئے تھے۔ خود حاکم علی کی دو ہی اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مہر علی جو حیدر علی سے بے حد متاثر تھی اور تعلیم میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود بھی صرف اس لیے کتابوں کے ساتھ لگی رہتی کہ حیدر علی کتابوں سے محبت کرنے والا شخص تھا، یوں باپ سے ضد کرکے جیسے تیسے سہی انٹر کا امتحان پاس کر رکھا تھا اور دو ماہ قبل حیدر علی سے ہونے والے نکاح کے بعد خود کو گویا ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتی تھی کہ جو خواہش اس کے دل میں نہ جانے کب سے حسرت بن کر زندہ تھی، اسے اچانک ہی تعبیر مل گئی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی شاہ زین تھا جو ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔

☆ ☆ ☆

"چاچی... صوفیہ خوشی سے گلنار چہرہ لیے اندر آئی۔ چاچی نے مہر کو دبوچا ہوا تھا اور اس کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھیں۔ بی بی پاس ہی تخت پر براجمان تھیں۔ دونوں نند بھاوج کسی خاندانی مسئلے کو چھیڑے بیٹھی تھیں، جبکہ مہر پر آہستہ آہستہ غنودگی طاری ہو رہی تھی، جب ہی سر چاچی کے زانو پر ٹکا رکھا تھا۔

"وہ باہر میرے ماموں آئے ہیں مجھے لینے کچھ دنوں کے لیے۔ حیدر لالا سے فون پر پوچھ لیا ہے۔ انہوں نے اجازت دے دی ہے، میں چلی جاؤں؟" خوشی سے صوفیہ کی آواز لرز رہی تھی۔

"تو تو مل لے اپنے ماموں سے، مگر یہ گھر جانے کی کیا تک بنتی ہے بھلا۔" چاچی بھی، چاچا حاکم علی ہی کی زبان بولنے لگی تھیں۔

"تو اب اس میں اعتراض والی کیا بات ہے اماں... چلی جائے صوفی اپنے ماموں کے گھر... میں بھی تو اپنے ماموں کے گھر جاتی ہوں اور کئی کئی دن رہ کے بھی آجاتی ہوں۔ یہاں پر تو صرف اس کا ماموں آیا ہے۔ گھر جائے گی تو اپنی ممانی اور کزنز وغیرہ سے بھی مل آئے گی۔" صوفیہ کی خوشی ماند پڑتی دیکھ کر مہر ہی اس کی مدد کو آئی۔

"تو چپ کر، جب کسی بات کا پتا نہ ہو تو بولا مت کر در میان میں، کتنی بار کہا ہے۔" چاچی نے مہر کو گھر کا۔ "ہزار بار تجھے اور اس کو بتایا ہے کہ صوفی کی ماں ہمارے خاندان سے نہیں تھی۔ ان کے وڈیرے کامے تھے ہمارے بڑکھوں کے۔ پسند کی بیاہ لایا تھا تیرا تایا۔ کئی منتوں ترلوں کے بعد اس عورت کو گھر میں تو بہو کا درجہ دے دیا، مگر ان لوگوں کو یہاں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ تیری تائی بھی خاص خاص موقعوں پر ہی جاتی تھی میکے۔ جب وہ بھلی مانس قبر میں جا سوئی تو سالوں کوئی رابطہ نہ رکھا کسی نے، نہ ہی تیرے ابا کو پسند ہے سب۔"

اس کا ماما سالوں، پر سالوں میں آکر عید، بقر عید پر مل جاتا ہے بھانجی بھانجے سے، یہی کافی ہے۔ ہمارا اور ان کا کوئی میل نہیں ہے۔ یہ بات میں آخری دفعہ بتا اور سمجھا رہی ہوں آرام سے۔ ورنہ اپنے ابے کا غصہ تو بھی جانتی ہے اور یہ صوفی بھی۔" چاچی نے ہزار بار کی دہرائی ہوئی داستان ایک بار پھر سنائی۔

"وہ تمہارے ماموں ہیں صوفی بچے! ان کو بٹھاؤ، ان کی خاطر تواضع کرو اور جا کر مل بھی لو، مگر فی الحال ان کے ساتھ جانے کی اجازت تمہیں ہم نہیں دے سکتے۔ ماموں کو ٹھہرالو۔ بھائی آجائیں تو ان سے پوچھ لینا۔ اگر اجازت دیں تو چلی جانا ایک دو دن۔ نہیں تو ماموں سے کہنا کچھ دنوں میں تمہاری ممانی اور اپنے بچوں کو بھی تم سے ملوانے لے آئیں۔ جاؤ بچہ

شاباش۔" چاچی کے برعکس بی بی نے بڑے پیار سے کہا تو صوفی سرہلاتی ہوئے ہوئے قدم اٹھاتی پلٹ گئی۔

"یہ عجیب قسم کے رسم و رواج مجھے لگتا ہے صرف ہمارے ہاں ہی ہیں۔ شادی صرف اپنی برادری میں کرو۔ جوڑ ہو نہ ہو بے جوڑ رشتے کرکے ساری زندگی کے لیے دوسروں کو دوزخ میں دھکیل دو۔ بیوہ کی شادی کا فوری حکم دیتا ہے ہمارا مذہب مگر بی بی کا صرف نکاح ہوا تھا، منگیتر بے چارہ حادثے میں چلا گیا۔ کتنے رشتے آئے مگر جائیداد غیروں میں نہ چلی جائے اس عذر کو ایک غلط روایت میں لپیٹ کر گلے سے لٹکالیا کہ ہمارے ہاں بیوہ ساری زندگی مرنے والے کے نام پر گزار دیتی ہے۔ کیوں بھئی! جب اللہ اجازت دے رہا ہے تو ہم تم کون ہوتے ہیں کسی کو غیر شرعی طوق پہنانے والے۔ صوفی کی امی غریب خاندان سے تھیں۔ تایا کے مزارعے کی بیٹی، پسند کی شادی تھی تو تمام عمر کے لیے معتوب ٹھہریں، مرنے کے بعد بھی آزاد نہ ہو سکیں۔ صوفی ماموں کے گھر نہ جائے، غریب ہیں تو بھئی غریب ہیں، پر انسان تو ہیں نا۔"

ابھی اس کی جذباتی تقریر کا کچھ حصہ باقی تھا جب چاچی کی کمر پر پڑنے والی دھپ اسے کراہنے پر مجبور کر گئی۔ بی بی الگ دھواں دھواں چہرہ لیے بیٹھی تھیں۔ اپنے ساتھ گزرنے والی ایسی بے رنگ زندگی کا ذکر اور سبب انہیں ہمیشہ غم زدہ کر دیتا تھا۔

"میں آج ہی تیرے ابا سے تیری طبیعت صاف کرواتی ہوں۔ یہ سکھا رہی ہے کم بخت تیری تعلیم تجھے۔ نہ ماں کا لحاظ، نہ پھپھو کی شرم۔ تیرا باپ سن لے تیری یہ بکواس تو ابھی کے ابھی زبان کاٹ کے ہتھیلی پہ دھر دے۔" چاچی کا بولتے بولتے سانس پھول گیا۔

"بچی ہے بھابھی۔۔۔ چھوڑیں، جانے دیں۔" بی بی نے آہستہ سے کہا۔

"شہر اٹھو بچے! جاؤ دیکھو صوفی کہاں ہے؟ کچن میں بھی ایک چکر لگا لینا۔ ملازمہ سے کہو کچھ خاص بنالے مہمانوں کے لیے۔" بی بی نے چاچی کو آنکھ کے اشارے سے تسلی دی اور اسے پچکارتے ہوئے وہ

سوں سوں کرتی اٹھی اور ان دونوں کو دیکھے بغیر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

چاچا جی نے صوفی کو ماموں کے ساتھ جانے سے منع کر دیا تھا۔ البتہ اپنی زیادتی کے ازالے کے طور پر انہیں بہت تحائف اور اپنی زمینوں کی دیگر سوغاتیں دے کے رخصت کیا تھا۔ نتیجتاً" صوفی کل سے ہی منہ سر لپیٹے پڑی تھی 'ورنہ تو وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی کام میں ہی مصروف نظر آتی تھی۔ کبھی سوئی دھاگا اور فریم کے ساتھ الجھی ہوتی 'کبھی کچن میں مختلف کھانوں سے نبرد آزما' تو کبھی لحافوں میں ڈورے ڈالتی۔ اب بھی مہر نے اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا کہ بہت دور نہ سہی' گھر کے پچھواڑے میں بنے ٹیوب ویل تک ہی چلے' مگر وہ کسلمندی سے لیٹی رہی تھی۔ تنگ آکر مہر نے اکیلی ہی وہاں آکر بیٹھ گئی تھی۔ گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر وہ دونوں دنیا جہاں کی باتیں کرتی تھیں۔ اپنی ہی سوچوں میں گم ایک خشک پتے کو توڑے مروڑے جارہی تھی۔ جب اس کی کمر پر ایک پتھر آکر بڑی زور سے لگا۔ وہ سی کر کے پیچھے کو مڑی تو شاہو۔ ہاتھوں میں غلیل لیے دانت نکال رہا تھا۔

"کیا بات ہے آپا! لگتا ہے حیدر لالا یاد آرہے ہیں۔ ویسے بھی جب سے تمہارا نکاح ہوا ہے۔ تم بدل گئی ہو۔ نہ کھیلتی ہو میرے ساتھ۔ نہ باتیں کرتی ہو 'بس ہر وقت کچھ سوچتی ہی رہتی ہو۔ اتنا بھی مت یاد کرو' بے چارے لالا کو کہ ادھر ہچکیاں لے لے کر اس کا برا حال ہو جائے۔" مزا لے لے کر کہتے شاہو کو دیکھ کر مزید اس کی بات سن کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تم اسکول کیوں نہیں گئے آج۔۔۔" اس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر وہ اس پر رعب جما کر بولی۔

"ارے پیاری آپا! قسمت سے ہی ایسا موقع ملتا ہے جب ابا گاؤں سے باہر جاتے ہیں۔ بس یہ سوچ کر میں نے چھٹی کرلی ہے۔ ویسے بھی ابا کہتے ہیں جمع' تفریق آنی چاہیے مجھے پھر اسکول سے اٹھالیں گے۔ میں نے کون سا نوکری کرنی ہے۔ جو اتنا دماغ کھپاؤں ان کتابوں میں 'مجھے تو بس ابا کی طرح زمین دار بننا ہے۔ بڑے بڑے فیصلے کرنے ہیں۔" اس کے تفاخر سے بولنے پر مہر تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

کچھ عرصہ پہلے تک وہ بھی مطمئن تھی اور تقریباً" بھائی جیسی ہی سوچ رکھتی تھی 'مگر جب سے حیدر کے لیے دل میں الگ جذبات پیدا ہوئے تھے۔ اس کے خیالات بھی اسے متاثر کر گئے تھے۔

"مجھے اپنے لوگوں کو غلامی کے اس طوق سے آزاد کرانا ہے جو صدیوں سے ان پر مسلط ہے۔ فرسودہ رسومات کو ختم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کرنا ہے۔ وہ رسومات جو ہمیں دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہی ہیں۔ تعلیم کو ہر خاص و عام کے لیے ضروری بنانا ہے۔" وہ جوش سے کہتا تو مہر مسحور سی اس کو دیکھے اور سنے جاتی۔ پھر جیسے گزرتے وقت کے ساتھ اس کے خیالات کی مہر پر بھی گہری چھاپ لگ گئی۔ وہ اسی کی طرح سوچنے اور بولنے لگی تھی۔ کب سے تعلیم کا رکا سلسلہ کتابیں جھاڑ کر دوبارہ سے جوڑا تھا۔ دفعتاً" اس کے خیالات میں دراڑ پڑی جب اس نے کسی کو اپنے بالکل قریب بیٹھتے محسوس کیا۔ شاہو کب سے وہاں سے جاچکا تھا جبکہ اسے اپنے اس قدر قریب بیٹھا دیکھ کر وہ حیرت سے تک رہ گئی۔

"میں۔۔۔ میں ابھی ابھی آپ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔" خوشی سے لرزتی آواز میں اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔ حیدر مسکرا دیا اور کندھے سے بھاری بیگ اتار کر سامنے ہی رکھ دیا۔

"اور میں تو بہت دنوں سے تمہیں سوچ رہا ہوں۔ بلکہ نکاح کے بعد سے تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔ کچھ بتانا تھا' کچھ پوچھنا تھا۔" اس کی بھاری آواز سے مہر کو دونوں کے درمیان ہونے والے نازک اور خوب صورت رشتے کا احساس ہوا تو اسے بے ساختہ ڈھیروں شرم نے آن گھیرا۔

"میں نے تمہیں کبھی ایک چچازاد سے زیادہ نہیں سمجھا تھا۔" وہ کچھ سوچ کر کہہ رہا تھا۔ مہر بے ساختہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"پھر صوفی کی باتوں میں تمہارا ذکر تواتر سے آنے لگا۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایسا بھی ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔ تم دونوں کزنز ہو۔ ایک ہی گھر میں رہتی ہو' پھر دوستی بھی... تو اس میں بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔" سامنے درخت کے پتوں میں کھو جتا وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ جبکہ مہر پوری جی جان سے اس کی جانب متوجہ تھی اور بے حد غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"پھر صوفی نے مجھے بتایا کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو۔" حیدر نے اچانک اس کو دیکھ کر کہا۔ مہر گھبرا گئی۔ صوفی کی بچی کو تو میں پوچھوں گی۔ پتا نہیں کیا کیا بتا دیا اور میں تو اپنے دل کی ہر بات اسے بتا دیتی ہوں۔ تو کیا سب بتا دیا۔ اس نے گھبرا کر اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔

"میرے لیے یہ بھی عام سی بات تھی۔ میں ساری زندگی باہر رہا ہوں۔ کالج' یونی ورسٹی میں بہت سی لڑکیاں میری جانب ملتفت بھی ہوئیں مگر میں ذرا اور طرح کی سوچ کا بندہ ہوں۔ میں نے کبھی صنف مخالف کی اس دلچسپی کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ میرے سارے ان کہے جذبے میری شریک حیات کے لیے تھے جس کے لیے میری سوچ تھی کہ مجھے سمجھتی ہو۔ تعلیم یافتہ ہو اور ایک شریف گھرانے کی باکردار لڑکی ہو بس..." وہ بولتا جا رہا تھا۔

"میں چونکا تب جب مجھے پتا چلا کہ تم نے اپنی چھوڑی ہوئی تعلیم کا سلسلہ صرف اس لیے دوبارہ جوڑ لیا کہ مجھے پڑھے لکھے لوگ اچھے لگتے ہیں' چاچا کی ہزار مخالفتوں کے باوجود اپنی پڑھائی میں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود۔ پھر صوفی بتاتی کہ مہر اب آپ کی جیسی باتیں کرتی ہے حیدر لالا۔ اسے بھی وہ سب زیادتیاں اور ناانصافیاں بری لگتی ہیں جن کو آپ ناپسند کرتے ہیں۔ وہ بھی تعلیم حاصل کرکے اپنے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے آپ کی طرح۔ وہ کہتی ہے کہ میں ایک کمزور لڑکی ہوں اور کچھ نہ بھی کر سکی تب بھی اس گاؤں کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے ہی ضرور آراستہ کروں گی۔ تبھی سے میرے دل نے تمہارے لیے الگ انداز میں سوچا تھا۔" اس نے گہری سانس لی۔ مہر کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"محبت بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر محبت میں خود کو بدلنے والے لوگ بہت کم ہوتے ہیں اور وہ ہی لوگ نایاب ہوتے ہیں۔ ان کی قدر کرنی چاہیے۔ پھر سنا کہ تمہارے ماموں' چاچا سے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میں پہلی فرصت میں شہر سے آیا تھا اور چاچا جی سے تمہارا ہاتھ مانگ لیا۔ اس سے پہلے کہ یہ نایاب لڑکی میرے ہاتھوں سے نکل جاتی' اس سے میں اپنے گھر کو روشن کرنا چاہتا تھا۔ آگے سب تم جانتی ہی ہو۔ بس تمہیں یہ بتانا تھا کہ اب سوچوں کے سفر میں تم اکیلی نہیں ہو تیں۔ جہاں تمہارے ساتھ میں ہوتا ہوں' وہاں میرے جذبات بھی تمہارے لیے جیسے انگڑائی لے کر بیدار ہو گئے ہیں۔ نکاح کے دو بول واقعی بہت

سانحہ ارتحال

ہماری مصنفہ فاخرہ گل کی والدہ قضائے الٰہی سے وفات پاگئیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم فاخرہ گل کے غم میں برابر کے شریک اور دعاگو ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے اور ان کے اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

بہنوں سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

طاقت رکھتے ہیں۔ دونوں فریقین کو خود سے باندھ لیتے ہیں کہ ہر سوچ کا سرا دوسرے فریق سے ہی جا کے ہی ملتا ہے۔ تم سے ملنے کا مقصد ہی یہ بتانا تھا کہ محبت کے اس سفر میں حیدر علی بھی تمہارے ساتھ ہے۔" اس کا ایسا کہنا مہر علی کو ہواؤں میں اڑا کے لے گیا۔

"یہ صوفی کہاں ہے؟ نظر نہیں آ رہی۔۔۔ ورنہ تو دونوں کی جوڑی ساتھ ہی دکھتی ہے ہمیشہ۔ اسے بلاؤ اور کہو کہ مجھے چائے بھجوائے کڑک سی' میں اپنے کمرے میں ہوں' ارے ہاں۔۔۔ یہ تم دونوں کے لیے چیزیں اور کپڑے لایا ہوں۔" اٹھتے اٹھتے وہ واپس بیٹھ گیا اور بھاری بیگ کو گھسیٹ کر قریب کیا اور کھول کر ایک شاپر مہر کو تھما دیا۔

"تھینک یو حیدر۔۔۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ اور شاپر لے کر کھڑی ہو گئی' جبکہ حیدر مسکراتا ہوا اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر گھر کی اندرونی جانب چلا گیا۔

مہر کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ آج اسے دونوں جہان کی خوشی ملی تھی' آخر کو محبوب جو کہ اب شوہر بھی تھا کی طرف سے اذن محبت ملا تھا۔ وہ تو اسے پا کر ہی بہت خوش اور قانع تھی' اس نے تو کبھی خواب میں بھی اتنی اہمیت کا نہ سوچا تھا جو اسے حیدر علی کی طرف سے ملی تھی۔

☆ ☆ ☆

چاچا جی گاؤں سے باہر تھے' سو حیدر بی بی کو بتا کر صوفی کو لے کر ماموں کے گھر چلا آیا تھا' جو کہ چند کوس دور ہی دوسرے گاؤں میں واقع تھا۔ ماموں اور ان کا پورا گھرانہ ہی ان کے آگے بچھ بچھ گیا تھا۔ تب ہی حیدر کی نظر سے ماموں کے بیٹے جواد کی آنکھوں کی وہ چمک پوشیدہ نہ رہ سکی تھی جو صوفی کو دیکھ کر بے دار ہوئی تھی۔ ویسے بھی جواد ایک سلجھا ہوا شریف نوجوان تھا۔ ایف اے پاس جواد کا پیشا بیڈ دوائیوں کا اپنا چھوٹا سا کاروبار تھا اور حیدر ویسے بھی کچھ عرصہ سے صوفی کی شادی کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ رشتہ داروں' برادری میں نظر دوڑانے پر کوئی بھی صوفی کے جوڑ کا نہ نظر آتا تو وہ الجھن کا شکار ہو جاتا تھا کہ چاچا یہاں بھی اپنی من مانی کرتے ہوئے کوئی اراغیرا رشتہ نہ ڈھونڈ لیں اس کے لیے' پورا دن خوش گوار وقت گزار کر اس کا اطمینان بے حد قوی ہو گیا' جب ماموں نے بے حد عاجزی اور درخواست سے جواد کے لیے صوفی کا ہاتھ مانگا تھا۔

"یہ تو چھوٹا منہ بڑی بات۔۔۔ تم لوگ کہاں' ہم کہاں۔۔۔ مگر صرف ایک بات پر یہ جرات کر پایا ہوں کہ تم دونوں میری اکلوتی بہن کی نشانیاں ہو۔ صوفی میرے گھر کی بہو بن جائے تو یہ رشتہ بحال رہے گا' جو اب مجھے ٹوٹتا نظر آ رہا ہے۔ یہ ہم سب کی شدید خواہش سمجھ لو۔ میں بہت بار تمہارے ہاں گیا ہوں' مگر تمہارے چاچا کا رویہ کچھ خاص حوصلہ افزا نہیں تھا جو ان سے یہ بات کرتا اس لیے تمہارے سامنے دست دراز کر رہا ہوں بچے۔"

ماموں جی گلوگیر لہجے میں بولے تو حیدر کو گہری شرمندگی نے گھیر لیا۔ واقعی ماموں جی جب بھی آتے ان کی خاطر تواضع تو خوب کی جاتی مگر اپنائیت کا احساس کہیں نہیں ملتا تھا' بلکہ کسی حد تک چاچا جی کا رویہ رعونت بھرا ہوتا جس سے ماموں جی اپنی بات ہمیشہ دل میں دبائے واپس آ جاتے تھے اور ایک دو دفعہ حیدر اگر گھر پر ملا تو چاچا جی ساتھ تھے۔ سو یہ بات وہیں کی وہیں دل ہی میں رہ گئی تھی۔ آج بھی انہوں نے بے حد جھجکتے ہوئے حیدر سے مدعا بیان کیا تھا۔ مامی جی بھی امید و مبہم کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ حیدر کے ذہن میں بے ساختہ جواد کی آنکھوں کی چمک اور صوفی کا گلرنگ چہرہ پھر گیا تھا' جب ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اس کے دماغ نے لمحوں میں ہی فیصلہ دے دیا۔ اس نے اپنے بالکل سامنے بیٹھے نظریں جھکائے ماموں کو ایک نظر دیکھا اور بے حد احترام سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"ماموں جی! آپ میرے لیے ویسے ہی قابل احترام ہیں جیسے کہ میری ماں' اور مجھ پر اور صوفی پر اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا کوئی بھی والدین اپنی اولاد پر رکھتے ہیں۔

میری بہن اپنے ماموں کے گھر کی بہو بنے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات کوئی اور نہیں میرے لیے۔ میں ابھی کے ابھی آپ کو ہاں کر دیتا مگر ہر رشتے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔" وہ کچھ لمحے کے لیے رکا۔ ماموں جی نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"چاچا جی بھی ہمارے والد کی جگہ پر ہیں اور ہمارے سرپرست بھی۔ میں ایک دفعہ ان سے پوچھ کر ان کو بتا کر ہی آپ کو جواب دوں گا اور ماموں جی سب سے بڑھ کر میرے لیے میری بہن کی خوشی ہوگی۔ میں اس سے بھی پوچھنا چاہوں گا۔ اگرچہ ہمارے ہاں لڑکیوں سے ان کی مرضی پوچھنا گناہ سمجھا جاتا ہے مگر میں یہ ضرور کروں گا کیونکہ اس کا حق ہمیں ہمارا مذہب بھی دیتا ہے۔ آپ یہ میرا موبائل نمبر رکھیں۔ مجھ سے گھر پر ملاقات نہ بھی ہو تب بھی فون پر رابطہ رہے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں مجھے لگتا ہے کہ آپ کی خواہش پوری ہونے میں بس چند دن ہی رہ گئے ہیں۔ بس دعا کیجیے کہ اللہ ہمارے آپ کے سب کے حق میں بہتر کرے گا۔" نرمی سے کہتے کہتے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماموں جی نے بے ساختہ نم آنکھوں سے اسے گلے سے لگا لیا۔

"صوفی کو بلائیے مامی! رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں نکلنا ہے۔" ماموں جی سے مصافحہ کرتے اس نے کہا تو مامی جی خوشی سے بے حال ہوتی سر ہلا کر باہر نکل گئیں کہ بہرحال حیدر علی کی طرف سے انہیں توقع سے بڑھ کر ردعمل ملا تھا۔ حیدر نے موقع کو غنیمت جان کر راستے میں بہن سے بھی اس کی مرضی دریافت کرلی تھی اور اس کے چہرے پر کھلتے رنگ اسے مطمئن کر گئے تھے۔ اگرچہ اس نے کسی قسم کا اظہار کیے بغیر بھائی سے اتنا کہا تھا کہ اسے اس کی زندگی کے بارے میں کیا گیا حیدر کا کوئی بھی فیصلہ قبول ہوگا۔ رات گئے ان کی واپسی عمل میں آئی تھی۔

صبح اٹھتے ہی صوفی مہر کو لے کر اپنی مخصوص جگہ پر آگئی تھی اور بے حد شرماتے مسکراتے سب کچھ بتا دیا تھا۔ مہر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

"گھنی میسنی۔۔۔ میں کیسے اپنے دل کی ہر بات سب سے پہلے تجھے بتاتی ہوں اور تو۔۔۔" اس نے دو تین مکے اس کے بازو پر رسید کیے۔ صوفی نے ہنستے ہوئے اسے پیچھے دھکیلا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو مہو! ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں کہ میں تمہیں بتاتی۔ بس ایک دفعہ پہلے جب میں حیدر بھائی کے ساتھ ماموں کے گھر گئی تھی تو اس کا ایک خاص نظر سے خود کو دیکھنا محسوس کیا تھا میں نے اور کچھ نہیں۔۔۔ پھر میں بھول بھال گئی تھی یہ سوچ کر کہ یہ کسی بھی مرد کی وقتی پسندیدگی کی نظر بھی ہو سکتی ہے۔ وہ تو کل مجھے رانی نے بتایا کہ جب سے جواد بھائی نے آپ کو دیکھا تھا تب سے ہی دیوانے ہو گئے تھے آپ کے۔۔۔" صوفی کہتے کہتے شرما کر ہنس پڑی۔ مہر نے اسے بڑے زور سے چٹکی کاٹی۔

"اور۔۔۔ اور کیا بتایا؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور بس ماموں جی نے بھائی سے بات کی۔ بھائی نے کہا چاچا جی سے بات کر کے جواب دیں گے پھر بھائی کے امتحان کے بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوگی جو دو ماہ بعد ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ بھائی میری شادی کے ساتھ ہی تمہاری رخصتی بھی چاچا جی سے مانگ لیں گے۔ یہ ہے ساری کہانی۔۔۔ میں رات آئی تمہیں بتانے مگر تم سو چکی تھیں۔" صوفی نے مہر کے مطلب کی بات بتا کر اسے خوش کر دیا۔

"اچھا صوفی! تو ایسا کرنا اپنی اور میری شادی سے پہلے مجھے حیدر کی پسند کے سارے کھانے بنانا سکھا دے۔۔۔ اور۔۔۔ بعد میں کیوں آج سے ہی جتنے دن وہ ادھر ہے نا میں چاہتی ہوں دسترخوان پر کوئی ایک ڈش ایسی ہو وہ اس کی پسند کی ہو اور میرے ہاتھ سے بنی ہو۔" وہ خواب ناک لہجے میں بول رہی تھی جب صوفی نے ایک دھپ اسے رسید کی۔ مہر نے پٹ سے آنکھیں کھول کے اسے گھورا کہ ملازمہ چاچی کا پیغام لے کر آگئی کہ وہ دونوں کو بلا رہی ہیں۔

☼ ☼ ☼

صوفی سے مل کر اپنا بیگ اٹھا کر جس پل وہ باہر نکلنے

کو تھا وہ ایک دم ہی کہیں سے نکل کر سامنے آئی تھی۔

"اس بار بھی مجھ سے ملے بغیر جارہے تھے۔" وہ روٹھے روٹھے لہجے میں بولی۔ "یہ اہمیت ہے آپ کی نظر میں میری' یعنی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔" اس کی بات پر وہ ہنس پڑا۔

"تمہاری اہمیت میری زندگی میں کیا ہے' اس کا اندازہ اس بات سے کرلو کہ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرچکا ہوں۔ باقی رہا ملنے کا سوال تو تم چاچی کے ساتھ ہی تھیں' جب میں ان سے رخصت لینے آیا تھا اور کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں' جن کا اظہار وقت پر ہی اچھا لگتا ہے کہ وقت سے پہلے وقوع پذیر ہونے پر وہ اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ صوفی کا بہت خیال رکھنا اور اپنا بھی۔" اس کے اس طرح کہنے پر مہر کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اگلی بار چاچا سے رخصتی کی بات کروں گا' پھر شادی کے بعد نہ مل کر جانے والے تمہارے سارے شکوے دم توڑ جائیں گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ شرارت سے بولا اور اس کی بات کی گہرائی جان کر مہر سرخ پڑگئی۔

"اللہ حافظ۔" حیدر نے اس کا ہاتھ ہلکے سے دبا کر چھوڑا' پھر گیٹ سے نکلتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"اس کل کے چھوکرے کی اتنی ہمت کہ میری مرضی کے بغیر اتنے بڑے بڑے فیصلے کرتا پھرے۔ ہم تو زمین کا ٹکڑا بھی کسی کو دان کرتا ہو تو نسل اور خاندان دیکھ کر دیتے ہیں۔ یہاں تو پھر معاملہ ہماری بچی کا ہے۔ رشتے ناتے کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے' نہ ہی بچوں کو کوئی حق حاصل ہوتا ہے ایسے بڑے فیصلے لینے کا۔ میں کل پنچائیت میں تھا جب نواب صاحب کی کال آئی ہے کہ میں نے اپنی بہن کا رشتہ طے کردیا ہے۔ ارے تم بھائی ہو تو میں باپ ہوں۔ میں کیسے کوئی غلط فیصلہ اپنی اولاد کے بارے میں برداشت کرسکتا ہوں۔ میرے گھر میں ہی میری بچی کے لیے ایک بہترین رشتہ موجود ہے' پہلے میں ایک دو سال انتظار کرنا چاہتا تھا' مگر اب اس کام میں دیر مناسب نہیں ہے۔ میں شاہو کے ساتھ صوفی کے رشتے کا نہ صرف اعلان کرتا ہوں بلکہ اس جمعہ کی مبارک شب دونوں کا نکاح بھی ہوگا۔"

حاکم علی کسی کا بھی ردعمل دیکھے بغیر سب کے حواسوں پر بم گرا کر جاچکے تھے۔ بی بی کا چہرہ زرد پڑچکا تھا' وہ جانتی تھیں کہ اس گھر کے مرد ایک دفعہ جو فیصلہ کرلیں اس سے انہیں دنیا کی کوئی طاقت بھی نہیں ہٹا سکتی۔ چاچی دم بخود تھیں' جبکہ اندر کمرے میں دروازے سے لگ کر تھر تھر کانپتی صوفی مہر سے جاکر لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

"میرا دل ایسے ہی وسوسوں کا شکار نہیں تھا مہو۔ مجھے لگتا تھا کہ بھائی جس بات کو بے حد آسان سمجھ رہے ہیں وہ اتنی آسان نہیں ہے۔" وہ سسک سسک کر بول رہی تھی۔ "شاہو تو ہمارا بھائی ہے نا مہو۔ مجھ سے تیرہ برس چھوٹا۔ ابھی تک میرا پلو پکڑے پکڑے کئی فرمائشیں منواتا ہے۔ آپا صوفی پکوڑے بنادو۔ آپا صوفی میرے دوستوں کی دعوت ہے۔ اچھے اچھے کھانے بنانا۔ چاچا جی نے ایک لمحے میں کتنی بڑی بات کہہ دی۔ میرا نہ سہی اس بچے کے احساسات کا ہی خیال کرلیتے۔" وہ روتے روتے نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر اچانک جھٹکے سے مہر سے الگ ہوئی۔

"مہو۔ جمعہ کب ہے؟" اس نے متوحش انداز میں پوچھا۔

"کل۔ نہیں کل نہیں پرسوں ہے۔" مہر کا انداز بھی عجیب افسردگی لیے تھا۔ جیسے سمجھ نہ آرہی ہو کہ کیا کرے اس صورت حال میں۔

"مجھے حیدر لالا کو بتانا ہوگا مہو۔ وہی مجھے بچا سکتے ہیں۔ ورنہ۔ ورنہ چاچا نے وہ سب ضرور کرنا ہوتا ہے جو انہوں نے سوچ رکھا ہوتا ہے۔ ان کی بلا سے کوئی جیے یا مرجائے۔" وہ اب تیز تیز ٹہلتی کچھ سوچ رہی تھی۔

"مہو۔ گھر والے نمبر سے لالا کو فون کرکے بتانا پڑے گا۔ یا شاہو سے کہتے ہیں باہر کہیں سے فون

کر کے لالا کو ساری صورت حال بتا کر جلدی آنے کا کہے۔ چلو مہر جلدی چلتے ہیں لالا کو بتانے... تم بس چاچی کو کسی طریقے سے وہاں سے ہٹاؤ، تھوڑی دیر کو میں لالا کو بتاتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ ایسا نقصان ہو جائے جس کی تلافی ممکن نہ ہو۔" تیز تیز بولتی صوفی گم صم کھڑی مہر کے قریب آئی اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

ہال میں ہی لینڈ لائن فون تھا اور وہیں پر بی بی اور چاچی سارا دن موجود رہتیں اور روزمرہ کے زیادہ تر کام وہیں نپٹائے جاتے۔ گاؤں کی عورتیں بھی وہیں پر آ کر براجمان رہتیں وہ تو صوفی کی قسمت اچھی تھی کہ چاچا حاکم علی کے اس اچانک اور سنگین حکم کے بعد سب اتنے پریشان تھے کہ بی بی تو اپنے کمرے میں تھیں چاچی بھی فی الحال وہاں موجود نہ تھیں، ایک ملازمہ صفائی کرتی نظر آئی تھی وہاں۔ مہر نے کھوے کر اسے اپنے کمرے سے کوئی چیز لے کر آنے کو کہا اور اس کے باہر جاتے ہی وہ دونوں تیزی سے فون کے قریب آئیں۔

صوفی نے جلدی جلدی حیدر کا نمبر ڈائل کیا اور وہ غالباً "کلاس میں تھا" اس لیے خاصی تاخیر سے کال اٹینڈ کی، وہ بھی جب صوفی مایوس ہونے لگی، ایک دم دوسری طرف سے بھائی کی آواز نے اس کے مردہ تن میں نئی روح پھونک دی تھی۔ ہال کے دروازے کو دیکھتے ہوئے اس نے تیزی سے حیدر کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا۔ دوسری طرف حیدر کا خون کھول اٹھا تھا یہ ساری بات سن کر۔

"تمہارا بھائی ابھی زندہ ہے صوفی اور اس کے ہوتے ہوئے تمہارے ساتھ کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ وہی ہوگا جو تم چاہوگی۔ تسلی رکھو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ میں نے چاچا جی کو بڑے ہونے کی بہت گنجائش دے دی۔ اب اور نہیں۔ یہ میری زمین یا جائیداد کا استحصال نہیں جو میں چپ کر جاؤں گا۔ یہ میری بہن کی زندگی کی خوشیوں کا سوال ہے۔ تم نے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔ میں خود آ رہا ہوں۔" اپنے مخصوص سنجیدہ لہجے میں کہہ کر صوفی کو خاطر خواہ تسلی دی تھی۔ جسے سن کر صوفی کے کانپتے دل کو قرار میسر آیا تھا۔ رات گہری ہونے سے قبل حیدر ایک بار پھر گھر پر تھا اور اس دفعہ چاچا بھتیجا کھل کر سامنے آئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"صوفی کا رشتہ میں طے کر چکا ہوں چاچا اور اس کی شادی بھی وہیں ہوگی۔ میں آپ کی فضول ضد اور غلط رسم و رواج پر اپنی بہن کی زندگی برباد نہیں کر سکتا اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ میں اب واپس جانے سے پہلے اپنی بہن کو یہاں سے رخصت کر کے جاؤں گا۔" وہ تن کر حاکم علی کے سامنے آ کھڑا ہوا اور قطعی انداز میں بولا تھا۔

حاکم علی چند لمحے اس کی جوانی کی منہ زوری اور دبنگ قوت فیصلہ کو جانچتے رہے اور کچھ دیر بعد بے حد ٹھہرے ہوئے انداز میں گویا ہوئے۔

"ٹھیک ہے، لیکن یہ مت بھولنا کہ ہماری جائیداد میں سے تمہاری بہن کو میں پھوٹی کوڑی بھی نہ دوں گا۔ نہ صرف یہ بلکہ مجھے اپنی بیٹی کے مستقبل کے فیصلہ پر بھی پھر غور کرنا ہوگا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو میں اسے کبھی بھی تمہارے ساتھ رخصت نہیں کروں گا۔ بھلے وہ ساری عمر میری دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے۔" وہ بھی اسی کے انداز میں ہر لفظ کو چبا چبا کر بولے تھے۔ آخر کو حاکم علی کیسے اپنی جھوٹی شان و شوکت اور جاہ و جلال کو کل کے لڑکے کے سامنے سرنگوں ہوتا دیکھتے سو انہوں نے اپنا داؤ کھیل دیا تھا اور حیدر علی کا پارہ لمحوں میں ہی آسمان پر جا پہنچا۔

"اپنے باپ، دادا کی جائیداد کے ہم قانونی وارث ہیں، چاچا اور یہ حق ہمیں ہمارا مذہب دیتا ہے اور رہی بات میری بیوی کی رخصتی نہ کرانے کی تو نکاح کے بعد اس کا ہر حق میرے ذمہ ہے۔ میں اسے جس وقت چاہوں یہاں سے لے کر جا سکتا ہوں۔ دنیا کا کوئی قانون مجھے اس سے روک نہیں سکتا نہ ہی مجھے اس کے لیے آپ کی یا کسی کی اجازت درکار ہے۔" ان کی آنکھوں

میں دیکھ کر کہتا وہ رکا نہیں تھا۔ چلا گیا تھا۔

حاکم علی تلملا کر رہ گئے تھے۔ باپ دادا کی وہ جائیداد جس پر وہ سانپ بن کر بیٹھے تھے جس کے لیے انہوں نے اپنی اکلوتی بہن کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ جس کے لیے وہ اپنے کم سن بیٹے کی شادی اس سے تیرہ سال بڑی لڑکی سے کرنے پر مجبور تھے، وہ ہاتھوں سے نہ نکلے اس کے لیے انہیں کوئی اور لائحہ عمل سوچنا تھا۔ رات جب چاچی نے شاہو کی شادی صوفی سے کرنے پر واویلا کیا تھا تو انہوں نے بیٹھ کر انہیں سمجھایا تھا۔

"او جاہل عورت۔ کوئی مر نہیں گیا ادھر جس کے تو بین ڈال رہی ہے، مجھے بھی اپنی اولاد عزیز ہے اور کچھ سوچ سمجھ کر ہی میں نے فیصلہ کیا ہے۔ صوفی کی شادی غیروں میں کر کے میں اپنی آدھی جائیداد سے ہاتھ نہیں دھو سکتا۔ کل ہمارے جوتے سیدھے کرنے والے آج کیسے ہمارے برابر آ سکتے ہیں بھلا؟ شاہو سے صوفی کی شادی ہو جائے تو گھر کی جائیداد گھر میں رہے گی۔ صوفی اچھی اور شریف بچی ہے۔ ساری زندگی تمہاری خدمت کرے گی اور رہا شاہو تو جوان ہونے پر اس کی دوسری بیوی بیاہ لائیں گے۔ مرد کی تو شان ہے دو، دو تین، تین بیویاں رکھنا۔" انہوں نے بیٹھ کر سمجھایا تو چاچی بھی حاکم علی کے زرخیز دماغ کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ یہاں تک تو سب ٹھیک تھا مگر اب حیدر علی، حاکم علی کے منصوبوں سے ٹکرانے آن پہنچا تھا۔

حیدر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے والا نوجوان تھا۔ اس نے فوری طور پر اپنے ماموں سے رابطہ کر کے انہیں مختصر سی روداد بتاتے ہوئے دو دن کے اندر اندر مختصر بندوں کے ساتھ برات لانے کی درخواست کی تھی۔ ماموں نے بلا حیل و حجت اس کی درخواست مان لی تھی۔ صوفی کو رخصت کرنا اس کی فوری ترجیح تھی۔ باقی رہا جائیداد اور اس کی اپنی زندگی کا معاملہ تو اسے وہ صوفی کو رخصت کرنے کے بعد بھی دیکھ سکتا تھا۔

مگر مہر کو کسی طور قرار نصیب نہیں تھی، جب سے ابا اور حیدر علی کے درمیان ہونے والی زبانی چپقلش کا پتا چلا تھا ساتھ ہی ابا کے رخصتی نہ کرنے والی بات بھی۔ تب سے وہ جلے پیر کی بلی کی مانند یہاں سے وہاں چکرا رہی تھی۔ اپنے ابا کی فطرت کو بہت اچھی طرح جانتی تھی وہ۔ اپنے اصولوں سے ٹکرانے والے لوگ ابا کو سخت ناپسند تھے اور اپنی بات کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک چلے جایا کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

رات آنکھوں میں کاٹنے کے بعد وہ پو پھٹتے ہی باہر آ گئی تھی۔ ابا کے گھر سے باہر ہونے کا یقین کر لینے کے بعد ایک نظر بی بی پر ڈالی، وہ نماز کے بعد کے ذکر و اذکار میں مصروف تھیں۔ جبکہ اس کی امی اس ٹائم کچن میں تازہ آنے والا دودھ ملازماؤں سے گرم کروانے میں لسی اور تازہ مکھن نکلوانے میں مصروف تھیں۔ صوفی بھی عموماً ان کے ساتھ ہی ہوتی تھی مگر اس وقت وہ اسے کہیں نظر نہ آئی تھی۔ تسلی کر کے وہ حیدر علی کے کمرے کی جانب آ گئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد صبح کی سیر کا عادی تھا۔ پچھلی طرف والے درختوں کے جھنڈ کے پاس آ کر وہ بے قراری سے اس کا انتظار کرنے لگی، جہاں سے حویلی کا بڑا پھاٹک صاف نظر آ رہا تھا، جو کہ بیرونی آمد و رفت کا واحد ذریعہ تھا۔ نماز کے لیے باندھا گیا دوپٹا ویسے ہی لپٹا تھا، درود پاک پڑھتے ہوئے وہ ٹہلنے لگی۔ پھر اس نے اسے گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ ابا کے آنے سے پہلے وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔ سو بے قراری سے اسے آواز دی۔ حیدر نے چونک کر اس سمت دیکھا اور باڑھ پھلانگ کر اسی جانب چلا آیا۔ اسے دیکھ کر مہر کے آنسو پلکوں کی باڑھ توڑ کر نکل آئے۔

"کیا ہوا؟ خیریت ہے۔" اتنی صبح اسے روتا دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔

"ابا کی بات سنی آپ نے۔ انہوں نے کہا اگر حیدر اپنی مرضی کرے گا تو وہ بھی مجھے تمام عمر اپنی دہلیز پر بٹھائے رکھیں گے۔ ابا اپنی ضد کے پکے ہیں حیدر۔

وہ وہی کریں گے جو انہوں نے کہہ دیا ہے۔ خدا کے لیے آپ اپنی ضد چھوڑ دیں۔ وہ روتے ہوئے بولی، جبکہ حیدر اس کی بات سن کر کچھ لمحے کو گنگ رہ گیا۔

"ضد چھوڑ دوں اور صوفی کو شاہو سے بیاہ دوں؟" اس کے لہجے کی ٹھنڈک سے مہر سٹپٹا گئی۔

"نہیں، نہیں بخدا... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ لیکن ایک بار..." وہ جھجک سی گئی اور قدرے رخ موڑ لیا۔

"ایک بار ہماری شادی مطلب... رخصتی ہو جاتی تو آپ کو پھر ہی صوفی کا معاملہ اٹھانا چاہیے تھا۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اتنی دیر میں تمہارے ابا صوفی کا کام کر چکے ہوتے، کیونکہ مسئلہ میں نے نہیں تمہارے ابا نے اٹھایا ہے محترمہ۔ میں صرف اسے صحیح انجام تک پہنچا رہا ہوں اور تم فکر نہ کرو۔ صوفی کی شادی کے بعد میں رخصتی بھی کرواؤں گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تم فکر مت کرو۔ تمہیں ساری زندگی بٹھائے رکھنے کی صرف ایک گیدڑ بھبکی ہے چاچا کی، ورنہ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسا ناممکن ہے۔" وہ جو پہلے ذرا تیز ہوا تھا اب مہر کو اس قدر پریشان دیکھ کر اس کا لہجہ خود بخود نرم پڑ گیا تھا۔

"وہ اپنی انا کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں حیدر اور... اور میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔" رونا ایک بار پھر شروع ہو گیا تھا۔ حیدر طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے اس کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے نرمی سے آنسو پونچھے اور گویا ہوا۔

"دیکھو مہر! رونا کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہر مسئلے کا مقابلہ جواں مردی سے کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" یہ میرا قول ہے اور اگر پھر بھی حل نہ ہو تو پھر تدبیر لڑانی چاہیے اور پھر بھی مسئلہ جوں کا توں رہے تو اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔ ابھی تو ہمارا پہلا مرحلہ بھی شروع نہیں ہوا۔ بس تم نے اپنے اعصاب قابو میں رکھتے ہوئے حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔

تم جاؤ میں سب سنبھال لوں گا اور تم اب میری اور میں تمہارا ہوں۔ اس بات کا یقین کر لو اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتی۔" اس کے تسلی دلانے پر اس کی پریشانی تو کم نہیں ہوئی تھی، لیکن جو رات سے گھٹن محسوس کر رہی تھی اس کا خاتمہ ضرور ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صوفی ناشتا لے کر آئی تھی حیدر کے لیے اور ابھی کسی کام سے باہر گئی تھی جب اس نے بی بی کو قدرے محتاط انداز میں کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔

"ارے بی بی! آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے بلا لیا ہوتا۔" ناشتے کی ٹرے دور کھسکاتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بی بی اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں اور حیدر کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے تم پر فخر ہے حیدر۔ اپنی بہن کی خوشیوں کے لیے جس طرح تم ڈٹ کر کھڑے ہو۔ بیس سال پہلے میرا کوئی بھائی بھی ایسا ہی قدم اٹھاتا تو میری تمام زندگی ایسی ویران نہ گزرتی، مگر مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ جس دولت جائیداد اور فرسودہ روایات کے لیے میرے باپ، بھائیوں نے میری زندگی رول دی، اس کی تمہارے نزدیک چنداں اہمیت نہیں ہے۔ تمہارے لیے انسان اور انسانی احساسات کی زیادہ قدر ہے بہ نسبت مادی اشیائ کے... خوش رہو میرے بچے۔ اللہ تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔" انہوں نے پرجوش انداز میں کہہ کر اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

"میں اپنی زندگی گزار چکی ہوں۔ بچے اس لیے شاید کھلم کھلا تمہاری اس جدوجہد میں تمہارا ساتھ نہ دے پاؤں کہ عمر کے آخری دنوں میں، میں اپنے بھائی سے کسی قسم کی کوئی چپقلش نہیں چاہتی، مگر میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور یہ..." انہوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک پوٹلی حیدر کے ہاتھ میں پکڑائی۔ اس نے ناسمجھی سے بی بی کو دیکھا تو وہ مسکرا دیں۔

"صوفی کے لیے ہیں۔ وہ تمام زیورات جو میری ماں

نے مجھے دیے تھے۔ میری طرف سے تحفہ ہے ایک معمولی سا۔ اور دعاؤں کا انمول خزانہ بھی کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو دونوں جہانوں کی تمام خوشیوں سے سرفراز فرمائے اور تمہارے وہ تمام ارادے کامیاب کرے جو تم نے اس علاقے کے لوگوں کی زندگیوں سے تاریکی دور کرکے اجالا لانے کے لیے کر رکھے ہیں۔ چلتی ہوں۔ بھائی زمینوں سے آتے ہی ہوں گے۔" کہہ کر وہ رکی نہیں تھیں' تیزی سے اس کے کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔ صوفی جس وقت کمرے میں واپس آئی تھی بھائی کو کسی گہری سوچ میں دیکھا تھا۔ اس نے مختصر سا بہن کو بی بی کے بارے میں بتا کر وہ زیورات سنبھالنے کو کہا تھا اور خود چاچا سے ملنے چل دیا تھا' جو کچھ دیر قبل ہی اوطاق سے آئے تھے اور اب اپنے کمرہ خاص میں بیٹھے ناشتا تناول کرنے میں مصروف تھے۔ حیدر کو دیکھتے ہی چونکے تو تھے مگر کچھ ظاہر کیے بنا اسے اپنے ساتھ ناشتا کرنے کی پیش کش کی تھی۔ جسے اس نے نرمی سے منع کردیا تھا اور خود ان کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

"آپ ہمارے بزرگ اور سرپرست ہیں چاچا جی اور آپ کو ہم نے ہمیشہ اپنے والد کی جگہ پر سمجھا ہے' کیونکہ اپنے والد کی تو دھندلی سی شبیہ ہے ذہن میں بس۔ آپ نے بھی ہمیں اپنی اولاد کی طرح چاہا' پالا' پوسا اور آج اس مقام تک لائے ہیں۔ ہمارے دل میں آپ کے لیے ویسی ہی عزت اور احترام ہے۔ جیسے ایک والد کی ہونی چاہیے۔" وہ سر جھکائے بہت سنجیدگی سے بول رہا تھا' جبکہ چاچا حاکم علی یہ سوچ کر مسکرا دیے تھے کہ شاید وہ اپنے ارادے سے باز آچکا ہے' جب ہی ایسے انداز میں ان سے محبت اور ان کے احسانات کا اظہار کررہا ہے۔ مگر اس کی اگلی بات نے ان کے تیور خراب کرنے شروع کردیے تھے۔

"آپ سے یہی درخواست ہے کہ میرے فیصلے پر غور کرتے ہوئے میری بہن کی شادی وہیں کردیں' جہاں میں نے طے کی ہے۔ بخدا شاہو میرا بھائی ہے۔ میرا ہی خون ہے' اگر وہ آج صوفی سے بڑا نہ سہی اس کا ہم عمر ہی ہوتا تو مجھے اپنی بہن کو اس سے بیاہنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔ مگر اتنا بڑا ظلم میں برداشت نہیں کرسکتا۔" حیدر کے لہجے میں آج غصے کی بجائے لجاجت تھی۔

"میں نے ماموں کو کل بارات لانے کو کہا ہے۔ آپ اگر سرپرست بن کر صوفی کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کریں گے تو آپ کا یہ احسان شاید میں عمر بھر نہ اتار پاؤں۔" اس کی اس بات نے حاکم علی کو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کردیا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا حیدر علی! غیر برادری سے کوئی بارات آج تک نہ ہمارے خاندان میں آئی ہے نہ ہی غیر برادری کو بیٹی دے کر ہم اپنا شملہ جھکا سکتے ہیں۔ ہاں تم ایسے کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو تو بے شک اپنی بہن کو جہاں چاہتے ہو رخصت کردو' مگر اس کے بعد تمہارا اور تمہاری بہن کا ہم سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں ہوگا۔ بھول جانا کہ میں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ کبھی تمہیں تھمایا تھا اور اس بھول میں بھی مت رہنا کہ میں اسے ایسے ہی بٹھائے رکھوں گا۔ اگر میں اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے سکتا ہوں تو یہ رشتہ توڑ بھی سکتا ہوں۔ میں اسے تم سے خلع دلوا کر اس کی شادی خاندان میں ہی کسی اور سے کردوں گا۔" اپنی انا اور جھوٹے جاہ و جلال کے زعم میں چاچا جی جی بہت غلط بول رہے تھے۔ حیدر نے اپنے ضبط کو رخصت ہوتا محسوس کیا۔

"اور اس وقت آپ کا اونچا شملہ کہاں ہوگا چاچا جی۔ جب آپ اپنی عزت اپنی بیٹی کو لے کر عدالتوں کے دھکے کھائیں گے' اسے خلع دلوانے کے لیے کیونکہ میں اپنی بیوی کو کبھی بھی نہیں چھوڑوں گا اور جہاں بات عزت اور غیرت کی آتی ہے تو جہاں سات پشتوں میں آپ کی دہلیز پر غیر برادری سے بارات نہیں اتری۔ کئی بے جوڑ رشتے کرکے کئی زندگیاں برباد کردی گئیں۔ کئی لڑکیوں کو عمر بھر کنوارہ بٹھا کر قبر میں اترنے پر مجبور کردیا گیا کہ ان کے جوڑ کا خاندان برادری میں رشتہ نہیں تھا اور غیر خاندان میں شادی پر جائیداد بھی غیروں کو دینی پڑے گی اور رسم و رواج پر بھی

حرف آئے گا وہاں آپ شاید یہ بھول گئے کہ آپ کی سات پشتوں میں کسی عورت نے خلع بھی نہیں لی۔ آپ کے خاندان کی عورتوں نے بھی پورا گاؤں نہیں دیکھا اور آپ اپنی بیٹی کو عدالت میں ہزاروں مردوں کے درمیان گھٹیا سوالات اور رکیک الزامات کی بوچھاڑ میں جا کھڑا کریں گے۔ کیونکہ خلع لینے کے لیے بھی بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مقصد میں کامیابی ہو یا نہ ہو' اس وقت آپ کی عزت' آپ کے شملے اور خاندانی رسم و رواج پر حرف نہیں آئے گا کیا؟" وہ غصے میں ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا تھا۔ چاچا حاکم علی تلملا گئے تھے۔

"کل صوفی کا نکاح اور رخصتی ہے چاچا! اگر آپ آکر اسے اپنی دعاؤں کے سائے تلے رخصت کردیں گے تو ہمیں خوشی ہوگی' ورنہ یہ بات تو میں جانتا ہی ہوں کہ ہمارے ماں' باپ اس دنیا سے بہت پہلے رخصت ہو چکے ہیں اور اپنی بہن کے لیے اس کا اچھا برا میں نے ہی سوچنا ہے۔ صوفی کی رخصتی کے بعد میں اپنی بیوی کے بارے میں بات کروں گا آپ سے؟" کہہ کر وہ رکا نہیں تھا' حاکم علی کو غصے میں تلملاتا وہیں چھوڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز حاکم علی نے حیدر علی کو پیغام بھیجا تھا کہ یا تو وہ اپنے ارادے سے باز آجائے یا پھر جب وہ واپس آئیں تو وہ ان کو حویلی میں نہ ملے' کیونکہ اپنے اصولوں سے روگردانی کرنے والے کو وہ کڑی سزا دیتے ہیں' مگر یہاں وہ صرف اس بات کا لحاظ کر رہے ہیں کہ وہ ان کے مرحوم بھائی کی نشانی ہے' ورنہ حاکم علی کے دروازے پر کوئی غیر بازو لینے آئے اس بازو کو وہ کاٹ دیا کرتے ہیں۔

منشی نے ویسے ہی تمام الفاظ حیدر علی کے سامنے آکر دہرا دیے تھے۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر چپ بیٹھا رہا تھا کہ آج کے دن وہ کسی بھی فرد سے زبانی اور عملی مڈبھیڑ نہیں چاہتا تھا۔

حاکم علی کو پتا نہیں واقعی کسی ضروری کام سے نکلنا پڑا تھا یا وہ جان کر منظر سے غائب ہوئے تھے یہ کوئی نہ جان پایا تھا' مگر ان کی گھر سے جانے کے بعد مہر نے اچھا خاصا رونق کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ حویلی کی تمام ملازماؤں اور اپنی قریبی سہیلیوں کو بڑے ہال میں جلد از جلد پہنچنے کا حکم دے کر نہ صرف خود تیار ہوئی تھی بلکہ بی بی کے کہنے پر صوفی کو بھی تیار کروایا تھا۔ پھر محض دو گھنٹے کے اندر اچھا خاصا شادی کے گھر والا ماحول بن گیا تھا بی بی نے جب اسے آج صوفی کی رخصتی کا بتایا تھا وہ اپنے بارے میں پریشان ہونے کے بجائے یہ سوچ کر رہ گئی تھی کہ صوفی کو بھی خوشیاں پانے کا اتنا ہی حق ہے جتنا اسے۔ سوائے ہر قسم کی فکر چھوڑ کر اس کی خوشی میں شریک ہونا چاہیے۔ آخر کو دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ ہم راز' مخلص ساتھی۔ بی بی نے ابھی اسے حاکم علی کی خلع والی دھمکی کی بابت نہیں بتایا تھا' ورنہ وہ یوں بے فکری نہ پھر رہی ہوتی۔ وہ تو آج تک حیدر کی اسی بات کے زیر اثر اپنی تمام پریشانیاں بھول چکی تھی کہ وہ اس کی ذمہ داری اٹھا چکا تھا تو نبھانا بھی جانتا ہے۔ سو چاچی کے گھورنے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے ملازمہ سے ڈھولکی بھی منگوائی تھی۔ اور اب ہال میں سب کو جمع کیے گلا پھاڑ پھاڑ کر گارہی تھی۔

صوفی کچھ افسردہ کچھ خوش' ملی جلی کیفیات میں صوفے پر بی بی کے ساتھ بیٹھی یہ سب ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ دوپہر دو بجے کے قریب ماموں اور جواد دس بارہ بندوں پر مشتمل بارات لائے تھے یہ بھی حیدر علی کی تاکید پر ہوا تھا کہ وہ اپنی تمام خوشیاں اپنے گھر جا کر پوری کرلیں۔ فرنیچر اور باقی کا جہیز کا قیمتی سامان اس نے ماموں کے گھر بھجوا دیا تھا حاکم علی کو کچھ بھی بتائے اور پوچھے بغیر۔

نکاح کسی بھی تلخی کے بغیر ہو گیا تھا کہ حاکم علی موجود نہ تھے۔ کھانا کھا کر رخصتی عمل میں لائی جانے لگی۔ ملتے سے صوفی سے جہاں مہر اور بی بی پھوٹ پھوٹ کر روئیں وہاں چاچی بھی صوفی سے ملیں اور دو سونے کی طلائی چوڑیاں چپکے سے اس کی کلائی کی زینت

بتا دیں کہ کچھ وقت کو وہ بھی چاچا حاکم علی والی سوچ کے زیر اثر بہک گئی تھیں مگر پھر صوفی کی معصوم صورت پر نظر پڑتے ہی انہیں مہر یاد آجاتی تو دل دو مختلف راگ الاپنے لگتا' سو رخصتی کے وقت وہ بھی افسردہ تھیں کہ صوفی نے تو مہر سے بڑھ کر ان کو ایک سال کا مان دیا تھا اور خدمت کی تھی۔

سہ پہر تک یہ سارا ہنگامہ رہا تھا پھر ایک سکون سا چاروں اور چھا گیا تھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا اپنے کمرے میں آیا تھا اس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مہر اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ حیدر نے غور سے اس کے سجے سنورے روپ کو دیکھا پھر شکریہ کہہ کر اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔

"میں نے اپنی ایک ذمہ داری پوری کردی ہے مہر اور مجھے لگتا ہے کہ اب ایک اور اہم فرض کی ادائیگی کا وقت ہے۔" گھونٹ گھونٹ چائے پیتا وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا۔ مہر کیا کہتی۔ نظریں جھکائے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو کھوجتی رہی۔

"چاچا اپنی انا کو بلند رکھنے کے سلسلے میں کوئی ایسا غلط فیصلہ نہ کریں جس سے ناقابل تلافی نقصان ہو' اس سے پہلے ہی مجھے کچھ اہم فیصلے لینے ہوں گے۔ مگر اس بار مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہوگی مہر بلکہ گھر کے ہر فرد کی وہ اس وقت غصے میں ہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ جب جب کسی پر بھی برا وقت آیا تو اسی غصہ نے شیطان بن کر انسان پر ایسا وار کر کیا کہ وہ سدھ بدھ کھو کر ہمیشہ انسان کو تباہی کی طرف لے گیا۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوں حیدر۔۔۔ مگر میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" اس کی ذومعنی باتوں کے جواب میں اس نے الجھ کر کہا۔

"چاچا نے کہا تھا کہ اگر میں نے صوفی کو ماموں کے ہاں بیاہا تو وہ کبھی تمہیں میرے سنگ رخصت نہیں کریں گے اور جب میں نے ان سے کہا کہ مجھے ان کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے تمہیں رخصت کرانے کے لیے۔ انہوں نے کہا وہ زبردستی تمہیں مجھ سے خلع دلوائیں گے۔" مہر نے حیدر کو سنجیدگی سے بولتے سنا اور بے اختیار اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا حیدر۔ میں ایسے نہیں ڈر رہی تھی۔ ایسے ہی نہیں خدشات نے دن رات میری نیند اڑائی ہوئی تھی۔ وہ ضد پر اڑ گئے ہیں اور غصے میں ہیں تو پھر کسی نقصان کی نہیں سوچیں گے بھلے ان کی بیٹی کا گھر اجڑے یا دل انہیں کسی بھی بات کی پروا نہیں ہوگی۔ میں کہتی تھی کہ یہ وقت ان سے ڈبھیڑ کا نہیں ہے۔۔۔ اب۔۔۔ اب کیا ہوگا؟" بے حد پریشانی سے اس نے حیدر سے پوچھا۔

"کچھ نہیں ہوگا اگر تم ثابت قدم رہو گی اور میرا ساتھ دو گی تو اور اسی کے لیے تمہیں قبل از وقت تیار کر رہا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں تو مرتے دم تک آپ کے ساتھ ہوں حیدر۔ آپ مجھے نہ کہتے تب بھی۔ میں مر جاؤں تب بھی ابا مجھ سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں منوا سکتے حیدر! جس میں آپ کے چھوڑنے کی بات آئی ہو۔" اس کے الفاظ ہی نہیں لہجہ بھی اس کی سچائی کی گواہی دے رہے تھے کہ حیدر کو اس نے اپنی دعاؤں سے پایا تھا کوئی کیسے بھلا ان کو الگ کرسکتا تھا۔ پھر مہر کی یقین دہانی کے بعد اس کی پریشانی کچھ کم ہوئی تھی۔ چاچا حاکم علی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ جذباتی داؤ پیچ آزما کر کسی الٹے سیدھے کاغذ پر مہر سے سائن کروالیتے جس سے واقعی ان دونوں کی زندگی داؤ پر لگ جاتی۔ مہر کے جانے کے بعد وہ آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگا کہ چاچا حاکم علی کا رد عمل اب کیا ہوگا۔ کیا اسے مہر کو رخصت کرانے کی بات ابھی چھیڑنی چاہیے یا ڈیڑھ ماہ بعد ہونے والے اپنے امتحانات کے بعد۔ سوچوں کے اس گورکھ دھندے کو سلجھاتے وہ نیند کی گہری وادی میں اتر گیا۔

☼ ☼ ☼

انسان اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے لیتا ہے مگر کاتب تقدیر کو انسان کی مرضی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ انسان کی لاکھ تدبیروں کے باوجود بھی زندگی اسی

نیچ سے ہی گزرتی ہے جیسے کاتب تقدیر نے لکھا ہوتا ہے۔ حاکم علی کے زور زور سے بولنے کی آواز پر حیدر کی آنکھ کھلی تھی۔ شام رات میں بدلنے کو تیار تھی۔ ملگجا سا اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا۔ کچھ دیر وہ یوں ہی کسلمندی سے لیٹا رہا۔ پہلا خیال صوفی کا آیا' وہ ہمیشہ اس ٹائم اس کے لیے چائے لے کر حاضر ہو جایا کرتی تھی۔ اس کے اچھے نصیب کی دعا کرتا وہ باہر آگیا۔ چاچا حاکم علی کو اپنے مزاج کے خلاف ہر بات پر ہی غصے سے چلانے کی عادت تھی مگر آج حیدر غصے کا ماخذ جانتا تھا۔ سو خود کو ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتا وہ آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ حاکم علی اس کی توقع سے بھی بڑھ کر غصے میں تھے۔

"میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنی من مانی کرنے کے بعد ہمیں تم بھائی بہن کو خود کے لیے اور اس گھر کے لیے مرا ہوا تصور کروں گا۔ تم مجھے یہاں اپنی شکل مت دکھانا مگر تم میری بات کو دیوانے کی بڑ سمجھے تھے شاید۔" اس پر نظر پڑتے ہوئے حاکم علی نے دھاڑ کر کہا۔ بی بی نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ چاچی بھی دوڑی چلی آئیں۔ اس سے پہلے ان دونوں کا ہر مباحثہ اکیلے ہی ہوا تھا۔ مہر الگ دروازے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بی بی اور اپنی ماں کے سامنے وہ ہر بات بول جایا کرتی تھی مگر ابا کے سامنے منہ سے ایک لفظ نکالنے کی جرات نہیں تھی اس کی۔

"ٹھیک ہے چلا جاتا ہوں یہاں سے مگر میری ایک امانت ہے آپ کے پاس۔ وہ میرے حوالے کر دیں۔ پھر اس کے بعد میں نظر بھی آجاؤں آپ کو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔" حیدر خاصا پرسکون تھا حاکم علی کے مقابلے میں اس کا یہ انداز حاکم علی کو آگ لگا گیا۔

"کون سی امانت۔۔۔ کیسی امانت۔۔۔ جاؤ یہاں سے ہمارا اب تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اپنی فطرت کے خلاف بہت نرمی برت چکا ہوں تم سے۔ جاؤ چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے بندوں کے ذریعے تمہیں اٹھا کر باہر پھنکوانا پڑے۔"

"میری بیوی کو میرے ساتھ بھیج دیں چاچا! میں ابھی چلا جاؤں گا۔" اندر کھڑی مہر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ چاچا بھتیجے کی جنگ میں وہ کس کو جیتتے گی' کس کو ہارے گی' یہ خیال اس کو دہلائے جا رہا تھا۔

"خبردار جو میری بیٹی کا نام بار بار اپنی زبان پر لائے تو۔ حاکم علی کی بیٹی ہے وہ اپنے باپ کا مان رکھے گی جیسے میں کہوں گا ویسے کرے گی۔ مہر۔۔۔ مہر۔۔۔ باہر آؤ اور آکر اس کو اس کی اوقات بتا دو۔ جس شخص نے باپ کی بات کی عزت نہیں رکھی وہ اس کی بیٹی کو خاک تحفظ دے گا۔" غصے نے حاکم علی کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے زور زور سے مہر کو آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ چند ہی لمحوں میں سمٹی سمٹائی مہر سب کے سامنے تھی۔ کسی کے بولنے سے پہلے حیدر سب سے آگے آیا۔

"چاچا نے تمہاری رخصتی میرے ساتھ کرنے کو انکار کر دیا ہے مہر۔ وہ ہمارا رشتہ توڑنا چاہتے ہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے یہاں سے ساری زندگی کے لیے نکل جانے کو کہا ہے مگر میں تمہیں لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ تم اپنا سامان پیک کرو ہمیں ابھی جانا ہے۔" وہ تیز تیز بول کر اس کو حالات کی سنگینی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مہر نے بے یقینی سے اپنے ابا کی سمت نظر کی۔

"تم اس کو اس کے سامنے اپنی زبان سے ہی بتا دو مہر پتر کہ تم اس نافرمان کے لیے اپنے باپ کا سر نہیں جھکا سکتیں۔ نہ ہی ہمارے ہاں کی بیٹیاں ایسے شتر بے مہار ہو کر ماں باپ کی اجازت اور مرضی کے بغیر منہ اٹھا کر کہیں بھی چل پڑتی ہیں۔" حاکم علی نے گونج دار آواز میں کہہ کر مہر کو مشکل میں ڈال دیا۔

"یہ تمہیں جذباتی طور پر بلیک میل کر رہے ہیں مہر۔ میں کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ چلو تو تمہیں چلنا ہوگا۔ آج یہ جذباتی داؤ پیچ لڑا کر اور کل کو اور کوئی چال چل کر ہمیں الگ کر دیں گے۔" مہر کے چہرے پر بے بسی دیکھ کر حیدر چلایا۔

وہ بے بسی سے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔ گویا دل و جان سے حیدر کے ساتھ جانے پر آمادہ بھی ہو مگر ایسے کہ ابا کا سر بھی نہ جھکے وہ مان جو انہیں

اپنی بیٹی پر تھا۔ وہ نہ ٹوٹے۔

"دیکھ لیا میاں اس کا ردعمل اور جان لی اس کی نظروں میں اپنی اوقات!" حاکم علی مہر کے رونے کو اپنی جیت سمجھے تھے اور طنزیہ انداز میں بولے تھے۔ "ہمارے ہاں کی شریف بیٹیاں اپنی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنے ماں باپ کو دے کر ان کا مان رکھتی ہیں۔ تمہاری طرح خودسری نہیں دکھاتیں۔ اب تم جاسکتے ہو..... کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔" ان کا لہجہ اور الفاظ نخوت سے بھرپور تھے۔ مہر نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"ابا! ایسے مت کریں حیدر کے ساتھ۔ میں نہیں جاؤں گی اس کے کہنے پر کہیں بھی۔ مگر آپ اسے گھر سے مت نکالیں۔ یہ گھر اس کا بھی تو ہے۔" اب کے وہ رونہ سکی اور روتے ہوئے حاکم علی سے کہا۔

"ہاں حاکم بھائی! مہر ٹھیک کہہ رہی ہے۔ حیدر آپ کا اپنا خون ہے اور پھر داماد بھی۔ آپ کیسے نکاح کرنے کے بعد اپنی بیٹی کا ہاتھ اسے دینے سے مکر سکتے ہیں۔ اس نے غلطی کی ہے تو اسے سزا دیجیے مگر اس طرح کرکے ظلم مت کریں۔" بی بی بھی تخت سے اٹھ کر بھائی کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

"اس کے کیے کی میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ آپ بھی اپنا بچہ سمجھ کر درگزر کریں اور کوئی مبارک دن دیکھ کر مہر کو اس کے ساتھ رخصت کردیجیے خدارا ایک ضد کی خاطر ان دونوں کی زندگیوں سے مت کھیلیں۔" اس گھر کی عورتوں کو کبھی اپنے حق کے لیے بولنے نہیں دیا گیا تھا۔ مگر آج بی بی میدان میں اتر آئی تھیں جبکہ چاچی ہنوز خاموش تھیں۔ کبھی غصے سے گرجتے برستے اپنے شوہر کو دیکھتیں 'تو کبھی زاروقطار روتی بیٹی کو۔

"تم چپ کرو خالدہ! اس نے غلطی نہیں گناہ کرکے اپنی آنے والی نسلوں کو ایک غلط اور عجیب ترغیب دی ہے۔ آج اس کو سزا نہ ملی تو ہر دوسرا بندہ اٹھ کر الٹے سیدھے قدم اٹھانے لگے گا۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ اس جیسے شخص کے ہاتھ میں دینا میری بہت بڑی بھول تھی اور حاکم علی اپنی بھول سدھارنا جانتا ہے۔ جہاں تک میری بیٹی کی بات ہے۔ یہ ابھی ناسمجھ ہے۔ اسے صحیح غلط کا نہیں پتا۔ وقت گزرنے پر یہ بھی کھرے کھوٹے پہچان لے گی اور پتا چل جائے گا اسے کہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کے لیے غلط فیصلہ نہیں کرتے۔ مجھے خوشی ہے کہ میری بیٹی نے میرا مان رکھ لیا اور اس کے فخر کو اس کے منہ پر دھتکار دیا۔ ہونہہ۔ اپنی بیوی کو لے کر جاؤں گا۔" وہ تحقیرانہ انداز میں بولے۔" اور اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آکر مہر کوئی قدم اٹھا بھی لیتی تو میں نے اسی وقت خود کو گولی مار دینی تھی۔

غلام علی!..... حاکم علی نے زوردار آواز میں ملازم کو بلایا۔ "اس شخص کو دھکے مار کر اس گھر کی دہلیز سے باہر کردو۔ اور آئندہ باہر نظر آئے تو بے شک گولی مار دینا۔" ان کے ملازم کو اس طرح کہنے پر مہر نے بمشکل اپنی چیخوں کا گلا گھونٹا تھا اور ایک بار پھر حاکم علی کے سامنے آئی۔

"ابا! ایسا مت کریں میں معافی مانگتی ہوں حیدر کی طرف سے۔ یہ آئندہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔"

"بس کرو یہ ڈراما مہر بی بی! تمہارے ابا کی ان دھمکیوں سے میں ڈرنے والا نہیں ہوں لیکن میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے کتنی قدر ہے؟ میں جارہا ہوں اور ہاں۔ اب تم بلاؤ گی تب بھی حیدر علی نہیں آئے گا اور تمہارے ابا کی خوش فہمی بھی وقت دور کرہی دے گا کہ حیدر علی تمہیں چھوڑ دے گا..... " غلام علی کو جو اسے ہاتھ لگاتے ہوئے جھجک رہا تھا گو ہاتھوں سے دور دھکیلتے ہوئے وہ مہر تک آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"حیدر..... حیدر! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو..... " وہ بوکھلا کر بولی جبکہ اس کی دوسری کوئی بات سُنے بغیر وہ تیز قدموں سے مڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا شاید کبھی واپس نہ آنے کے لیے..... مہر نے کچھ دیر ساکت کھڑی رہی اور پتھرائی آنکھوں سے اسے غائب ہوتے دیکھا۔ پھر ملامتی نظروں سے حاکم علی کو دیکھتی اندر بھاگ گئی۔ بی بی بھی تھکے تھکے قدموں سے اٹھیں اور

اس کے پیچھے چل دیں۔

☆ ☆ ☆

ضد اور انا کی جنگ میں بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جذبات' احساسات' رشتے حتیٰ کہ انسان بھی۔ پتا نہیں وقت اس بار زندگی کا کون سا نیا رنگ انہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اس گھر میں جو کچھ جب بھی ان کے ساتھ ہوا وہ سمجھتی تھیں کہ بس اب اس سے بڑھ کر برا رنگ تو زندگی کا ہو ہی نہیں ہو گا مگر اگلی بار اس سے بھی گہری اور کاری ضرب پر وہ پھر یہی سوچتیں۔ اب حالات جو رخ اختیار کر گئے تھے اس کے بعد نہ جانے کیا کچھ دیکھنا ابھی باقی تھا۔ انہیں دیکھ کر مہران کے گلے لگ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"میں نے زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا بی بی! مجھے نہیں پتا تھا کہ حالات ایسا رخ اختیار کر جائیں گے۔ ابا یوں مجھے کٹہرے میں کھڑا کر کے اپنے باپ ہونے کا خراج مانگ لیں گے...... وہ بہت خفا ہو کر گیا ہے بی بی' کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں آئے گا۔"

"تمہیں اس کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا مہر!" بی بی کی ٹھہری ہوئی آواز پر وہ حیران رہ گئی۔

"تمہارے ابا نے ہمیشہ وہی کیا جو ان سے ان کی انا نے کروایا۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ مجھے نہ تو حیدر جیسے بھائی کی سرپرستی ملی تھی' نہ حیدر جیسا شریک سفر جو اپنے سے بندھے ہر رشتے پر آنے والی کوئی بھی آنچ خود پر لے لے۔"

"میں کیا کرتی بی بی! میرے ہاتھ ابا نے باندھ دیے تھے۔ اب کیا ہو گا...... میں کیا کروں گی؟" وہ بے حد پریشانی میں ان سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہو گا...... بس اب اللہ سے دعا کرو کہ وہ ہی کوئی راہ نکالے۔ میں حیدر سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گی۔" انہوں نے اس کے ہاتھ تھپتھپا کر اسے تسلی دی تھی۔

☆ ☆ ☆

حاکم علی کے گھر سے وہ بہت دلبرداشتہ اور غصے میں نکلا تھا۔ وہ تو چاچا کو سمجھانا چاہتا تھا کسی بھی بدمزگی کے بغیر مہر کی رخصتی کی بات کرنا چاہتا تھا مگر چاچا کے غصے نے حالات کچھ اس قسم کے پیدا کر دیے تھے کہ مہر کو درمیان میں لانا پڑا تھا۔ اور حیدر جسے مہر کی محبت اور یقین دہانیوں پر بہت ناز تھا' بری طرح ٹوٹ گیا جب مہر نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مہر کی اس بے وفائی سے اس کے اندر ایک جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔

مرد اور عورت کے زندگی کو برتنے کے لیے ایک جیسے معاملات پر احساسات مختلف ہوتے ہیں۔ وہ اس پل اس بات کو ذہن میں رکھ کر کڑھ رہا تھا کہ وہ مہر پر شرعی حق رکھتا تھا پھر بھی وہ اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ ایک عورت کے جذبات کو جانے بغیر کہ وہ اس کی بیوی تھی تو کسی کی بیٹی بھی تو تھی۔

حالات نے اسے ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اگر وہ اپنے باپ کی نافرمانی کر کے اس کے پیچھے چل دیتی تو نافرمانی کی ایک نئی داستان رقم کرتی ایک مان جو باپ کو اپنی بیٹی پر تھا' وہ ٹوٹ جاتا کہ ہر رشتے کے الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس پل اگر وہ حیدر کی منکوحہ سے بیوی بن چکی ہوتی تب لاکھ حاکم علی اسے واسطے دیتے اپنی عزت و جلال کے' وہ اپنے خاوند کے ساتھ جانے کو ترجیح دیتی مگر اس پل وہ دونوں مرد اس کے احساسات کو سمجھ نہیں پائے تھے اور دونوں نے ہی اپنی انا کی جنگ میں اس کی محبت کا استحصال کیا تھا۔

وہاں سے حیدر سیدھا ماموں کے ہاں گیا تھا۔ صوفی کو خوش دیکھ کر جلتے دل کو کچھ قرار آیا تھا۔ پھر صوفی کو مختصر سی صورت حال بتا کر وہ شہر چلا گیا تھا۔ زندگی کی پہلی اور اہم ترجیح اس کے لیے تعلیم ہی تھی وہ تو درمیان میں وہ خواہ مخواہ میں ہی محبت نامی آکٹوپس کا شکار ہو کر مہر سے نکاح کر بیٹھا ورنہ اس کی دور دور کی منصوبہ بندی میں ابھی شادی شامل نہیں تھی۔ مگر اسی کا نام زندگی ہے کہ یہ ہمارے طے کردہ راستوں پر نہیں چلتی' زندگی کو اپنی نہج پر چلانے کے قدرت کے اپنے متعین قوانین ہیں جن پر انسان کو چاہے یا نہ چاہے چلنا

ہی پڑتا ہے۔

اب اسے پہلے اپنے امتحان کی طرف یکسوئی سے توجہ دینی تھی پھر اس سے فارغ ہو کر سکون سے ہی اپنی زندگی کے بارے میں کچھ اہم فیصلے لینے تھے۔ جن میں حاکم علی سے اپنی زمین واپس لے کر کچھ ترقیاتی منصوبوں پر کام تھا جس سے غریب کسان کا نہ صرف استحصال ختم ہو بلکہ اس کے روزگار کی بھی سبیل پیدا ہو۔ گاؤں میں تعلیم اور صحت کے لیے کچھ ضروری اقدامات جن سے جہالت کے اندھیروں کا خاتمہ ہو سکتا اور غریب لوگوں کو صحت کے حوالے سے بنیادی ضروریات بہم ملتیں ان سب کاموں کے لیے اس کا عزم تو تھا ہی مگر دولت کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں تھا وہ پیسے کے بغیر' صرف ارادے اور کوشش سے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

ایک دوبار حاکم علی سے اس نے اپنے ارادے شیئر کیے تھے تو ان کی سوچ جان کر حیران رہ گیا تھا کہ ان کا خیال تھا کہ غریب لوگوں کو اگر تعلیم کا شعور اور ہر بنیادی ضرورت مل گئی تو ان کی غلامی کون کرے گا۔ ان کا خیال تھا وہ بس اپنی تعلیم مکمل کرے اور عیش کرے۔ ان کتابی باتوں پر عمل کرنے کے لیے حکومت موجود ہے تب سے ہی اس نے سوچ رکھا تھا وہ خود اپنے بل بوتے پر جو ہو سکا کرے گا اور پھر مہر بھی اس کے خوابوں میں آشامل ہوئی تھی۔ مہر کی یاد آنے پر اس کے حلق میں جیسے کڑوا دھواں گھستا چلا گیا تھا۔

حاکم علی اگر اس گاؤں پر حکومت کرتا تھا تو کچھ وفادار حیدر علی کے بھی تھے۔ اس نے فون پر ان لوگوں کو کچھ ضروری ہدایات دیں' کچھ معلومات جمع کر کے پہنچانے کو کہا اور خود ہر سوچ کو جھٹک کر اپنے امتحان کی تیاری میں لگ گیا۔

☼ ☼ ☼

اسے گئے ہوئے آج دس دن ہونے کو آئے تھے اور مہر کا چین اور سکون گویا وہ اپنے ساتھ ہی لے کر گیا تھا۔ وہ جلے پیر کی بلی کی مانند یہاں سے وہاں چکراتی دن تمام کرتی۔ بی بی نے اس دن کے بعد اسے کتنی ہی بار کال کرنے کی کوشش کی مگر اس کا نمبر بند ملا تھا۔

حاکم علی کی زمینوں پر ساتھ والے گاؤں کے چوہدری سے تو تو میں میں ہو گئی تھی۔ وہ بھی ان ہی کی ٹکر کا بندہ تھا۔ سو آج کل ان کے چکر تھانے کچہریوں کے گرد ہی گزر رہے تھے۔ صوفی نے ایک بار لینڈ لائن نمبر پر رابطہ کیا تھا اس کی آواز سن کر وہ سسک اٹھی تھی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا مہر۔ اس وقت حالات جو ہیں' ان کا تقاضا یہی تھا کہ تم ان کے ساتھ چلی جاتیں' تمہارا یہ فیصلہ ہی چاچا کے اس ظلم کے سفر کو روک سکتا تھا۔ وہ تمہیں بھگا کے نہیں لے کے جا رہے تھے۔ سب کے سامنے اعلانیہ اپنی بیوی کو ساتھ چلنے کو کہا تھا انہوں نے۔ تم نے ان کا مان توڑ دیا مہر۔ وہ میرے پاس آئے تھے بہت ٹوٹے ہوئے لگ رہے تھے۔ بہت افسردہ۔" صوفی کا اس طرح کہنا اس کے اندر کئی ملال جگا گیا۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی صوفی۔ ابا نے کہا وہ خود کو گولی مار لیں گے' اگر میں گئی تو.... میں ڈر گئی تھی صوفی کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ماں باپ کی بیس سالہ شفقت' محبت اور اعتماد کا یہ صلہ دیا ایک بیٹی نے کہ صرف نکاح کے بل بوتے پر سب فراموش کر کے چل دی۔ خدا کی قسم صوفی! میرا دل چیخ چیخ کر حیدر کے ساتھ جانے کی ضد کر رہا تھا۔" وہ رو رو کر اپنی عزیز از جان دوست پر اپنا مطمع نظر واضح کر رہی تھی۔

"رونا بند کرو مہر' اب بھی رونے کا نہیں کچھ سوچنے اور کر دکھانے کا وقت ہے۔ ابھی حیدر لالہ بہت غصے میں ہیں' ایک دو دن میں ان کے امتحان شروع ہونے والے ہیں' میں اس کے بعد ان سے بات کروں گی' تب تک ہو سکتا ہے چاچا کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو مل بیٹھ کر ہی بات ہو سکتی ہے۔" صوفی کی بات پر اسے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ اپنی پریشانی سے نکلی تو صوفی سے اس کے گھر خاوند اور دیگر لوگوں کی بابت پوچھا تھا۔ جواباً اس کے لہجے کی طمانیت اور کھنک

سے ہی وہ اس کی خوشی کی بابت جان گئی تھی۔

حاکم علی واقعی اسے حیدر سے خلع دلوا کر رشتے کے ایک چچازاد سے بیاہنا چاہتے تھے‘ جو عمر میں اس سے کچھ بڑا تھا۔ ایک بیوی بھی تھی کی پہلی بیوی سے صرف ایک ہی بیٹی تھی اور کسی پیچیدگی کے باعث اب اس کی بیوی مزید بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں تھی وہ اپنی بیٹی کو وٹے سٹے میں شاہو کو دے کر مہر کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا‘ مربوں زمین کے مالک نواز نے حاکم علی کی حریصانہ حس کو بھڑکا دیا تھا۔

”مہر کے ابا‘ شاہو کی ہی بات کرلو ان سے مہر کا رشتہ توڑنے کا فیصلہ مت کرو۔ ہمارے خاندان میں تو کبھی منگنی نہیں ٹوٹی اور آپ نکاح توڑنے کی بات کررہے ہو۔ برادری کیا کہے گی؟ حیدر برا بچہ نہیں ہے۔ بس ذرا جذباتی ہے پیار سے سمجھادو گے تو سمجھ جائے گا۔“ چاچی نے پھر بھی انہیں روکنے کی کوشش کی تھی۔

”برادری کا بڑا ہوں میں‘ مجھے کسی نے کیا کہنا ہے پھر سب کو پتا ہے کہ حیدر ایک باغی نوجوان ہے اور اس نے اپنی بہن کو برادری سے باہر بیاہ کر بغاوت کی ہے۔ مجھے اب اس کو اپنی دھی کا ہاتھ نہیں دیتا اور نواز کی بھی تو شادی کی یہی شرط ہے کہ رشتہ دوگے تو ہی وہ بازو دے گا اور اچھے بچے کی کارستانی بھی سن لو۔ عدالت کی طرف سے اپنی زمین اور جائیداد کی حوالگی کا نوٹس بھیجا ہے اس نے۔ اس نافرمان کو بہت شوق ہے نا عدالتوں کے چکر لگانے کا تو اس کا یہ شوق تو اب میں پورا کروں گا۔“

حاکم علی کے ارادے سن کر باہر کان لگا کر سنتی مہر سے اندر بھی نہ داخل ہوا گیا‘ وہ دودھ لے کر واپس پلٹ آئی اور ملازمہ کو دودھ پکڑا کر خود اپنے کمرے میں آگئی۔ ساری رات اسی ادھیڑبن میں گزری تھی اور صبح ابا کے کمرے میں خصوصی بلاوا اس کا جی دھڑکا کے رکھ گیا۔

✡ ✡ ✡

”آؤ پتر بیٹھو۔“ انہوں نے اسے بیٹھنے کو کہا پھر کچھ کاغذات اور پین جو ٹیبل پر رکھے تھے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ وہ جہاں جہاں کہتے جائیں سائن کرتی جائے۔ مہر کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا تھا وہ بدک کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

”نہیں... نہیں ابا۔ آپ نے آج تک جو کہا وہ میں نے مانا‘ مگر میں ان پر یا کسی بھی کاغذات پر سائن نہیں کروں گی۔ کبھی بھی نہیں۔“ اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور خوف زدہ نظروں سے میز پر پڑے کاغذات کو دیکھا گویا وہ بے جان کاغذ نہ ہوں عفریت ہو کوئی۔

”مہر... تم نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔“ حاکم علی کچھ دیر تو ششدر سے اس کا ردعمل دیکھتے رہے پھر زور سے گرج کر کہا جواباً مہر نہیں کہہ کر وہاں سے روتی ہوئی بھاگ گئی تھی۔

حاکم علی جو اب تک نجانے کتنے منصوبے بنا چکے تھے مہر کی خلع‘ پھر شادی‘ دولت کا حصول‘ حیدر کی دولت ہڑپ کرنے کا منصوبہ اس سب میں انہیں مہر کا رویہ دراڑیں ڈالتا محسوس ہونے لگا پھر پیار‘ ڈانٹ حتیٰ کہ مار بھی مہر سے ان کاغذات پر حاکم علی کو دستخط کروانے پر مجبور نہ کرسکی تھی۔ اس وقت حاکم علی کی حالت اس بپھرے شیر کی مانند تھی جس سے اس کا اپنا شکار کوئی اور چھین کر لے گیا ہو۔ اس دوران حیدر علی کی طرف سے انہیں ایک اور عدالتی نوٹس بھی مل چکا تھا۔

حاکمیت ہو یا دولت کا حصول یہ ایسا نشہ ہے جس میں انسان نفس کی غلامی قبول کرکے خود کو فرعونیت کے درجے پر لے جاتا ہے۔ حاکم علی پر بھی اس وقت فرعونیت کا بھوت سوار تھا وہ نہ تو اس حاکمیت کے درجے سے دستبردار ہونا چاہتے تھے جس پر گزشتہ بیس برس سے فائز تھے‘ نہ ہی انہیں اس زمین اور جائیداد سے محرومی قبول تھی جو کچھ تو انہوں نے مختلف ناجائز طریقوں سے حاصل کی تھی اور آدھی سے زیادہ جائیداد کا حیدر قانونی وارث تھا جس کو اس سے پہلے تو حیدر نے چنداں اہمیت نہ دی تھی بلکہ ہر لحاظ سے حاکم علی ہی کرتا دھرتا تھے مگر اب اس کی طرف سے قانونی چارہ

جوئی نے حاکم علی کو بوکھلا کر رکھ دیا۔

انہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد اپنے معتمد خاص کو بلایا تھا۔ پھر اسے حیدر کے قتل کا حکم دیتے ہوئے ان کا دل ذرا بھی نہ کانپا تھا۔ یہ انوکھا خیال اب ان کے ذہن میں آیا تھا کہ مہر سائن کرے یا نہ کرے، اب اس کی پروا بھی نہیں تھی انہیں، جب حیدر نے مرجانا تھا تو خود بخود ساری جائیداد ان کے قبضے میں بھی آجاتی تھی اور مہر بھی اس بندھن سے آزاد ہو جاتی اور وہ اس کی شادی نواز سے کرسکتے تھے۔ بدلے میں نواز نے انہیں دو مربے زمین اسے دینے کا وعدہ کیا تھا۔

"اس کی روٹین پر نظر رکھو۔ وہ اپنی بہن سے ملنے کے لیے آتا ہے شہر اس بار وہ آئے تو زندہ بچ کر جانے نہ پائے۔" انہوں نے سفاک لہجے میں حکم دیا تھا۔

تقدیر نے ایک ظالم انسان کے اس فیصلے کو سنا اور اشرف المخلوقات کی اس متعلق العنانی پر مسکرا دی کہ صفت کس کے لیے ہے اور اسے اپنا کون سمجھتا ہے۔

☼ ☼ ☼

ذہن سے ساری سوچوں کو جھٹک کر فی الحال وہ اپنے امتحان میں مصروف تھا، مگر اس دوران اس کا گاؤں اپنے خاص بندوں سے مسلسل رابطہ تھا اور وکیل سے بھی دو تین دفعہ ملاقات کی تھی۔ صوفی اس سے روز رات کو فون پر بات کرتی اور اس نے ایک دفعہ مہر کی طرف سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کی تھی، مگر حیدر نے سختی سے اسے ٹوک دیا تھا کہ وہ اس حوالے سے کوئی بات نہیں سننا چاہتا اس کے اس قدر قطعی انداز کے بعد صوفی کی مزید کچھ کہنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ پھر عدالت کی پہلی پیشی پر حاکم علی نہیں آئے تھے۔ انہیں سختی سے اگلی پیشی پر پیش ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔

حیدر کا آج آخری پیپر تھا۔ کل اس کا صوفی کی طرف جانے کا ارادہ تھا اور پھر اپنے گاؤں۔ سو فارغ ہو کر وہ جو سویا تو شام کی خبر لایا تھا۔ نیند سے جاگنے پر اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا۔ اب اس کا ارادہ مارکیٹ جا کر صوفی کے لیے کچھ شاپنگ کرنے کا تھا، شاپنگ سے اسے پچھلی دفعہ اس دشمن جاں کے لیے کی گئی خریداری یاد آئی، جسے جب اس نے اس کے حوالے کیا تھا تو کیسے وہ حیرت اور خوشی سے گنگ رہ گئی تھی۔ پھر اس خیال پر بے وفائی کی بدگمانی نے اپنا رنگ گہرا کیا تو اس نے سر جھٹک کر آف پڑا موبائل آن کیا اور خود مارکیٹ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ موبائل آن کرنے پر مسیجز کی رنگ ٹون کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور ابھی وہ اسے کھول کر دیکھنے نہ پایا تھا اسے صوفی کی طرف سے کال موصول ہوئی۔

"لالہ! آپ کہاں ہیں؟ میں صبح سے آپ کو کال کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ چاچا حاکم علی کا شہر آتے ہوئے بہت بری طرح سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے، شدید زخمی حالت میں انہیں وہیں شہر لایا گیا ہے، جواد کہہ رہے ہیں ہمیں چلنا چاہیے، مگر میں آپ سے پوچھنا چاہتی تھی پہلے۔" صوفی تیز تیز بول رہی تھی اور اس کی آواز حیدر کو روئی ہوئی بھی لگی۔ حیدر کو اس پل نہ دکھ ہوا تھا نہ خوشی ایک سناٹے کی سی کیفیت نے اس کے وجود پر پھیلائے۔

"ہاں صوفی! مجھے جواد سے اسپتال کا پتا کر کے دو میں خود جا کے ساری صورت حال معلوم کر کے تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا کرنا ہے، تم..." وہ کچھ رک کر بولا۔ "تم حویلی چلی جانا مگر ابھی نہیں کل صبح۔ اب رات ہونے والی ہے۔" پھر جواد نے صوفی سے فون لے کر حیدر کو شہر کے اس اسپتال کا نام بتا دیا جہاں حاکم علی کو لے جایا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے پر اسے حاکم علی کے دو خاص ملازمین کے علاوہ چوہدری نواز ملا تھا اور پھر سہما ہوا شاہو روتا ہوا حیدر سے آکر لپٹ گیا۔

"حیدر لالا... ابا بہت زخمی ہیں... اب کیا ہوگا۔"

بارہ تیرہ سالہ شاہو کو کسی اپنے کی موجودگی نے بے حد ڈھارس دی تھی۔ حیدر نے اسے تسلی سے تھپکی دی۔

"اللہ سے دعا کرو شاہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ڈاکٹرز سے مل لوں۔" اس نے اپنے مخصوص سنجیدہ انداز میں کہا۔ اس دوران ملازم اس کو حاکم علی کی

حالت سے آگاہ کر چکے تھے۔ چوہدری نواز کو حیدر علی کے یہاں آنے کی ہرگز امید نہیں تھی' وہ خود تو ان کا وارث سمجھ کر یہاں آیا تھا اب حیدر کو دیکھ کر ناگواری سے منہ بنائے ایک طرف بیٹھا تھا۔

حاکم علی کا آپریشن دو سے تین گھنٹے جاری رہا تھا بالآخر ان کی دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑی تھیں۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آئے تھے۔ اگلے چوبیس گھنٹے بے حد اہم تھے۔ آئی سی یو کے ٹھنڈے شیشے کے پار حیدر نے کئی مشینوں میں جکڑے حاکم علی کو دیکھا اور ان کا رعب' غصہ' چلنا' پھرنا یاد کر کے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ فون کر کے اس نے بی بی سے بہت دن بعد رابطہ کیا تھا اور ان کو آہستہ سے ساری صورت حال بتا کر دعا کرنے کو کہا تھا۔

"میں کہتی تھی نا حیدر حاکم علی کو کہ مت' غریبوں کی بددعائیں سمیٹے۔ مظلوم کی آہ اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ پھر اس نے جو تمہارے ساتھ کیا۔ اس کے بعد میرا دل ہولتا تھا۔ ایسا لگتا تھا ہر پل کہ کوئی طوفان آنے کو ہے۔" بی بی رو رو کر کہہ رہی تھیں۔

"قدرت کے فیصلے انسان کی دعاؤں یا بددعاؤں کے محتاج نہیں ہوتے بی بی۔ نہ ہی میں نے ان سے بددعا کا رشتہ رکھا تھا۔ میری ان سے جنگ صحیح اور غلط کے لیے تھی بس۔ اب ان کو صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

قدرت کو ابھی حاکم علی کی زندگی منظور تھی تب ہی دو دن بعد انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں' مگر فی الحال ان کو زیادہ تر مسکن دوائیوں کے زیر اثر رکھا جا رہا تھا۔ گھر کی خواتین بھی ایک چکر اسپتال کا لگا گئی تھیں۔ مہر باب کی طرف سے صدمے کا شکار تو تھی ہی' حیدر کی لاتعلقی اور سرد مہری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسپتال میں وہ سب کے لیے وہی پرانا حیدر تھا۔ تسلی دیتا ہوا مہربان۔ سوائے اس کے' اس نے سب کو ہی اس وقت صبر اور حوصلے سے کام لینے کو کہا تھا۔ ان کے تعلقات کی تجدید نے چوہدری نواز کو جلد ہی وہاں سے واپس جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہفتہ بعد حاکم علی کو مکمل ہوش آیا تھا اور اپنی حالت کے بارے میں جان کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے پھر حیدر کی موجودگی اس کی دیکھ بھال اور اپنے ساتھ رویہ دیکھ کر انہوں نے پہلا فون اپنے اسی معتمد خاص کو پچھلا حکم رد کرنے کا کیا تھا۔

"میرے خدا! اگر اس نے حیدر کو مار ڈالا ہوتا تو..."

وہ سوچ کر لرز کر رہ جاتے۔ جب وہ ان کے لیے ڈاکٹروں کے پیچھے دوڑا پھرتا' اس کا مسلسل قیام ان کے ساتھ ہی تھا۔ دولت سب کچھ ہو سکتی ہے' مگر رشتوں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ شاہو ابھی چھوٹا تھا۔ وہ برادری' خاندان جس کا ہوا وہ ہر وقت خود پر سوار رکھتے وہ ایک بار ان کی عیادت کرنے کے بعد اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ فقط حیدر ہی بچا تھا یہاں اسپتال میں ان کے پاس' جو مسلسل ڈیڑھ ماہ سے ان کے ساتھ کسی سائے کی مانند تھا۔

اس دوران حیدر کے پریکٹیکلز ہوئے تھے اور وہ ملازم کو ہزار تاکید کے بعد فقط تین گھنٹے کے لیے جاتا اور واپس آنے کی کرتا تھا۔ حاکم علی کے دو آپریشن مزید ہوئے تھے۔ گھر کی خواتین بھی درمیان میں آتی رہی تھیں۔ مہر کی پیاسی نظریں اس کو دیکھ سیراب ہو جاتیں۔ حیدر کا رویہ اس کے ساتھ ہنوز وہی تھا۔ ایک دفعہ اس نے حاکم علی کی طبیعت کے بہانے ہی کچھ دریافت کیا تھا اس سے۔ اس نے اس قدر سرد مہری سے جواب دیا تھا کہ مہر آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ صوفی بھی جواد اور ماموں کے ساتھ آئی تھی حاکم علی کو دیکھنے اور جس روز حاکم علی نے حیدر کے سہارے وہیل چیئر پر حویلی کی دہلیز پار کی تھی' پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے۔ گزرے اس جان لیوا عرصہ میں انہوں نے صرف اپنا محاسبہ کرنے کا کام ہی کیا تھا اور انصاف کی کسوٹی پر اپنے اعمال کی سیاہی انہیں اس بری طرح شرمندہ کر گئی تھی کہ وہ سوچتے کہ حیدر سے معافی کیسے اور کس منہ سے مانگیں' مگر آج انہوں نے مزید دیر نہ کرنے کی سوچتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ جب وہ ان کو ان

کے بستر پر لٹانے میں ہی ہانپ رہا تھا۔ حیدر ساکت ہی تو رہ گیا تھا اور تیزی سے ان کے جڑے ہاتھ کھول دیے۔

"ایسے کر کے مجھے گناہ گار مت کریں پلیز چاچا! یہ آپ کا مرتبہ نہیں ہے۔" چچا بھتیجے کے بیچ اس جذباتی سین نے وہاں پر موجود سب لوگوں کو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"آپ سے مجھے پہلے بھی گلہ نہیں تھا' چاچا! ہاں آپ کی ضد اور غلط فیصلوں پر اعتراض ضرور تھا کیوں کہ میں انسان سے نہیں اس کی برائی سے نفرت کرنے والا شخص ہوں۔ آپ میرے باپ کی جگہ پر ہیں' آپ کی خبر گیری اور خدمت میرا فرض ہے اور یہ بھی بتا دوں کہ آپ آج بھی غلط فیصلہ لیں گے تو میں آج بھی آپ کو ٹوکوں گا کیوں کہ غلط بات کو قبول کرنا میری سرشت میں ہی نہیں ہے۔"

"ارے تو تو ہیرا ہے میرے بچے۔ فرشتہ ہے اور میں بدذات' کمینہ تجھے مارنے تک کا منصوبہ بنا بیٹھا تھا۔ یہ تو اللہ نے مجھے ٹھوکر لگائی تو صحیح غلط کا فرق سمجھنے کا موقع ملا ہے ورنہ نجانے کتنے اور بڑے گناہ میرے ہاتھوں سرزد ہونے تھے مجھ جیسے لوگ ہوتے ہیں' جو قدرت کی ڈھیل کو سمجھ ہی نہیں پاتے اور جب رسی کھینچ لی جاتی ہے تو منہ کے بل گرتے ہیں۔" خود احتسابی کے کڑے عمل سے گزرنے کے بعد حاکم علی کو نجانے کون کون سے گناہ یاد آ رہے تھے۔ حیدر مزید کیا کہتا بس ان کا ہاتھ تھپکتا رہا اور ان کے گناہوں کے اعترافات کی طویل فہرست سنتا رہا۔

"بس کریں چاچا! گناہ اس وقت خطرناک ترین صورت اختیار کرتا ہے جب گناہ گار اس کو گناہ ہی نہ جانے اور جب انسان کو غلطی کا احساس ہو جائے تو معافی کا در تو رب کے ہاں ہر وقت کھلا ہے۔ بے شک وہ رحیم اور غفار توبہ قبول کرنے والا ہے۔ کچھتانا تو انسان تب ہے جب اسے توبہ کا موقع دیے بغیر رسی کھینچ لی جائے جس کو زندگی میں ہی گناہوں کی توبہ کا موقع مل جائے وہ تو خوش نصیب ہے چاچا۔" اس نے اپنے اسی نرم لہجے میں سمجھایا جس سے اب تک ان کو سمجھاتا آ رہا تھا۔

ڈاکٹرز سے اس کی طویل بات چیت ہوئی تھی جس میں انہوں نے بتایا تھا اس قسم کے مریض جنہوں نے پہلے بھرپور زندگی گزاری ہو جب کسی حادثے کے بعد ایسی لاچاری کی حالت میں آ جائیں مایوسی کی حد پر آ کر ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں ان کے گھر والوں کو ان کا ہر قسم کا رویہ برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ گھر والوں کی محبت اور خیال ان کو آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لے آتا ہے اور تھوڑی سی حوصلہ شکنی یا تنہائی ان کو خودکشی کی طرف دھکیل سکتی ہے۔ اس نے مہر کے علاوہ باقی سب کو بھی یہ بات سمجھا دی تھی۔

چاچا نے صوفی کو بلوا کر اس سے بھی معافی مانگی تھی اب صوفی اور اس کے گھر والوں کے لیے حاکم علی کے گھر کے دروازے کھل چکے تھے۔ چاچا نے زمینداری تو کیا گھر اور گاؤں کے تمام امور کی ذمہ داری کلی طور پر حیدر کو سونپ دی تھی اس کے باوجود وہ ہر کام کرنے سے پہلے انہیں بتاتا' ان سے اجازت طلب کرتا' انہیں اپنے مشوروں میں شامل رکھتا تاکہ وہ خود کو عضو معطل محسوس نہ کریں۔ ایک دو بار کسی پنچائت میں ان کو وہیل چیئر سمیت بھی لے کر گیا تھا۔ شاہویز بھی اسکول جانے کے لیے حیدر کی طرف سے بہت سختی تھی۔

اس دن بی بی نے اسے بلوا بھیجا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ حاکم علی سے اسے اپنی اور مہر کی شادی کی بات کرنی چاہیے مگر حیدر نے منع کر کے انہیں حیران کر دیا تھا۔

"میری زندگی کے یہ دو تین سال میرے ارادوں کو پایہ تکمیل پہنچانے کے لیے بہت اہم سال ہیں۔ ایسے میں میں شادی جیسی ذمہ داری اٹھانے کا خود کو اہل نہیں سمجھتا فارغ ہو کر کچھ اس بارے میں بھی کچھ سوچ لیں گے۔" سنجیدگی سے اس نے کہا تھا اور ایسا کہتے ہوئے کچھ عرصہ پہلے کا وہ وقت نظروں کے سامنے ٹھہر گیا جب اس ظالم لڑکی نے اس کا مان توڑ دیا تھا۔

صوفی جو کہ بی بی کے ذمہ لگا کر گئی تھی کہ حیدر سے اس حوالے سے بات کریں۔ بی بی کی زبانی اس کا جواب جان کر جان گئی تھی کہ حیدر کے انکار کے پیچھے مہر پر اس کا غصہ تھا۔ اور اس بار جب وہ آئی تو مہر کو پکڑا تھا جو خود اس کے بے مہر رویے سے ادھ موئی ہو رہی تھی۔

"لالہ تم سے بہت خفا ہیں مہو۔ انہیں منالو۔ وہ دل کے سخت نہیں ہیں' لیکن وہ اس بات کو قبول ہی نہیں کرپائے کہ زندگی کے سب سے اہم فیصلے میں ان کی زندگی کی ساتھی نے ان کے ساتھ چلنے سے انکار کردیا تھا۔"

"تمہیں پتا ہے' نا صوفی... میں نے ایسا کیوں کیا۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"ہاں مجھے پتا ہے' مگر تمہیں ان کو بتانا چاہیے۔ اپنی زبان سے... بی بی نے ان سے شادی کی بات کی تھی' مگر انہوں نے رخصتی کی بات چاچا سے کرنے کو منع کردیا ہے وہ اگلے کئی سالوں تک شادی کے حق میں نہیں ہیں۔ خود سوچو مہو... محض دو ماہ پہلے تمہاری رخصتی کے لیے چاچا کے سامنے تن جانے والے لالا نے ایک دم کیوں اس معاملے میں خاموشی اختیار کرلی جب کہ اب حالات بھی ان کے حق میں ہیں ابھی تم دونوں کے درمیان صرف غلط فہمی ہے۔ اعتبار کا فقدان ہے اور یہ دونوں چیزیں مل کر بدگمانی کو جنم لیتی ہیں۔ لالا کے دل میں بدگمانی کی اس گرد کو اپنے اعتبار محبت سے صاف کرو مہو۔ مرد کے دل میں ایک دفعہ میل آجائے تو آسانی سے نہیں دھلتا۔ دیر مت کرو... میں تم دونوں کو ایک ساتھ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔" صوفی کافی دیر اسے سمجھاتی رہی تھی۔

مہر بھی اس کی سرد مہری برداشت کرتے کرتے تھک چکی تھی جب ہی اس کے انتظار میں جلے پیر کی بلی کی مانند یہاں وہاں چکراتی رہی۔ بی بی سے پتا چلا تھا کہ وہ حاکم علی کے ساتھ زمینوں پر تھا اور آج کوئی ضروری فیصلہ تھا تو دیر سے آنا تھا۔ پھر واقعی وہ لوگ رات گئے نو بجے ہی لوٹے تھے۔ حیدر نے حاکم علی کو ملازمین کی مدد سے گاڑی سے وہیل چیئر پر منتقل کیا پھر انہیں ان کے کمرے میں لے کر گیا اور وہاں سے آتے آتے بھی اس نے مزید آدھا گھنٹا لگا دیا تھا کہ حاکم علی کا علاج ابھی بھی جاری تھا اور ان کو دوائیاں وغیرہ دینا' سب حیدر نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ اس کا ارادہ ڈاکٹرز سے مشورے کے بعد حاکم علی کی مصنوعی ٹانگیں لگوانے کا تھا۔ کافی دیر انتظار کے بعد مہر نے اسے اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

کچن میں جاکر اس نے ملازم سے وہ دودھ کا گلاس لیا جو وہ حیدر کے لیے نیم گرم کرکے لے جارہا تھا اور دھڑکتے دل سے اس کے کمرے کی جانب آگئی۔ ہلکی سی دستک کے بعد وہ کمرے میں آگئی۔ وہ بستر پر بیٹھا اپنے جوتے کے تسمے کھول رہا تھا۔

"رکھ دو یار! آج تو بہت تھک گیا ہوں۔" وہ نیچے جھکا جھکا ہی ملازم سمجھ کر بولا تھا' مگر اس کی ہلکی سی "السلام علیکم" سن کر اس نے جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا تھا۔ دروازے کے پاس شرمندہ سی مہر کو دیکھ کر بے ساختہ ایک طویل سانس نکل گئی تھی۔

"وعلیکم السلام... فرمایئے۔" کتنا اجنبی سا انداز تھا اس کا۔ مہر بے ساختہ ہونٹ چبا کر رہ گئی۔

"ایسے اس انداز میں بولے گا تو کیا خاک بات ہوپائے گی۔" مہر نے دل ہی دل میں سوچا۔ جب کہ حیدر اب بازو پیچھے کرکے بیڈ پر ہاتھ ٹکائے خاصے آرام دہ حالت میں بیٹھ کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔

کتنا تکلیف دی تھی اس لڑکی نے کچھ عرصہ پہلے اسے۔ وہ تو بی بی نے اسے جب ساری تفصیل بتائی تھی کہ کس طرح حاکم علی زبردستی مہر سے خلع کے کاغذات پر سائن کروا کے اس کی شادی نواز سے کرنا چاہتے تھے' مگر مہر نے انکار کردیا تھا اور سختی سے اپنی ضد پر اڑی رہی تھی حتیٰ کہ حاکم علی نے اس کو مارا بھی تھا اور دو دن کمرے میں قید بھی رکھا تھا' مگر پیار' مار پیٹ حتیٰ کہ بھوک اور پیاس بھی اس کو دستخط کرنے پر مجبور نہ کرپائی تھی' تب حیدر کے دل پر بدگمانی کی جو میل جمی تھی وہ صاف ہوئی تھی' مگر وہ چاہتا تھا کہ وہ خود اس کو یہ سب بتائے اور صلح میں پہل کرے۔ سو بی بی کو اپنی

شادی سے فی الحال منع کر دیا تھا اور اس کی توقع کے عین مطابق اگلے ہی روز وہ اس کے سامنے موجود تھی۔

"اگر تم مراقبہ کرنے آئی ہو تو اس کے لیے یہ جگہ قطعاً" نامناسب ہے۔" اس کے کہنے پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ حیدر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کانپتے ہاتھوں سے دودھ کا گلاس لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ مہر اور بتاؤ کہ کیا کہنے آئی تھیں؟" اس کا نرمی سے اس طرح کہنا تھا کہ آنسوؤں کا ایک ریلا پلکوں کا بند توڑ کر باہر نکل آیا۔ اس لہجے کے لیے کتنا ترسی تھی اور وہ کیسے اجنبی سا بنا رہا تھا اب تک۔ سب سے معمول کے مطابق بات کرتا، مگر مہر کی بات کا اول تو جواب ہی نہ دیتا اگر کبھی دیتا بھی ایسے جیسے پتھر کھینچ مارنے کے مترادف ہوتا۔

"مجھے معاف کر دیں حیدر! میں نے آپ کی بات ماننے سے اس لیے نہیں انکار کیا تھا کہ میں بے وفائی کر رہی تھی یا آپ سے چھٹکارا چاہتی تھی بس اس پل میں ابا کا جھکا ہوا سر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ مان نہیں توڑ سکی جو انہیں مجھ پر تھا۔" وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں... جس نے آپ کو دیکھ کر جینا سیکھا تھا، آپ جیسا بننے کی خواہش میں میں بدلتی چلی گئی۔ آپ کو اپنے رب سے دعاؤں میں اتنا مانگا کہ اس کریم ذات نے کسی نعمت کی طرح آپ کو مجھے دان دیا۔ میں بھلا آپ کو چھوڑنے کا سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے...؟" اب کے اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لیے تھے، مگر سسکیوں کے درمیان بات جاری رکھی تھی۔ وہ اپنا مطمع نظر اس پر واضح کر دینا چاہتی تھی مبادا پھر موقع نہ ملے اور حیدر جو اس کو کچھ دن اور ستائے رکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے آنسوؤں سے ہار گیا۔ دل تو صاف کر ہی چکا تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھ کر آیا اور نیچے بیٹھ کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

"بڑی سے بڑی جنگ لڑنے سے بھی آپ وہ کام نہیں کر سکتے، جو ایک عورت کے آنسو آپ سے کروا جاتے ہیں۔ ایسا میں نے کبھی پڑھا تھا اور ہنس دیا تھا کہ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے، مگر آج یہاں بیٹھ کر وہ میری ہنسی ہی میرا مذاق اڑاتی محسوس ہو رہی ہے۔" مہر نے نا سمجھی سے اسے دیکھا پھر فوراً" ہی نظریں جھکالی تھیں کہ عرصہ بعد اس کی نظروں میں اپنے لیے وہی جذبات نظر آئے تھے جو اس کی زندگی کا حاصل تھے۔

"اس وقت چاچا ہمارے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتے تھے اس میں اگر وہ کامیاب ہو گئے تو... یہ سوچ ہی مجھے پاگل کر دینے کو کافی تھی، میں اگر خود کو حق پر سمجھ رہا تھا تو غلط تم بھی نہیں تھیں، جس معاشرے کی ہم پیداوار ہیں وہاں واقعی ہر رشتے کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں، تم بغیر رخصتی کے اپنے باپ کی دہلیز سے میرے ساتھ ایسے بھلا کیسے چل سکتی تھیں۔ میں تمہارے اس نقطہ نظر کو تمہاری بے وفائی سمجھا اور کچھ عرصہ کے لیے تم سے برگشتہ ضرور ہو گیا تھا، مگر بعد میں جب حقائق میرے سامنے آئے تو ہر چیز صاف صاف تھی، مگر تمہاری اپنے لیے محبت، بے چینی دیکھ کر دل کو عجیب سی طمانیت محسوس ہوئی اور پھر سوچا کہ وہ وقت بھی دور نہیں جب اظہار کا اذن بھی سماعتوں کو مل جائے گا تو کیسے حسین پل ہوں گے، مگر یار کیا ہے کہ ان آنسوؤں نے میرا پلان پورا ہی نہیں ہونے دیا۔" وہ مسکرایا، مہر نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"میری جان پر بنی ہوئی تھی اور اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو..." "ارے ارے زوجہ محترمہ بس اب وہ خدشات وسوسوں بھرے دن پھر نہیں آئیں گے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے تو کیا خیال ہے پھر کل ہی چاچا سے رخصتی کے لیے بات کی جائے یا ابھی چلا جاؤں..."

"نہیں اس وقت نہیں ابا سو گئے ہوں گے کل..." مہر نے بے ساختہ اسے ٹوکا اور حیدر کا بے ساختہ قہقہہ اس کو احساس دلا گیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ سو گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور شرما کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ حیدر نے آسودگی کے احساس کے ساتھ آنکھیں موند لی تھیں۔ ان کی زندگی میں ہجر کی کالی رات ڈھل چکی تھی۔

مصباح علی

ازمیر اور مریم آسٹریلیا کے شہر وکٹوریہ میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی روائیہ شادی کے گیارہ سال بعد پیدا ہوئی۔ وہ ایک خوب صورت اور معصوم لڑکی ہونے کے ساتھ والدین کی بے حد لاڈلی ہے۔ وہ اس کی سرپرائز سالگرہ آسٹریلیا کے مشہور نیشنل گرین فورسٹ میں شاندار طریقے سے مناتے ہیں۔ سارا پروگرام جندب ترتیب دیتا ہے۔ جندب کا ہاسٹل ازمیر کے فلیٹ کے بالکل قریب ہے۔ اکثر اوقات وہ ان کے ہاں آتا رہتا ہے۔ ان چاروں کے درمیان دوستی اور خلوص کا رشتہ ہے۔ میرزکا فیصل آباد کے نواحی گاؤں میں مانے ہوئے زمیندار ہیں۔ ان کی والدہ فالج کی مریضہ ہیں۔

میرزکا کے دو بیٹے خیام زکا، حنبل زکا ہیں۔ خیام کی شادی آئمہ سے ہو چکی ہے۔ حویلی میں آئمہ کی حکمرانی ہے۔ آئمہ کے دو بچے ہیں۔ ازلان، اعشال۔ ازلان لاابالی اور شرارتی ہے جب کہ اعشال رکھ رکھاؤ والی زمیندار لڑکی ہے۔

زینب حویلی میں جدی پشتی خدمت گزار کی حیثیت سے ہے، لیکن دل حنبل زکا کی وجاہت میں بری طرح جکڑا ہوا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنے لیے آنے والے رشتے ٹھکرا دیتی ہے۔ ایک دن ان ہی کے طبقے سے تعلق رکھنے والے اصغر نے اسے چھیڑا۔ حنبل نے نہ صرف دیکھا بلکہ بے تحاشا پیٹا۔ اس واقعے نے زینب کو مکمل طور پر حنبل زکا کا اسیر کر دیا ہے۔
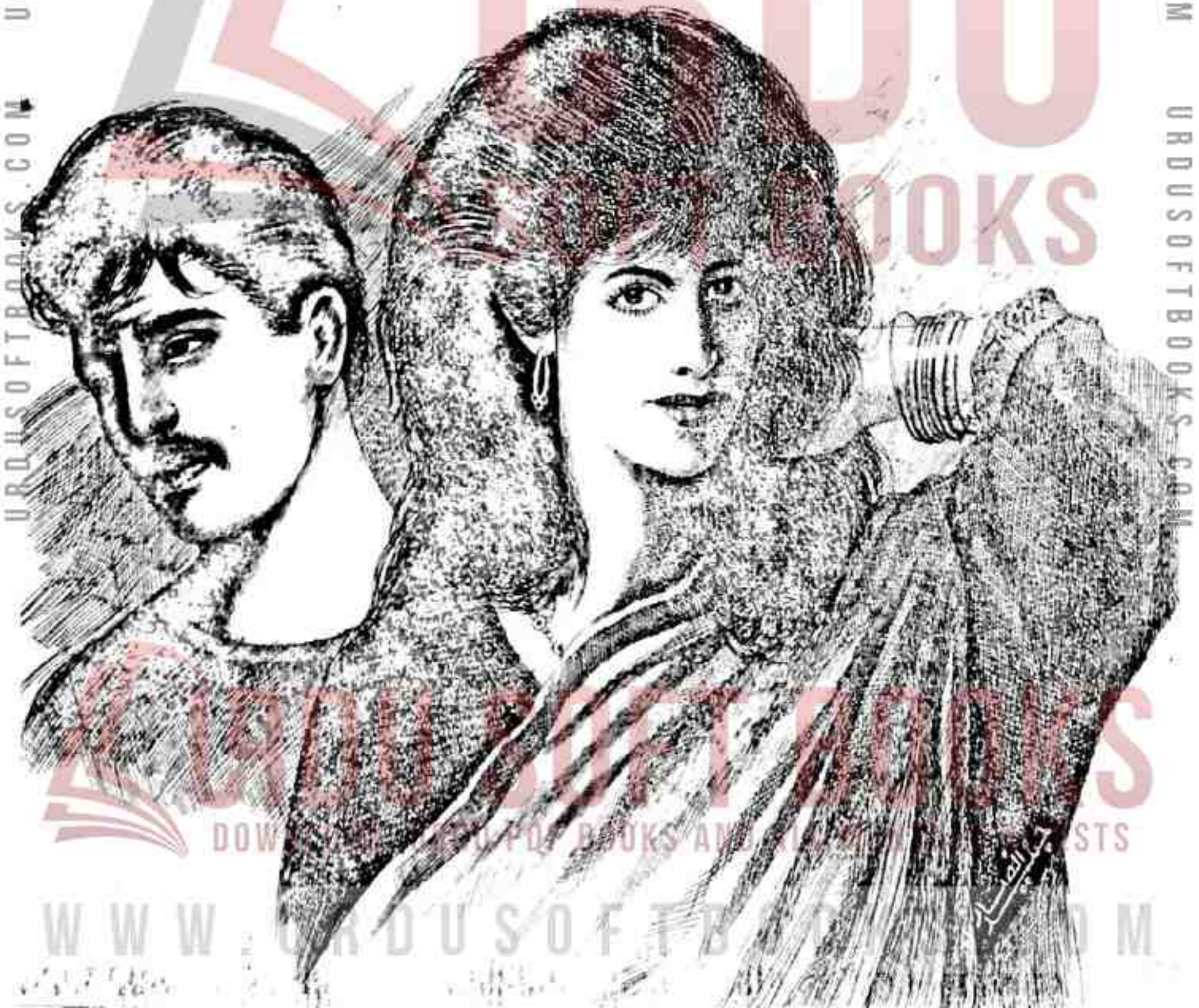
شہروز کمال صبرینہ کا شوہر ہے۔ دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ رنگین مزاج بھی ہے۔ صبرینہ سے اس کی پسند کی شادی ہے، لیکن اوپر تلے چار بیٹیوں کی پیدائش نے اسے صبرینہ سے متنفر کردیا ہے۔ اسے بیٹے کی شدید خواہش ہے۔ اکثر صبرینہ اس کے طنز و طعنے کے حصار میں رہتی ہے۔ بیٹیاں باپ کے سخت رویے سے خوف زدہ ہیں۔ باپ کے قریب جانے سے بھی ڈرتی ہیں یہ جرم بھی شہروز صبرینہ کے کھاتے میں ڈالتا ہے۔

اب آگے پڑھیں۔

دوسری قسط

مکمل ناول
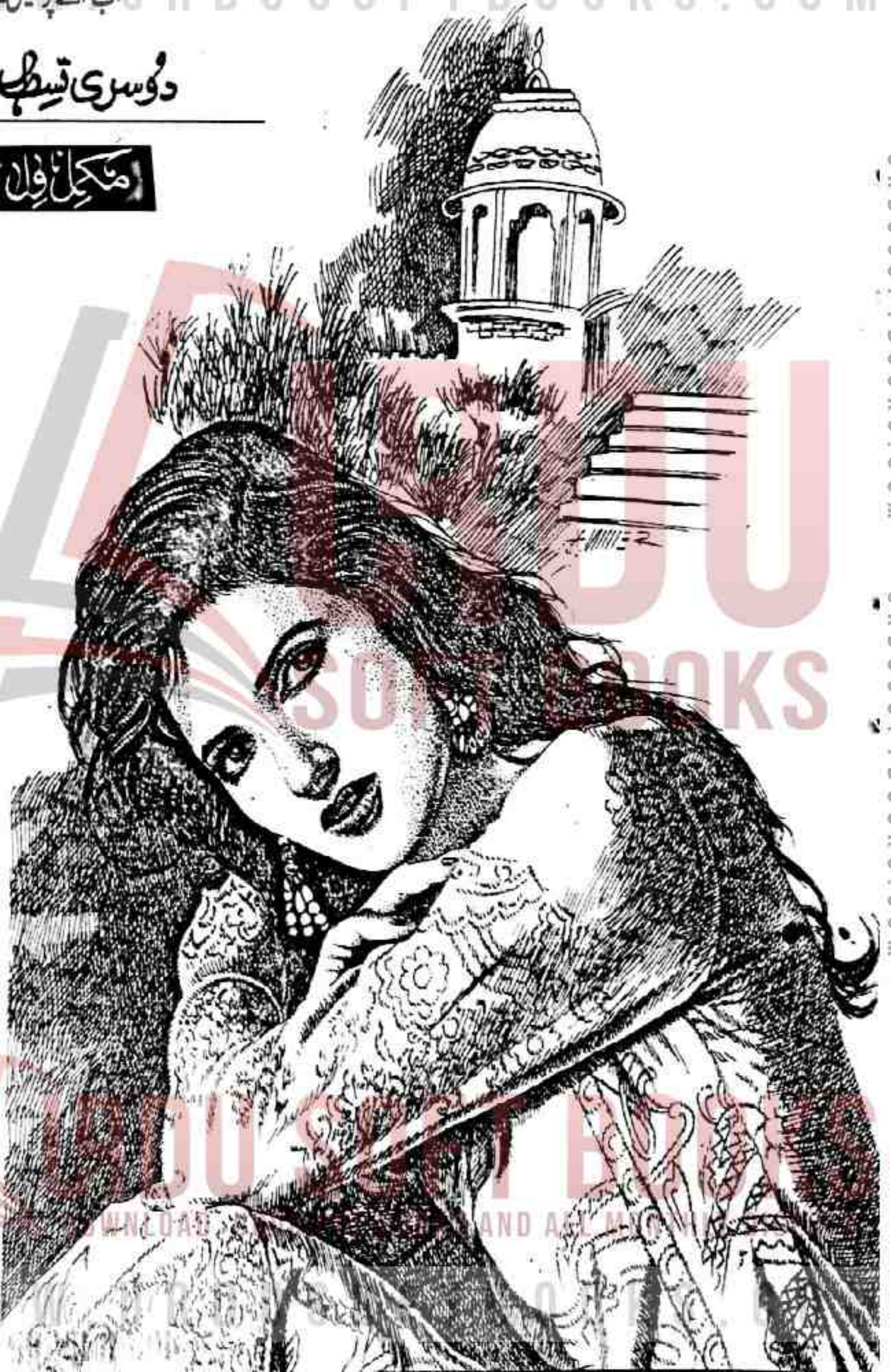
”تم نے سنا نہیں میں تمہیں نہیں جانتی۔۔۔“ اس کی روندھی آواز میں خار اگ آئے تھے۔ اتنے بڑے خار کہ مقابل کے بدن میں پیوست ہوتے دوسری جانب سے نکلنے لگے۔ انہی خاروں میں جکڑا اس کا دل تھا جو بے طرح سے چھلنی ہوا، ہر قطرے سے لہو ٹپکنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی تندی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مقابل بھی حیران تھا کوئی اتنا بھی بدل جاتا ہے۔

”میں تمہیں مزید لمحہ بھر بھی برداشت نہیں کر سکتی۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔“ خاروں میں آگ لگ گئی تھی جلتے خون کی بدبو میں سانس تعفن زدہ ہو گئی مگر اس وقت اس کے تعفن سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا اور وہ جانتی تھی یہ ڈھیٹ ہے کبھی نہیں جائے گا۔۔۔ مجھے جانا چاہیے۔ ٹیبل پر رکھا بیگ اس نے جھٹکے سے اٹھایا ساتھ رکھی کئی چیزیں بھی نیچے گر گئی تھیں۔ پھر اپنی چابیاں، موبائل اٹھایا دروازے کی جانب بڑھنے لگی اس نے ہمت کر کے اس کی کلائی پکڑ لی تھی جلتے خون کی لو اس کی کلائی تک پہنچی۔ اس کی آنکھوں میں اترا خون ٹپکنے کو بے قرار تھا۔ اس نے ایک رعونت بھری نگاہ سے اس کو دیکھا تھا پھر اس زور سے کلائی جھٹکی کہ اس کا مردانہ مضبوط ہاتھ اس کے پہلو میں آگرا۔ وہ دھاڑ سے دروازہ کھول باہر نکلی تھی۔ ٹھک ٹھک کرتی تیز چلتی جا رہی تھی اس کے شانوں سے نیچے تک آتے بال بغیر ہوا کے ہی ایسے اچھل رہے تھے جیسے تیز ہوا چل رہی ہو۔ اس کے ورکرز نے آج سے پہلے اسے کبھی نہ تو اتنی جلدی میں دیکھا تھا اور نہ ہی اتنے شدید غصے میں۔ جس طرح اس وقت تھی سب کی حیرت زدہ نگاہیں اٹھی تھیں۔

بائیں جانب کے دو رخی دروازے سے عینی باہر نکلی اس کے ہاتھ میں ایک گاؤن تھا۔ اس کی ڈیزائننگ کے بارے میں ایک دن پہلے دونوں نے ڈسکس کیا تھا کہ وہ اس گاؤن پر کٹ ورک کے ذریعے مغلی طرز کی کڑھائی کروائیں گی۔ جدید و قدیم سے طرز کا شرٹ گاؤن اسی سلسلے میں عینی پوچھنے کو آگے بڑھی مگر اس کے مزاج تندی دیکھ کر ایک قدم پیچھے ہو گئی۔ وہ خارجی دروازہ کھول کر کوریڈور عبور کر برقی سیڑھی پر تھی اور برقی سیڑھی پر بھی وہ ساکت کھڑی رہنے کے بجائے تیز تیز اسٹیپس اترتی جلدی نیچے پہنچ گئی۔ اندر کے شدید گرداب کو کم از کم اس پلازے میں بہانا نہیں چاہتی تھی گاڑی، اسٹارٹ کی، جبڑے شدید بھاری ہو گئے تھے آنکھیں دھندلانے لگیں۔ آنسو چھلکنے سے پہلے ہی اس کا موبائل چیخ پڑا روشن اسکرین پر ” School “ (اسکول) درج تھا۔ جادو کی چھڑی گھومی پچھلا منظر صاف ہو گیا۔ نئی آنے والی کال پر حیرت ہوئی تھی۔ آنسو اندر گر گئے اور موبائل آن ہو کر کان سے لگ گیا۔ رسمی ہیلو کے بعد ہی فکر سے اس کا منہ کھل گیا۔

”کب۔۔۔ کیسے۔۔۔ وہ ٹھیک تو ہے ناں۔۔۔ پلیز اسے اسپتال پہنچا ئیں میں آ رہی ہوں۔۔۔“ اس کے رکتے ہی پرنسپل نے اسپتال کا نام تک بتا دیا تھا۔

”اوکے۔۔۔ اوکے۔۔۔ آئی ایم کمنگ۔“ اس نے گاڑی کا رخ اسپتال کی جانب موڑ دیا تھا۔ پریشانی نے نیا روپ دھار لیا۔ ایک بار پھر سے موبائل نے تھرکنا شروع کیا اس نے روشن اسکرین کو دیکھا بالکل اٹھانے کو دل نہیں کیا جب تک وہ اسپتال پہنچی مسلسل کال آتی رہی بلا آخر اس نے اٹھا ہی لیا۔

”اب کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔۔۔“ وہ ترشی سے بولی تھی۔

”کہاں ہو تم۔۔۔ خدا کے لیے اس وقت ڈرائیو مت کرو۔۔۔ کوئی نقصان ہو جائے گا۔“

”نقصان ہو رہا ہے۔“ جواباً“ اس کی آواز غصے سے پھٹی وہ قدرے تحمل سے بولا۔

”جانتا ہوں۔۔۔ تم اس وقت جس کرب سے گزر رہی ہو۔۔۔ لیکن۔۔۔“ اس نے فوراً“ اس کا جملہ کاٹ دیا۔

”تم کچھ بھی نہیں جانتے۔۔۔ ہونہہ۔۔۔“ وہ چبا کر بولی۔ ”میں اس وقت اسپتال میں ہوں۔ رابی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اسے بلڈ کی ضرورت ہے اور میں اس وقت لیبارٹری جا رہی ہوں بلڈ دینے۔

اور۔" اس کی گیلی آواز سے لگتا تھا بہت سے آنسو اس نے ساتھ اندر اتارے ہیں۔ "اللہ کا شکر ادا کر رہی ہوں میری بیٹی کا بلڈ گروپ مجھ پر ہے، ورنہ آج مجھے اس شخص کی منتیں کرنا پڑتیں، جسے میں دوسری نظر دیکھنا نہیں چاہتی۔۔۔ کیوں کہ مجھے اپنی بیٹی کو زندہ رکھنا ہے۔"

فون کھٹ سے بند ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے پروسیسنگ یونٹ میں تھا جہاں بہت سی مشینیں بیک وقت چل رہی تھیں۔ یونٹ کے ہال نما کوریڈور میں خالص اسٹیل سے بنا ریمپ تھا جس پر تیزی سے پھسلتے مالٹے نیچے ایک پانی کے ٹب میں گرتے ایک چکر کھا کر ٹب انہیں چھلنی میں پلٹ کر پھر سے سیدھا ہو جاتا۔ نئے مالٹے آکر اس میں گر جاتے، خشک مالٹے سیدھی قدرے کم چوڑی پٹی پر چلتے چکی نما جو سر کی جانب سفر پر تھے۔ اسلام آباد سے آئے تین افراد کے وفد کو وہ ایک ایک کر کے تمام مشینیں دکھا رہا تھا۔ اس وفد کا یہ کوئی چوتھا چکر تھا خریدنے سے پہلے اس یونٹ کی مالیت اور اہلیت کو جانچ رہے تھے۔

"دیکھ لیں سر۔" حنبل ذکا نے مشینوں کی جانب اشارہ کر کے ہاتھ ڈریس پینٹ کی جیبوں میں ڈال لیے۔ "ساری مشینری آپ کے سامنے ہے۔۔۔ اگر آپ کو کچھ سمجھ آتا ہے تو پھر کلی (قانونی طریقے سے) شروع کرتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے سر ہلانے لگے۔

"یونٹ کی رننگ کو کتنے سال بتا رہے تھے، آپ۔"

سب سے بڑے والے نے پھر سے پوچھا۔

"چار۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" تینوں کا سر اثبات میں ہلنے لگا۔

"شہروز سے مشورہ کر لو۔" چھوٹے والے نے بڑے دونوں بھائیوں کو دیکھتے ہوئے کہا بڑے کے دل کو یہ بات لگی تھی اس نے فوراً "اپنا موبائل نکال کر کھٹ کھٹ نمبر ملایا تھا۔

حنبل ذکا نے چار سال پہلے جوس بنانے کا یونٹ شہر کے مضافات میں لگایا تھا۔ ان چار سالوں میں اس کی کارکردگی خاصی اچھی رہی تھی، لیکن روز بروز مقابلے پر نت نئے جوسز آنے لگے۔ کچھ ماہ پہلے ہی خیام ذکا کے ایک دوست نے مشورہ دیا تھا جرمنی کے اندر ایک فوڈ پلانٹ لگانے کا۔ اس کا اپنا بھائی وہاں چاکلیٹس ٹافیوں کا بڑے پیمانے پر بزنس کر رہا تھا یہ بات خیام ذکا کو تو اتنی سمجھ نہیں آئی جتنی جلدی حنبل ذکا کو بہتر لگی تھی۔ کیوں کہ گاؤں میں آئمہ بیگم کے بھائیوں کے بڑے پیمانے پر مرغیوں اور مچھلیوں کے فارمز تھے جن پر بہت اچھا امپورٹ ایکسپورٹ چل رہا تھا۔ حنبل ذکا بزنس کے معاملے میں اچھا خاصا ذہین تھا فوراً "کڑی کو کہیں سے کہیں جوڑ لیتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ جرمنی کے اندر لائیو اسٹاک محدود ہوتا جا رہا ہے، دوسری انڈسٹری جتنی تیزی سے اٹھ رہی ہے، لائیو اسٹاک اسی طرح گر رہی ہے۔ ذہن میں کوندا لپکتے ہی اس نے ریسرچ شروع کی تو بہت سی راہیں سامنے آئیں۔ پاکستان میں لائیو اسٹاک پالنا بے حد آسان اور سستا ہے اگر ان سے حاصل ہونے والا گوشت اور دودھ کو محفوظ طریقے سے جرمنی پہنچایا جائے اور وہاں پر کوئی پروسیسنگ یونٹ لگا کر ان کے کلچر کے مطابق کوئی پیکڈ غذا تیار کی جائے۔ بہت زبردست بزنس رہے گا۔

میر ذکا نے تو فوراً "اس معاملے سے ہاتھ اٹھا کر سب اس کے سپرد کر دیا کیوں کہ وہ صرف یا تو سیاست کر سکتے تھے یا پھر اپنے کھاتے چلا سکتے تھے، وہ بھی ہدایت اللہ اور اسلم کے ساتھ مل کر۔ البتہ ان کے بیٹے خاص کر حنبل ذکا کی کاروباری سوچ کا کینوس بہت وسیع تھا۔ وہ بہت دور دور کی کڑیاں فائدے نقصان ملا لیتا تھا۔ خیام ذکا نے بھی اس کے مشورے کو سراہا۔

"تم شروع کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اب وہ اسی پر کام کر رہے تھے۔

خیام ذکا چند ماہ جرمنی لگا کر آئے۔ وہاں یونٹ لگانے کے لیے جگہ۔ قانون اور لوگوں کے رویے

پرکھنے کے لیے اور یہاں پر زمین کا فالتو بڑا بہت بڑا حصہ میر زکا نے فروخت کر کے ان کے اکاؤنٹس میں ڈلوایا تھا تاکہ یہ کام جلد شروع ہو اور اسی یونٹ کو چلانے کے لیے شہر میں لگے۔ جو سی یونٹ پر توجہ کم رہ گئی تھی۔ اس کو فروخت کر دینے کا مشورہ حنبل زکا کا تھا۔ پھر اگلا قدم تیار مال کو ایک سال کے اندر اندر ختم کر کے آفس اسٹوریج کو سمیٹنا تھا۔ کاروباری معاملہ تھا۔ بہت مصروفیت چاہتا تھا اور وہ ان ہی کاموں میں الجھا ہوا رہنے لگا۔

"شہروز کا نمبر بند جا رہا ہے۔" اس نے کوئی تین بار ملانے کے بعد کہا۔ دفعتاً" حنبل زکا کا موبائل تھرکنے لگا۔ وہ "ایکسوزمی" کر کے سائیڈ پر چلا گیا۔ گھر سے خالہ گلزاری کی کال تھی۔

"جی۔ خیریت۔۔۔؟"

"بڑی بی بی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

"کیا مسئلہ ہے۔۔۔؟" اس کے لہجے میں یک لخت گھبراہٹ اتر آئی تھی۔

"پہلے کھانسی ہوتی رہی پھر بے سدھ پڑی ہیں۔۔۔ جواب بھی نہیں دے رہیں۔۔۔ سانس لمبی ہے۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ تم انہیں ہلا کر دیکھو۔" وہ بات کاٹ کر بولا تھا اور ازلان کہاں ہے۔۔۔ اسے بلاؤ۔۔۔ میں بھا جان سے رابطہ کرتا ہوں۔۔۔ اسپتال لے کر جائیں۔۔۔ مجھے تو پہنچنے میں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔" اس نے فوراً" کال کاٹ کر پہلے خیام زکا کو کی تھی۔ وہ حویلی ہی جا رہے تھے۔

"تم پریشان مت ہو' میں حویلی جا رہا ہوں۔۔۔ اگر اسپتال کی ضرورت ہوئی لے جاتا ہوں۔" خیام زکا کا لہجہ تسلی آمیز تھا' لیکن حنبل کو بہنوں سے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ خاص کر ماں جان کے حوالے سے اور شاید وہ اب تک زندہ بھی اسی لیے تھیں کہ جس طرح حنبل زکا ان کا خیال رکھتا تھا شاید ہی کوئی دوسرا رکھتا ہو۔ اس نے اپنی پارٹی کی گھر پر توجہ دینے کے بجائے اپنی آئمہ بیگم کو کی نگران کا فون مسلسل بجتا رہا۔ جھنجلا کر سلوی کے نمبر پر کی تھی۔ اس کا موبائل

ہاتھ میں تھا فوراً" ریسیو کیا تھا۔

"جی۔۔۔"

"آپ لوگ مال سے باہر آئیں' میں تھوڑی دیر میں پہنچنے والا ہوں۔"

"خیریت۔۔۔؟"

"ہاں۔ حویلی پہنچنا ہے' ماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ بھرجائی کو بتا دیں۔" اس نے کہہ کر کال کاٹی اور واپس ان تینوں کی جانب آیا۔ وہ قطعیت سے معذرت کر رہا تھا۔

"ایم سوری۔۔۔ میرے گھر پر ایمرجنسی ہے' آپ نے جس سے مشورہ کرنا ہے کر لیں۔۔۔ سوچ لیں' ایسی کوئی جلدی نہیں ہے ہم پھر بات کر لیں گے۔" حنبل زکا کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھی ابھی کشمکش و پنج میں ہیں ڈیلنگ فائنل کرنے کے بارے میں۔ انہیں اعتذار کرنے کی نوبت نہیں آئی مسکرا کر اس کی پیش کش کو سراہا۔ وہ ان سے مصافحہ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھتا تھا راستے میں اپنے منیجر کو ضروری ہدایات دیتا گیا۔

وہ ان کی بتائی جگہ پر پہنچ چکا تھا۔ بازار کی مصروف شاہراہ پر معمول کی طرح بھی ٹریفک اور لوگوں کا ہجوم تھا۔ مال کے خارجی ریمپ پر انہیں دیکھا تینوں چادروں میں لپٹی ڈھیروں شاپرز پکڑے۔

"اف کتنا خبط ہوتا ہے' خواتین کو شاپنگ کا۔ ان میں سے آدھا بھی یہ استعمال نہیں کریں گی۔" وہ گاڑی سے نکل کر لاک کر کے ان کی جانب بڑھا تھا اور فوراً" سامان کی جانب ہاتھ بڑھائے تھے۔

"لائیں مجھے دیں۔۔۔" حنبل زکا کی بہت سی خوبیوں میں آئمہ بیگم اس خوبی کی بھی معترف تھیں' گھر کی خواتین کو بوجھ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر اس کی جگہ خیام زکا ہوتے آدھا ہی اٹھاتے ساتھ ڈپٹ بھی دیتے' اتنا ضرور خریدنا تھا" اور ازلان اس سے تو یہ بھی توقع نہیں پوچھے بھی۔ اسے صرف اپنے مطلب کے سامان سے غرض ہوتی تھی۔ آئمہ اسے سامان پکڑاتے تشکر آمیز مسکرائی تھیں' جب کہ سلوی کے ہونٹوں پر بھی پراتی مسکراہٹ تھی۔ حویلی پہنچنے تک اس نے کئی

بار کال ملائی تھی راستوں میں سگنلز کے کم زیادہ ہونے کے سبب رابطہ ہونے سے پہلے ہی منقطع ہو جاتی اور پھر خیام زکا سے رابطہ ہوا تو وہ بالکل عام انداز میں بولے تھے۔

"ایسے ہی خواہ مخواہ پریشان ہو جاتے ہو اور دوسروں کو بھی کرتے ہو۔۔۔ ماں جان ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" اسے اچنبھا ہوا۔

"لیکن خالہ گلزاری تو کہہ رہی تھیں۔۔۔"

"دماغ خراب ہے خالہ گلزاری کا۔۔۔ دواؤں کے زیر اثر اونگھ آجاتی ہے' وہ جانے کیا سمجھ کر شور مچا دیتی ہے۔" خیام زکا کو خالہ گلزاری پر شدید غصہ تھا۔ اچھا بھلا ان کا شہر آکر فیکٹری کا چکر لگانے کا موڈ تھا۔ اب گھر آکر دوبارہ موڈ نہیں بن رہا تھا۔ آفس کے منیجر سے ہی بازپرس کرلی۔

رات کے کھانے پر سب لوگ میز پر جمع تھے۔ شہر سے واپسی پر اعشال نے سلویٰ کو واپس جانے نہیں دیا اور اسی کی موجودگی کے سبب خالہ گلزاری نے لڑکیوں سے اہتمام سے کھانا تیار کروایا تھا اور اتفاق سے سب اکٹھے کھانا کھا رہے تھے ورنہ کبھی کوئی غائب ہوتا تو کبھی کوئی۔ اسی اہتمامی دعوت کو دیکھتے خیام زکا نے میٹھے انداز میں کہا تھا۔

"میرے خیال میں بابا جان' سلویٰ کو یہاں ہی روک لینا چاہیے۔۔۔ اسی کی بدولت کھانے پر اہل خانہ سب اکٹھے ہیں۔۔۔ کیوں حنبل۔۔۔" انہوں نے تائیدی نگاہ حنبل کی جانب اٹھائی اور اسے محسوس ہوا تھا سب ہی کی منتظر نگاہ اس کی جانب اٹھی ہے اس نے کچھ کہے بنا ایک اچٹتی نگاہ سلویٰ پر ڈالی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ رہی تھی۔ اس نے نگاہ کا رخ پھیر لیا۔ میر زکا' خیام زکا کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے کہہ رہے تھے۔

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں۔۔۔ ہر کام کا وقت ہوتا ہے بھئی۔۔۔"

"اور کیا وقت ہوگا دولے کیا چاچو کے بالوں میں چاندی اگا کر زیور ہونا ہے۔" اولاد تو ایسی باتوں کے اشارے کنارے فوراً" سمجھ جاتا تھا جہاں تھوڑے سے ملے گلے کا ذکر ہو۔ یہ تو پھر اس کے اکلوتے چاچو کی شادی کا ذکر خیر تھا۔ اس کے سنجیدگی سے ادا کیے جملے پر سب ہنس پڑے تھے۔ سلویٰ کے سانولے رخسار دہک کر چمکنے لگے۔ آئمہ بیگم کے چہرے پر کچھ ایسا تاثر تھا جیسے ان کے دل کی بات کسی نے پوری توجہ کے ساتھ سن لی ہو۔ ویسے بھی اب اور کتنی گھڑیاں دیکھنا تھیں۔ ان دونوں کی غیر اعلانیہ منگنی کو ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ یہ بات سب کے ذہنوں میں پوری طرح راسخ تھی کہ سلویٰ کو حنبل کی دلہن بن کر اسی حویلی میں آنا ہے۔ آنے جانے پر اس کے پابندی اس لیے نہیں تھی نہ تو کوئی باقاعدہ رسم ابھی تک نبھائی گئی تھی پھر یہ حویلی کوئی اجنبیوں کی نہیں تھی۔ اس کی سگی بہن کا گھر اور مرحومہ پھوپھی کے بچے ادھر رہتے تھے۔ میر زکا' حنبل کی شادی بھی یقیناً" خیام زکا کی طرح بہت جلد کردیتے' لیکن حنبل زکا کو تعلیم میں بہت دلچسپی تھی۔ اس نے کسی بات کا سہارا لینے کے بجائے صاف اپنے منہ سے کہا تھا۔

"مجھے ایم ایس باٹنی کرنا ہے اور اس کے بعد اسٹرونگ ہونا ہے' بہتر جاب ملی تو جاب ورنہ کوئی بزنس۔۔۔" جاب ملی تو اسے بہت سی آفر تھیں' لیکن میر زکا نے اپنے خاندانی کام میں اسے شامل کیا' لیکن آڑھت کے کام کی اس نے تعلیم کے حساب سے شکل بدل دی تھی اور ان ہی الجھنوں میں اس کی شادی ٹلتی گئی۔ اب ایک اور دھن سما گئی تھی بیرون ملک بزنس چلانے کی جو بے حد مصروفیت مانگ رہا تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ سب کی نظریں اس کے جواب کی منتظر ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے لب ہلاتا۔ وہیل چیئر پر بیٹھیں ماں جان نے بمشکل اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا۔ سب کو دیکھتے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بولی تھیں۔

"تم۔۔۔ شادی کرلو۔۔۔" اس سہ لفظی جملے پر چار پانچ بار سانس ٹوٹی تھی۔ "دلہے بلاؤ گے یا خیام کی طرح۔۔۔" چچا منہ تک جاتا اس کا ہاتھ رک گیا تھا۔

ابھا۔ جو ہر دن جیسے ہر دیکھا بوڑھی آنکھوں میں بجھی جوت کا سایہ چہرے پر بیٹے سے جدائی کا کرب لوٹنیاں لگا رہا تھا۔ ان کی وہیل چیئر ہمیشہ کی طرح حنبل ذکا کے برابر تھی۔ شہر سے آتے ہی وہ اسلم کو سامان اتارنے کا کہہ کر تیزی سے ماں جان کے کمرے کی جانب بڑھا تھا۔ اس وقت تک وہ اٹھ چکی تھیں اور اسے دیکھ کر مسکرائیں بھی۔

"کیوں پریشان کرتی ہیں مجھے۔ جانتی ہیں میں کتنا پریشان ہو گیا تھا۔" نرم آواز میں اس نے دبا شکوہ کیا تھا۔ پہلے وہ کھانسیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہ پریشان ہوا کر۔ ابھی مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی تو میں نے اسے بھی دیکھنا ہے۔" خشک آنکھوں میں بھرتی نمی اس کا دل کاٹ گئی ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف کر لیا تھا۔ پورے گھر میں ماں جان اس کے لیے ایسی تھیں کہ وہ ان کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتا تھا۔ بس نہیں چلتا تھا ازمیر چچا کو اٹھا کر لے آئے۔ اس نے ان کو بہت دیر تک تسلی دی تھی، لیکن اب وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھیں بڑھاپا بھی بڑا عجیب ہے بالکل بچپن جیسا بات بات پر بے اعتبار، تسلی ہو جانے کے بعد اب پھر اس کی جانب ایسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھیں جیسے وہ بھی اپنی شادی پر خیام کی طرح ازمیر کو نہیں بلائے گا۔ زینب ہاتھ میں ساگودانے کا باؤل پکڑے انہیں چمچہ چمچہ کھلا رہی تھی، لیکن جیسے ہی انہوں نے بولنا شروع کیا۔ کھانے سے رخ پھیر لیا تھا۔

"ماں جی آپ کھانا کھائیں پھر دوا بھی لینی ہو گی۔" خود پر کنٹرول کرنے کے باوجود بھی میر ذکا کے اندر کی تلخی زبان پر آ گئی۔ حنبل ذکا نے ابرو اچکا کر ملتجی نگاہ سے دیکھا تھا کہ وہ چپ رہیں مگر وہ چپ نہیں رہے تھے۔

"مت سوچا کریں اسے۔ آپ کی بڑھتی بیماری کا سبب وہی ہے، فضول سوچوں میں خود کو ہلکان کرتی ہیں۔"

"کیسے نہ سوچوں۔" وہ ہانپتے ہوئے بمشکل کہہ رہی تھیں۔ "میرا بیٹا ہے وہ۔ میرا پیدا کیا تھا۔"

"اچھا۔" انہوں نے استہزا میں کہتے پلیٹ آگے سے سرکا دی۔ "اور میں۔ میں بیٹا نہیں ہوں، میرے یہ دو بیٹے آپ کے سامنے ہیں، خیام کا بیٹا آپ کا دم بھرتا ہے، ہم کھائی نہیں دیتے وہ بے دید جو کوسوں دور ہے اس کے لیے خود کو ہلکان کر رہی ہیں۔"

"بس بابا جان۔" اس کی التجائیہ نظروں کا جب میر ذکا پر کوئی اثر نہ ہوا تو وہ بہت ٹھوس انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا وہ بھی تلخ چہرہ بناتے چپ کر گئے۔ "میرا خیال ہے، رات ہمارے درمیان کوئی بات طے پائی تھی۔" وہ نہیں چاہتا تھا سب کے بیچ کوئی بدمزگی ہو مگر میر ذکا کے مزاج کا تغیر اسے چبا چبا کر یاد دہانی کروانے پر مجبور کر گیا تھا۔ خیام ذکا ایسے موقع پر اکثر ہی خاموش تماشائی کا روپ دھار لیتے چہرے پر ناگواریت کا تاثر ایک کے بعد ایک گزرتا رہتا۔ تینوں خواتین دم سادھے ایسے تھیں جیسے سلیمانی چادر لپیٹے کسی کو دکھائی نہ دے رہی ہوں۔ البتہ اذلان بے حد سنجیدگی سے کبھی دادا، کبھی چچا کے الفاظ و انداز بغور دیکھ رہا تھا۔ حنبل نے نیپکن سے ماں جان کے لرزتے ہونٹ تھپتھپا کر صاف کیے اور زینب کو اشارہ کیا تھا۔

"انہیں کمرے میں لے جاؤ۔" میر ذکا بھی کرسی دھکیل کر اٹھے کمرے کی جانب بڑھے تھے اسی پل اتنے ہی غصے میں حنبل ذکا اٹھا ان کے پیچھے بڑھا تھا تب خیام ذکا نے پیچھے سے آواز دی۔

"حنبل رک جاؤ۔ میں کسی وقت بات کروں گا، ان سے۔"

"اگر آپ انہیں قائل کر سکتے، تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی۔" وہ اپنے مخصوص جمے انداز میں بات کر رہا تھا۔ "آخر ایسا بھی کیا جرم کر دیا ازمیر چچا نے۔ اپنی بوڑھی ماں پر بھی ترس نہیں آتا۔ کیوں انہیں اذیت دے رہے ہیں یہ دونوں۔"

"میں نے کہا نا، میں بات کروں گا۔" خیام بات ختم کرنا چاہ رہے تھے مگر وہ ڈٹا ہوا تھا۔

"اور میں بھی جانتا ہوں، آپ بات نہیں کریں

گئے۔ میں بابا سے ہی نہیں چچا سے بھی دو ٹوک بات کروں گا۔ اگر وہ اب نہ آئے تو بعد میں بھی نہ آئیں، بابا نے تو کیا پابندی لگائی ہو گی جو میں لگاؤں گا۔ حویلی تو کیا پھر وہ شہر میں بھی قدم نہیں رکھ سکیں گے۔ ہونہہ، تماشا بنا رکھا ہے۔ جانے ان کے خون کی گرمائش کہاں ہے۔" کاٹ دار انداز میں کہہ کر وہ بابا کے بجائے اپنی اسٹڈی کی جانب بڑھ گیا تھا کیوں کہ جتنا اسے اس وقت غصہ تھا بات بنانے کے بجائے بگاڑ ہی سکتا تھا اور اس کے غصے کی وجہ یہی تھی کل رات کئی گھنٹے لگا کر وہ میرزا کو قائل کر چکا تھا کہ وہ چچا کو فون کر چکا ہے وہ آئیں گے، انہیں خود پر کنٹرول رکھنا ہو گا۔ اتنا کھپ جانے کے بعد پھر ماں جان کے سامنے وہی تلخ باتیں۔ اس کے قدموں کی دھمک میں گم ہوتے سراپے کو سلویٰ نے اسٹڈی میں بند ہوتے تک دیکھا تھا۔ پھر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"بڑا متلون مزاج بندہ ہے۔ اف!" پھر اس کے سراپے کا سحر سوچوں پر چڑھ گیا اور وہ جادو میں جکڑتی چلی گئی۔

٭ ٭ ٭

ٹھٹھرتی سردی کی اس شام نے ہر جانب اپنی سیاہی اتار دی تھی۔ تمام در و دیوار اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ سیاہ گھپ، سرد سناٹا اور ہڈیوں کو منجمد کر دینے والی اس خوف ناک سردی میں اس کا تن من، اپنی دہکائی آگ میں جھلس گیا تھا۔ جھلسے بدبودار کوئلہ نما بدن سے دھوئیں کا تعفن پھوٹ رہا تھا۔ یہ اسی کی بچھائی بساط تھی۔ مہرے ہارتے ہی اس پر الٹا دی گئی تھی۔ دوسروں کو گرم بھوبھلوں کے سپرد کرتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گرداب بھی بنائے ہیں جس میں پھنس کر پہلے وجود دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے پھر دور تک دیا جاتا ہے۔

٭ ٭ ٭

آج اس کا موڈ صبح سے ہی خوش گوار تھا۔ اس کا تک سک سے تیار ہونا کسی انہونی کا پتا دے رہے تھے۔ صبیحہ اسے کن انکھیوں سے دیکھتی رہی ایک ایک چیز میں اہتمام۔ رات آپنے بیگ میں بھی جن کپڑوں اور چیزوں کا بطور خاص اہتمام کروایا تھا اس سے اندازہ تو ہوتا تھا کہ وہ صرف ایک بزنس میٹنگ میں نہیں جا رہا شاید کوئی پارٹی یا فنکشن۔ بہرحال وہ سوال کر کے اس کے الفاظ سے بدمزا ہونا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی شہروز کمال نے حسب معمول کڑوی کسیلی سنائیں اس کی فلائٹ میں چند گھنٹے تھے اسی لیے جلدی جلدی ناشتا کر کے گھر سے نکلا تھا۔ ایئرپورٹ کے راستے میں اسے پک بھی کرنا تھا۔ جاتے جاتے وہ اسے کہہ گیا تھا۔

"اگر بھائیوں کی طرف جانا چاہو تو۔۔۔ چند دن کے لیے چلی جانا۔ لیکن میری واپسی سے پہلے گھر پر موجود ہونا چاہیے۔" اس کا ایک ہفتے کا پروگرام تھا اور ایک ہفتہ کافی تھا بہت عرصے سے وہ میکے بھی نہ جا سکی تھی۔ سو وہ اسی بہانے خوش ہو گئی۔ دوا لینے سے حبہ کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ بچیوں کے گھر آتے ہی اس نے بھائی کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔

صبیحہ وارڈ روب کھولے اپنے اور بچیوں کے کپڑے چیک کر رہی تھی۔ سوٹ کیس بیڈ پر رکھا تھا کچھ کپڑے رکھ چکی تھی، کچھ اپنے لگا کر دیکھتی اور تہ کر کے سوٹ کیس میں رکھ دیتی۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ باسی پھول کی طرح مرجھایا، بے رونق تھا، رات کے ملگجے کپڑے بکھرے بال، بالکل ایک عام عورت کی طرح۔ کہیں سے بھی وہ اپ ٹو ڈیٹ رہنے والے شہروز کمال کی بیوی نہیں لگ رہی تھی۔ حالانکہ یونی ورسٹی کے زمانے میں اچھی خاصی بولڈ اور پہناوے سے طریقے سلیقے والی لگتی تھی۔ کچھ بات کرنے کا انداز اس قدر خوب صورت تھا کہ شہروز کمال ملتفت ہوتا چلا گیا تھا۔ شادی کے بعد شہروز کمال کا رویہ بدلا اس کے چہرے کی رونق، بولڈنس، لیکن صبیحہ نے اپنے میکے میں بھی اس کے تلخ رویے کی بھنک پڑنے نہیں دی تھی۔ ہر موقع پر گھما پھرا کر اس کے رویے کو مصروفیت کی آڑ بخش دیتی۔ اس کی بھرپور کوشش تھی جو چھپا

ہے' چھپا رہے خواہ مخواہ اذیت دینے سے کیا حاصل۔ مردوں کے رویے سے وہ بچپن میں آشنا ہو چکی تھی۔ باپ کم ظالم تھا۔ بات بے بات ماں کو ذلیل کرو دیتا تھا۔ اک ناکردہ گناہ کی سزا۔ کسی لمحے بھی وہ یہ نہیں بھولتا تھا۔ سبرینہ کی گھٹی میں ماں نے ایک بات گھوٹ دی تھی۔

"اپنی جان دے دینا' لیکن اپنا گھر ٹوٹنے مت دینا' بھلے کسی حد تک جانا پڑے' ٹوٹے ہوئے گھر کی عورت اس خوب صورت ٹوٹے برتن کی طرح ہوتی ہے' جسے پھینکنے کو دل بھی نہیں کرتا اور استعمال کے قابل بھی نہیں رہتا۔" بے شک ماں اب زندہ نہیں تھی' لیکن اس کی پلائی گئی باتیں دل میں بس گئی تھیں۔ بس ایک چپ سو سکھ۔۔۔ اسی لیے شہروز کمال کی باتیں' رویہ خاموشی سے اندر اتار لیتی۔ صرف گھر کو بچانے کے لیے۔ اس نے آف وائٹ قمیص اپنے لگا کر تنقیدی جائزہ لیا۔ فرنیچر کی ڈسٹنگ کرتی نسیم سے ویسے ہی مشورہ مانگ لیا تھا۔

"کیا خیال ہے نسیم یہ ٹھیک لگ رہا ہے ناں۔۔۔" اس نے مسکرا کر بیڈ پر رکھے ہرے سوٹ کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"یہ والا پہن لو۔۔۔ ہرا۔۔۔ اللہ آپ کو ہرا بھرا' سدا سہاگن رکھے۔۔۔ سب سے اچھی لگو۔۔۔"

"باہر تو تب اچھا لگے نسیم' جب اندر اچھا ہو۔۔۔" پھیکے لہجے میں درد کی آمیزش تھی۔ آف وائٹ سوٹ بھی بیڈ پر رکھ دیا۔ نسیم جھاڑن سے میز چمکا کر اس کے قریب آ بیٹھی۔

"ایک بات بتاؤں سبرینہ بی بی۔" سبرینہ کے متوجہ ہونے پر وہ رازدانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"ایک آیت کلام پاک ہے۔۔۔ حضرت زکریا کی دعا۔۔۔ "ربی لا تذرنی فردا وانت خیر الوارثین" "اے رب مجھ کو لاوارث مت رکھ' اور سب وارثوں سے بہتر وارث آپ ہیں" میں نے جس جس کو بتائی یقین مانو اللہ نے نوازا' پورے دل دھیان کے ساتھ نماز کے بعد چلتے پھرتے اللہ سے فریاد کرو وہی رب ہے سننے والا جس نے اپنے بندے کو بوڑھا اور بیوی کو بانجھ ہونے کے باوجود وارث عطا کیا' وہ تمہاری بھی سنے گا۔"

"اف!" سبرینہ نے لمبی تو بھری تھی۔ "میں بھی سوچ رہی ہوں' کوئی ورد شروع کروں۔ چلو کل سے فجر شروع کرتی ہوں پھر پڑھا کروں گی۔"

"ہائے ہائے۔۔۔" نسیم گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھتے تاسف سے بولی تھی۔ "یہی کل کی فجر شروع کرنے کے چکر میں' زندگی کی کل ہو جاتی ہے اور اس پر قل۔۔۔ کل والی فجر نہیں آتی۔۔۔ ضروری تھوڑی ہے فجر سے نماز شروع کرو۔۔۔ جب ارادہ کر لیا جس نماز کا وقت ہے ادا کر لو' فجر کا وقت بھی آجائے گا۔" اس کے تاسف میں کچھ ملامتی آمیزش تھی جس نے سبرینہ کو قدرے شرمسار کیا تھا۔

"کیا کروں نسیم' دل بہت کرتا ہے نماز ادا کرنے کو' مگر یکسوئی نہیں ہوتی' ہزار جگہ دماغ بھٹکتا ہے۔ مسئلے بھی تو دیکھو میری زندگی میں' ایک کے بعد ایک۔۔۔ ساری نماز الجھنوں میں خراب ہو جاتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔" اسے اچنبھا ہوا۔ "راستوں میں گند دیکھ کر مسافر راستہ نہیں بدلتا' بلکہ خود کو بچا کر گزر جاتا ہے بی بی وسوسے تو شیطان کا پھیلا گند ہیں' اب مرضی ہے بیٹھے گند پر کوستے رہو یا تیزی سے گزر جاؤ۔۔۔ اور وہ بھی تو ہیں جو گند کو اٹھا کر جگہ صاف کر لیتے ہیں۔" نسیم اٹھ کر کھڑکیاں دروازے صاف کرتی باہر نکل گئی تھی۔ کچھ دیر میں نسیم واپس آئی تھی سبرینہ جہاں کی تہاں بیٹھی تھی۔

"نیچے فون ہے آپ کا۔۔۔" سوچ کا ارتکاز ٹوٹتے ہی آنکھوں میں ناگواریت ابھر آئی۔

"لوگ بھی ناں۔۔۔ موبائل پر نہیں کرتے اب نیچے جاؤ سننے۔۔۔" کمرے سے نکلتے ہی پہلا خیال اسکول کا آیا کیوں کہ میڈم ہمیشہ لینڈ لائن پر کرتی تھی اور پھر یاد آ ہی گیا اس کا موبائل چارجنگ پہ ہے صبح سے گڑبڑ کر رہا ہے۔ اس نے فون اٹھایا اور آواز سنتے کھل سی گئی تھی۔ اس نے آج بہت عرصے بعد فون کیا تھا۔ بچپن سے دوستی تھی گاؤں کی باتیں ہوتے ہوتے اتنی طویل

ہوئیں کہ وقت کا بھی پتا نہ چلا۔ سبرینہ کی ہر بات گھوم پھر کر شہروز کے رویے پر ختم ہو جاتی۔ واحد وہی ایسی سہیلی تھی جس سے وہ یہ بات ڈسکس کر لیتی تھی۔ اس کی محویت داخلی دروازہ دھاڑ سے کھلنے پر ٹوٹی۔ شہروز کمال گھر میں داخل ہوا تھا۔ ستا ہوا چہرہ اور آنکھوں میں کرو فر بھرا لگتا تھا وہ اندر تک لرز گئی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت وہ بے حد خوش باش تھا اس کی خوشی آدھے راستے میں ہی کافور ہوگئی۔ جب چمکتی اسکرین دیکھ کر سرور میں موبائل کان سے لگایا تھا۔ "ہیلو" کے ساتھ ہی اسے پس منظر کی آوازوں نے چونکا دیا۔

"یہ کہاں ہو تم... کیسا شور ہے۔"

"سر یہ میرے ہونے والے گناہوں کا شور ہے... لیکن اب میں کہیں نہیں جا رہی... مجھے لینے مت آئیں۔"

"واٹ نان سینس... کیا کہہ رہی ہو... میں تم سے نکاح کروں گا... ہوٹل میں بکنگ کروا چکا ہوں۔"

"ہونہہ نکاح..." اس کی بیٹھی آواز پھٹ گئی۔

"اس چند دن کے نکاح کی حیثیت میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی... کسی عورت کے ارمانوں پر اپنا محل تعمیر کرنے لگی تھی... اس محل کی بنیاد میں میرے باپ کی قبر بن گئی ہے سر... میرا باپ مر چکا ہے۔ سبرینہ کی آہ نکلنے سے پہلے ہی میرا واحد سہارا بھی چھین گیا۔" وہ بے تحاشا روتے بے سروپا بول رہی تھی۔ اس کے باپ کا سن کر شہروز کمال کی آواز قدرے ڈھیلی ہوگئی اور اندر غصہ بھی اٹھا۔

"اس بڈھے نے آج ہی مرنا تھا۔"

"دیکھو بےبی... مجھے افسوس ہوا تمہارے والد کا سن کر... لیکن انسان کیا کر سکتا ہے۔ بہرحال تم خود کو سنبھالو... ہم اپنا پروگرام اگلے ہفتے پر ملتوی کر دیتے ہیں۔"

"سر میں نے کہا ناں... مجھے اب کہیں نہیں جانا۔ بے شک نوکری سے نکال دیں۔ اب نوکری کی ضرورت نہیں رہی۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ یک دم کڑواہٹ سے بھر گیا۔ "اگر میں تم سے نکاح کر رہا ہوں تو اس کی پیشگی ادائیگی کر چکا ہوں... جانتی ہو ناں تم مجھے۔"

"ہاں جانتی ہوں... آپ آئیں اور سب لوگوں کے بیچ مجھے ذلیل کریں' میں اسی قابل ہوں۔ جب گھر کی بیٹیاں چوروں کے لیے دروازے کھول دیں' ڈاکے اور قتل تو ہوتے ہیں... آپ مجھے قتل کر دیں' مار دیں مجھے جان سے..." اس کے ہذیانی چلانے پر شہروز کمال نے دو حرف بھیجتے فون پٹخ دیا۔ اسے اس کے ارادوں پر شدید غصہ تھا۔ اس کے باپ کے علاج اور دوسری ضرورتوں پر بہت سی رقم لٹا چکا تھا صرف اور صرف ایک خوب صورت کم عمر لڑکی کا ساتھ' بیٹے کی تمنا... وہ انکار پر آگ بگولا ہو گیا۔

"چلو ٹھہر کر دیکھ لوں گا۔" خود کو تسلی دیتا وہ گھر پہنچا... غصہ ابھی بھی وجود میں دہک رہا تھا اوپر سے سبرینہ کا تھکا دینے والا حلیہ اس نے ایک تنفر سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی اس کے ہاتھ میں فون بمشکل سنبھالا۔

"خیریت... گئے نہیں..." سبرینہ کی گھٹی آواز میں حیرانی تھی۔

"کیوں... تمہیں ہر بات بتانے کا پابند ہوں میں... اور یہ فون پر کس سے باتیں کر رہی ہو..." اس کے ہاتھ میں ریسیور دیکھ کر قریب آیا۔ ہاتھ سے جھپٹ کر اپنے کان کو لگایا وہ ادھر پوچھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے سبرینہ خیریت تو ہے... یہ تمہارے شوہر کی آواز ہے۔" اس نے تنفر سے فون اس کے اوپر پٹخا میز کو ٹھوکر مار زینے کی جانب بڑھا تھا۔ سبرینہ کی سیاہ آنکھیں پانی سے ڈبڈبا گئیں۔

☆ ☆ ☆

اسپتال میں معمول کے مطابق رش تھا اور وہ ریسپشن پر ڈسچارج کی ادائیگی کر رہی تھی۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی وہ اس کی جانب گھوما۔ اسے کسی قدر غصہ بھی تھا۔ رانی کے اسپتال کا سن کر وہ بے طرح بوکھلا گیا تھا۔

کتنی بار اسے کال کی' اسپتال کا نام پتا کرنے کے لیے' لیکن وہ اٹھائے تب ناں۔ اب وہ سارے اسپتال چیک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بھی فون ڈیش بورڈ پر رکھا چھوڑ کر ایمر جنسی کی جانب بڑھی تھی پھر وہاں ڈاکٹرز اور خون کے سلسلے میں اسے فون کا خیال تک نہیں آیا۔ خون دینے کے سلسلے میں بھی اکیلے فرد کو دیکھ کر لیبارٹرین رسک نہیں لیتے خون لینے کا۔ اب کیا دوبارہ رش کو چیرتی پارکنگ تک جائے اور فون کرکے یہاں کسی کو بلائے۔ اوپر سے اسلام آباد کے رستے جہاں بسا اوقات تیس منٹ کا رستہ منظم ٹریفک اور کھلے اشارے ملنے کی وجہ سے بیس منٹ میں بھی طے ہو جاتا ہے وہاں اکثر و بیشتر سرکاری وفود کی آمد و رفت اور پروٹوکول ٹھنوں کے حساب سے ٹریفک بند رہنے سے تیس منٹ تین گھنٹے میں بدل جاتے ہیں اسی لیے اس نے وہاں ہی ایک بوڑھے شخص سے مدد لے کر اپنا اٹینڈنٹ بنایا اور خون دیا تھا۔ خون نکلنے میں کم البتہ لگنے میں اچھا خاصا وقت لگا تھا اس دوران ڈیش بورڈ پر اس کا موبائل مسلسل بجتا رہا۔ تنگ آکر اس نے اسکول کا رخ کیا تاکہ وہاں سے پتا کرے تب وہ وہاں پہنچا۔ وہ گود میں رابی کو سنبھالے خارجی دروازے کی جانب بڑھی۔ اسے وہاں دیکھ کر ذرا حیرت نہیں ہوئی تھی وہ ایسے ہی اس کا پیچھا کرتے پہنچ جاتا تھا۔ اس نے ایک خفا نگاہ اس پر ڈالی اور رابی کو اپنی گود میں لے لیا۔

"کیسے ہوا یہ سب۔"

"سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔"

"آیا۔ ٹیچرز کہاں تھیں۔" اس کے لہجے میں غصہ تھا۔ رابی کے سر پر بندھی پٹی پر اس نے بوسہ لیا۔ بچی نے کسمسا کر منہ اس کی گردن میں چھپا لیا۔

"لوگوں کی موجودگی میں بھی حادثات ہو جاتے ہیں۔" اسپتال کے احاطے سے باہر آچکے تھے تب اس نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا۔

"بلڈ تم نے دیا ہے۔"

"پیدا بھی میں نے ہی کیا تھا۔ اکیلے۔" وہ بہت سرد لہجے میں بولی تھی۔ وہ گہری سانس لیتا لمحہ بھر رک گیا۔

"میں گاڑی لایا ہوں' میرے ساتھ چلو۔ یہ بعد میں آجائے گی۔" وہ اپنی گاڑی کا لاک کھول کر آرام سے بیٹھی۔

"میرے پاس اپنی سواری ہے' میں جا سکتی ہوں۔ تم رابی کو پیچھے لٹا دو۔" وہ سامنے سے چکر کھا کر دوسری جانب سے آبیٹھا تھا۔

"تم نے کبھی نہیں مانی' ہمیشہ اپنی مرضی کرتی ہو۔" اس نے اچٹتی ناگوار نگاہ اس پر ڈالی تھی اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ جواب ندارد تھا۔

"خفا ہو۔" وہ مخل ہوا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو اور کیوں' یہ بھی۔"

"میرا یقین کرو' اسے بلانے کا مقصد قطعاً" تمہیں ٹیس کرنا نہیں تھا تم۔"

"پلیز۔ پلیز۔" اس کا لہجہ بہت سخت ہو گیا تھا۔ "میں مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی' کیوں بار بار ماضی کو سامنے لا کھڑا کرتے ہو۔ تمہیں رحم نہیں آتا مجھ پہ۔ ذرا سا بھی۔" ان کی آوازوں پر رابی ڈسٹرب ہو کر کسمسانے لگی۔ وہ اب اس کو پیار کرتا اس کا حال پوچھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کئی دنوں سے بہت کھوئے کھوئے سے تھے۔ بہت بہت دیر گھر کے باہر لگی ریلنگ پر کھڑے خالی خالی نگاہوں سے ادھر ادھر تکتے رہتے کتنے منظر آنکھوں میں ابھرتے' دھندلاتے' مٹ جاتے۔ جب کسی کام کی غرض سے رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھتے بہت بہت دیر بیٹھے رہتے نہ کتابوں میں دل لگ رہا تھا نہ ہی اسکول میں۔ مریم بالکل مخل نہیں ہو رہی تھیں وہ سب تو جانتی تھیں۔ اس دن فورسٹ میں آنے والے فون پر کیا گفتگو ہوئی ہوگی کسی حد تک انہیں اندازہ تھا بار بار کرید کر گزند پہنچاتا وہ بھی ازمیر کو اس کا تصور بھی وہ نہیں کر سکتی تھیں۔ رات کے اس پہر ازمیر گھر کے باہر لگی ریلنگ پر بچھی کرسی پر بیٹھے تھے ٹانگیں لمبی پھیلا کر

چھوٹی سی پلاسٹک کی بنی تپائی پر پھیلا رکھی تھیں۔ مریم نے کافی کے دو مگ لا کر تپائی پر رکھے۔ ازمیر نے ابرو اٹھا کر اچٹتی نگاہ ان پر ڈالی وہ برابر کرسی پر بیٹھ رہی تھیں۔ شال پھیلا کر کندھوں پر برابر کی شال میں دبے بالوں کے سرے ایک ہاتھ سے نکال کر پشت پر پھیلا لیے۔ ازمیر کو مگ تھما کر اپنا اٹھا لیا۔ ٹانگ پر ٹانگ جمی تھی اور نگاہیں نادیدہ مناظر پر۔۔۔ وکٹوریہ کے سمندر سے وقتاً" فوقتاً" اٹھتی ٹھنڈی ہواؤں سے اس کے سنہرے بال پیچھے سے آگے کی جانب آتے۔ کئی بار پیچھے اڑسنے پر بھی وہ اڑ رہے تھے مریم نے سمیٹ کر بائیں کندھے کے سامنے ڈال لیے جدھر ازمیر بیٹھے تھے۔ گرم کافی کی چند چسکیاں لینے کے بعد وہ بہت مستحکم لہجے میں بولی تھیں۔

"تم ان سے مل کیوں نہیں آتے۔" انہوں نے چونک کر دیکھا تھا۔ نہ انہوں نے فون کے متعلق کوئی بھی بات اس سے کی تھی اور نہ ہی مریم نے کچھ بھی پوچھا تھا۔ پھر ایسا کیا تھا اس عورت میں' ازمیر کی آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر تک کا حال جان جاتی تھی۔ وہ اپنی کہنی کرسی کی ہتھی پر جمائے اپنی ادھ کھلی مٹھی پر ٹھوڑی رکھے مسلسل ان کا چہرہ تک رہی تھیں۔ انہوں نے پھر سے گردن پھیر کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا۔

"وقت کی گرد ماضی کو دفنا دیتی ہے ازمیر۔" مریم کا لہجہ ٹھہری ندی جیسا سکون بھرا تھا۔ "ہو سکتا ہے میرزکا ماضی دفنا چکا ہو' تم بھی بھول جاؤ پھر اپنی ماں کا سوچو' اپنی انا کی سزا انہیں مت دو' ایک بار مل آؤ۔ تمہیں' انہیں دونوں کو سکون آجائے گا۔"

"ماضی دفنا کر میں ملنے گیا تھا۔ تم بھول رہی ہو شاید۔"

"تب میں اور اب میں بہت لمبا عرصہ ہے۔" مریم کے سپاٹ انداز پر اک بار پھر تھکی نگاہ سے اسے دیکھا۔ وہ پھیکا سا مسکرا دیں۔

"انا تو نہ۔۔۔"

"انا نہیں یہ میری قسم ہے۔"

"قسم کا کفارہ ہے۔۔۔ اور تمہاری قسم تمہاری ماں کے انتظار سے زیادہ اہم نہیں ہوگی۔" نا چاہتے ہوئے بھی ان کا تائیدی سر ہلا۔ کافی کے آخری گھونٹ ایک ساتھ اندر انڈیل کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆ ☆ ☆

حویلی کے داخلی دروازے کے ساتھ مڑتے برآمدے کی جانب بنے مہمان خانے میں اس وقت میر زکا اپنے سیاسی احباب کے ساتھ براجمان تھے۔ الیکشن میں ویسے تو کئی ماہ تھے' لیکن سیاسی گرما گرمی چلتی ہی رہتی تھی۔ حنبل زکا شہر فیکٹری سے آیا تھا۔ مہمان خانے سے آتی آوازوں پر کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔ میر زکا بہت اچھے موڈ میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے وہ بھی سلام کرتا اندر داخل ہو گیا۔

"ہاں ہاں آؤ حنبل۔" وہ سب سے مصافحہ کر کرسی پر بیٹھتے ہی ٹانگ پر ٹانگ چڑھا لی۔ بہت خاموشی سے بابا کی بات سن رہا تھا۔ وہ سامنے بیٹھے ایک دوست سے کہہ رہے تھے۔

"تم لوگ چک جنوبی کے چوہدری سے بات کرو۔۔۔ اگر معافی وغیرہ مانگنی پڑتی ہے تو میں ساتھ چلنے کے لیے حاضر ہوں۔" انہوں نے اپنا ہاتھ سینے پر پھیلاتے پورے وثوق سے کہا تھا۔ "معافی مانگ لینے سے ہم چھوٹے نہیں ہو جائیں گے۔ اس چک میں بہت بڑا ووٹ ہے اور پھر غلطی بھی ہماری تھی۔۔۔ ہم نے ہی ان کی سڑک میں رخنے اڑائے تھے۔ ایسا کرو تدبیر رانا تم آج ہی جاؤ۔" پھر کچھ توقف کے دوران سوچتے ہوئے بولے۔ "بلکہ تم ایسا کرو۔۔۔ ایک سڑک کے لیے درخواست لکھوا کر ساتھ لے جاؤ دستخط وغیرہ کرواؤ۔۔۔ خوش ہو جائیں گے۔ میں خود ان کی درخواست آگے پہنچاؤں گا۔" قطعیت سے کہتے انہوں نے بات ختم کی۔ تدبیر رانا اور اس کے ساتھی اجازت لے باہر کو نکلے تھے۔ ہدایت اللہ اور اسلم جو کھانے پکڑے تیار کھڑے تھے۔ میر زکا کو فارغ دیکھتے ہی کھانے پھیلانے کو آگے بڑھے۔ حنبل زکا نے انہیں ہاتھ سے روکا اور

باہر نکلنے کا اشارہ کیا تھا۔ تابعداری سے ہاتھ باندھے وہ آگے پیچھے نکلے تھے۔

وہ ایک ٹک باپ کو دیکھ رہا تھا ان کا موڈ اور گفتگو خاصی حوصلہ افزا لگی تھی۔ دو دن پہلے اس سے ماں جان نے بے حد اصرار کرتے ہوئے کہا تھا۔

"حنبل۔۔۔ بچے صرف تو ہی کوشش کر سکتا ہے۔۔۔ مجھے ازمیر کو دکھانے کی۔۔۔ صرف ایک بار۔۔۔ ایک بار آجائے۔۔۔ مرنے سے پہلے اسے دیکھ لوں۔" اتنا لمبا جملہ بولنے پر دھونکنی کی طرح چلتی سانسوں نے حنبل ذکا کو کاٹ کے رکھ دیا اس نے فوراً" چچا کو پھر کال ملائی تھی۔ رسمی جملوں کے بعد ایک ہی بات۔

"کیا پروگرام بنایا آپ نے۔"

"ہاں میں آرہا ہوں' اپنی فیملی کے ساتھ۔۔۔" ان کے مضبوط انداز پر اسے خوشی ہوئی تھی۔

"ضرور۔۔۔ موسٹ ویلکم۔۔۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ خاص طور پر ماں جان۔۔۔"

"میں جانتا ہوں۔" پل میں ان کا لہجہ بے تاثر ہو گیا تھا۔ "اور میں ان ہی سے ملنے آرہا ہوں۔ میرا بھائی تو شاید مجھے برداشت نہ کرے۔"

"آپ انہیں برداشت کر لیں گے۔" وہ بات کرتا کمرے سے نکل گیا تھا۔

"حنبل یہ بات مت کرو۔۔۔ میں نے بہت برداشت کیا ہے۔"

"چچا۔۔۔ برداشت انہوں نے بھی بہت کیا ہے۔ لیکن۔۔۔" اس نے توقف کے دوران آواز میں استحکام بڑھایا۔ "آپ دونوں نے مل کر اس برداشت کا کوئی حل نہیں نکالا' اپنی ماں کو امتحان میں ضرور ڈالا ہے۔۔۔ بہرحال آپ آئیں ہم پورے دل سے آپ کے منتظر ہیں۔" پہلے جیسے رسمی جملوں کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ اب وہ جلد ہی آئیں گے۔ ان کے آنے سے پہلے بابا جان کے موڈ کو سازگار بنانے کا یہ موقع بہت اچھا تھا۔ اس نے مسکرا کر تالی بجائی تھی۔

"واہ بابا جان۔۔۔ مجھے آپ کی گفتگو نے متاثر کیا۔"

"میں سمجھا نہیں۔۔۔" انہوں نے اخبار کھول کر میز پر پھیلا لیا۔

"یہی معافی مانگ لینے سے کوئی چھوٹا نہیں ہوتا اور یقیناً" معاف کر دینے والا تو بالکل چھوٹا نہیں ہو سکتا۔۔۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بھائی کو۔۔۔"

"کیا جتانا چاہ رہے ہو تم۔۔۔"

"سمجھ کر بھی انجان بن رہے ہیں۔"

"حنبل تم میرے بیٹے ہو۔۔۔ باپ مت بنو۔" اس کے بھرے رخسار استہزائیہ پھیلنے سے گھنی سیاہ مونچھوں کے نیچے تاسف سمیٹ گیا۔ وہ گردن اٹھائے باپ کو دیکھ رہا تھا کہنی کرسی کی ہتھی پر جمی تھی انگشت لبوں پر ٹھوڑی کے نیچے انگوٹھا دیا تھا۔

"جب باپ بچوں کی طرح بے جا ضد کرنے لگیں تو انہیں سمجھانے کے لیے بچوں کو باپ بننا پڑتا ہے بابا۔۔۔" میرزکا نے اخبار بند کرتے اسے گھور کر دیکھا وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں جمائے بھرپور تاثیر لہجے میں جما جما کر بول رہا تھا۔

"وہ چند دن کے لیے آئیں گے۔ چلے جائیں گے نہ چاہتے ہوئے بھی خوش مزاجی کا ڈرامہ کر لیجئے گا۔"

"میرا خیال ہے' حنبل ذکا' میں چند دن کے لیے یہاں سے چلا جاتا ہوں تاکہ تمہیں خفگی کا موقع نہ ملے۔"

"آپ کے اسی خیال سے مجھے اختلاف ہے۔۔۔ ایک بیٹے کی آمد پر دوسرا ناراض ہو کر چلا جائے۔ آپ کو ترس نہیں آتا' اپنی بوڑھی ماں پر۔۔۔ پرانی رنجشیں دفنا دیں پلیز۔۔۔ وہ آپ کے بھائی ہیں' آپ کا خون' بچپن میں کبھی تو آپ نے ساتھ کھیلا ہو گا' کھایا ہو گا' پہنا ہو گا۔۔۔ کچھ یاد نہیں آتا اگر کبھی میں اور خیام بھا ایسے دور ہو جائیں آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔"

"اچھا بس کرو میرے باپ۔۔۔" اپنی ہار تسلیم کرتے انہوں نے غصے سے ہاتھ جوڑے۔ "آ جانے دو۔ نہیں کوئی مارتا اسے۔۔۔"

"کوئی تو مانے بھی نہیں ہے۔۔۔ میں اپنے باپ کو قاتل نہیں دیکھ سکتا۔" وہ اب ان کی برداشت سے باہر

ہوتا جارہا تھا انہوں نے گہری سانس بھرتے ہوئے آنکھیں سختی سے بند کرکے کھولیں۔

"وہ آئے گا' میں راستے میں بانہیں کھول کر کھڑا ہو جاؤں گا' سینے سے لگاؤں گا' معافی مانگوں گا' پاؤں پکڑ لوں گا۔ اتنا بہت ہے یا اور بھی کچھ چاہتے ہو۔" ان کے اکتاہٹ بھرے انداز پر جبل ذکا کا بھرپور قہقہہ نکل گیا تھا۔

"بس بس یہ بہت زیادہ ہو گیا۔۔۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں ماں جان کے سامنے کوئی بدمزگی نہ ہو۔"

"آپ بڑے ہیں۔۔۔" اس نے ٹانگ سے ٹانگ اتاری اٹھ کر مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ "دل کو کشادہ کریں' معاف کردیں' پورے دل سے نہ سہی ادھورے دل سے سہی۔" کسی فاتح کی طرح بازو کھول کر ان کے گلے لگ گیا تھا۔ اس کے پشت پر جاندار تھپکی لگاتے ہوئے آج پہلی بار میر ذکا کو پتا چلا وہ صرف قد میں ہی نہیں خیام ذکا اور ان سے بڑا ہوا ہے' سوچ میں بھی ہو گیا ہے۔

☆ ☆ ☆

سارے گھر میں اک افراتفری کا سامان تھا۔ وہ سارا سارا دن بازاروں میں گھوم کر ڈھیروں شاپنگ کرتیں رات کو بیٹھ کر دیر تک اس شاپنگ پر بحث اور خرچے کا اندازہ لگاتیں۔ اتنا کچھ مزید لینے کے باوجود کسی صورت عائشہ کی تسلی نہیں ہو رہی تھی گھر کی پہلی خوشی تھی اسی لیے جوش بھی خوب تھا اوپر سے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگر کسی دن بازار نہ جانا ہوتا اس دن گھر کے ساز و سامان کی خیر نہیں ہوتی تھی بانو کو لے کر کبھی کہیں کی صفائی کبھی کہیں کی۔ ایک ایک کو ناچ نچا کر بھی رضا حیات سے بہت خفا تھیں۔

"کیا جاتا اگر' وائٹ واش کروا دیتے" گھر کے فنکشن پر تو ساری دنیا کرواتی ہے۔۔۔ لیکن بس' ایک میرا میاں۔۔۔ اور اس کی کنجوسیاں۔"

"او بیگم۔۔۔ ابھی تو صرف منگنی ہے' منگنی پر ہی اتنا خرچا کروا دیا۔"

"کیا خرچا بھئی۔"

وہ سارا کام چھوڑ حساب کتاب کرنے ان کے سامنے بیٹھ گئیں۔

"چند کپڑے جوتے ہی لیے ہیں۔۔۔ اور کچھ دینا دلانا۔۔۔ سو طرح کے رسم و رواج ہوتے ہیں کیا وہ بھی نہ نبھائیں۔۔۔"

"ہاں تو کس نے روکا ہے۔۔۔ یہ وائٹ واش کے طعنے تو نہ مارا کرو۔۔۔ جب شادی ہوگی تمہارے کہے بنا وائٹ واش بھی ہوگا مرمتیں بھی ہوں گی۔ ویسے بھی شادی پر زیادہ مہمان آتے ہیں' رہتے ہیں' گھر بہتر حالت میں ہونا چاہیے۔"

"ہاں بالکل میاں جی۔۔۔ منگنی پر تو گھر سے باہر کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔" وہ اٹھ کر پھر سے کام میں لگ گئی تھیں۔ رضا حیات کے لیے لائے گئے کپڑے دکھاتے ہوئے جندب کا خیال آیا تھا۔

"جندب نے کچھ بتایا اپنے آنے کا۔۔۔ ہے کوئی پروگرام۔۔۔"

"وہ آسٹریلیا میں ہے بیگم' پچھلے محلے میں نہیں' گردن سے پکڑ کر لے آتا۔ اس کے یہاں آنے میں ہی کئی ہزار لگ جائیں گے۔۔۔"

"اتنا پیسا ہے تمہارے پاس اور بات بات پر ایسے رونا روتے ہو جیسے انتہائی تنگی ہوئی جیب ہو' ایک ہی بھائی ہے ماہم کا' وہ بھی منگنی پر نہیں ہوگا۔"

"میری بات ہوئی تھی اس سے۔۔۔ اس کا سمسٹر پورا ہونے والا ہے' کم از کم اس ماہ نہیں آسکتا۔۔۔ اور پھر سال کے اندر اندر شادی کردینی ہے۔۔۔ تب آئے گا ناں۔۔۔"

"ہاں اگر تمہاری جیب نے جب اجازت دی تو۔۔۔" جندب کی غیر موجودگی کا دکھ میاں کو گھور کر نکالا۔۔۔ وہ ہمیشہ کی طرح انہیں غصے میں دیکھ کر مسکرا دیے۔

"کتنے پیسے چاہئیں۔۔۔ بتاؤ چیک کاٹ دوں۔۔۔"

"چیک رہنے دو۔۔۔ کچھ کاٹنا ہے تو سبزی کاٹ دو۔۔۔ آج بانو نہیں آئی۔۔۔" وہ منہ میں بڑبڑائے کچن کی

جانب مڑ گئی تھیں۔ جہاں بہت سا کام ان کا منتظر تھا۔ ماہم کی منگنی اس کے یونی ورسٹی فیلو سے اس کی پسند اور ماں باپ کی مکمل خوشی سے ہو رہی تھی۔ اچھا خوب صورت لڑکا تھا گھر بار، والدین سب ہی بہترین تھا اوپر سے ان ہی کے شہر اسلام آباد میں۔ اور اسی بات پر عائشہ سب سے زیادہ خوش تھیں ان کی بیٹی بیاہ کر دور پردیس نہیں جانے والی پہلے ہی اکلوتا بیٹا سمندروں پار تھا۔ اس کی واپسی کا وقت گنتی تھیں کب تعلیم مکمل ہوگی کب واپس آئے گا۔ اس وقت جو سب سے زیادہ یاد آرہا تھا وہ جندب ہی تھا بیٹھے بیٹھے اس سے خود کلامی کرنے لگ جاتیں مشورے کرتیں اور پھر جی بھر کر اس کی یاد ستاتی۔ رضا حیات سے دن میں ہونے والے ڈھیروں شکوؤں میں ایک یہ بھی شامل ہو جاتا۔ اکلوتے بیٹے کو کس دل سے وہاں چھوڑ رکھا ہے۔ بھلا یہاں کون سی تعلیم نہیں ہے سب کچھ ہے، ایسے ہی خواہ مخواہ۔ چائنیز چاولوں کو دم پر رکھتے ہوئے انہیں یاد آیا تھا، رضا کو مریم کے فون کا بتانا۔ انہوں نے چولہے کی آنچ چیک کر کے پھیلاوا سمیٹا۔ اور سلاد کا سامان لے کر باہر لاؤنج میں آگئیں جہاں رضا حیات لیپ ٹاپ کھولے اپنا بزنس کا کوئی کام کر رہے تھے۔ سلاد کی باسکٹ ٹیبل پر رکھتے قدرے آگے ہو کر بیٹھیں۔

"کل مریم کا فون آیا تھا، مجھے بتانا یاد ہی نہیں رہا۔" لیپ ٹاپ ان کی گود میں رکھا تھا۔ ٹانگیں ٹیبل پر پھیلی تھیں۔ سن کر "ہوں" میں سہلاتے اپنے کام میں محو تھے۔ عائشہ نے گاجر اٹھا کر چھیلنی شروع کر دی۔

"بتا رہی تھی، وہ لوگ پاکستان آرہے ہیں۔" ان کی سرعت سے نگاہ اٹھی ماتھے پر حیرانگی ابھری تھی جیسے سننے میں کچھ غلطی لگی ہو۔

"ازمیر کی والدہ بیمار ہیں.... ان سے ملنے کے لیے آرہے ہیں....."

"اچھا.... " انہیں اچنبھا ہوا تھا "کب کی بات ہے....؟"

"کل.... بتا تو رہی ہوں آپ کو۔" گاجر چھیل کر پلیٹ میں رکھی کھیرا چھیلنے لگیں "ادھر سے ہی اصرار کے فون جا رہے ہیں۔ شاید جلد ہی آئیں۔" رضا حیات نے لیپ ٹاپ پرے رکھ دیا تھا۔ ٹانگیں سمیٹ لیں۔

"بہت دن ہوئے میری ازمیر سے بات نہیں ہوئی....." پھر قدرے توقف سے مسکرا کر بولے تھے۔

"چلو یہ تو اچھا ہے..... بہت عرصہ ہو گیا اسے پاکستان آئے، میں بات کرتا ہوں اس سے....." انہوں نے جیب میں رکھا موبائل ٹٹول کر نکالا کھٹ کھٹ آسٹریلیا کا نمبر ملایا تھا۔ وہاں رات کا آخری پہر چل رہا تھا ایسے میں فون کی مسلسل بپ 'ازمیر' ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ پہلا خیال ماں جان کا ہی آیا تھا۔ آج کل اٹھتے بیٹھتے دھیان ان کی جانب تھا۔ عقبل ذکا نے ان کی طبیعت کے بارے میں صاف بتایا تھا۔

"ڈاکٹرز کچھ خاص پر امید نہیں ہیں۔ کئی سال کا فالج بڑھ کر اب ہڈیوں کے کینسر میں تبدیل ہو چکا ہے مدافعتی نظام بری طرح متاثر ہو کر پھیپھڑوں کو ناکارہ کر چکا ہے۔ اسپتال کئی بار داخل کروایا مگر وہاں وہ جلد ہی گھبرا جاتیں۔ شور مچا کر حویلی آتی تھیں۔ انہیں اپنے گھر میں مرنا تھا اور انتظار صرف ازمیر کا تھا ایک بار اسے 'اس کی بیوی بچی کو دیکھ لیں۔ ازمیر کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ موبائل اٹھا کر دیکھا۔

"اف..... " ایک گہری سانس خارج ہوئی اور رضا حیات پر غصہ بھی آیا۔ بھلا یہ وقت ہے، ایسے کال کرنے کا مریم بھی تب تک جاگ چکی تھیں۔ ازمیر نے فون اٹھاتے ہی نروٹھے پن سے کہا تھا۔

"یار یہ کوئی وقت ہے، شرفا کو تنگ کرنے کا..... بندہ وقت ہی دیکھ لیتا ہے..... اونلی پرسنل ٹائم۔" رضا حیات کی نگاہ کلاک پر جاتے ہی قہقہہ نکل گیا۔ انہیں وقت کا اندازہ نہیں ہوا تھا فوراً" سے کال ملائی۔ یہاں تو ابھی رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ اس کے نیچ انداز پروہ مسلسل ہنس رہے تھے۔

"اب کچھ بولو گے یا اپنی بھیانک آواز سنانے کے لیے فون کیا ہے..... کوئی لطیفہ نہیں سنایا جو لوٹ پوٹ ہو رہے ہو....."

"لطیفہ ہی ہے ناں یار۔۔۔ پچاس سال سے اوپر تمہاری عمر ہو گئی ہے' ابھی تک تمہارا پرسنل ٹائم چل رہا ہے۔۔۔ اس عمر میں تو نیند اڑ جاتی ہے' تمہارے ابھی تک سٹیرٹ نہیں اڑے۔۔۔ ہاہاہا۔"

"بکو مت۔۔۔" انہوں نے پہلو بدلا تھا۔ مریم اشارے سے "کس کا ہے" پوچھ کر اب لیٹ گئی تھیں۔ انہیں پتا تھا اب یہ دونوں اگر شروع ہو گئے تو صبح ہی ہو جائے گی ان کی باتیں ختم ہوتے ہوئے۔

"میں یار سچ میں ڈر گیا تھا۔ ماں جان کی طبیعت بہت خراب ہے۔ دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔۔۔"

"ہاں' عائشہ بتا رہی تھی۔۔۔ تم پاکستان آ رہے ہو۔۔۔" آواز میں کچھ تحیر کی آمیزش تھی۔

"ہوں۔۔۔ اگلے ہفتے تک۔۔۔"

"سب سیٹ ہو گیا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے میراز کا بھائی کا رویہ وغیرہ۔"

"یہاں آ کر ہی پتا چلے گا۔۔۔ تم سناؤ عائشہ ٹھیک ہے' ماہم کیسی ہے۔"

"دونوں ایک دم فٹ ہیں۔۔۔ اور ماہم کی انگیجمنٹ ہو رہی ہے۔ بتایا ہو گا جندب نے۔"

"ہاں' ہاں یار مجھے پتا ہے۔۔۔ بہت مبارک ہو۔"

"فون بھی اسی لیے کیا ہے۔ ذرا مبارک کے ساتھ خود بھی تشریف لے آنا۔۔۔ مریم' روائیبہ کو لے کر ضرور آنا ہے' یہ نا ہو ملے بغیر چلے جاؤ۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں عمل۔۔۔ ہر صورت' لازمی۔۔۔ کہو تو میں فیصل آباد خود آ جاؤں گا تمہیں لینے۔۔۔"

"نہیں' نہیں آ جاؤں گا۔ یار۔۔۔" پھر ادھر ادھر کی باتیں' بچوں کے مسائل اپنی جوانی سے ملاتے انہیں واقعی بہت دیر ہو گئی کال کرتے ہوئے۔

ازمیر' رضا حیات بہت گہرے دوست تھے۔ اکٹھے کالج' اسکول میں پڑھا تھا۔ ایک یونی ورسٹی سے اگری کلچر میں بی۔ ایس کرنے کے بعد اسکالرشپ پر اکٹھے ہی آسٹریلیا پڑھنے آئے تھے۔ بہت ساتھ رہنے سے بے حد' بے تکلفی تھی۔ رضا حیات شادی خصوصاً بچوں کی پیدائش کے بعد پاکستان واپس آ کر اسلام آباد میں شفٹ ہو گئے تھے وہاں ایک بہترین جاب ان کی منتظر تھی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے ساری وارڈروب بیڈ پر الٹ رکھی تھی۔ کپڑے میچ کرتی اور ہینگر میں لٹکا کر راڈ پر ٹانگتی رہتیں۔ انہوں نے پہلے کچن کے سارے کیبنٹ صاف کیے تھے۔ حالانکہ مریم طریقے سلیقے والی خاتون تھیں لیکن ان کے اندر عجیب قسم کی بے چینی لگی ہوئی تھی۔ عجیب سے وسوسے' پریشانی اور ان وسوسوں سے اپنا دھیان بٹانے کے لیے مختلف کام نکال لیے۔ جب کچن اچھی طرح سے سیٹ ہو گیا تو کمرے کی سیٹنگ بدلنے لگیں' پھر الماریاں کھول لیں۔ دھیان بار بار ایک ہی بات پر آ رکتا۔

"بھلا میرا جانا کون سا ضروری ہے۔۔۔ بدمزگی ہوتا ہو مگر میرے جانے سے ضرور ہو گی۔۔۔" وہ ازمیر کو کھل کر انکار نہیں کر سکی تھیں۔ کھل کر کیا' انہوں نے تو سرسری سا بھی نا نہیں کہا تھا۔ ازمیر نے جس دن جانے کا پکا ارادہ کیا مریم اور روائیبہ کے پاسپورٹ' ویزے کی بات کی تھی۔ اور صاف کہا تھا۔

"ہم تینوں چلیں گے۔۔۔ پتا نہیں دوبارہ زندگی میں اس طرح کا موقع آئے' میں چاہ رہا ہوں' ایک بار میری ماں' میری بیوی بیٹی سے مل تو لے۔۔۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔۔۔" حالانکہ وہ اندر سے کچھ خجالت محسوس کر رہی تھیں۔ روائیبہ چھوٹے سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی ایک فائل پر تیزی سے فزکس کے نیومیریکل حل کر رہی تھی۔ اندر سے آتی آواز پر کان چونکے ضرور تھے۔ کہیں جانے کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن کہاں وہ اسے سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی۔

"جب تک میرے پیپرز ختم نہیں ہوتے' کسی آؤٹنگ جیسی پکنک کا پروگرام نہیں بنے گا۔" فائل کا صفحہ پلٹتے اسے کوئی رسپانس نہ ملا تو دوبارہ اونچی آواز میں

دہرایا تھا۔

"مسٹر اینڈ مسز ازمیر' میرا خیال ہے میرا اعلان آپ سن چکے ہیں۔۔۔" فزیکل اینھکس کے نیومیریکلز کر کے اس کا دماغ اس قدر تھک چکا تھا ریلیکس کرنے کے لیے وہ کوئی اچھا سا جواب سننا چاہ رہی تھی۔ لیکن اندر سے جواب کی جگہ ازمیر خود چلتے باہر آگئے۔ اور اس کے برابر بیٹھ گئے تھے۔

"جن پیپرز کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا ہے مس روائیہ' وہ شروع کب ہو رہے ہیں۔۔۔؟" "یقیناً اگلے ماہ۔۔۔" اس نے فائل بند کی اور کلکولیٹر آف کر کے اوپر رکھ دیا۔

"اگر میں غلطی پر نہیں ہوں' مائی سویٹ ہارٹ ابھی یہ ماہ بھی ختم ہونے میں پچیس دن ہیں۔۔۔"

"بالکل ہیں۔۔۔" اس نے اپنی ٹانگیں اوپر کر کے چوکڑی لگائی ہاتھ جھولی میں رکھ لیے۔

"ہم نے صرف دس دن کے شارٹ ویزے پر جانا ہے' آپ اگر پیپرز دے سکتی ہو' مائی ڈیئر۔۔۔"

"ڈیڈی۔۔۔" وہ بیٹھی بیٹھی ان کی جانب گھوم گئی "میرا بہت سا کام ادھورا پڑا ہے' مینتھ کے کتنے لینڈ مِی تھیورمز ہیں ان میں سے کئی میں نے ٹچ بھی نہیں کیے۔ لٹریچر کے پورے تھیسز رہتے ہیں۔ بہت کام ہے" اس نے خفت مٹانے کو منہ پھلایا ازمیر نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

"کیوں اتنا کام پینڈنگ (التوا) پر رکھتی ہو۔۔۔" پچھلا سارا مہینہ اس نے اگزیبیشن پر لگا دیا تھا اس کا دل تھا وہ کوئی خوب صورت سی پورٹریٹ بنائے اور اپنے اسکول میں ہونے والی اس سالانہ نمائش میں جیت جائے سارا سارا دن اپنا ہاتھ' منہ کپڑے رنگنے کے ساتھ کتنے کینوس چارٹ برباد کیے تھے۔ آخر ایک کینوس چارٹ جس پر ممی ڈیڈی کے علاوہ جنذب نے خاص طور پر تعریف کی تھی کہ۔

"بس کرو۔۔۔ یہ ایسا شاہکار ہے جو جیت جائے گا۔۔۔" مریم' ازمیر نے بھی مسکراتے ہوئے تائید کی سر ہلایا۔ وہ خوش ہو گئی تھی اوپر سے آنے والے جیت کے لمحات نے ویسے ہی پرجوش کر دیا۔ اور جس دن وہ اپنی ہیڈ کو آرڈینیٹر کے پاس کینوس جمع کروانے گئی کہ اسے نمائش میں رکھا جائے۔ انہوں نے اس سے پکڑ کر ٹیبل پر بچھا لیا۔ اور پھر بہت دیر اس کے رنگ' نقش و نگار سمجھنے کی کوشش کرنے کے بعد پوچھا تھا۔

"آئیڈیا کہاں سے آیا۔۔۔؟"

"یونیک۔۔۔" روائیہ نے پرجوش انداز سے کہا تو کوآرڈینیٹر کی مزید آنکھیں کھل گئیں۔ اثبات میں بہت دیر سر ہلا کر کہا تھا۔

"میں بھی یہی دیکھ رہی ہوں۔ اور پلیز اسے اٹھاؤ' اور گھر میں کہیں چھپا کر رکھ دو۔۔۔ میں نہیں چاہتی ہمارے چیف گیسٹ لارنس ہیل اس شاہکار کو دیکھ کر پاگل ہو جائیں' اور جو ان کے سر پر چار بال ہیں' انہیں بھی نوچ ڈالیں۔" وہ ان کی بات سمجھ نہیں پائی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ جانے والے جنذب اور سمتھ نہ صرف سمجھ رہے تھے بلکہ اپنی ہنسی بمشکل روکے ہوئے تھے۔ وہ تنگ آگئے تھے اس کی بے سروپا پینٹنگ دیکھ دیکھ کر حل یہی تھا تعریف کر کے جان چھڑائی جائے۔ جان تو البتہ کیا چھٹی تھی باہر آکر اس نے اپنے تمام برشز اور بورڈ ان دونوں کے سر پر مارے تھے' ممی' ڈیڈی سے بھی منہ پھلائے رکھا۔ پھر ان کے سمجھانے پر قدرے ٹھیک ہو گئی تھی مگر وقت کافی برباد ہو گیا تھا' کئی کلاسز مس ہوئیں ان کا کام رہ گیا تھا۔ اوپر سے اسپورٹس گالا ویک شروع ہو گیا۔ اسپورٹس کی بات ہو پھر تو وہ ویسے ہی اپنے حواس کھو دیتی تھی البتہ اس میں کم محنت سے ہی اس کی ٹیم میچ جیت گئی تھی لیکن وہی لیکچرز کئی مس ہو گئے تھے۔ اب وہ چاہ رہی تھی سکون سے بیٹھ کر تمام تیاری کرے۔ ادھر مریم اور ازمیر نے پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا۔ ازمیر کے اصرار کے باوجود اس کی ایک ہی بات تھی۔

"ڈیڈی اگر مزید لیکچر شارٹ ہوئے تو میں فیل ہو جاؤں گی۔۔۔ میں نہیں جا سکتی۔"

"کیوں نہ ہم بھی دو ماہ بعد پروگرام رکھ لیں۔" مریم رائے دینے کے انداز میں گویا تھیں مگر ازمیر سوچتے

ہوئے نفی میں سر ہلا رہے تھے۔

"دو ماہ کے انتظار میں' زیادہ دیر نہ ہو جائے۔۔۔"

کیوں کہ خلیل ذکا نے ماں جان کی حالت زیادہ تشویش ناک بتا رکھی تھی۔ بے شک کہ وہ بے حد سیریس حالت میں چلی جاتی تھیں لیکن اس نے سیریس کو مزید سیریس کر کے بتایا تھا تاکہ وہ جلد از جلد آجائیں۔ ازمیر خاصے مخمصے میں تھے آج سے پہلے کبھی روائیبہ کو اکیلے نہیں چھوڑا تھا۔ سولہ سال کی ہو جانے کے باوجود آج بھی اسے سولہ دن کی بچی کی طرح ٹریٹ کرنے لگ جاتے۔ وہ بڑی بہادر بنی کہہ رہی تھی۔

"آپ بے فکر ہو کر جائیں' میں رہ لوں گی۔"

"لیکن کیسے۔۔۔؟" مریم کو خاصی فکر تھی۔ وہ بالکل بھی ان پر نہیں تھی دلیر' بہادر۔ بلکہ ذرا سا کیڑا دیکھ کر ایک ایک فٹ کی چھلانگ لگالیتی۔ حالانکہ بچپن میں مریم چلتا کیڑا کوڑا اٹھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھیں جیسے جیسے بڑی ہوئی بجائے ڈر نکلنے کے خوف بیٹھنا شروع ہو گیا اور اس وقت صاحب بہادر بنی اکڑ کر بولی تھی۔

"کیسے کا کیا مطلب ہے۔۔۔ جیسے سب رہتے ہیں' میں بھی رہ لوں گی۔۔۔"

"روائیبہ۔۔۔ تم میری بات بالکل نہیں مانتی ہو۔۔۔" ازمیر کے کہنے کی دیر تھی وہ دونوں بازو پھیلا کر ان سے لپٹ گئی۔

"ڈیڈی۔۔۔"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے اپنا سر پیار سے اس کے سر سے جوڑا۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔

"تھوڑی سی اور بڑی ہو جانے دیں۔ ایک قدم بھی آپ کی مرضی کے خلاف نہیں اٹھے گا۔"

"شیور۔۔۔"

"یس۔۔۔ ہنڈرڈ پرسینٹ شیور۔۔۔"

اس کے بے فکر انداز پر کم از کم وہ دونوں میاں بیوی بے فکر نہیں ہو پا رہے تھے۔ مریم کی بالکل خواہش نہیں تھی جانے کی مگر ازمیر کی خاطر تو وہ دنیا کے آخری کنارے تک جانے کو ہر دم تیار رہتی تھیں۔ اب بھی مرے دل سے مگر تیاری کر رہی تھیں۔ روائیبہ کی جانب سے خاصی پریشانی تھی۔ ویسے تو وہاں بچے بہت بولڈ تھے۔ اس سے کم عمر' تنہائی سے نہیں گھبراتے تھے لیکن اسے کبھی چھوڑا نہیں تھا اس لیے کسی صورت اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ سب سے پہلے مریم کے ذہن میں اپنی بہن فلوریہ کا آیا تھا کہ اس کے ہاں اسے بھجوا دے لیکن ازمیر تو بعد میں انکار کرتے روائیبہ نے پہلے کہہ دیا تھا۔

"میں ادھر جانے والی نہیں۔۔۔" اسے اپنی خالہ سے کبھی کوئی ایشو نہیں رہا تھا بہت محبت سے اسے ملتی تھیں لیکن ان کے بچے رچرڈ اور سی اسموکنگ کرتے تھے' روائیبہ کو تو انہیں دیکھتے ہی قے آنے کو ہوتی تھی۔ دس دن بھلا کیسے ان کو برداشت کرتی' دس منٹ مشکل تھا۔ ازمیر نے نچلے فلیٹ والی لیسا فیڈرک کا مشورہ دیا تھا۔ وہ خاصی بوڑھی خاتون تھیں جو اپنی بھتیجی کے ساتھ فرسٹ فلور پر رہ رہی تھیں یہ ساری بلڈنگ ان ہی کی تھی۔ عادت مرنجاں مرنج بے حد محبت کرنے والی' ملنسار' کبھی کرائے کے سلسلے میں بھی تلخ کلامی نہیں ہوئی تھی اور پھر اس کی اکلوتی بھتیجی اکثر و بیشتر ہی جاب کے سلسلے میں وکٹوریہ سے باہر چلی جاتی تھی ان کے پاس رہنے یا انہیں یہاں رکھ لینے میں کسی قسم کا کوئی حرج نہیں تھا اور سب سے بڑھ کر جندب تھا جس پر ازمیر آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے تھے کتنی بار تو واضح کہا کرتے تھے۔

"مجھے کبھی بیٹے کی محرومی کا احساس نہیں ہوتا جندب اگر میں تمہیں دیکھوں تو۔۔۔"

"دراصل میں آپ کا بھی بیٹا ہوں۔۔۔"

"بالکل ہو یار۔۔۔"

☼ ☼ ☼

چند دن میں ہی ان دونوں کے ویزے اور ٹکٹس آچکے تھے۔ مریم نے ساری تیاری کر لی تھی۔ وہاں جانے سے پہلے بہت سی شاپنگ کی۔ ازمیر سے پوچھ کر

اس کی فیملی کے لیے تحائف پھر ہاہم عائشہ کے لیے بہت سے تحفے خریدے اور ان سب میں جو شاپنگ عروج پر تھی وہ روائبہ کی تھی۔ کتنی چیزیں لا کر اسے سمجھا کر الماریوں میں رکھی تھیں۔ انہیں پتا تھا وہ بے حد لاپروا ہے' اپنا اور گھر کا خیال رکھنا نہیں آتا جب بھی وہ سامنے ہوتی مختلف ہدایات دیتی رہتیں۔

"یہاں وہ سامان رکھا ہے' وہاں وہ رکھا ہے' پریشان نہیں ہونا' یاد نہیں کرنا' اپنا خیال رکھنا ہے' بلاوجہ گھر سے باہر نہیں نکلنا' اگر ضروری جانا پڑے تو جندب کو بلا لینا۔ کوئی کام ہو تو اس سے مشورہ کرلینا۔" ہر بات کے بعد جندب جو سن کر عاجز آگئی۔

"مجھے لگ رہا ہے' میں آپ کی بیٹی نہیں جندب کی ہوں۔۔۔ جو وہ میرا خیال رکھے گا۔"

"کم از کم وہ تم سے سمجھ دار ہے' اس لیے کہہ رہے ہیں۔۔۔" مریم نے اسے قدرے ڈپٹتے ہوئے کہا تھا۔

مریم اور ازمیر کی تمام تیاریاں ہوچکی تھیں۔ جندب نے بھی کچھ تحائف خاص کر ہاہم اور اس کے منگیتر کے لیے دیے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر مریم ازمیر نارمل نہیں تھے۔ ایک عجیب سا کھٹکا لگا تھا۔ دل بے طرح سے کھنچ رہا تھا۔ جس صبح کو ان کی فلائٹ تھی۔ وہ ساری رات نہیں سوئے تھے اور روائبہ جو بہت دلیر بنی کہہ رہی تھی آپ جائیں میں رہ لوں گی۔ یک لخت بجھ سی گئی تھی۔ اپنے کمرے سے نکلی اور ڈھیلے قدموں چلتی ان کے کمرے پر ناک دے کر اندر آگئی۔ وہ دونوں صوفے پر بیٹھے باتوں میں محو تھے وہ بھی درمیان آکر بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے خیریت۔" ازمیر نے اس کے شانوں پر ہاتھ پھیلا کر اپنے قریب کرلیا۔

"آپ لوگ صبح جا رہے ہیں۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ تو؟"

"کتنے دن میں آجائیں گے۔۔؟"

"اونلی ون ویک۔۔۔"

"ون ویک۔۔۔" اس نے خوب کھینچ کر کہا تھا۔ "انھیں آپ کو یاد نہیں آؤں گی۔"

"تم نے خود ہی انکار کیا ہے۔" مریم نے خفگی سے گھورا تھا۔

"آپ ٹھہر کر چلے جاتے ناں۔" اس کی پرامید سی نگاہ ازمیر پر گئی انہوں نے ایک نگاہ اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں اس کے سر کو اپنے کندھے سے لگا کر ہتھیلی سے تھپتھپانے لگے۔

"میری جان۔۔۔ میری ماں بہت بیمار ہے' میں نے اپنی ساری زندگی اس زمین کو دے دی' اتنا مصروف رہا کہ پچھلوں کا خیال تک نہیں آیا' میرا بھائی ہے وہاں' اس کی فیملی ہے' میرے باپ کی قبر ہے' بہت یادیں ہیں اس زمین پر مگر تمہارا باپ بہت غیر ذمہ دار رہا اپنے رشتے نبھانے میں' لیکن اب میں مزید دیر نہیں کرنا چاہتا' اپنی ماں کی چلتی سانسیں دیکھ لوں۔۔۔ اور پتا ہے۔۔۔" انہوں نے آنکھیں کھولیں اور سر بیک سے اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا وہ ان ہی کا کرب زدہ چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"میں سوچ رہا ہوں' ہم ہمیشہ کے لیے پاکستان شفٹ ہوجائیں' یار میں چاہتا ہوں تم باقی کی زندگی پاکستان میں گزارو' اپنوں کے درمیان۔ وہاں بہت کھرے لوگ ہیں یہاں کی طرح انجان نہیں۔ تمہاری دادو' تمہارے بابا تم سے بہت محبت کرتے ہیں' بار بار تمہارا پوچھ رہے ہیں لیکن۔۔۔" ایک لمبی سانس لی۔ "خیر تمہارے پیپرز ہوجائیں پھر کچھ پلان کرتے ہیں' کیوں مریم۔۔۔" انہوں نے تائیدی نگاہ مریم پر اٹھائی تھی جو اس وقت حمایت میں سر بھی نہ ہلا سکی صرف یہی سوچتی رہیں۔

"اپنے رشتوں کو پروموٹ کرنے کے لیے' یہ شخص کتنے پردے ڈالتا ہے۔" وہ بہت اچھی طرح جانتی تھیں کہ وہ سب کتنی محبت کرتے ہوں گے مریم یا روائبہ سے۔ اگر ایسا واقعی ہوتا تو کم از کم ازمیر ایسے لوگوں میں سے نہیں تھے جو پیسے' جاب یا کسی بھی اور لالچ میں اپنوں سے دور رہتے جب کہ مریم بھی ہر پل ساتھ جانے کو ہمہ وقت تیار رہی تھیں۔۔۔ بہت دیر بعد مریم نے پرسوچ انداز میں تائیدی سر ہلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ پوری فرصت نکال کر صاف ستھری ہوئی۔ الماری سے اپنا بہترین سوٹ نکالا نہا دھو کر پہن لیا۔ دوپٹا پھیلا کر اوڑھا بار بار سر کے بالوں پر پھسلنے لگا۔ سیفٹی پن لے کر ڈریسنگ کے سامنے کھڑی ہوئی اور دوپٹا کسنے لگی۔ آج اس نے مکمل ارادہ کیا تھا نماز ادا کرنے کا' کتنا عرصہ ہو گیا تھا زندگی کی الجھنوں میں لگ کر کوئی خاص عبادت نہ کی تھی۔ ہم اپنی زندگی میں جانے عبادت ہی ایسے مقام پر کیوں رکھتے ہیں کہ فرصت ہو گی تو ضرور کریں گے۔ اور وہ فرصت تو کم از کم زندگی میں کبھی نہیں آتی' اور جس چند گز کی زمین میں فرصت ملتی ہے وہاں عبادت نہیں ہو سکتی' بلکہ اس کے پلٹنے کا عمل ہوتا ہے۔ جلی جائے نماز بچھا کر ہاتھ تکبیر میں اٹھانے لگی تھی جب حبہ بھاگتی آئی۔

"مما۔ مما' عشا کے چوٹ لگ گئی۔" پھر کہاں کی نماز' کہاں کی دعائیں و وظائف وہ سرپٹ باہر کی جانب بھاگی تھی۔ شیطان بھی ہمارا بڑا عقل مند دشمن ہے' کس پر کب کہاں' کیسے وار کرتا ہے' کم از کم اسے ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ ایسا ہی تھا۔ عشا صوفے کی گدی میں منہ گھسیڑے بے طرح رو رہی تھی۔ سبرینہ نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا اس کے ماتھے پر معمولی سی چوٹ تھی۔ جہاں سے خون رس رہا تھا۔ ٹشو کھینچ کر اس نے اس کا ماتھا صاف کیا' اسے گود میں اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کہاں سے لگی تھی۔" عشا نے میز کے کونے کی جانب انگلی کی' پھر بھاں بھاں رونے لگی۔ اتنی چوٹ نہیں تھی جتنا واویلا مچا رہی تھی۔ سبرینہ نے حبہ کو اندر سے چاکلیٹ لانے کا کہا تھا اور خود اسے تھپک تھپک کر بہلانے لگی۔ تب ہی وہ تیار ہوا اپنے کمرے سے نکلا ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ معمول سے ہٹ کر خاصی صاف ستھری اور بہتر لگ رہی تھی۔ کسی کام سے باہر جانے کے لیے نکلا تھا مگر رک گیا اس کے چہرے سے نگاہ عشا پر ٹھہر گئی۔

"کیا ہوا اسے؟"

"گر گئی ہے۔" اپنے متعلق بات ہونے پر عشا نے ماں کے سینے سے سر نکال کر کن انکھیوں سے باپ کو دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر کچھ ملائمت محسوس ہوتی تھی' جو لمحے میں ہی بے زاریت میں بدل گئی۔

"کبھی ان کا خیال مت رکھنا۔ جب اندھی' کانی' لولی لنگڑی ہو جائیں گی' بیٹھ کر پہرے دیتی رہنا ان کے۔" عشا کے معمولی زخم پر ہی اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ دفعتاً" اس کے موبائل کی بپ ہونے لگی۔ نمبر دیکھ کر ایک نگاہ سبرینہ پر ڈالی آن کر کے کان سے لگایا اور سامنے بیٹھ گیا۔

"جی السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ لوگ؟" جواب کے لیے وہ لحہ بھر رکتا اسے دیکھتا پھر اگلی بات شروع کر دیتا۔ سبرینہ کے ساتھ اس کا رویہ جتنا بھی کرخت بدمزاج تھا مگر اس کے گھر والوں کے ساتھ بے شک سیدھے سادے انداز سے بات کرتا مگر لہجہ خاصا شستہ کر لیتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے بھائی کسی جوس فیکٹری کا ذکر کر رہے تھے۔ چند ہفتے پہلے بھی انہوں نے اس فیکٹری کا ذکر کیا تھا۔ دراصل سبرینہ کے بھائی کوئی ہائی فائی کلاس سے نہیں تھے کہ کھڑے کھڑے بڑے بڑے سودے کر لیتے۔ برسوں میں کمائی جمع پونجی تھی۔ سوچ سمجھ کر لگانا چاہ رہے تھے۔ شہوز خاندانی کاروباری تھا۔ اسی لیے وہ چاہ رہے تھے ایک بار وہ وقت نکال کر ان کی فیکٹری کا چکر لگا لے۔ ساز و سامان اور اس کی قیمت کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کا ہولے ہولے اثبات میں ہلتا سر رکا۔ قدرے بہتر لہجے میں بولا تھا۔

"دراصل میں پچھلے دنوں خاصا مصروف رہا' لیکن ان شاء اللہ بہت جلد چکر لگاؤں گا۔ بلکہ آپ ساتھ چلیے گا۔" رسمی باتیں اور فیملی کا پوچھ کر اس نے فون بند کر دیا تھا۔ سبرینہ وہاں سامنے ہی بیٹھی تھی اور گفتگو سے اندازہ ہو چکا تھا کس سے اور کیا بات ہو رہی ہے لیکن شہوز کمال نے کچھ بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ ٹانگ پر چڑھی ٹانگ کا بوٹ میں مقید پاؤں ہلکا

ہلکا ہلاتے وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

☆☆☆

مریم آج روٹین سے ذرا جلدی اٹھ گئی تھیں حالانکہ رات انہیں لیٹتے لیٹتے خاصی دیر ہوگئی تھی بمشکل دو تین گھنٹے ہی ہوئے ہوں گے۔ انہوں نے اٹھ کر سارا سامان ایک جانب کیا پھر کچن میں چلی گئیں۔ روائیبہ کے کمرے کی لائٹ آن تھی یقیناً وہ بھی جاگی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسے پکارا وہ فوراً ہی باہر آگئی تھی۔ کچھ بکھری بکھری خاموش سی۔ اس وقت مریم اسے چھیڑنا نہیں چاہ رہی تھیں' اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا وہ رو پڑے گی۔ ناشتا تیار ہوا تب تک ازمیر بھی فریش ہو کر آگئے تھے معمول کی طرح بیٹھ کر ناشتا کیا گیا تھا مگر روٹین سے ہٹ کر خاموشی ضرور تھی۔ جندب اپنے بتائے گئے مقررہ وقت پر یہاں موجود تھا۔ سفری بیگز اٹھا کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ منہ پھلائے دیکھتی رہی۔ جب مریم نے اپنے ہینڈ بیگ کی زپ بند کی ایک لخت روائیبہ کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"آپ جلدی آئیں گے' ناں۔"

"ہاں یار......" ازمیر نے اس کے شانے پر تھپکی دی تھی۔ "چند دن تمہاری دادو کے پاس رہیں گے' پھر وہاں سے ماہم کی انگیجمنٹ اٹینڈ کرنی ہے' پھر ہماری سیٹس بک ہیں ٹوٹلی تین ویز لگنے ہیں۔"

"ماہم کی شادی پر میں بھی جاؤں گی......"

"بیٹا میں تو اب بھی چاہ رہا تھا۔ خیر ٹھیک ہے......" انہوں نے ہینڈ بیگ اپنے کندھے پر ڈالا مریم نے پرس اٹھالیا تھا۔ اور وہ کئی دن سے کی گئی باتیں پھر سے دہرا رہی تھیں۔ بات بات پر نصیحتیں۔

"دلیتا کو زیادہ تنگ نہیں کرنا' وہ بوڑھی ہیں...... پلیز۔ روائیبہ کسی قسم کی شرارت مت کرنا' اینڈ اپنا بہت خیال رکھنا' ہمیں اپنی بیٹی ایسی ہی چاہیے جیسی چھوڑ کر جارہے ہیں تمہیں۔" گاڑی کی پچھلی نشست پر وہ مریم کے گلے کا ہار بنی بیٹھی رہی۔ جندب گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ ازمیر اس کے برابر بیٹھے تھے۔

"کچھ دن کی بات ہے یار' ہم چکر لگاتے رہنا۔ ویسے تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے' لیکن پھر بھی' کبھی اسے اکیلا چھوڑا نہیں ہے۔" جندب کی ایک لخت ہی ہنسی نکل گئی تھی۔

"انکل یہ کوئی بچی نہیں ہے' جس کا خیال رکھا جائے' کھانے پینے کو دیا جائے۔ یہ تو خود ہی دوسرے کو کھانے کے لیے تیار رہتی ہے۔" روائیبہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا ناگواری سی تیوری ڈال کر سر جھٹکا پھر' مریم کے کندھے سے لگ گئی۔

"یہ تو ہے۔ یہ بچی نہیں ہے' لیکن تم اس سے بڑے ہو اگر کوئی مسئلہ ہو تو ہینڈل کر سکتے ہو۔"

رضا حیات جب پاکستان شفٹ ہوئے اس وقت ماہم سولہ سال کی تھی۔ یہاں کے ماحول کو دیکھتے ہوئے عائشہ کسی صورت یہاں رہنے پر تیار نہیں تھیں البتہ جندب کو وہ یہاں ہی چھوڑ گئے تھے۔ تعلیم مکمل ہوگی تو واپس آجائے گا۔ رضا حیات کو ایک تسلی یہ بھی تھی ان کا دوست ازمیر یہاں ہی آباد تھا ایک تو اس کا یہاں سے جانے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا دوسرا جندب ان ہی کے اسکول میں پڑھ رہا تھا جہاں وہ پڑھاتے تھے۔ ہوسٹل بھی ان کے فلیٹ کے قریب تھا۔ اکثر و بیشتر وہ ان ہی کے فلیٹ پر پایا جاتا۔ ان کے لیے وہ ایک گھر کے فرد کی طرح تھا۔ اور جتنا انسان اپنے گھر کے فرد پر اعتبار کرتا ہے ازمیر اس سے بھی کچھ زیادہ جندب پر اعتماد کرتے تھے۔ اس قدر آنا جانا اور اعتباری جندب اور روائیبہ کے درمیان بہترین دوستی کا سبب بن گئی تھی۔ وہ اکیلی تھی جب بھی کسی ساتھی' فرینڈ کی ضرورت ہوتی وہ حاضر ہوتا تھا۔ عمر میں اس سے صرف چار سال بڑا تھا لیکن قد کاٹھ کی وجہ سے ذرا زیادہ ہی لگتا تھا۔ کیوں کہ روائیبہ خاصی پتلی لمبی مگر نازک سی تھی۔ اور جیسے جیسے گاڑی ایئرپورٹ کی جانب بڑھ رہی تھی اس کی نازک سی ناک "سوں سوں" میں بنا آواز سمٹ جاتی۔ جندب نے ریو مرر سے اس کی کیفیت بھانپ لی تھی خوب بشاشت سے بولا تھا۔

"ڈیئر انکل، آپ میری طرف سے بے فکر ہو کر جائیں، مگر اپنی اس بے بی کو الہ کو سمجھا دیں مجھ سے ہنگے لینے کی کوشش نہ کرے۔ نہ لڑائی کرے اور نہ ہی رو رو کر مجھے غصہ دلائے کہ میں اس کے اگلے دو دانتوں میں سے کم از کم ایک توڑ دوں۔" اس کے سنجیدہ انداز پر ازمیر نے اسے چونک کر دیکھا اس نے مذاق میں آنکھ دبائی۔ جب کہ مریم نے پیچھے سے ہی اس کے شانے پر چپت لگائی تھی۔

"ارے ارے، تم یہ سلوک کرو گے، میری ڈول کے ساتھ۔"

"یہی تو کہہ رہا ہوں، میں کرنا نہیں چاہتا، بس یہ میڈم مجبور نہ کریں۔۔۔" اس نے اب بھی کوئی ریسپانس نہیں دیا تھا آنکھیں بند کیے مریم کے کندھے سے لگی چپ تھی۔ اب اس نے ڈائریکٹ اسے ہی مخاطب کر کے رائے مانگی۔

"کیوں میڈم۔ کان کام نہیں کر رہے کیا۔"

"مجھے تمہاری فضول باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہونہہ۔"

"کیوں تنگ کر رہے ہو، میری بیٹی کو یار۔۔۔" ازمیر نے گھر کا۔

وینٹنگ لاؤنج میں اناؤنسمنٹ گونجتے ہی وہ جندب سے زور سے ملے تھے ایک بار پھر اس کا خیال رکھنے کی تاکید کی۔ پھر اس کی جانب بڑھے وہ زور سے لپٹ گئی تھی۔ اس کا کبھی بھی پاکستان جانے کو دل نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی دلچسپی تھی۔ گھر میں سرسری ساذکر سنتی رہتی تھی یا پھر کسی خاص ایونٹ عید، بقر عید پر ڈیڈی کو اداس دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ضرور دل میں آتا ڈیڈی کی فیملی دیکھنی چاہیے۔ لیکن وہ لمحاتی محبت لمحے میں ہی نکل جاتی۔ کبھی کبھار ازمیر خود سے گفٹس خرید کر ان کے پیکٹ بنا کے ایسے لا کر کھولتے جیسے سچ مچ پاکستان سے آئے ہیں۔ ایک ایک چیز کی دل سے تعریف کرتے۔ اسے کبھی ان چیزوں میں اٹریکشن نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اتنا کہہ دیتی تھی۔

"ڈیڈی ہم کبھی ان سے ملے نہیں، لیکن دل بہت ملتے ہیں، ساری ہماری پسند کی چیزیں۔" مگر اس وقت وہ سب چیزیں، وہ فیملی، وہ دیس، جیسے اپنا لگ رہا تھا۔ لمحے میں ہی یہ مٹی جہاں اس نے آنکھ کھولی، پلی بڑھی، پل میں اجنبی، غیر مانوس سی لگنے لگی آنکھوں میں گرم پانی مرچوں کی صورت کاٹنے لگا تھا۔ اس نے ان کی پشت سے شرٹ مٹھیوں میں دبوچ رکھی تھی۔ آواز البتہ بند تھی مگر سر نفی میں ہل رہا تھا۔ اناؤنسمنٹ مسلسل گونج رہی تھی۔ مریم نے دو قدم آگے بڑھ کر اسے ان سے الگ کیا وہ مریم سے لپٹ گئی۔ اس کا بدن ہولے سے لرز رہا تھا۔ مریم ایک مضبوط عورت تھیں۔ بے حد مضبوط کبھی نہ رونے والی بڑے بڑے فیصلے کرنے والی۔ لیکن اس وقت ان کی اپنی آنکھیں بھاری ہو گئیں۔ گردن پھیر کر اس کے رخسار کو چوما۔

"بری بات۔ ایسے بچوں کی طرح بی ہیو نہیں کرتے۔"

"جلدی آنا، میرا دل نہیں لگے گا۔"

"ضرور۔۔۔ یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے، اور فیصلوں کو سمجھنا سیکھو۔۔۔"

"جندب یار۔ پلیز سنبھالو اسے۔" ازمیر نے اسے دیکھتے ہوئے کہا خود لائن کی جانب بڑھے مریم کی کلائی پکڑ رکھی تھی وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے ہاتھ سے بائے کرتی ڈیپارچر کی جانب قدم اٹھا رہی تھیں۔ روائمہ اپنے گلابی ہونٹ دانتوں میں بھینچے، سوچی سوچی آنکھوں سے انہیں دور جاتے دیکھ رہی تھی جیسے ہی وہ ڈیپارچر کی لائن میں گم ہو گئے۔

"ڈیڈی۔ ممی پلیز۔" اس نے قدم ان کی جانب بڑھائے تھے۔ جندب نے سرعت سے اس کی کلائی تھامنا چاہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آسٹریلیا کے بارے میں جو کچھ انہوں نے سن رکھا تھا اس سے کہیں بڑھ کر پایا تھا۔ وہاں آنے سے پہلے کتنے دن تو اس یاد دہانی میں گزر گئے کہ واقعی اسکالر شپ ہمارا ہی آیا ہے۔ کتنے اسٹوڈنٹس تھے جنہوں نے

زرعی یونیورسٹی سے باہر ویزے کے لیے اپلائی کر رکھا تھا ان دس میں سے صرف ازمیر' رضا حیات سلیکٹ ہوئے۔ وہ باٹنی میں ایم ایس سی کر چکے تھے وہاں ایم فل کے لیے جانا تھا۔ ازمیر کی خوشی ایک طرف اور پورے گھر کا انکار دوسرے جانب۔

"کون سے لعل لگے ہوئے ہیں' باہر کی ڈگری پر جو یہاں نہیں۔" یہ ان کے والد میر علی تھے جو باہر پڑھنے کے زبردست خلاف تھے۔

"ابا جی لعل تو واقعی لگے ہوئے ہیں' ہاتھوں ہاتھ مانگ ہے وہاں کی ڈگری کی۔"

"ازمیر تمہیں ہاتھوں ہاتھ مانگ کی ضرورت نہیں ہے' تم صرف میرا ہاتھ ہو' اور میرے ہاتھ میرے کھیتوں میں ہی چلیں گے۔ جو پڑھنا ہے' یہاں ہی پڑھو' نہیں تو ختم کرو اس ڈرامے کو۔ سیدھی طرح نکل کے گوداموں پر جاؤ حساب کتاب لگاؤ۔ میرز کا کیا کیا دیکھیے۔" ازمیر کا سارا موڈ خراب ہو گیا تھا حمایت طلب نگاہ ماں جان پر اٹھائی وہ ویسے ہی دبو سی تھیں میر علی خاصے سخت گیر انسان تھے جو کہہ دیا پتھر پر لکیر' بیٹے کو دیکھ کر حمایت کرنے کے بجائے سر جھکا لیا تھا۔ یعنی کہ بے بس ہونے کا اعلان۔ انہیں اپنا مقدمہ خود لڑنا تھا اور وہ ان ہی کی اولاد تھے نڈر دلیر۔ صاف گوئی سے کہا تھا۔

"میں نے جو اتنا پڑھا ہے منشی بننے کے لیے تو نہیں کیا۔ مجھے آگے پڑھنا ہے۔"

"کتنا آگے کیا دنیا کے آخری سرے تک جانا چاہتے ہو۔"

"ابا جی آپ جو مرضی سمجھیں' لیکن مجھے بہر حال پڑھنا ہے اور میں کون سا آپ کے کھیتوں سے انکار کر رہا ہوں بلکہ ان سے کئی گنا زیادہ فائدہ لینے کے اصول پڑھنا چاہ رہا ہوں۔ صرف چند سالوں کی بات ہے پھر ہم اپنی فرٹیلائزر (مصنوعی کھاد) کی فرم لگائیں گے' دیکھیے گا آپ۔ یہ آپ کے کھیت کھلیان کہاں سے کہاں پہنچتے ہیں۔"

"میرے کھیت جہاں ہیں' بہت اچھے ہیں۔ ویسے بھی میں تمہاری شادی کی بات چلا رہا ہوں۔ زاہد بار بار اصرار کر رہا ہے۔"

"خدا کا واسطہ ابا جی۔" وہ تنک کر اٹھے تھے۔ "میں ابھی شادی کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"کیوں اپنی مردانگی پر شک ہے تمہیں۔" انہوں نے کچھ اس طرح سے گھورا' ازمیر کا سارا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور سامنے سے ہٹ گئے تھے۔

یہ تو حقیقت تھی کہ انہوں نے جانا ہے اور ضرور جانا ہے۔ رضا حیات کو اکلوتے بیٹے ہونے کے باوجود اجازت مل گئی تھی پھر ایسا کیسے ہو سکتا تھا ازمیر نہ جاتے۔ براہ راست ابا جی سے بات کرنے سے بہتر تھا میرز کا بھاجی کے کندھے استعمال کیے جائیں۔ ایک تو وہ کاروبار میں ابا جی کے دائیں بازو تھے پھر ویسے ہی باپ کے سامنے جی حضور ٹائپ بنے رہتے تھے۔ بہت دیر تو اس کے ارادے سنتے رہے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی جو بے سود تھی بس انہیں اجازت چاہیے تھی نہ صرف اجازت بلکہ وہاں کے اخراجات کے لیے بہترین اکاؤنٹ ڈپازٹ بھی۔ یہ میرز کا ہی کی کوشش تھی کہ انہوں نے اس سے چند شرائط منوا کر ابا جی کو راضی کر لیا تھا اور یوں ازمیر نے آسٹریلیا کی ونڈر لینڈ میں قدم رکھا۔ ان دونوں کا داخلہ بلیین کیتھولک کی یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ بہترین یونیورسٹی' بہترین ٹیچرز اور خوب صورت ملک۔ زندگی خوش کن بن گئی تھی۔ انہیں یہاں آئے تقریباً" ایک سال ہونے کو تھا ایم فل کا پہلا سال تو ویسے ہی بہت مصروفیت چاہتا ہے کاغذ بھرنے میں ہی گزر جاتا ہے اور پھر شعبہ بھی ایگری کلچر کا تھا۔ ہر ٹاپک کے ساتھ اس کا ریسرچ ورک' سیمپلز لگانے پڑتے جن کو تلاشنے بہت بہت وقت صرف ہو جاتا۔ وہ سب سوچیں آسٹریلیا جا کر سیرو سیاحت کریں گے خواب ہو گئی تھیں۔

ان دنوں انہیں سیلٹنی (تھوہر) کا ٹاپک ملا ہوا تھا جس پر بہت ریسرچ کی ضرورت تھی۔ ویک اینڈ قریب آیا۔ رضا حیات نے ہی پلان بنایا کیوں نہ نیشنل گرین رین فورسٹ چلیں۔ اس طرح کی جلاو گریاں آسٹریلیا

میں بست ہیں جہاں پلک جھپک میں موسم بدلتا ہے، جب کہ برازیل بھی بہترین تھا کیوں کہ نیشنل فورسٹ میں جہاں زیریں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا وہاں چڑھائی پر یوکلپٹس کے گھنے جنگل تھے۔ سمندر اور یوکلپٹس اس کا مطلب تھا سیلینٹی اینڈ واٹر لاگنگ (سیم و تھور) پر ریسرچ کے لیے کچھ بہتر تجاویز مل سکتی ہیں۔ انہوں نے اپنی چیزیں سمیٹیں اور ادھر کا رخ کیا تھا، مفت میں تفریح بھی میسر آگئی۔ اس وقت جنگل کی گہرائی میں جانے کے لیے بہترین سڑک نہیں تھی جیسی کہ آج کل بنی ہوئی ہے اور نہ ہی ایسی ہنٹر جیپس چلتی تھیں البتہ چیئر لفٹ تب بھی لگی تھی اور اسی کے ذریعے وہ چڑھائی پر گئے۔ انہوں نے کئی جگہ کی کھدائی کر کے مٹی اور کچھ جڑی بوٹیاں وہاں سے اکٹھی کی تھیں۔

ازمیر ایک نئے کھدے گڑھے میں سیلینٹی میٹر (تھور ناپنے کا آلہ) کی راڈ اتار رہے تھے تب نگاہ کچھ فاصلے پر اسی لڑکی پر گئی جو فورسٹ کی انٹرنس پر ملی تھی۔ گلے میں ڈیجیٹل کیم کورڈ کیمرہ لٹکائے پوری محویت سے سمندر کو دیکھ رہی تھی جب دل چاہتا "کیچ کیچ" فوٹو گراف بنانے لگ جاتی۔ چست سیاہ جینز، ڈھیلی ڈھالی سفید ٹی شرٹ، سنہرے بالوں والی دبلی پتلی لمبی سی یہ لڑکی اپنی ظاہری شخصیت سے وہاں کی رہائشی لگ رہی تھی۔ اس لڑکی سے انہوں نے فورسٹ میں جانے کے آسان راستے پوچھے تھے، بتا تو دو اس نے بتایا۔ وہ چیئر لفٹ کے لیے اپنی ٹکٹ لینے جا رہی تھی انہیں سیاح سمجھ کر ٹکٹس لینے میں ان کی مدد کی تھی۔ نہ تو وہاں اتنا رش تھا اور نہ ہی اتنی دیر ہوئی تھی کہ وہ بھول جاتے وہ اس وقت سامنے تھی نوکیلے سے پتھر پر کھڑی کمر کے بل ترچھی جھکی ہوئی اس طرح جھکنے سے اس کے سنہری بال کمر سے کم از کم ایک بالشت دور تھے ازمیر کے ہاتھ وہاں ہی تھم گئے تھے تحیر سے رضا کو دیکھتے پوچھا تھا۔

"یار یہ کیا کر رہی ہے۔"

"کرتب..." یہ تو انہیں معلوم ہی تھا ویسٹرن میں اکثریت جوکرز کی پائی جاتی ہے اور جو بچ جاتے ہیں وہ انہی جیسی حرکتیں کر کے خود کو ابنارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس لڑکی نے تو حد ہی کر دی تھی۔ وہ دم بخود دیکھ رہے تھے، جس زاویے پر وہ کھڑی تھی گرے تو وہ چار اعضا ٹوٹنے لازم تھے۔

"لیکن یہ ایسا کر کیوں رہی ہے۔"

ازمیر کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی ذرا سی نظر سرکا کر دیکھا ویسی ہی نوکیلی قدرے اونچی چٹان پر اس کا ڈیجیٹل کیم کورڈ کیمرہ فٹ تھا جس کے موونگ لینس (گھومنے والا عدسہ) کے اوپر نہایت چھوٹی سی جلتی بجھتی بتی سے پتا چل رہا تھا کیمرہ آن ہے۔

"اوہو... شاید یہ کوئی ویڈیو بنا رہی ہے۔ لیکن اتنی خطرناک۔" اب وہ ایک ٹانگ اوپر اٹھا کر بازو پھیلاتی کچھ ہل رہی تھی۔ اسے ڈگمگاتے دیکھ کر ازمیر کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

"آ ے..." اور بس اس لڑکی کا فوکس ہٹا اور دھڑام... پھر کیسا گڑھا اور کیسا سیلینٹی راڈ کو وہاں ہی چھوڑ دونوں تیزی سے بھاگے تھے۔ وہ بہت گہرائی میں تو نہیں لیکن کم از کم آٹھ، دس فٹ نیچے گری تھی۔ دونوں سنبھل کر اس تک آئے وہ اوندھی لیٹی لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی کراہ بھینچے دانتوں میں رکی تھی۔ کھینچ کر سانس لیتے اپنی کہنیوں کو سمیٹ وزن ڈالا قدرے سیدھی ہوگئی۔ تکلیف اس قدر تھی اس سے بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ ماتھے کے ایک جانب سے ہلکا خون رس رہا تھا باقی چہرے اور ہاتھوں پر گہرے نشان اور خراشیں تھیں ان دونوں کو اپنے اطراف جما کھڑا دیکھ کر شدت تکلیف سے آنکھیں پل بھر کے لیے بھینچ کر کھولیں۔ اس طرح کرنے سے اپنے کرب پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔

اس نے اپنا بازو سہارے کے لیے ان کی جانب بڑھایا ازمیر کا ہاتھ قریب تھا انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھنے میں مدد دی وہ اچھی خاصی زخمی تھی گردن تک خراشیں لگ چکی تھیں۔

"تم خودکشی کرنا چاہ رہی تھیں؟" ازمیر کی بات کا جواب اس لڑکی کے بجائے رضا حیات نے دیا تھا۔

"خودکشی نہیں، سرکس کی پریکٹس کرنے۔"

انگریزی زبان میں ادا ہوئے ان کے جملے وہ بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی اگر اس وقت ٹھیک ہوتی انہیں ٹھیک ٹھاک جواب دیتی مگر وہ چپ تھی۔ رضا حیات کو تشویش ہوئی۔

"یار یہ بہری تو نہیں۔" اس لڑکی نے سرعت سے تند نگاہ اٹھائی۔ پھر نفی میں سر ہلاتے گھٹنے پر ماتھا ٹیک لیا۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا وہ بہت تکلیف میں ہے۔ اس نے زمین سے اٹھنے کی دو تین بار کوشش کی مگر اس کا ایک پاؤں بالکل وزن نہیں اٹھا رہا تھا۔ ٹخنے والی جگہ پر شدید درد تھا۔

"کیا ہوا؟ اٹھا نہیں جا رہا۔"

ازمیر کے پوچھنے پر اس نے اپنے پاؤں کی جانب اشارہ کیا۔ وہ گھٹنا ٹیکتے ہوئے اس کے مقابل بیٹھ گئے۔ اس کا فلیٹ بوٹ اتار کر پاؤں کا معائنہ کیا۔ جو بالکل بے جان چیز کی طرح جھول رہا تھا ٹخنے کی جگہ پر اچھا خاصا ورم آ گیا تھا۔

"لگتا ہے یہ جوڑ سے نکل گیا ہے۔"

"بڑی بات ہے ایک ہی نکلا' میرا تو خیال تھا ہڈی ٹوٹ گئی ہوگی۔"

رضا حیات اردو زبان میں بڑبڑائے' ازمیر نے نگاہوں سے چپ رہنے کی سرزنش کی تھی۔ کیوں کہ اس کا پاؤں بری طرح متاثر لگ رہا تھا اور وہ لڑکی کمال ضبط سے اپنی تکلیف برداشت کر رہی تھی' اگر اس وقت ان کے گاؤں کی لڑکی ہوتی تو یقیناً" چلا چلا کے سارے گاؤں کو اکٹھا کر لیتی۔ اور پورا مجمع اس کا پاؤں ہلا ہلا کر رہے سہے جوڑ بھی ہلا دیتے۔ لیکن وہ لڑکی آنکھیں اور منہ سختی سے بند کیے برداشت کر رہی تھی۔

"اگر پاؤں پر کچھ لپیٹ دیا جائے تو شاید اٹھنے میں آسانی ہو۔" وہ خود کلامی کرتے ادھر ادھر کوئی چیز تلاش رہے تھے۔ اس لڑکی کے پاس دوپٹا تو کیا مفلر تک نہیں تھا جو کام آ جاتا۔ یک لخت ان کا ذہن اپنی جرابوں کی جانب گیا تھا۔ آج انہوں نے اسپورٹس والی لانگ سوکس پہن رکھی تھیں۔ وہ اپنے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگے جب رضا حیات کو کہتے سنا۔

"رہنے دے یار' بڑی بو آئے گی تیری جرابوں سے' وہ بدبو سے مر جائے گی۔"

ازمیر کا جی چاہا اس کمینے کو دھکا دے کر ساحل تک پھینک دے' اس وقت بھی اسے مذاق سوجھ رہا ہے۔ انہوں نے اسے ایسے گھورا تھا جیسے کہا ہو' اسے واقعی تکلیف ہے۔

دونوں جرابوں کو اس کے ٹخنے پر زور سے لپیٹ کر اسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔ اس کا پاؤں کوشش کے باوجود زمین پر نہیں لگ رہا تھا۔ ان کے کندھے کا سہارا لیے وہ بڑی ہمت سے کھڑی تھی۔ پاؤں اوپر اٹھا لیا۔

"مجھے ہیلتھ کیئر تک پہنچا دیں۔ پلیز۔" انگریزی زبان میں کہتے اس کی آواز درد سے بیٹھ رہی تھی۔

ازمیر نے اثبات میں سر ہلاتے۔ آگے قدم اٹھائے۔ تب ہی اس لڑکی نے سامنے چٹان پر اشارہ کیا۔

"وہ۔" وہاں اس کا کیمرہ رکھا تھا۔

"توبہ استغفراللہ' مرنے کو پڑی ہے' کیمرہ نہیں بھولی۔"

رضا حیات بڑبڑاتے کیمرے کی جانب بڑھے اور اپنا سازو سامان بھی اٹھا لائے تھے۔ لفٹ اسٹیشن پر ہیلتھ کیئر سنٹر تھا اور یقیناً" وہ اسی لیے بنا ہے جنگل میں ہونے والے کسی بھی حادثے کی صورت میں فوراً" فرسٹ ایڈ مہیا کر دی جائے۔ اس چھوٹے سے سنٹر میں جا کر محسوس ہوتا تھا اس لڑکی کی خوب جان پہچان ہے یا تو وہ آئے دن گرتی رہی ہے' یا اس سنٹر میں کام کرتی رہی ہے۔ کیوں کہ جس طرح سے ڈاکٹر اور نرسز اس سے بات کرتے ہوئے ڈپٹ رہے تھے وہ اس کے اپنے ہی لگ رہے تھے۔

وہ اسے وہاں چھوڑ کر' اجازت لے یونیورسٹی واپس آ گئے' پھر کتنے دن تک ایسے ہی باتوں میں اس کا ذکر نکل آتا۔ اس کے خبط پر دونوں کانوں کو ہاتھ ہی لگاتے تھے۔ تھیسز مکمل ہونے پر دونوں کی اسائنمنٹ جمع ہو چکی تھیں۔ ویک اینڈ پر فری تھے۔ اب تک وہ جہاں

بھی گئے تھے اپنے کام کے سلسلے میں جانا ہوا لیکن آج بطور خاص سیاحت کی غرض سے (فیوزی بائیک) کا انتخاب کیا تھا کہ جا کر دیکھا جائے ایسا کون سا کمال ہے کتنے اسٹوڈنٹ ہو کر آئے، اپنے نئے قصے سناتے۔۔۔

کمال تو واقعی وہاں بڑا تھا۔ انتہائی چوڑی سرمئی سڑک پر ہر جانب سائیکلوں کی بھرمار تھی۔ بچے، بوڑھے، لڑکے، لڑکیاں سب سائیکلوں پر ون ویلنگ کرتے، گول چکروں میں گھماتے عجیب مضحکہ خیز حرکتیں کر رہے تھے اور تو اور چھوٹے چھوٹے ٹھیلے بھی سائیکلوں پر لگے تھے۔ سائیکل کے ہینڈل کی جانب چھوٹی سی باسکٹ اور پیچھے کیریئر کی جگہ بھی تاروں والی باسکٹ فٹ تھی اس میں مختلف اشیاء رکھے فروخت کر رہے تھے پھول، چاکلیٹ، بسکٹ، برگرز۔۔۔ لوگوں کا خوب رش، ہنستے مسکراتے بے فکر سے چہرے تھے۔

"مجھے لگتا ہے اپنے ہاں جو قلفی کی ریڑھیاں پھرتی ہیں، انہوں نے یہاں سے ہی آئیڈیا لیا ہوگا۔" ازمیر کے سامنے سے آئس کریم کی سائیکل ریڑھی گزری تھی جس کے ہینڈل پر بڑا سا فریزر لگا تھا۔ رضا حیات آگے بڑھ کر دو کون آئس کریم لے آئے آئس کریم کھاتے باتیں کرتے آگے بڑھ رہے تھے جب ایک بار پھر سے دم بخود رہ گئے۔ ہاتھوں میں پکڑی کون تک بھول گئے سلو موشن میں انہیں پھیر کر ایک دوجے کو دیکھا پھر سامنے۔

چوڑی سڑک کے بالکل سامنے بڑا سا بیضوی گراؤنڈ تھا۔ جس میں بہت سے ٹریک بنے ہوئے تھے مختلف لڑکے، لڑکیاں وہاں تیز سائیکلیں گھما رہے تھے۔ کوئی وہیل اٹھا لیتا، کوئی ہاتھ چھوڑ کر چلاتا۔ گراؤنڈ کے درمیان میں پانچ لڑکے ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے دائرے میں اپنی اپنی سائیکل ایسے مہارت سے چلا رہے تھے ایک بھی ٹریک سے باہر نہیں نکل رہا تھا۔ اگر ہم کبھی آسٹریلیا جائیں انہیں دیکھ کر پورا یقین آجاتا ہے اس قوم کی زندگی میں کھیل کود کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔ جگہ جگہ کھیل کے میدان کھلاڑی ہر پل تیار اور پھر خطرناک قسم کے کھیل۔

سائیکلیں گھمانا، ون ویلنگ اپنی جگہ لیکن اس گراؤنڈ کے داہنی جانب خاصی چوڑی اور اونچائی سے آتی لمبی سی سلوپ تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے ہاں پارکوں میں سلائیڈ لگی ہوتی ہے بچے اوپر سے بیٹھ کر نیچے پھسلتے آتے ہیں۔ ہمارے ہاں کی سلائیڈ سے کئی گنا چوڑی اور اونچی اس کی چکنی سطح سے لگتا تھا وہ بے حد سلپی ہے۔ بہت سے نوجوان اس کے پیچھے بنے ریمپ پر اپنی بائیکل گھسیٹ کر لے جاتے اور اونچائی پر پہنچ کر سوار ہوتے اور نیچے کی جانب پھسلتے آتے تھے۔ لڑکوں کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ! وہ ہی سنہرے بالوں والی لڑکی اپنی اسپورٹس سائیکل لیے اونچائی پر کھڑی تھی۔ بڑے فخر سے گردن اکڑا کر سائیکل پر سوار ہوئی۔ پیڈل پر پاؤں جماتے ہی اپنے ہاتھ سینے پر لپیٹ لیے سائیکل نیچے پھسلنے لگی۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھی سنہرے بال ہوا سے پیچھے کی جانب اڑ رہے تھے۔ سلوپ کے تقریباً درمیان میں پہنچ کر سینے پر لپیٹے ہاتھ دائیں بائیں پھیلا لیے۔ صرف پیڈل سے ہی ہینڈل پر گرفت جما رکھی تھی۔

"یار یہ لڑکی یقیناً سرکس میں کام کرتی ہے۔ پاؤں تڑوا کر چین نہیں پڑا، آج یقیناً گردن یا بازو تڑوائے گی۔" رضا حیات کے تبصرے پر ازمیر "ہوں" کہتے ہوئے چونکے۔

"یار میں اس کی بات کر رہا ہوں۔" رضا نے کون کا بسکٹ چبا کر خالی ریپر ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے اس لڑکی کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"میں بھی اسے ہی دیکھ رہا ہوں۔" ازمیر کا لہجہ خاصا کھویا ہوا تھا وہ حیران تھے لڑکیاں اتنی دلیر بھی ہو سکتی ہیں، انہوں نے تو اپنے گاؤں کی شرمائی، ایک جھلک میں دوبار آنکھیں بند کرتی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ کہاں یہ بلندی سے پھسلتی لڑکی۔

"میں حیران ہوں۔"

"اور میں پریشان۔"

ازمیر کی حیرانگی پر وہ جھرجھری لیتے بولے "یار مجھے اپنا آپ خبطی محسوس ہو رہا ہے یہاں تو ایک سے بڑھ

کر ایک پاگل ہے' اگر مزید کچھ دیر رکے ہم اپنا منہ نوچنے لگیں گے۔" اب وہ لڑکی نیچے گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ اور سب کی بھرپور تالیوں کی داد ہنس ہنس کر وصول کرتی سائیکل بھگاتی ان کے قریب سے گزری تھی۔ اس نے تو شاید ہی انہیں دیکھا ہو' البتہ وہ دونوں ساکت ضرور تھے اس کی جرات پر۔

"اس جگہ کا فیوزی بائیک نام پتا ہے کیوں رکھا ہو گا؟" رضا نے ازمیر سے کہا تھا۔

وہ ابھی بھی اس لڑکی کی حرکت کے زیر اثر تھے صرف استفہامیہ نگاہ اٹھائی۔

"کیوں...؟"

"یار فیوزی تو نکلا ہو گا فیوز سے' اور بائیک' بائیسکل ... یعنی جس کے دماغ کا فیوز اڑ چکا ہے وہ اپنی سائیکل لے کر یہاں آجائے اور دوسروں کا بھی اڑا دے۔" انہوں نے قہقہہ لگاتے ازمیر کے کندھے پر زور سے تھپکی ماری۔

"اور اس لڑکی کی مجھے لگتا ہے' ہر کنکشن کی تار ٹوٹ چکی ہے۔" ان کا ارادہ یہاں سے ملبورن اسٹیڈیم جانے کا تھا' جو چند منٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔ مگر پھر ارادہ ہی بدل دیا۔ کیوں کہ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے اگلے ہفتے آسٹریلیا آنا تھا اور اس سلسلے میں اسٹیڈیم میں کچھ کام وغیرہ ہو رہا تھا۔ وہ وہاں سے سیدھے ہوسٹل آ گئے۔ البتہ وہ لڑکی ذہن میں کہیں محو ہو گئی تھی اور رضا حیات نے تو باقاعدہ اس کا نام "وہ سرکس والی" رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ازمیر کی آج کلاس نہیں تھی لائبریری میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی اور میوزیم کے درمیان سے گزرتے واٹر چینل پر آ کر بیٹھ گئے خاصا سکون تھا یہاں' پانی کی اٹھتی ٹھنڈی لہریں' جھولتے پام کے درخت' اسٹوڈنٹس بھی اکا دکا تھا۔ کچھ دیر بعد کشتی نما چھوٹی سی فیری گزر جاتی' کچھ دیر پانی کروٹیں کھاتے پھر سکون سے بہنے لگتا۔ تب ہی وہ سامنے سے چلتی آ رہی تھی۔ نیلی جینز پر سرخ کھلی سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی گلے میں اس کے کیم کورڈ جھول رہا تھا اور دائیں ہاتھ میں ہیل والے سینڈل پکڑ رکھے تھے۔ وہ ننگے پاؤں واٹر چینل کے پتھروں پر چلتی اسی جانب آ رہی تھی جدھر ایک بینچ پر ازمیر بیٹھے تھے۔ چلتے چلتے اس نے ایک اچٹتی نگاہ ان پر ڈالی وہ مسلسل پانی کو دیکھ رہے تھے۔ اس لڑکی کی یادداشت بلا کی تیز تھی۔ دو ماہ پہلے ہونے والی فورسٹ والی ملاقات اسے یاد تھی۔ ایک نگاہ میں ہی ازمیر کو پہچان گئی۔

"ہائے۔" وہ قدرے قریب ہو کر بولی۔ وہ چونکے ضرور تھے لیکن اس کے مسکرانے پر جواباً" وہ بھی مسکرا دیے۔

"تم وہی ہو ناں۔ فورسٹ والے۔" اس نے جوتے بائیں ہاتھ میں تبدیل کرتے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے کہا تھا۔

"میں میبھل آسکر۔"

"اوہ۔" انہوں نے اس سے ہاتھ ملایا "میں ازمیر میر علی۔"

"اوہ میر۔"

اسے صرف "میر" مشابہہ لگا تھا۔ البتہ انہوں نے تصحیح کر دی "میر نہیں ازمیر۔"

"وہ گڈ۔"

اپنے سینڈل نیچے رکھتی وہ ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔ ازمیر کی گود میں اس کی ایک فائل رکھی تھی' اسے دیکھتے ہوئے جب وہ شروع ہوئی تو ایسے معلوم ہوتا تھا کوئی اجنبی نہیں بلکہ شناسا دوست بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی صورت ہی کی طرح خاصی خوش اخلاق بھی لگی تھی بات سے بات' بات اور تب ہی ازمیر کو پتا چلا تھا وہ بھی کیتھولک کی اسٹوڈنٹ ہے اور آج کل "نارتھ کے سرف سٹی" کے ساحلی کلچر پر ریسرچ کر رہی ہے ایک ڈاکومنٹری بنانی ہے۔"

"اوہو زبردست۔" ازمیر کو اس کی ایجوکیشن کا سن کر خوشی ہوئی تھی۔ "پھر اس دن چٹان پر کیا کر رہی تھیں' میرا خیال ہے وہاں سرفنگ کلچر نہیں تھا۔" وہ

سنتے ہی بہت زور سے ہنسی تھی جب ہی ازمیر نے دیکھا اس کے سفید گال پر بہت گہرا ڈمپل پڑتا ہے، جو اس سے بھی زیادہ ہنس رہا تھا۔

"اکیچوکی میری ڈاکومنٹری میں ایک کلپ ایسا ضرور ہوتا ہے' دیکھنے والے تالیاں بجائیں نہ بجائیں' خوف سے ان کے دانت ضرور بج جاتے ہیں۔" اس نے اپنے کیم کورڈ میں ایک ڈسک ڈال کر اسے کئی ڈاکومنٹری دکھائی تھیں۔ مختلف بیچز اور آبشاروں کی اور ہر جگہ کہیں نہ کہیں پر خطر کھڑی چونکا رہی تھی۔ یہ ان کی اتفاقیہ ملاقات تھی جو خاصی طویل ہوئی تھی اور دوستی کی بنیاد بھی ثابت ہوئی اور پھر اس طرح کی اکثر ملاقاتیں لیلی ورسٹی میں ہونے لگیں۔ مذہب کے علاوہ ہر کرنٹ افیئرز پر بحث ہوتی۔ ازمیر خاصے پرکشش نوجوان تھے ان کی شخصیت کا سحر میبجل پر چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے ڈپارٹمنٹ میں ڈھونڈتی ڈھانڈتی پہنچ جاتی۔ ایک دن رضا حیات نے ازمیر کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

"اس سرکس والی کے ساتھ تیرا کیا چکر ہے؟"

"اوہو' میرا اس سے کیا چکر ہوتا۔۔۔ اسٹوپڈ۔"

"اچھا۔" رضا کو اچنبھا ہوا "اگر چکر نہیں ہے تو' تیرے آگے پیچھے کیوں گھومتی ہے۔"

"جا کر پوچھ لے کیوں گھومتی ہے۔"

"سیدھی طرح بتاتا ہے یا۔۔۔ کھڑکاؤں چاچا میر علی کو فون۔۔۔ تاکہ وہ آکر تجھے کھڑکا دیں۔"

"کیا ہو گیا ہے یار' رضا۔۔۔ جسٹ آ فرینڈ۔۔۔ مجھے اپنی لمٹ کا پتا ہے۔" ازمیر جھنجلا گئے۔

"پھر اسے بھی ذرا اپنی لمٹ بتا دے۔۔۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا' تیرے آگے پیچھے کوئی گوری گھومے' اور مجھے کوئی گھاس بھی نہ ڈالے۔"

"تو ذرا خود کو گدھا سمجھنا چھوڑ دے ناں' گھاس کی ضرورت نہیں رہے گی۔" رضا حیات پنجے جھاڑتے ہوئے اس پر چڑھ دوڑے تھے۔

وقت اپنی موج میں بہہ رہا تھا ازمیر کو اندازہ بھی نہیں ہوا میبجل کب اور کیوں ان میں حد سے زیادہ دلچسپی لینے لگی ہے' ویک اینڈز پر ہونے والی ملاقات ہر روز پر محیط ہونے لگی اور آئے دن اسے کسی مقام پر جانا ہوتا ازمیر کو ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگی۔ ایک دو بار تو اس کے ساتھ چلے گئے لیکن جب انہیں اس کے بڑھتے ہوئے قدم محسوس ہونے لگے تو اپنے روک لیے تھے صاف کہا تھا۔

"دیکھو میبجل میں یہاں پڑھنے کے لیے آیا ہوں' واپس چلا جاؤں گا' ہر صورت اور میں چاہتا ہوں میں یہاں سے اچھی ڈگری لے کر جاؤں' نہ کہ یادیں۔"

"جہاں سے انسان ڈگریاں اکٹھی کرتا ہے' وہاں کچھ یادیں بھی ہوتی ہیں' جو خود بخود اس کے ساتھ لپٹ جاتی ہیں' ان سے پیچھا چھڑانا انسان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔"

"لیکن میرا خود پر بس چلتا ہے۔"

آسٹریلیا میں کرکٹ میچز چل رہے تھے وہ اسٹیڈیم کی ٹکٹس لے کر آئی تھی۔ ازمیر نے اس کے ہاتھ سے ٹکٹ پکڑا تک نہیں تھا اپنے دونوں ہاتھ جیبوں میں اڑسے رکھے۔

"تمہارا خود پر چلتا ہوگا' لیکن میرا خود پر سے اٹھ گیا ہے۔" انہوں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی نیلی گرے آنکھوں میں بے بسی سی تھی انہیں یک لخت اس سے وحشت ہوئی۔ اور تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

اسے بہت شدت سے آنے والے لمحوں کا انتظار تھا۔ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتا۔ وقت جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وقت کی یہ خصوصیت حاوی رہی ہے جب بھی اس کے گزرنے کا انتظار ہو وہ کسی کیکڑے کی طرح اپنی سوئیاں جما لیتا ہے' بھاگنے تو کیا سرکنے کا بھی گمان نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ ہفتہ گزرا تھا جس دن ازمیر چچا نے فون پر اپنے آنے کی ڈیٹ اور فلائٹ نمبر بتایا حنبل ذکا حرکت میں آ گئے تھے۔ مہمان خانے کی صفائی کا آرڈر آمنہ بھرجائی کو دینے کے علاوہ

بذات خود زینب کو بلا کر کہا تھا کہ وہ اپنی نگرانی میں کروائے۔ چیزیں دیکھے وہاں کس کس چیز کی ضرورت ہے' کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے اور جب صبح شام دو تین بار خود زینب سے پوچھا اسے اپنا آپ ویسے ہی معتبر لگنے لگا تھا۔ حنبل ذکا کی عادت نہیں تھی وہ کبھی گھر کے معاملات میں اس طرح پوچھ گچھ نہیں کرتا تھا۔ یہ سب آئمہ بیگم کی ذمہ داری تھی جو بخوبی نبھا بھی رہی تھیں' لیکن اب جس طرح سے وہ دلچسپی ظاہر کر رہا تھا سب ہی محسوس کرنے لگے۔ آئمہ بیگم نے تو ایک دن ہنستے ہوئے کہا بھی تھا۔

"ماں جان سے زیادہ چچا کے آنے کی خوشی حنبل کو ہے۔"

"ہونی بھی چاہیے۔" وہ گردن اٹھا کر بولا "جس طرح ازلان میرا بھتیجا ہے' اسے مجھ سے بے تحاشا محبت ہے' بالکل اسی طرح میں از میر چچا کا بھتیجا ہوں' مجھے ان سے محبت ہے' ہم ایک خاندان ہیں' ایک خون ہیں' خوشی تو پھر بنتی ہے ناں۔"

آئمہ بیگم مسکرا دی تھیں۔ زینب جو آئمہ بیگم کو مہمان خانے کے بارے میں کوئی اطلاع دینے آئی تھی حنبل ذکا کو دیکھ کر' دیکھتی رہ گئی اچھا بھلا اس کا دماغ کچھ ٹھکانے آنے لگا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا ایک رشتہ آیا تھا۔ روزانہ سبزی لے جا کر شہر بیچتا تھا شکل صورت کا بھی قدرے بہتر ہی تھا۔ اس رشتے پر زینب نے دل کو نہ سہی مگر زبان کو کنٹرول میں رکھا ہوا تھا۔ نہ زیادہ چیخی چلائی تھی' نہ ماں سے لڑائی جھگڑا کیا تھا۔ بس چپ ہو گئی تھی اور خاموشی اقرار کی تصدیق سمجھی جاتی ہے' یعنی وہ اقرار کر چکی تھی کہ حنبل ذکا اور اس میں بے تحاشا فرق ہے نہ صرف شکل و صورت کا بلکہ خاندان اور طرز خاندان کا اس نے اپنی بھرپور کوشش سے اس کے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا اور خاص کر جب سلویٰ آئی خود کو کچن میں زینب اس طرح مصروف کر لیتی جیسے پر تکلف کھانوں کے لیے جلتا چولہا۔ چولہے کی لو کی طرح ہی اس کا دل سلویٰ کو دیکھ کر بھڑ بھڑ اتا تھا۔ لیکن اب جان گئی تھی اس بھڑ بھڑاہٹ کا حل کوئی نہیں ہے بہتر ہے خود کو سامنے سے ہٹا دوں۔ جب خود کو ہٹا دیا تو اس نے پھر سے لو تیز کر دی تھی بار بار اسے بلا کر' اس کے ذمے کام لگا کر اور اس دن جب زینب کے دل میں آیا مہمان خانے کی صفائی میں سب سے پہلے رنگ و روغن ہے' بھلے چند مہینے پہلے ساری حویلی میں پینٹ ہوئے تھے تب مہمان خانے میں بھی ہوا تھا لیکن اب بطور خاص حنبل ذکا نے صفائی کا کہا ہے تو دوبارہ سے ہو جائے کمرہ تو لشکارے مارے گا۔

موچی نذیر کا لڑکا اصغر رنگ روغن بہت اچھا کر لیتا تھا۔ پہلے بھی اس نے ہی کچھ اور لڑکوں کے ساتھ مل کر حویلی میں روغن کروایا تھا۔ اب تو صرف مہمان خانے میں کروانا ہے اکیلا بھی کر سکتا ہے' ویسے تو وہ اس کے پاس کبھی بھی نہ جاتی جس طرح سے اصغر اسے تنگ کرتا تھا مگر اب معاملہ اور تھا۔ حنبل ذکا کو خوش کرنے کا۔ اسی نیت سے وہ ڈیرے کے پیچھے بنے کھیتوں میں کام کرتے اصغر کے پاس گئی تھی وہ اس کی فرمائش سن کر پوری کمینگی سے ہنس رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتا حنبل ذکا دو تین مزارعوں کے ساتھ کھیتوں کا چکر لگاتا وہاں سے گزرا' ان پر نظر پڑتے ہی خون اندر تک کھول گیا تھا۔ اس نے مزارعوں کو ہاتھ سے پیچھے ہی روک دیا خود تیز قدموں سے اس کی جانب بڑھا۔

"کیا بات ہے' کیوں آئی ہو ادھر۔" زینب کے منمنانے پر اصغر فوراً سے اپنی صفائی میں بولا۔

"چیمہ جی' میں نے نہیں اسے بلایا۔ خود آئی ہے' روغن کروانے کے لیے۔" اسے پرانی مار بھولی نہیں تھی۔ اس سے پیشتر کہ حنبل کا پھر سے ہاتھ اٹھتا وہ کہہ کر کئی قدم پیچھے ہو گیا۔ اب حنبل ذکا نے ابرو اٹھا کر زینب کو غصے سے دیکھا تھا وہ چادر لپیٹ تیزی سے حویلی کی جانب بھاگی۔ وہاں تو حنبل ذکا نے اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ لیکن اگلے دن لان میں جب وہ پودوں کو پانی دے رہی تھی وہ اس کے پاس رک گیا۔

"حویلی کی ہر عورت' یہاں کے مردوں کی عزت ہے' مجھے اچھا نہیں لگتا' ہماری عزت پر ہوس کی نگاہ

اٹھے۔ آئندہ وہاں نہ دیکھوں، سمجھیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا، دل تیز دھڑک رہا تھا۔

"اور یہ رنگ روغن کا کیا مسئلہ ہے، کچھ عرصہ ہی تو گزرا ہے، صفائی کا مطلب جھاڑ پونچھ اور دوسری چیزیں ہیں... نہ کہ مرمتیں شروع کروا دو۔"

وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا لیکن اس کا جملہ "حویلی کی عورت، اس کی عزت" نے پھر سے سلائے دل کو جگا دیا۔ بات بات پر ماں سے جھگڑنے لگی، سبزی فروش کے اندر یک لخت سنڈیاں کیڑے پڑ گئے تھے۔ بس یہ یاد تھا باہر سے مہمان آرہے ہیں حنبل ذکا خوش ہے اور اسے اس نے بہت خوش کرنا ہے۔ مہمانوں کی خدمت کرکے، مہمان خانہ بہترین تیار کرکے وہ یہی بتانے آئی تھی کہ نئے پردے لگا دیے ہیں ذرا دیکھ لیتے۔ حنبل ذکا کا سر ہلنے سے پہلے آمنہ بیگم اٹھ گئیں۔

"تو چل میں دیکھتی ہوں۔"

زینب کا دل برا ہوا تھا کاش حنبل ذکا آتا دیکھنے، وہ اس کے کام اور محنت کو سراہتا لیکن وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا کچھ دیر بعد آمنہ بیگم نے مہمان خانے کا جائزہ لیا کچھ نقص نکالے۔ کچھ چیزیں بہتر کہہ دیں۔

☼ ☼ ☼

جوس فیکٹری کے فروخت کا معاملہ کچھ التوا میں پڑا تھا۔ میرز ذکا اس معاملے میں بالکل بھی شامل نہیں تھے انہیں اپنے دونوں بیٹوں کی سمجھ بوجھ پر بہت اعتماد تھا۔ خیام ذکا آج کل چاول پالش کرنے والی مل میں بہت زیادہ مصروف تھے۔ کیوں کہ وہاں سے بہت بڑی مقدار میں چاول باہر بھجوانے والے تھے اسی لیے ان کا سارا دن مل اور گوداموں میں گزر جاتا۔ حنبل ذکا، خیام ذکا کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے۔ اسی مصروفیت میں ان کا پھر فون آگیا۔ حالانکہ غیر نہیں تھے پھر بھی کاروبار کے معاملہ میں ڈر رہے تھے اور وہ اپنے بہنوئی کے ساتھ فیکٹری کا دورہ کرنا چاہتے ہیں۔ حنبل ذکا نے بہت سہولت سے یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ وہ جب چاہیں وہاں کا وزٹ کر سکتے ہیں میرا منیجر ان کی مدد کر دے گا۔

وہ تینوں بھائی اپنے بہنوئی شہروز کمال کے ساتھ فیکٹری کے دورے پر تھے۔ حنبل ذکا بھی اس وقت شہر میں فیکٹری سے ملحقہ آفس میں موجود تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ ادھر فیکٹری کی جانب آگیا۔ شہروز کمال فیکٹری کے ایک ایک حصے پر اعتراض کر رہا تھا۔ جوس کنٹینرز بہت پرانا ہے، پائپس لیک کر رہی ہیں، لیور زنگ آلود ہیں۔ اس کے اعتراضات میں کچھ حد تک ہی حقیقت تھی۔ جس طرح سے فیکٹری کی قیمت لگ رہی تھی اس حساب سے انتہائی فضول اعتراض تھے حنبل ذکا پشت پر ہاتھ باندھے خاموشی سے ان کی رائے سننے کے بعد اپنے ہمیشہ کے تحمل بھرے لہجے میں گویا ہوا۔

"آپ کا نقطہ نظر اپنی جگہ، لیکن پائپس اتنے لیک نہیں ہیں کہ جوس ٹپک کر باہر نکل رہا ہے، نہ کہ کنٹینرز اتنے پرانے کہ جوس جمع ہوتے ہی ایکسپائر ہو رہا ہے، ان سب کی مرمت بہت کم لاگت میں ہو سکتی ہے اور میں آپ کو یہ بتا دوں۔"

اس نے شہروز کمال کی آنکھوں میں آنکھیں جما دیں "یہ فیکٹری فیصل آباد چیمبر آف کامرس کی رکنیت رکھتی ہے، اگر اتنے گئے گزرے حالات ہوتے تو چیمبر میں میری رائے اتنی اہمیت نہ رکھتی جتنی کہ اس وقت ہے، بہر حال آپ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔" وہ کہہ کر مضبوط قدموں سے چلتا فیکٹری کے ہال سے نکل کر کوریڈور کی جانب مڑ گیا اپنے منیجر کے کیبن میں جاکر اسے ہدایات دیں خود آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں اس کے بہت سے کام تھے۔ جس جس جگہ پر ان کے شیئرز تھے اسے وہ بھی خود ہی ہینڈل کرتا تھے۔ نہ کہ ایک فیکٹری کی فروخت پر اپنا سارا وقت برباد کرے۔

شہروز کمال نے اپنے سالوں کے سامنے اس فیکٹری کی حالت مایوس کن ہی کہی تھی۔ وہ پہلے ہی بزنس کا تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ شہروز کمال کی بات نے انہیں بالکل ڈرا دیا۔ یہ نہ ہو کہ فیکٹری خرید کر پچھتائیں ایک ایک

مشینری کو ٹھیک کروانا پڑے۔ وہ الجھ کر رہ گئے تھے۔
البتہ شہروز کمال نے کچھ دن بعد حنبل زکا سے خود رابطہ کیا اور سالوں سے قدرے بہتر پیشکش دیتے ہوئے فیکٹری میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ تب اسے اس کے اعتراض کی وجہ پتا چلی تھی۔ حنبل زکا نے اسے نہ تو مکمل جواب دیا اور نہ ہی ملاقات کا ٹائم بلکہ بہت سمجھ داری سے یہ کہہ دیا۔
"فی الحال اگلا ایک ہفتہ میں بہت بزی ہوں' میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وکیل کو ٹائم دے سکوں۔۔۔ یقیناً" ہم اس ٹاپک پر بعد میں بات کریں گے۔" اس نے اگلی کال اس کے بڑے سالے کو ملائی تھی۔ جو بڑے وثوق سے شہروز کمال کی زبان بول رہا تھا۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے قطعیت سے کہا تھا۔
"شہروز کمال حقیقتاً" کمال کا آدمی ہے۔۔۔"
"میں سمجھا نہیں۔" ڈیلر کو تعجب ہوا تھا۔
"آپ کو سمجھانے کے لیے ہی فون کیا ہے' زندگی کے معاملات میں اپنے دماغ اور آنکھوں سے کام لینا سیکھیں' میں آپ کا کزن ہوں اور بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں' جبکہ شہروز کمال کو چند سال ہے۔" اس نے حیرت سے بند فون کو دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرہجل آسکر بہت دنوں سے ان کے ڈپارٹمنٹ میں نہیں آئی تھی۔ کچھ عرصہ سے وہ جس روٹین سے آرہی تھی یہ تعجب کی بات تھی۔ ازمیر کے دل میں ایک دو بار خیال گزرا اس کا پتا کرلینا چاہیے' آخر کو بہت اچھی دوست ہے۔ پھر اس خیال سے خود کو روکے رکھا۔ میرا اس سے ملنے جانا' اس کی مزید حوصلہ افزائی کرے گا۔ وہ رک گئے۔ رضا حیات نے انہی دنوں ایک فرٹیلائزر کمپنی میں جاب کرلی رات کو خاصی دیر سے ہوسٹل آتے۔ انہیں اپنے آفس میں کسی جاننے والے سے پتا چلا تھا۔ میرہجل بہت بیمار ہے' انہوں نے ازمیر سے ذرا سا تذکرہ کیا۔ وہ استعجابیہ چونکے تھے۔
"کیوں کیا ہوا۔۔۔ کس نے بتایا تمہیں؟"
"اوہ بھائی صبر۔" رضا حیات کو ان کا انداز ہنسنے پر مجبور کر گیا "ہونا کیا ہے' سرکس کرتے ٹوٹ گئی ہوگی کوئی چیز۔"
"بی سیریس یار۔" ان کا لہجہ تفکر آمیز تھا۔
"تو بڑا سیریس ہو رہا ہے' میری پچھلے ہفتے طبیعت خراب رہی ہے' دوا تک تو نے نہیں لا کر دی' گر تا پڑتا خود گیا تھا لینے۔۔۔ اس کی فکر دیکھو۔۔۔ جسٹ آ فرینڈ۔" آخر جملہ چبا کر ادا کرنے پر ازمیر اندر تک تلملا گئے۔
"تو بتائے گا یا میں خود جا کر پتا کرلوں۔"
"مجھے کیا پتا' ہوا کیا ہے اسے۔۔۔ آفس کا ایک کولیگ اسے جانتا ہے اسی نے بتایا تھا۔۔۔ میں تو سمجھا تجھے پتا ہوگا۔۔۔ آخر کو جسٹ آ فرینڈ ہے۔" اس پر دو حرف بھیج کر انہوں نے اپنا فون اٹھایا نمبر ملایا تھا۔ وہ بند جا رہا تھا۔ پھر یہی سوچ کر رکھ دیا صبح خود جا کر پتا کرلیں گے۔ اس نے اپنا ایڈریس انہیں دے رکھا تھا۔ اگلے دن یونی میں بہت مصروف گزرا کسی کا گمان بھی نہیں آیا تھا۔ شام کو جب ہوسٹل میں لڑکوں نے میچ کا پروگرام بتایا انہیں یک لخت میرہجل یاد آگئی تھی رضا حیات اس دن چھٹی پر تھا اور بیڈ پر بے کار لوگوں کی طرح اونچا اونچا کوئی گانا گنگنا رہا تھا۔ ازمیر نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی آفر کی جو انہوں نے صاف رد کر دی۔
"میں کہیں نہیں جا رہا۔۔۔ اللہ اللہ کر کے چھٹی ملی ہے' عیادتوں میں ضائع کر دوں۔" دفعتاً" ان کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ازمیر پاس کھڑے تھے انہوں نے کھول کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے چونکتی نگاہ رفتہ رفتہ شرمساری میں بدل گئی۔ کیونکہ سامنے میرہجل کھڑی تھی اسکن جینز پر سیاہ کالر والی شرٹ پہنے۔ روکھے پھیکے چہرے پر ہلکی سی لپ اسٹک تھی۔ اونچی ہیل اور ایک کندھے پر لمبی اسٹرپ والا پرس جھول رہا تھا۔
"ہیلو" کہتے انہوں نے اسے اندر آنے کا راستہ دے دیا تھا۔ وہ اعتماد سے چلتی اندر آگئی۔ رضا اسے

دیکھتے ہی فوراً" اٹھ کھڑے ہوئے خاصا رف حلیہ تھا خجالت سے کان کھجاتے ایک جانب ہو گئے۔

"آؤ میر بچل..... بیٹھو۔"

ازمیر نے انہیں بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ رضا نے فریج سے ایک جوس کین نکال کر ازمیر کی جانب اچھالتے بھنوؤں سے ایسے اشارہ کیا تھا جیسے کہا ہو "پیش کر" خود باہر نکل گئے۔

"کیا حال ہے تمہارا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

اس نے سرعت سے گردن اٹھا کر انہیں دیکھا اندر چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا خیال تھا ازمیر کو اس کی طبیعت کا معلوم نہیں ہو گا۔ اسی لیے فون تک نہیں کیا۔ لیکن وہ تو اپنے منہ سے اقرار کر رہا تھا اسے پہلے سے معلوم ہے۔

"تمہیں میری طبیعت کا پتا تھا۔" اس کی آواز کنوئیں میں دھنسی لگ رہی تھی۔ "میں خوش فہم تھی کہ نہیں پتا ہو گا۔" ازمیر کے چہرے پر ایک خفت کا سایہ لہرایا تھا۔ قدرے اعتماد سے بولے۔

"ایکچوئلی مجھے کل ہی رضا نے بتایا ہے" آج یونی میں مصروفیت بہت رہی "ابھی تمہاری طرف کا پلان کر رہا تھا۔"

"نہیں ازمیر دراصل تمہیں خود پر کنٹرول ہے..... میرا خود پر نہیں رہا۔"

اس کے ٹھہرے لہجے میں بہت سی اداسی تھی۔

انہوں نے ایسا تاثر دیا جیسے اس کی بات سنی نہ ہو۔ کین کی سیل کھولی۔ ذرا سے ایک چھوٹی سی پائپ کا ریپ اتار کر اس میں لگائی۔ اسے جوس پیش کیا تھا۔ اس نے بنا انکار پکڑ لیا تھا اور مسلسل ازمیر کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کھوئی کھوئی، بجھی بجھی آنکھوں سے۔

"تمہاری ڈاکومنٹری کا کیا بنا؟ پوری ہو گئی۔"

وہ جان کر موضوع بدل رہے تھے۔ اس نے بھی نظریں چہرے سے ہٹا کر اردگرد رکھی چیزوں پر گھمائیں۔

"ہاں ڈاکومنٹری کا کیا ہے، ایک پوری ہوتی ہے دوسری شروع کر لیتی ہوں۔ بات تو زندگی کی ہے۔" لمحہ

توقف کے بعد اس نے اپنا پرس کھول کر ایک کارڈ نکالا۔

"ہمارے گھر سالانہ ڈنر ہے۔ کیا شرکت کرو گے۔"

اس نے کارڈ پکڑا کھول کر دیکھنے لگا۔ "میں تمہیں اپنے گھر والوں سے ملوانا چاہتی ہوں۔" انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا خاموشی سے پڑھ رہے تھے۔ میہجل کو انکار کا خدشہ ہوا تھا تبھی دوبارہ سے کہہ رہی تھی۔ "میرا خیال ہے تم انکار کردو گے۔ تمہارا خود پر بس چلتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے میہجل۔" انہوں نے کارڈ بند کرکے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا "میں ضرور آؤں گا۔ اور میں کچھ چیزوں پر تم سے اوائڈ کرتا ہوں' اس کی وجوہات ہیں' میں نہیں چاہتا میرے کسی انکار سے تمہارا دل ٹوٹے۔" وہ دم سادھے اک ٹک اسے دیکھے گئی۔ پھر اپنے بیگ کی اسٹرپ درست کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ خاموشی سے باہر نکلتی چلی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک کے بن گئے تھے۔

مقررہ رات انہوں نے الماری سے ایک عام سا پینٹ شرٹ نکالا اور واش روم کی جانب چل پڑے کچھ دیر بعد نہا دھو کر آئینے کے سامنے کھڑے بال بنا رہے تھے تب رضا حیات کو تعجب ہوا۔

"تم اس سوٹ میں اس کے گھر ڈنر پر جاؤ گے۔"

گول گلے والی وائٹ ٹی شرٹ نیچے چپل سیاہ جینز بالکل ایک عام سا حلیہ تھا۔

"کیوں کیا ہے ایسے۔"

انہوں نے گلے کے گرد اسپرے کرتے ایسے پوچھا جیسے وہ بہترین تیار ہوں اور رضا کو کچھ غلط نظر آرہا ہو۔

"انتہائی بکواس ہے۔ تم اس کے گھر پہلی بار' اور سالانہ ڈنر پر جارہے ہو' ان کے رشتے دار ہوں گے۔ اور بھی بہت سے لوگ ہوں گے اور تم جانتے ہو یہاں سالانہ ڈنر کتنے اہتمام سے ہوتا ہے۔ اس نے کسی سے ملوانا ہو گا تمہیں۔"

"اور میں اسی لیے اہتمام سے نہیں جانا چاہ رہا' عام بن کر جانا چاہتا ہوں۔" وہ بوٹ پہن کر اس کے تسمے بند کرتے سیدھے ہوئے "مجھے ضرورت نہیں ہے پرفیکٹ بن کر دکھانے کی۔"

"چہ چہ چہ۔۔۔" رضا کو سچ میں غصہ آگیا "تو بہت ہوشیار ہے' اپنی اہمیت بڑھانے کو مختلف بن کر جاتا ہے۔ ایسا حلیہ دیکھ کر اس کی اماں تجھے برتن مانجھنے پر لگا دے گی۔"

وہ کہتے ہوئے الماری کی جانب بڑھے ویلوٹ کا سیاہ کوٹ نکال کر زبردستی انہیں پہنایا۔ "شرٹ نہیں بدلنی نہ بدل' کم از کم یہ پہن لے' برتن مانجھتا از میر مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔" وہ اسے گھورتے رہے ایک جھٹکے سے کوٹ چڑھا باہر نکل گئے۔

میہجل کا تعلق وہاں کی متمول فیملی سے تھا۔ اس کے خاندان میں اس کی ماں اور بہن فلوریہ شامل تھیں۔ اس کی ماں ٹانگوں کی معذوری کے باعث وہیل چیئر پر تھی مگر پھر بھی اپنے شوہر کی چھوڑی بہت سی جائداد کی دیکھ ریکھ اور کرائے کو بہتر طریقے سے چلانے کے ساتھ آن لائن ایک بوتیک اور جیولری شاپ چلا رہی تھیں۔ فلوریہ اپنی ماں کا دایاں بازو تھی تعلیم کے ساتھ ان کے بزنس کے معاملات میں پیش پیش رہتی۔ میہجل چھوٹی اور بے حد لاڈلی ہونے کے باعث کسی بھی قسم کی ذمہ داری سے آزاد تھی۔ لیکن اس کے عجیب و غریب شوق تھا۔ ایڈونچرز اس کی رگوں میں بسے ہوئے تھے۔ خطرناک جگہوں پر جانا ڈاکومنٹری فلمز بنانا' انتہائی خطرناک حرکتیں کرکے دوسروں کو دم بخود کردینا۔ فیملی کی روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے اس کی یہ عادت پختہ ہو گئی تھی۔ ڈاکومنٹری فلم سے جو پیسا کماتی اپنے ایڈونچر پر لگاتی یا کسی سینٹر میں چیریٹی کردیتی۔ اس کی زندگی بہت مزے میں گزر رہی تھی کہ اچانک ازمیر نے سوچوں پر قبضہ کرلیا۔ چند ماہ میں ہی اس کی سرگرمیوں میں پہلی سی شدت نہیں رہی تھی۔ خود سے لاپروا لڑکی بہت بہت دیر آئینے کے سامنے کھڑے ہوئے خود پر توجہ لباس مسکراہٹ نہیں

کچھ تھا جو فلوریہ اور لیڈی ہیلہ کو چونکا گیا۔ پہلے تو وہ ٹالتی رہی لیکن پھر اس نے صاف اور دو ٹوک ازمیر کے بارے میں اپنے احساسات بتا دیے تھے۔

"اوہ شیٹ... ایسٹرن۔" فلوریہ کو بے حد دھچکا لگا تھا اسے اپنی چھوٹی بہن میرہجل بے حد عزیز تھی یوں کسی مشرقی لڑکے کے ہاتھوں کھلونا بنتے وہ کم از کم میرہجل کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے ڈپٹ کر رکھ دیا تھا۔ مقابل بھی میرہجل تھی۔ ضدی ہٹ دھرم، نڈر اس نے ماں کو صاف کہا تھا۔

"آپ نے میرے باپ سے لو میرج کی، فلوریہ کا بوائے فرینڈ اس کی پسند کا ہے، بہت جلد اس کی شادی ہو جائے گی، پھر میرے لیے پابندی کیوں۔"

"ہم نے اپنے ملک اور اسٹینڈرڈ کے لوگ پسند کیے تھے، تم بھی اپنے سرکل سے کسی کو پسند کر لو۔"

"مجھے اپنے سرکل سے کوئی پسند نہیں۔ صرف وہ ایسٹرن اور بس۔" فلوریہ کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جن کے ساتھ ایسٹرن لڑکوں نے وقت گزاری کی اور چلے گئے، اسے میرہجل کے نصیب سے خوف آیا تھا۔ ہر ممکنہ حد تک اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی کمان ازمیر پر جا کر ٹوٹ جاتی تھی۔ پھر لیڈی ہیلہ نے ہی بات ختم کرتے اسے کہا تھا۔

"سالانہ ڈنر پر اسے بلاؤ، ہم سے ملواؤ۔"

میرہجل کو پورا یقین تھا ازمیر ضرور آئے گا۔ اس نے اس ڈنر کے لیے بطور خاص اپنا لباس تیار کروایا ہر طرح کی تیاری میں وہ پیش پیش تھی۔ اس کا دل تھا ازمیر آج یہاں آئے اسے اور اس کی ارینجمنٹ کو دیکھ کر بے طرح انسپائر ہو جائے اور اس کی ماں اور بہن، ازمیر سے۔ اس نے ایک رات قبل فون کر کے ازمیر کو یاد دہانی کروائی تھی۔ جواباً" اس نے صرف اتنا کہا تھا۔

"میرہجل میں کمٹمنٹ تب کرتا ہوں جب نبھا سکوں میں نے کہا ہے آؤں گا تو ضرور آؤں گا۔" پھر بھی میرہجل کے دل کو دھڑکا سا تھا اسے خود پر بہت کنٹرول ہے، ہو سکتا ہے نہ آئے۔ وہ ڈوبتے دل کے ساتھ بھی بہت خوب صورت تیار ہوئی تھی۔

مرجنڈا رنگ میں باریک سلک کی لمبی میکسی، جس کے گھیر پر لگے سلور باریک اسٹونز جگنوؤں کی طرح چمک رہے تھے۔ لانگ ہیل کا سینڈل، ہلکی پھلکی جیولری، چھوٹے ہینڈل کا بڑا سا بیگ کہنی پر لٹکائے، سنہرے بال آگے سے کچھ اٹھا کر چھوٹے سے کلپ میں جکڑ کر باقی کھلے شانوں پر چھوڑ رکھے تھے۔ وہ اپنی عام روٹین سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔ لیڈی ہیلہ اور فلوریہ کو اس کی خاص تیاری سے اس کے جذبات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ فلوریہ دل سے چاہ رہی تھی وہ لڑکا کبھی نہ آئے۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو جائے، مر جائے یا واپس اپنے دیس چلا جائے لیکن میری شوخ بہن کی زندگی تباہ کرنے کبھی نہ آسکے۔

لان میں لگائی گئیں ٹیبلز پر برتن سجا دیے گئے تھے۔ ویٹرز کھانے کی ڈشز لا کر کنٹینرز میں انڈیلتے، ڈھکن ڈھانپ دیتے۔ شمع دانوں میں ٹکائی گئیں شمعیں جلانے کا کام جاری ہو چکا تھا۔ تقریباً" سب مہمان آچکے تھے۔ لیڈی ہیلہ سب سے مسکرا کر باتیں کھانے کی میز پر آنے کی دعوت مہمانوں کو دے رہی تھیں۔ ایک جلتی شمع کے پاس وہ کرسی پر ٹک گئی تھی پھڑپھڑاتی لو اس کے چہرے کو نکھار رہی تھی۔ بس منظر میں بجتا پیانو اس وقت آخری رسوم پر اٹھنے والی رودھم کے مشابہ لگا تھا۔ دفعتاً" اس کے سفید ہینڈ بیگ میں اس کے موبائل نے ہلچل مچا دی۔

(باقی آئندہ)

☼ ☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل ------------- انمول بلوچ

میک اپ ------------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ------------- موسیٰ رضا

بشریٰ احمد

میں کب سے اخبار کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ پہلے سرخیاں پڑھیں' پھر درمیانی صفحہ کھول کر سب اہم خبروں کے بقیہ حصے پڑھے۔ اس کے بعد اداریہ صفحے کی باری آئی۔ پہلے اپنے پسندیدہ کالم نگاروں کے کالم پڑھے' اس کے بعد ناپسندیدہ کالم نگاروں کے کالموں پر بھی نگاہ ڈال لی۔ علاقائی خبریں شوبز کا صفحہ اور پھر اسپورٹس تک کا صفحہ پڑھ ڈالا۔ اچھی طرح اخبار کھنگال کر جب میز پر رکھا تو گھڑی سوا گیارہ بجا رہی تھی۔

"یہ وقت آخر گزرتا کیوں نہیں؟ ابھی تو ظہر میں بھی بہتیرا وقت پڑا ہے۔" میں نے گہری سانس اندر کھینچی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں بھی دنیا کے ہر دوسرے فرد کی طرح وقت کی کمیابی کی شکایت کرتی تھی۔ ظاہر ہے یہ زمانہ میری جوانی کا تھا۔ گھر کے کام نپٹاتے ہی صبح سے شام ہو جاتی اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا۔ حالانکہ فل ٹائم ملازمہ بھی با آسانی رکھ سکتے تھے' لیکن مجھے کسی دوسرے کے ہاتھ کا کیا کام پسند ہی نہ آتا تھا۔ اس لحاظ سے میری طبیعت ذرا وہمی سی تھی۔ جیسے تیسے کر کے میں اپنے گھر کے سارے کام خود ہی نپٹاتی تھی۔ اریبہ اور سعد میرے دو ہی بچے تھے۔ اریبہ ذرا بڑی ہوئی تو اس نے گھر کے کاموں میں از خود حصہ لینا شروع کر دیا۔ سعد بھی عام بچوں کی طرح شرارتی نہ تھا۔ میرے دونوں بچے ہی بہت تمیزدار اور سلجھے ہوئے بچے تھے۔

عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ میرے پٹھوں میں کھچاؤ اور درد رہنے لگا تھا۔ اس کے باوجود کسی پل ٹک کر نہ بیٹھتی تھی۔ اپنے لیے کوئی نہ کوئی کام اور مصروفیت ڈھونڈتی رہتی۔ اپنے اور اریبہ کے کپڑے بھی خود سلائی کرتی' یہ الگ بات کہ رات کو ہائے ہائے کے بعد یونس سے خوب ہی ڈانٹ پڑتی۔ میرا ہمدرد' غمگسار اور بے تحاشا چاہنے والا شوہر' جس کی یاد اس کے بچھڑنے کے اتنے برس بعد بھی کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی۔ اریبہ کی شادی کے محض چھ ماہ بعد یونس راہ عدم سدھار گئے۔ اریبہ بیاہ کر کینیڈا گئی تھی۔ باپ کی پہلی برسی پر ہی اس کا پاکستان آنا ممکن ہو سکا تھا۔

لوگ کہتے تھے کہ مجھے اکلوتی بیٹی کو اتنی دور نہیں بیاہنا چاہیے تھا۔ کہتی تو میں بھی یہی تھی لیکن یہ یونس کا فیصلہ تھا۔ میرا داماد شہریار ان کے جگری دوست کا بیٹا تھا۔ ہر لحاظ سے بہترین لڑکا تھا۔ یونس کہتے تھے کہ محض دوری کو بنیاد بنا کر اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرانا کفران نعمت ہے۔ شوہر کا کہا میری سمجھ میں بھی آگیا اور آج بھی میں یونس کا فیصلہ تسلیم کرنے پر اللہ کا ہزار بار شکر کرتی ہوں۔ یونس نے اکلوتی لاڈلی بیٹی کو اپنے ہاتھ سے وداع کیا۔ ہمارے دو بچوں میں سے کم از کم ایک کی خوشی تو انہوں نے دیکھ لی۔

اریبہ کی شادی کے چھ ماہ بعد ہارٹ اٹیک کے نتیجے میں یونس جان کی بازی ہار گئے۔ بہت کڑا وقت تھا۔ ہم ماں بیٹے نے وہ مشکل وقت ایک دوسرے کے سہارے کاٹ ہی لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ دل کے نادیدہ زخموں پر کھرنڈ آگیا اور کسی حد تک صبر بھی۔ اب میرے ہمدرد احباب مجھے مشورہ دینے لگے تھے کہ میں گھر کے سناٹے کو توڑنے کے لیے سعد کی شادی کر دوں۔ میں لوگوں کو کیا بتاتی کہ میں تو عرصہ دراز سے سعد کے لیے لڑکی کی تلاش میں ہوں۔ گھر گھر جا کر ہو

ڈھونڈنے کا مشغلہ میرے من کو نہ بھاتا تھا۔ البتہ میں خاندان' برادری' دوست احباب کے ہاں منعقد ہونے والی تقریبات میں اسی غرض سے شرکت کرتی کہ مجھے اپنے سعد کے لیے کوئی اچھی لڑکی مل جائے۔ ددھیال' ننھیال میں تو سعد کے جوڑ کی کوئی لڑکی ہی نہ تھی۔ سعد کے لیے مجھے خاندان سے باہر کی ہی کوئی لڑکی ڈھونڈنی تھیں اور میں کب سے اسی مشن پر لگی تھی، مگر ابھی تک کامیابی نصیب نہ ہوئی تھی۔

عام ماؤں کی طرح مجھے کسی چندے آفتاب' چندے ماہتاب بہو کا خاص ارمان تھا۔ بہت خوب صورت نہ سہی، مگر پرکشش نظر آنے والی لڑکی جو تعلیم یافتہ بھی ہو اور سلیقہ مند بھی۔ سنجیدہ اور بردباری ہو تو کیا ہی کہنے۔ یوں سمجھ لیں کہ جتنا سمجھ دار اور میچور میرا بیٹا تھا، مجھے ویسی ہی بہو کی تلاش تھی اور اللہ اللہ کر کے یہ تلاش پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اجالا میری بڑی بھاوج کی سب سے چھوٹی بہن کی نند تھی۔ بھابھی کے ہاں ایک تقریب میں' میں نے اسے دیکھا' اس کی سنجیدگی اور متانت میرے دل کو بھا گئی۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں خوب بن ٹھن کر اونچے اونچے قہقہے لگانے والی لڑکیوں سے میں سخت الرجک تھی۔ لیکن زیادہ تر تقریبات میں مجھے ایسی ہی لڑکیوں سے پالا پڑتا تھا' لیکن اجالا اپنی عمر کی دوسری لاابالی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔

میرے بھتیجے کی مہندی کا فنکشن تھا اور اجالا اس تقریب میں اپنی ماں کے ساتھ جڑ کر بیٹھی رہی۔ دوسری لڑکیاں خوب ہلا گلا کر رہی تھیں۔ اجالا ان لڑکیوں میں سب سے منفرد اور ممتاز تھی۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں اس کی شخصیت بہت بردبار اور میچور لگ رہی تھی۔ میں نے عائشہ بھابھی سے کہہ کر اجالا کی امی سے تعارف حاصل کیا۔ یہ جان کر کہ اجالا کی فی الحال کہیں منگنی وغیرہ نہیں ہوئی ہے' میں خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اتنی تلاش کے بعد مجھے میری من پسند لڑکی نظر آئی تھی' میں نے مزید دیر کرنا مناسب نہ جانا۔ اجالا کے گھر جا کر سیدھے سبھاؤ کا رشتہ مانگ لیا۔ میرے شہزادوں جیسے بیٹے کو فوراً ہی سند قبولیت بخش دی گئی۔ تین ماہ بعد اجالا دلہن بن کر ہمارے ہاں آگئی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق وہ سگھڑ اور سلیقہ مند ثابت ہوئی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس نے گھر کا انتظام و انصرام بخوبی سنبھال لیا تھا۔ میں نے اب تک بہت مصروف زندگی گزاری تھی۔ اب فراغت کے مزے لوٹنے کا وقت تھا۔ لیکن اب مجھ سے یہ فارغ وقت کاٹے نہ کٹتا تھا۔ سعد صبح کا آفس گیا شام گئے گھر لوٹتا تھا۔ اجالا گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی اور میں فارغ بیٹھی بور ہوتی رہتی۔ کبھی گھر کے کاموں میں حصہ لینے پر اصرار کرتی تو اجالا منع کر دیتی۔

"نہیں آنٹی آپ رہنے دیں' میں کرلوں گی۔" اجالا کے انداز میں اپنائیت کے بجائے عجیب سی قطعیت ہوتی تھی۔ شروع شروع میں' میں اس کے انداز پر

قدرے تھکی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ مجھے یہ انداز اچھا نہ لگا تھا۔ پھر میں نے خود کو سمجھایا کہ شاید میں یونس کے بعد بہت زود رنج ہو گئی ہوں اور چھوٹی موٹی باتوں کو زیادہ محسوس کرنے لگی ہوں اور یہ کہ اجالا کے انداز میں کوئی رکھائی یا اجنبی پن نہیں ہے۔ اس کے بولنے کا طریقہ ہی کچھ ایسا ہے۔ میں نے اس کی اجنبیت اور گریز بھرے رویے کو اپنا وہم سمجھ کر ٹالنا چاہا' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اندازہ ہوا کہ یہ میرا وہم نہیں حقیقت تھی۔ اجالا نے گھر کا انتظام و انصرام تو بخوبی سنبھال لیا تھا' لیکن اسے میری ذات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ گھر کے کسی بھی کام میں میرے مشورے یا نصیحت کو وہ مداخلت گردانتی تھی۔ اگرچہ منہ سے کچھ نہ کہتی' مگر اس کے چہرے کے تاثرات اس کی ناگواری اور بے زاری کو ظاہر کر دیتے۔ میں اس کی مدد کے خیال سے بھی گھر کے کسی کام میں ہاتھ بٹانا چاہتی تو وہ عجیب قطعیت بھرے انداز میں مجھے منع کر دیتی ہیں' سمجھ گئی تھی کہ یہ گھر اب اجالا کی راجدھانی تھا اور اسے اپنی راجدھانی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں۔ اس کی جس سنجیدگی اور بردباری پر میں مرمٹی تھی اب اندازہ ہوا کہ وہ تو آدم بے زاری کی ایک شکل تھی۔

سعد بھی شادی کے بعد مزید سنجیدہ ہو گیا تھا۔ دونوں میں نئے نویلے شادی شدہ جوڑوں والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ نہ ہنسی مذاق' نہ کوئی روٹھنا منانا' نہ کوئی شوخی چونچالی' بس ایک لگی بندھی روٹین تھی جس کے مطابق دونوں زندگی گزار رہے تھے۔ مجھے گھر کے اس سناٹے اور جمود والی فضا سے عجیب وحشت سی ہوتی۔ موقع پا کر میں سعد کو ہی سمجھانا شروع کر دیتی۔

"یہ ہی تو وقت ہے بیٹا' بیوی کے ناز نخرے اٹھانے کا۔ اسے آؤٹنگ پر لے کر جایا کرو۔ شاپنگ وغیرہ کروایا کرو۔ نئی نویلی دلہنوں کے دل میں سو ارمان دبے ہوتے ہیں' اپنی سنجیدگی کا چولا اتار پھینکو۔ ہو سکتا ہے بہو تمہارے رویے سے شاکی ہو کر ہی ابھی تک ہم سے کھل ملی نہیں۔ وہ اس گھر میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہے۔" میں نے سعد کو سمجھانا چاہا تھا۔

"اجالا بائے نیچر ہی ریزرو اور سنجیدہ مزاج لڑکی ہے امی اور یقین کریں میری طرف سے اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں۔ میں اپنی طرف سے تو یہ کر سکتا ہوں کہ اسے منہ مانگا جیب خرچ دے دوں۔ وہ میں دے دیتا ہوں۔ وہ آؤٹنگ' شاپنگ کا کوئی پروگرام بنائے تب بھی میں خوش دلی سے اس کے پروگرام پر عمل کر لوں گا۔ لیکن وہ میرے بجائے اپنی امی اور بہنوں کے ساتھ شاپنگ کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے خواتین کے ذوق یا فیشن کا کیا پتا' جب میں صحیح مشورہ دینے کا اہل ہی نہیں تو میرے ساتھ شاپنگ پر جانے کا فائدہ۔" سعد نے بظاہر مسکرا کر بتایا تھا' لیکن میں مسکرا بھی نہ سکی۔ مجھے اس پل یونس بے تحاشا یاد آئے تھے۔ ہم شاپنگ کرنے جاتے تو مجھے زبردستی اپنی پسند کے ملبوسات خریدنے پر مجبور کرتے۔ مجھے ہلکے رنگ پسند تھے۔ وہ شوخ رنگوں کے شیدائی تھے۔ میں بہت نخروں کے بعد احسان جتا کر ان کی پسند کے کپڑے سلوا کر پہنتی' لیکن پھر یونس کی والہانہ انداز میں کی جانے والی تعریفوں پر خوب مغرور اور مسرور بھی ہوتی اور ایک میرا بیٹا تھا جس کی بیوی کو اس کے ساتھ خریداری کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ میں ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وقت گزرنے کے ساتھ اجالا کے مزاج میں تو کوئی تبدیلی نہ آئی' البتہ ہم نے اس کے مزاج سے سمجھوتا کر لیا' لیکن میرا مسئلہ تنہائی اور اکیلے پن کا تھا۔ وقت کاٹے نہ کٹتا تھا' آج بھی ایسا ہی دن تھا۔ اخبار کے تفصیلی مطالعے سے فارغ ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا تو ابھی سوا گیارہ ہی بجے تھے۔ اجالا کچن میں تھی اور کچن کے کاموں سے فارغ ہو کر اس نے اپنے بیڈ روم میں بند ہو جانا تھا' دوبارہ اس نے کسی کام سے ہی باہر نکلنا تھا۔ اللہ جانے بند کمرے میں اس کا وقت کیسے گزرتا تھا۔ شادی کے دو سال بعد بھی اس کی گود ہری نہ ہوئی تھی۔ میں باوجود خواہش کے بہو یا بیٹے سے یہ نہ پوچھ

سکی تھی کہ یہ دیر قدرت کی طرف سے ہے یا پھر اجالا ہی ابھی خود کو اس ذمہ داری کے قابل نہیں سمجھتی۔ اب تنہائی میرے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔ وقت گزارنے کے لیے میں آس پڑوس کے گھروں میں نکل جاتی۔ برسوں کا ساتھ تھا‘ سب ہی پڑوسیوں سے میرے مثالی تعلقات تھے‘ لیکن آج کل میں زیادہ تر فاطمہ بھابھی کے پاس جاتی تھی۔ دو گھر چھوڑ کر ان کا گھر تھا۔ ان کے شوہر کا بھی دو برس پہلے انتقال ہوا تھا۔ میری طرح ان کا بھی اکلوتا بیٹا تھا‘ تین ماہ پہلے انہوں نے بیٹے کی شادی کی تھی۔ فاطمہ بھابھی خود تو بہت ہنس مکھ خاتون تھیں‘ بہو بھی ان ہی جیسی تھی‘ ان کے گھر جا کر ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔

آج بھی میں نے ان ہی کی طرف جانے کا ارادہ باندھا۔ اجالا کو کچن میں ہی جا کر بتایا کہ میں پڑوس میں جا رہی ہوں‘ کچھ دیر تک لوٹوں گی۔ وہ ”ٹھیک ہے آنٹی“ کہہ کر دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گئی۔ فاطمہ بھابھی کے گئی تو دونوں ساس‘ بہو ٹی وی دیکھتے ہوئے مل کر سبزی بنا رہی تھیں۔

”مومنہ آنٹی! آپ۔۔۔ ابھی ابھی ہم آپ کو ہی یاد کر رہے تھے۔“ رامین نے سلام کرنے کے بعد مسکرا کر مجھے مخاطب کیا۔

”اچھا‘ اس کا مطلب ہے میری عمر لمبی ہے یا پھر مجھے شیطانوں کی کیٹگری میں۔۔۔“

”ہائے اللہ مومنہ آنٹی کیسی بات کر دی یہ آپ نے۔۔۔“ رامین نے سٹپٹاتے ہوئے میرے مسکراتے جملے کو سرعت سے کاٹا تھا۔ ”اللہ صحت‘ تندرستی کے ساتھ آپ کی عمر دراز کرے‘ دراصل میں نے آج صبح شاہی ٹکڑے بنائے تھے۔ امی ابھی یہی کہہ رہی تھیں کہ شاہی ٹکڑوں کی ترکیب تو میں آپ سے پوچھوں‘ آپ بہت لذیذ شاہی ٹکڑے بناتی ہیں۔“ رامین نے مجھے مخاطب کیا۔

”ہاں مومنہ بھابھی میری بہو کو صحیح ترکیب بتا دیں‘ اتنی آسان سی ڈش ہے‘ لیکن نہ کبھی مجھ سے صحیح بنی نہ آج رامین سے ٹھیک بنی۔ میں رامین کو بتا رہی تھی کہ مومنہ بھابھی تو میٹھے پکوان بنانے میں ایکسپرٹ ہیں‘ میرے بجائے تم ان سے ترکیبیں پوچھا کرو۔“ فاطمہ بھابھی نے مسکرا کر بتایا۔ رامین کو اتنی اچھی کوکنگ نہیں آتی تھی اور سچی بات تو یہ تھی فاطمہ بھابھی بھی بس گزارے لائق ہی پکاتی تھیں۔ ان کی بتائی گئی ترکیبوں پر جب بہو عمل کرتی تھی تو نتیجہ بہترین نہ نکلتا۔ رامین فراخدلی سے اپنی نالائقی کا اعتراف کر لیتی۔ فاطمہ بھابھی بھی بہو پر تنقید کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔

”بچی ہے ابھی۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ سر پر کام نہیں پڑا ابھی‘ اب سیکھ لے گی آہستہ آہستہ۔ سیکھنے کو ساری عمر ہی پڑی ہے۔“ وہ رامین کی غیر موجودگی میں رسانیت سے کہتیں۔ میں مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ان کی بات کی تائید کرتی۔ ”میرا احترام کرتی ہے۔ میرا خیال رکھتی ہے۔ ہنستے مسکراتے گھر کے کام نپٹاتی ہے اور مجھے کیا چاہیے مومنہ بھابھی۔“ فاطمہ بھابھی کے چہرے سے دلی اطمینان جھلک رہا تھا۔ اس پل مجھے ان پر خوب رشک آیا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ پھر رامین دوبارہ چلی آئی تھی دسترخوان لگنے کی اطلاع کے ساتھ۔

”میں تو اب چلوں گی بیٹا‘ بہت دیر ہو گئی ہے آپ لوگ کھانا کھائیں۔“ میں گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی‘ لیکن فاطمہ بھابھی اور رامین کے اصرار کے آگے میری ایک نہ چلی تھی۔

”مومنہ آنٹی سادہ سے دال چاول ہی ہیں۔ میں نے کون سا کوئی خاص اہتمام کیا ہے۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے ہی تھوڑی دیر کو بیٹھ جائیں۔“ رامین کا پرخلوص انداز‘ مجھے ماننے ہی بنی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے فاطمہ بھابھی‘ بہو پر خفا ہوئی تھیں۔

”میری وجہ سے یہ پھیکی سی پرہیزی دال پکالی۔ میں نے کہا بھی تھا اپنے لیے کچھ الگ بنا لینا۔ فریج میں چکن بھی پڑا تھا اور مٹن بھی۔“ فاطمہ بھابھی‘ بہو پر خفا

ہوئی تھیں' وہ خود معدے کے السر میں مبتلا تھیں۔ ان کے لیے پرہیزی کھانا بنتا تھا اور اب وہ رامین کو اسی وجہ سے ٹوک رہی تھیں کہ اس نے اپنے لیے کچھ اور کیوں نہیں پکایا۔

"اوہو امی! صرف ایک وقت کے کھانے کی تو بات ہے' اپنے لیے علیحدہ سے کیا تردد کرتی۔ شام کو سبزیوں والا پلاؤ بناؤں گی نا' ساتھ چکن کا سالن بھی بنالوں گی ناشتے میں بھی چل جائے گا اور اویس کو آفس کے لیے بھی لنچ باکس بنادوں گی۔" اجالا نے لاپروا سے انداز میں جواب دیا۔

"اور اب خود یہ پھیکی دال چاولوں پر ڈال کر کھاؤ گی؟" فاطمہ بھابھی کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"یہ نمک' گرم مسالا ہے نا' امی اور پھر یہ دیکھیں مزے کا اچار' میری دال تو خود بخود چٹ پٹی ہوجائے گی۔" اس نے چٹخارا سا بھرا۔

"بہت کاہل لڑکی ہے۔" فاطمہ بھابھی نے اسے گھورا۔ یہ گھورنا خفگی بھرا نہ تھا' بلکہ ان کی آنکھوں سے پیار چھلک رہا تھا۔ "کاہل لڑکی" اس خطاب کو پانے کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ میں بھی مسکرادی۔ جی ہی جی میں مجھے فاطمہ بھابھی پر ایک بار پھر رشک آیا تھا۔ اکلوتی بہو کے حوالے سے وہ کس قدر خوش نصیب ٹھہری تھیں' ان کا انتخاب واقعی لاجواب تھا۔

ایک میں تھی' میری پسند' ذوق اور انتخاب کی زمانے بھر میں دھوم تھی۔ کپڑوں کی خریداری ہو یا کپڑوں کی ڈیزائننگ' کراکری کا انتخاب ہو یا جیولری کا' فرنیچر کی سلیکشن کا معاملہ ہو یا گھر کی انٹیریئر ڈیکوریشن کا مرحلہ درپیش ہو خاندان میں ہر چھوٹا بڑا ان معاملات میں مجھے اتھارٹی گردانتے ہوئے مجھ سے مشورہ مانگتا تھا۔ میری سمجھ داری اور ذوقِ انتخاب کی دور و نزدیک میں مثالیں دی جاتی تھیں۔ لیکن جب بہو کے انتخاب کا مرحلہ درپیش آیا تو میرا انتخاب ناکام ٹھہرا۔ یہ قلق میرے دل سے جاتا ہی نہ تھا اور جب کبھی میں فاطمہ بھابھی کے ہاں سے ہو کر آتی تو یہ قلق مزید بڑھ جاتا۔

کاش مجھے بھی کوئی رامین جیسی بہو مل جاتی' جس کے آنے سے میرے سونے آنگن میں کچھ رونق تو ہوجاتی۔ اجالا پر تو مجھے کبھی کبھار کسی روبوٹ کا گمان ہوتا۔ سنجیدگی سے اپنے کام نپٹاتی' کام کے علاوہ مجھے مخاطب تک نہ کرتی' میں بھی خود ادھر ادھر کے قصے چھیڑ کر اس سے بے تکلفی بھرا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتی بھی تھی' مگر اس کی عدم دلچسپی اور بے زاری محسوس کرکے پھر سے خاموش ہوجاتی۔ سعد صحیح کہتا تھا وہ بائے نیچر ہی ایسی تھی جب میرے بیٹے نے اس کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا تو مجھے بھی صبر شکر کے ساتھ گزارہ کرنا تھا' میں خود کو بہتیرا سمجھاتی' لیکن دلی قلق ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر ایک دن اس دلی قلق کا خاتمہ ہو ہی گیا۔ اجالا ہر ویک اینڈ اپنے میکے گزارتی تھی۔ چاہے آندھی آئے یا طوفان میری طبیعت خراب ہو' سعد کی یا پھر اجالا کی اپنی اس معمول میں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ سعد اس روز مجھ سے فرمائشیں کرکے پکوان بنواتا۔ ہم نیٹ پر ارے یہ سے گھنٹوں باتیں کرتے' موسم خوش گوار ہوتا تو ہم دونوں ماں' بیٹا کالونی کی سڑکوں پر واک کے لیے نکل جاتے۔ اس دن بھی سعد اور میں چہل قدمی کرکے واپس گھر لوٹ رہے تھے' جب سامنے سے رامین اور اویس آتے دکھائی دیے۔ مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں رک کر ان سے سلام دعا کروں یا نظر انداز کرکے پاس سے گزر جاؤں۔ میرے ساتھ سعد تھا اور بھلے سے سعد اور اویس کی آپس میں بہت اچھی سلام دعا تھی' لیکن اویس کے ساتھ اس وقت رامین بھی تو تھی۔ فاطمہ بھابھی اور ہمارے گھرانے کا برسوں کا میل جول تھا' لیکن یہ میل جول دونوں گھرانوں کی خواتین کے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے کی حد تک تھا۔ مرد تو صرف آپس میں سرراہ علیک سلیک کرتے تھے۔ میری ادھیڑبن کا خاتمہ نہ ہوا تھا کہ رامین اور اویس دونوں ہی ہمارے پاس آکر رکے تھے۔

"یہ تم ہو سعد' یعنی مومنہ آنٹی کے بیٹے تم ہو۔ واٹ آ سرپرائز۔" رامین کی چہکتی آواز سن کر میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ رامین اب مسکراتے ہوئے اویس کو بتا رہی تھی کہ وہ اور سعد یونی ورسٹی فیلو تھے۔ سعد بھی مسکرا رہا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا موٹا کہ تم شادی ہو کر ہمارے پڑوس میں ہی آئی ہو اور سناؤ کیا حال چال ہے۔ مدثر کیسا ہے' اب تو اتنے عرصے سے اس سے کوئی رابطہ ہی نہیں ہوا۔" سعد پوچھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تو گویا رامین' یعنی کہ رامین وہ لڑکی تھی۔ وہ سعد کے دوست مدثر کی کزن' یعنی کہ موٹا۔ میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی تھی۔

"ملائیشیا سیٹل ہونے کے بعد مدثر بھائی کا تو ہم سے بھی رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ انہوں نے تو وہیں شادی بھی کرلی ہے۔" رامین بتا رہی تھی پھر دونوں نے اپنے دوسرے یونی ورسٹی فیلوز کے بارے میں پوچھنا اور بتانا شروع کیا تھا۔ "فردوس اسلام آباد ہوتی ہے۔ نجیب سے کوئی رابطہ نہیں۔ محمود ابھی تک سی ایس ایس پاس نہیں کرسکا۔ نورین میاں کے ساتھ یو کے چلی گئی ہے۔" اویس مسکراتے ہوئے بیوی کو نان اسٹاپ بولتے دیکھ رہا تھا۔

"یار سعد' یہ میری بیگم جو اب اتفاق سے تمہاری کلاس فیلو بھی نکل آئی ہے' اب تو یہ تمہارے سب کلاس فیلوز کے متعلق پوچھے یا بتائے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑے گی' تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ آج ڈنر ہمارے ساتھ کرلو۔ اکٹھے بیٹھ کر گپ شپ لگے گی' کیوں مومنہ آنٹی کیا خیال ہے۔" اویس بشاشت بھرے لہجے میں مجھ سے مخاطب تھا' لیکن میں نے تو شاید اس کا سوال ٹھیک سے سنا بھی نہ تھا' میرا دماغ تو عجیب سی آندھیوں کی لپیٹ میں تھا۔

"اکٹھے ڈنر کرنا ہی ہے تو وہ ہمارے ہاں ہوگا امی نے آج بہت مزے کی کوفتہ کڑھی اور مزے دار سی کھیر بنائی ہوئی ہے۔" سعد نے انہیں جوابی دعوت دے ڈالی تھی۔

"آنٹی کے ہاتھ کی کڑھی اور کھیر' منہ میں ابھی سے پانی آگیا یار' چلو ڈن' آج کا ڈنر تمہاری طرف۔" ہنس مکھ سی فاطمہ بھابھی کا بیٹا بھی ان ہی کی طرح ملنسار اور ہنس مکھ تھا اس نے فوراً سعد کی دعوت قبول کرلی۔ سعد اور رامین مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور میں سعد کے ساتھ گھر چلی آئی۔

"ٹھیک کیا نا امی میں نے انہیں اپنے ہاں ہی ڈنر پر بلالیا۔ آپ اس اچانک ہونے والی دعوت کی تیاری سے تھک تو نہیں جائیں گی۔" سعد پوچھ رہا تھا۔ میں نے مسکرا کر نفی میں گردن ہلادی اور یہ مسکراہٹ لبوں پر لانے میں مجھے جس دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا یہ میں ہی جانتی تھی' سچ تو یہ تھا کہ میرے رگ و پے میں عجیب سی تھکن سرایت کرتی جارہی تھی۔ سعد اپنا لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گیا اور میں اپنا نڈھال زدہ وجود لے کر بیڈ روم میں چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

میں کیسے بھول سکتی تھی وہ دن جب اریبہ اور شہریار کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوئی تھی اور یونس نے مسکراتے ہوئے بیٹے کو چھیڑا تھا۔

"تمہاری کوئی پسند ہے تو اپنی ماں کو بتادو یار۔ اریبہ کی شادی کے ساتھ تمہاری منگنی سے بھی نپٹ جاتے ہیں۔" سعد کا ان دنوں یونی ورسٹی میں لاسٹ سمسٹر چل رہا تھا' باپ کی بات سن کر وہ جھینپ کر ہنس پڑا تھا۔

"مومنہ بیگم اپنے لاڈلے کی مسکراہٹ نوٹ کرو۔ ارے ہم نے تو شوشا چھوڑا تھا' لیکن صاحب زادے کی جیسے باچھیں پھیلی ہیں' لگتا ہے دال میں کچھ کالا ہے۔" یونس بیٹے کی جھینپی ہوئی مسکراہٹ دیکھ کر پرجوش سے ہوگئے تھے۔

"ارے نہیں پاپا' ایسی کوئی بات نہیں۔" سعد نے جھینپ کر باپ کو ٹالا۔

"پاپا کی جان' ایسی ہی بات ہے' بس فٹافٹ لڑکی کا نام پتا بتاؤ' آگے تمہاری امی جانیں اور میں۔" یونس بیٹے کی حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ "حد کرتے ہیں آپ یونس' ابھی بیٹے کی پڑھائی تو مکمل ہونے دیں پھر اپنا کیریئر اسٹارٹ کرے گا۔ آپ ابھی سے اس کے

ذہن میں الٹی سیدھی سوچیں ڈال رہے ہیں۔" میں نے یونس کو خفگی سے ٹوکا تھا۔

"ارے چار، چھ ماہ کی پڑھائی رہ گئی' جتنا شان دار میرے بیٹے کا اکیڈمک ریکارڈ ہے پڑھائی کے فوراً" بعد شان دار سی نوکری بھی مل جائے گی اسے' اگر کوئی لڑکی پسند ہے تو کوئی چھوٹی موٹی منگنی وغیرہ کر دیتے ہیں۔ اچھی لڑکی کے تو ویسے بھی جھٹ پٹ رشتے ہو جاتے ہیں' ہم اس کی نوکری وغیرہ کا انتظار کرتے رہ جائیں اور کوئی دوسرا اس کی پسند کی ہوئی لڑکی سے بیاہ رچالے۔" یونس مسکرا کر مخاطب تھے اور مجھے اس وقت ان کے موڈ کی یہ چونچالی ہرگز نہ بھا رہی تھی۔

"تم مجھے ایسے کیوں گھور رہی ہو۔ عجیب ماں ہوا رے ماؤں کو تو اکلوتے بیٹے کی شادی کا ارمان بیٹے کے پاؤں پاؤں چلنے کی عمر سے ہی ہو جاتا ہے تمہارا بیٹا تو خیر سے اب گھبرو جوان ہے۔ شادی نہ سہی' منگنی تو ہو سکتی ہے نا۔" یونس حد درجہ پرجوش ہو رہے تھے۔ "بتاؤ یار بتاؤ کون سی لڑکی پسند ہے۔" وہ دوبارہ بیٹے کی جانب متوجہ ہوئے۔

"مدثر کی کزن ہے مونا۔ والد کے ٹرانسفر کے بعد ابھی مائیگریٹ ہو کر آئی ہے ہماری کورس میٹ ہے۔ مجھے لگتا ہے بابا وہ لڑکی ہمارے گھر میں اچھا اضافہ ثابت ہو سکتی ہے۔" سعد نے جھینپے ہوئے انداز میں اپنی پسند سے آگاہ کیا تھا' میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ باپ کی ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں یہ "انکشاف" فرمائے گا۔ یعنی کہ میرا بھولا بھالا' سیدھا سادہ سعد جو میری نگاہوں میں اب تک کسی دودھ پیتے بچے جتنا ہی معصوم تھا۔ وہاں' باپ سے بالا ہی بالا اپنے لیے لڑکی بھی منتخب کر چکا تھا۔ مجھے ایک پل کے لیے غصہ آیا' لیکن اگلے ہی لمحے میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"میرا بچہ واقعی اتنا بڑا ہو گیا کہ اپنے لیے لڑکی بھی ڈھونڈ لی۔" مجھے اس کی حماقت بھری معصومیت پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"ارے نہیں امی وہ تو بس بابا نے کہا تو میرے ذہن میں اچانک سے مونا کا خیال آ گیا۔ بائے دی وے بہت اچھی لڑکی ہے۔" وہ میرے ہنسنے پر کچھ خفیف سا ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے یار' ٹھیک ہے' دیکھیں گے وہ لڑکی۔ فکر ہی نہ کرو۔" یونس نے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔

"خدا کے لیے یونس' بچے کا دھیان پڑھائی کی طرف ہی لگا رہنے دیں۔ ابھی ان مرحلوں میں بہت وقت پڑا ہے۔" میں نے اس بار یونس کو ٹوک دیا تھا۔ اس وقت بات آئی گئی ہو گئی تھی۔ مدثر سعد کا بہت اچھا دوست تھا۔ اس کے بھائی کی شادی تھی' میں بھی سعد کے ساتھ تقریب میں گئی تھی اور جب ہی سعد نے مجھے مونا دکھائی تھی۔

"دیکھیں امی وہ رہی مونا' مدثر کی کزن۔" سعد نے نگاہوں سے لڑکیوں کے جھرمٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی' اس روز جو بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی تھی آج دوبارہ اس لڑکی کا ذکر اور یوں خاص طور پر مجھے اس لڑکی طرف متوجہ کرنا۔ صاف ظاہر تھا کہ میرا بیٹا واقعی اس لڑکی میں دلچسپی لینے لگا ہے' میں نے سعد کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

"وہ فیروزی سوٹ والی مونا ہے۔" اس نے دھیرے سے بتایا۔ سات آٹھ لڑکیوں کے گروپ میں فیروزی سوٹ ایک ہی لڑکی نے پہنا ہوا تھا۔ اس وقت کے فیشن کے مطابق سلا سوٹ اور وہ فیشن مجھے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ میری ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ فیشن کرتے وقت آپ کو یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ آیا یہ فیشن اپنانے کے قابل ہے بھی یا نہیں' اگر اس فیشن کو اپنا کر شخصیت مضحکہ خیز لگے تو اسے اپنانے سے گریز کرنا چاہیے' لیکن میرے بیٹے کی منتخب کردہ لڑکی وہ اول جلول سا لباس پہنے اس وقت اونچے اونچے قہقہے لگانے میں مشغول تھی۔ پہلی نگاہ میں ہی میں نے مونا کو ریجیکٹ کر دیا تھا جب مجھے لڑکی پسند ہی نہ آئی تھی تو میں نے اس سے قریب جا کر بات چیت کر کے پرکھنے کی

ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ حالانکہ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ سعد کی خواہش ہے کہ وہ مونا کا مجھ سے تعارف کروائے‘ لیکن سردرد کا بہانہ کر کے میں جلدی تقریب سے واپس لوٹ گئی تھی۔

”آپ کو مونا پسند نہیں آئی نا۔“ واپسی کے سفر میں میرے مزاج شناس بیٹے نے ہولے سے پوچھا۔ میں نے گہری سانس اندر کھینچی۔

”دیکھو سعد پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی تم ایک اسٹوڈنٹ ہو۔ یہ شادی بیاہ کی باتیں قبل از وقت ہیں۔“ میں نے اسے سنجیدگی سے باور کروایا۔

”وہ تو ٹھیک ہے امی‘ میں کون سا ابھی شادی کرنے لگا ہوں۔“ سعد قدرے خفیف ہوا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔

”اگر تم نے اس لڑکی سے کوئی کمٹمنٹ کرلی ہے تو الگ بات‘ ورنہ اس موضوع کو یہیں ختم کردو۔“

”ارے نہیں امی‘ کیسی کمٹمنٹ‘ وہ اس ٹائپ کی لڑکی ہی نہیں ہے۔ اس کے سامنے ایسی بات کر کے میں نے جوتے تھوڑی کھانے تھے۔ ویسے بھی وہ مدثر کی کزن ہے‘ میں اس سے اس قسم کی کوئی بات کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ سعد صاف گوئی سے بولا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”اگر آپ کو مونا پسند نہیں آئی تو کوئی مسئلہ نہیں‘ وہ تو اس روز پاپا کی باتیں سن کر خود بخود میرے ذہن میں مونا کا خیال آگیا۔ مجھے لگا وہ لڑکی ہمارے گھر میں اچھا اضافہ ثابت ہوسکتی ہے۔“ سعد اپنی صفائی دے رہا تھا۔

”میرے بچے مجھے تمہاری سنجیدگی اور میچورٹی پر کوئی شبہ نہیں‘ لیکن ابھی تمہیں چیزوں کی پرکھ نہیں‘ انسانوں کی پرکھ کا معاملہ تو پھر اور ہے۔ مجھے وہ لڑکی تمہارے مزاج کے مطابق نہیں لگی ہے اور ہم آہنگی کے بغیر زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔“ میں نے سعد کو سمجھایا تھا۔

”ٹھیک ہے امی‘ آپ کی عمر اور تجربہ مجھ سے زیادہ ہے‘ آپ کو انسانوں کی زیادہ پرکھ ہے۔“ سعد نے فوراً میرے فرماں بردار بیٹا ہونے کا ثبوت دیا تھا۔

اس دن کے بعد یہ موضوع دوبارہ نہیں چھڑا تھا۔ ایف ایس سی کے بعد سعد کی پڑھائی کا سلسلہ چلتا رہا... اس دن کے بعد یہ موضوع دوبارہ نہیں چھڑا تھا۔ ایک برس بعد سعد کی شادی ہوئی‘ پھر یونس ہم سے بچھڑ گئے۔ سعد تعلیم مکمل کر کے عملی زندگی میں داخل ہوگیا۔ اس کے یونیورسٹی کے دوست اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہوگئے۔ مدثر جو اس کا بہترین دوست تھا‘ وہ ملائیشیا چلا گیا‘ آہستہ آہستہ اس سے بھی رابطہ ختم ہوگیا۔ یہ ہی زندگی کا فطری بہاؤ ہے۔ اجالا سے سعد کی شادی کے بعد بھی مجھے کبھی مونا کا خیال تک نہ آیا تھا۔ مونا یعنی رامین جو اب اویس کی بیوی تھی۔ برسوں پہلے ایک سرسری نگاہ میں اسے رد کرنے کے بعد مجھے کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ مجھ سے دوبارہ ٹکرائے گی اور میں اسے پہچان بھی نہ پاؤں گی۔ فاطمہ بھابھی کی بہو جو مجھے ہر لحاظ سے آئیڈیل بہو لگا کرتی تھی اور جس کو دیکھ کر میرے دل میں خواہش بے دار ہوتی تھی کہ کاش مجھے بھی ایسی ہی بہو ملتی رامین‘ وہ ہی لڑکی تھی جس کے متعلق کبھی میرے بیٹے نے کہا تھا کہ وہ ہمارے گھر میں اچھا اضافہ ثابت ہوسکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

مجھے اپنی سمجھ اور پرکھ پر ہمیشہ سے بہت ناز تھا۔ اجالا کو بہو بنانے کے بعد مجھے یہ قلق ضرور رہتا تھا کہ مجھ سے بہو کے انتخاب میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے اسے منتخب کرنے میں جلد بازی سے کام لیا۔ آج احساس ہوا کہ اجالا کا انتخاب میری دوسری حماقت بھری جلد بازی تھی۔ بنا جانے‘ بنا پرکھے رامین کو رد کردیا‘ میری پہلی جلد بازی تھی۔ انسانوں کی پرکھ میں میرا بیٹا مجھ سے بازی لے گیا تھا اور آج رامین سے ملنے کے بعد مجھے سعد کے چہرے پر کوئی حیرت یا پچھتاوا نظر نہ آیا تھا۔ اس کے چہرے پر محض ایک پرانے دوست سے ملنے کی خوشی تھی‘ لیکن میں اپنے دل کا کیا کرتی جس کو کسی طرح قرار ہی نہ آرہا تھا۔ آج اچھی بہو نہ ملنے کا قلق بالکل ختم ہوگیا تھا۔ جی ہاں صحیح سمجھے یہ قلق اب ہمیشہ باقی رہ جانے والے پچھتاوے میں بدل گیا تھا۔

☼ ☼

سیما بنت عاصم

اف خدایا۔ گھر تھا کہ گھن چکر' ہفتہ بھر میں نشاط منزل کے کاموں نے امجد صاحب کے کس بل نکال کے رکھ دیے تھے۔ اس پر پے در پے بجتی گھنٹیوں کی بوچھاڑ۔ وہ آج بھی اپنے اکلوتے نور چشم فواد کو وقت پر دفتر روانہ کرنے کے لیے علی الصباح جاگے تھے اور ناتوان کے پیروں میں چکر ہی بندھ گیا۔

دودھ والا' اخبار والا' خاکروب۔ ٹوسٹر' الیکٹرک کیٹل' سیٹیاں اور گھنٹیاں۔

وہ کچن میں ناشتے کی تیاری کے دوران ان سیٹیوں' گھنٹیوں کی بوچھاڑ سے سر پیٹتے رہے تھے۔ ان کا ایک پیر کچن میں اور دوسرا نشاط منزل کے طول و عرض کو ناپتا رہا تھا۔ لاؤنج کے ڈائننگ پر ناشتا سجا کر ان کی نظر دیوار گیر کلاک پر پڑی تو بے ساختہ ان کے لبوں سے ایک سرد آہ بلند ہوئی تھی۔ اگلے ہی پل وہ قریبی صوفہ پر تھکے تھکے انداز میں نیم دراز ہو رہے تھے۔

"ان سیٹیوں اور گھنٹیوں نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔" اسی پل فریش موڈ میں نک سک سے تیار فواد اپنے کمرے سے برآمد ہوا تھا ڈائننگ کرسی سنبھال کر اس نے ایک نظر تھکے تھکے سے پاپا جی پر ڈالی تھی۔

"خیریت۔ پاپا جی۔؟"

"زندگی میں مجھے کسی چیز نے اتنا بے زار نہیں کیا۔ جتنا ان سیٹیوں گھنٹیوں کی بوچھاڑ نے۔"

"جواباً" فواد کا قہقہہ خاصا جاندار تھا۔ کیٹل سے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے' اس نے کانٹے سے آملیٹ منہ میں رکھ کر توسٹ کا کونا چبایا اور پھر چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا اور اگلے پل برا سا منہ بنا کر مگ واپس رکھ دیا۔

"اف پاپا جی۔ اتنے دن ہو گئے آپ کو کچن سنبھالے ہوئے۔ ابھی تک آپ سے ڈھنگ کی چائے تک نہیں بنی؟" اس نے بدمزگی سے کہتے ہوئے کان کے پاس انگلی بجائی تھی۔

"اف ایسی چائے سے تو دماغ کی کھلی کھڑکیاں بھی بند ہو جاتی ہیں۔" جبکہ امجد صاحب جھلا گئے تھے۔

"او بیٹا۔ میں بینک سے ریٹائر ہوا ہوں۔ کسی ہوٹل کے کک کی نوکری نہیں کی ہے اتنے سال۔"

"عورتیں تو کبھی ریٹائر بھی نہیں ہوتیں۔ سوچیں اگر ماں جی زندہ ہوتیں تو ابھی تک کچن سنبھالا ہوا ہوتا۔"

"اف۔ اس گھر کے دھندے۔ اس پر ان گھنٹیوں سیٹیوں کی بوچھاڑ۔ وہ بھی تھک ہار کر ریٹائرمنٹ مانگ ہی لیتی۔ بلکہ اب تک تو وہ بھلا کر سارا چارج اسے تھما چکی ہوتی۔" فواد نے جیسے ان کا مطلب جانچتے ہوئے۔ ان کی بات اڑائی تھی۔

"ماں جی ہوں یا ان کی بہو۔ گھر میں عورت کا ہونا لازمی ہے۔ عورت کے بغیر گھر کی گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔"

"سچ کہتے ہو۔ عورت کے بغیر گھر بہت نامکمل ہوتا ہے۔" انہوں نے اک ٹھنڈی سانس لے کر اک حسرت سے کہا تھا۔ "جانے کب آئے گا وہ دن۔ جب تمہاری دلہن اس گھر میں آئے گی۔ چاند سی دلہن

—"

"خدا کے لیے پپا جی۔۔۔ چاند سی دلہن کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں مجھے تو بس سادہ سی گھریلو لڑکی چاہیے ۔۔۔ جو گھر کو جنت بنا دے۔ سمپل ایکٹو جو اس گھر کا سارا بگڑا انتظام درست کر دے۔"

"بیٹا جی۔۔۔ یہ خوبیاں تو کسی ماسی میں بھی ہو سکتی ہیں۔" پھر کچھ یاد آنے پر بے ساختہ کہا۔ "ارے ہاں ۔۔۔ اسی پر یاد آیا۔ گھر کے کاموں کے لیے کیوں نہ اک ماسی رکھ لی جائے؟" اور یہیں آکر فواد ان کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا اب بھی اس نے برا سا منہ بنایا۔

"ماسی۔۔۔ اف۔۔۔ اوہ نو۔" اس نے نہایت بدمزگی سے کہتے ہوئے اک اذیت سے آنکھیں موندی تھیں۔ "میرے بس میں اگر ہو تو اس پورے ملک سے ماسی سسٹم ختم کر کے ماسیوں کا نام و نشان تک مٹا دوں۔ ماسی اگر اچار ڈالنے کو بھی نظر آجائے۔۔۔ تو میرا نام بدل دینا۔" یہیں آکر امجد صاحب مات کھا جاتے ۔۔۔ مگر یہ وہ ایشو تھا۔ جس پر سمجھو تا کم از کم ان کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ اب بھی انہوں نے اپنے

راج دلارے کو کنوینس کرنے کی کوشش کی تھی۔
"او بیٹا جی... ماسیاں ہمارے جیسے گھروں کی ضرورت ہوتی ہیں۔ کوئی اسٹیٹس کا سمبل نہیں۔"
"بھئی اک عورت کا کام تو عورت ہی کر سکتی ہے نا...؟"
"او پاپا جی... آپ کیوں نہیں سمجھتے... یہ گھر گھر کام کرنے والیاں بڑی کرپٹ ہوتی ہیں... سو روپے میں انہیں خرید لو... اور ان کے منہ سے سب کچھ اگلوا لو۔ کبھی کبھی تو یہ گھروں میں ڈکیتیاں تک پڑوا دیتی ہیں... اور ان کی گندگی! اف خدایا... ایک گھر سے واش روم دھو کر آتی ہیں اگلے گھر جا کر روٹیاں پکاتی ہیں۔ نا بابا نا میرے باپ کی توبہ!" اس نے کان پکڑتے ہوئے انکار میں سر ہلایا تو امجد صاحب جیسے ہار سے گئے تھے۔
"تو تم ہی بتاؤ... ماسی کے بغیر کام کیسے چلے گا؟"
"جیسے اب تک چل رہا ہے..." فواد نے مسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے اک جاندار قہقہہ لگایا تو امجد صاحب کی جان جل کر رہ گئی۔
"تو پھر اس مسئلے کا دوسرا حل یہی ہے کہ تم جلدی سے میرے لیے کوئی اچھی سی بہو لے آؤ۔"
"پاپا جی... آپ کی بہو کوئی سڑک پر پڑی ہے جو اٹھا کے لے آؤں؟" اس نے ہنوز اسی مسخرانہ انداز میں کہتے ہوئے بریف کیس اٹھا کر سدھارنے کی تیاری کی۔
"اف خدایا... تو کیا میں عمر بھر یہ نئی گھنٹیاں... سیٹیاں سنتا... اور کچن سنبھالتا رہوں گا۔" امجد صاحب کی بات درمیان میں تھی کہ اس بار کال بیل بجی... اور انہوں نے اف کہتے ہوئے اک اذیت سے آنکھیں موند لی تھیں... جبکہ فواد نے ان کی اس کیفیت کا خاصا مزا لیا تھا۔
"پھر بجی گھنٹی...!"
اگلے ہی پل وہ آفس سدھارنے کی غرض سے اپنا سامان سمیٹے لاؤنج کا دروازہ پار کر کے مختصر سے احاطے میں چھت کو جاتے زینے تلے پورچ سے اپنی سرخ آلٹو کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ امجد صاحب کافی دیر منتظر رہے۔ پھر قریب پڑا موبائل اٹھا کر فواد کا نمبر پش کیا تھا۔
"دروازے پر کون تھا؟" ان کا انداز خاصا مشکوک تھا۔ آلٹو بیک کر کے گلی تک لاتے فواد اک بار پھر زور سے ہنسا تھا۔
"کوئی نہیں تھا پاپا جی... آپ کو کسی کا انتظار ہے کیا کسی حسین... دل نشین ماسی کا..."
"اف... کیا وقت آ گیا ہے۔ پہلے موبائل پر مس بیلز آتی تھیں۔ اب گھروں کی گھنٹیوں کی مس بیلز!" امجد تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے صوفہ پر پھیل گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

فواد گھر کے عام حلیے میں سادہ سا ٹراؤزر اور شرٹ پہنے... سر پر دھول مٹی سے بچنے کو رومال لپیٹے... گھر کی جھاڑ پونچھ میں مصروف... سخت بدمزگی سے بڑبڑا رہا تھا۔
"کیا کر رہا ہے یہ شخص... کیا چاہ رہا ہے... میری سمجھ میں نہیں آ رہا... کہ یہ چاہ کیا رہا ہے؟"
کمرے میں داخل ہوتے باپ پر نظر پڑتے ہی وہ جھلا اٹھا تھا۔
"او پاپا جی... یہ آپ آفس سے آتے ہی مجھے کن کاموں میں پھنسا دیتے ہیں؟" او یار... مجھ سے نہیں ہوتی یہ جھاڑ پونچھ۔" جھاڑن پھینک کر وہ جھلایا تھا۔ جبکہ وہ اک شان بے نیازی سے سیٹی پر پھیل کر اک تجاہل سے گویا ہوئے۔
"جھاڑ پونچھ تو بیٹا تمہیں ہی کرنی پڑے گی... کیونکہ میں تو کچن سنبھالتا ہوں نا۔"
"پاپا جی... مجھے کچھ اور کام بتا دیں۔" وہ تھکے تھکے انداز میں دھپ سے اپنے بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔
"کچھ اور..." انہوں نے سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا "چلو تو پھر تم کپڑے دھو لیا کرو اور یاد رکھنا کہ کپڑے صرف دھونے نہیں ہوں گے۔

استری کر کے الماریوں میں لگانے بھی ہوں گے' ہاں۔" ہے۔ اب بھی اس کے چہرے کے قریب اپنا چہرہ لاتے ہوئے لہجے میں قدرے دلار اور خوشامد سمو کر کہا تھا۔

"او پاپا جی میری لکھ (کمر) ٹوٹ جائے گی۔ چک چلی جائے گی یار۔" روتے ہوئے لہجے میں فریاد کی۔

"فواد کیا ہو گیا ہے تمہیں... ہر گھر میں سیکڑوں عورتیں دن رات کپڑے دھوتی ہیں۔ تم تو پھر بھی مرد ہو یار..."

"او پاپا جی... کپڑے تو لانڈری سے بھی دھل کر آ سکتے ہیں نا۔" فواد نے اک بار پھر دہائی دی تھی۔ اطمینان سے صوفہ کی بیک سے سر ٹکا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر وہ قدرے غیریت و بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے۔

"تو پھر ٹھیک ہے... جب کپڑے لانڈری سے دھل کر آ سکتے ہیں تو کھانا بھی تو ہوٹل سے آ سکتا ہے نا!"

"پاپا جی... ہر روز کھانا ہوٹل سے آئے گا تو بجٹ خراب ہو جائے گا یار...!"

"تو لانڈری کے بل سے بجٹ خراب نہیں ہو گا؟ انہوں نے اترا کر کہا پھر مصالحانہ انداز اپنایا تھا۔ "اوکے... امریکن سسٹم تم اپنا خرچ اٹھاؤ گے اور میں اپنا۔"

"تو پھر اس جھاڑ پونچھ کا کیا ہو گا؟ برتن کون دھوئے گا؟" فواد نے ایک بار پھر دہائی دی تھی۔

"ایک اور امریکن سسٹم... تم اس گھر کے ہر کام کے لیے مجھے پیسے دو گے۔"

"او پاپا جی... پھر تو میں کنگال ہو جاؤں گا۔"

"تو بس پھر... شرافت سے جھاڑ پونچھ کرو...." وہ توتے کی طرح نظریں پھیر کر غیریت کی اداکاری کرتے بولے۔

"میں سب سمجھتا ہوں۔ آپ یہ ساری حرکتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ میں کسی ماسی یا نوکر کے لیے بھی خوشی مان جاؤں؟" فواد کے انداز میں نروٹھا پن تھا مگر ان کا اطمینان قابل دید تھا۔ اس سے کون مانتا کہ انہوں نے اپنے اکلوتے سپوت کو دوستوں کی طرح پالا

"جب پتا ہے تو مان کیوں نہیں جاتے...؟"

"او پاپا جی... یہ ماسیاں ڈکیتوں سے ملی ہوئی ہیں۔ چور ہوتی ہیں۔ چلتی مرغی بغل میں دبا لیتی ہیں۔ آپ کو نہیں پتا یار۔" قدرے بے بس لہجے میں گھتے ہوئے فواد نے اک بار پھر اپنی پرانی رٹ پکڑی تھی۔

"او بیٹا جی اس گھر میں ہے ہی کیا جو وہ ڈکیتی پڑوائے گی؟" اگلے ہی پل ان کے لہجے و انداز میں لاپروائی در آئی تھی "زیادہ سے زیادہ وہ تمہیں تاوان کے لیے اغوا کروا دے گی۔" پھر کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا۔

"نہ میرے پاس رقم ہو گی نہ میں تاوان ادا کروں گا۔"

"پاپا جی... " دونوں کے سر اک ساتھ جڑے تھے "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ تاوان کے لیے آپ کو اغوا کروا دے؟" فواد نے پراسرار لہجے میں سرگوشی کی تو موٹی فریم کی عینک تلے امجد صاحب کی آنکھوں نے گول گول حرکت کی تھی... جواباً "ان کی سرگوشی میں بھی پراسراریت تھی۔

"پھر کیا تم تاوان ادا کرو گے؟"

"ہاں مگر اس شرط پر کہ وہ آپ کو چھوڑیں گے نہیں..." فواد کا اطمینان قابل دید تھا۔

"اوہ مائی گاڈ۔" اک چیخ مار کر وہ اوندھے ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس دن اتوار تھا اور امجد صاحب نے اپنی اسی بے نیازی و غیریت سے کام لیتے ہوئے کاموں کا ڈھیر فواد کے سر پر لاد دیا تھا۔ گروسری' کچن شاپنگ' لانڈری کے چکر' بلوں کی ادائیگی اور اب اٹھائی دھرائی... فواد سے بڑھ کر کون سمجھتا کہ امجد صاحب کام ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکال رہے ہیں... ان ہی کاموں کے عوض پاپا جی اس کا سارا اسٹڈے نچوڑ کے پی گئے تھے۔ اب بھی اچھے بھلے اسٹور روم میں رکھے فل سائز صندوق کو اپنے کمرے میں لا پھینکنے کی جانے کیا سوجھی تھی...

اسی کوشش میں کچھ نہیں تو بیس پچیس منٹ تو گزر ہی چکے تھے۔۔۔ اور صندوق تھا کہ ٹس سے مس نہ ہو کے دیا تھا۔ آخر کار فواد تھک کر کمرے کے کارپٹ پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ تو امجد صاحب بھی اپنی کوشش ترک کر کے اس کے نزدیک آ بیٹھے۔۔۔ دونوں ہی ہانپ رہے تھے۔

"پاپا جی۔۔۔ اس صندوق میں ایسا کیا ہے۔۔۔ جو ہماری اتنی کوشش کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوا۔"

"مجھے خود حیرانی ہے بیٹا۔۔۔ صندوق تو بالکل خالی تھا راتوں رات اتنا بھاری بھرکم کیسے ہو گیا؟" انہوں نے سفید ململ کے کرتے سے رومال نکال کر پسینہ خشک کیا۔۔۔ پھر سر پر ٹکی عینک کے شیشے صاف کرنے لگے۔

"آپ کچھ بھی کہیں پاپا جی۔۔۔ کم از کم میں اس صندوق کو باہر نہیں لا سکتا۔"

"واٹ۔۔۔؟" وہ بری طرح چونکے تھے۔ "لیکن بیٹا جی صندوق تو کمرے کے اندر لے کے جانا تھا؟"

"اوہ مائی گاڈ۔۔۔" فواد سر پکڑ کر رہ گیا۔ "یعنی میں اسے اپنی طرف۔۔۔ اور آپ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔" وہ منہ پھاڑ کے بھونڈے پن سے ہنسا۔

"سمجھ نہیں آتا کہ اس لطیفے پر ہنسوں یا رووں؟" امجد صاحب نے مایوسی و افسردگی سے سر ہلایا جبکہ اس کا لہجہ ہنوز فریش تھا۔

"اب آپ کہیں گے کہ گھر میں کوئی عورت ہوتی تو۔۔۔؟ ماسی ہوتی۔۔۔ ماں یا پھوپھو۔۔۔؟ ہے نا۔"

"تو اور کیا' عورت کے بغیر گھر کتنا ادھورا کیسا نامکمل ہوتا ہے۔ ایک عورت۔۔۔" وہ ٹھہرے' چشم تصور میں اک خاکہ چھب دکھا کر چھپ گیا تھا۔ "بلکہ ایک اچھی عورت ہی گھر کو جنت بناتی ہے۔"

"پاپا جی۔۔۔ ماں' بہو یا ماسی۔۔۔ اگر ہوتی تو اپنا بوجھ ہم سے اٹھواتی۔۔۔ تاکہ ہمارا بوجھ اٹھاتی؟"

"بھئی کم از کم تمہاری شادی والا مسئلہ تو حل کر ہی دیتی۔۔۔ تمہاری ماں اگر زندہ ہوتی تو تمہارے لیے کوئی اچھی سی دلہن چٹکی بجاتے ہی ڈھونڈ لیتی۔" امجد صاحب نے چٹکی بجا کر کہا پھر ان کا لہجہ کچھ افسردہ ہو گیا۔ "وہ بھی تمہارے لیے چاند سی دلہن کے خواب دیکھتی تھی۔" ان کی افسردگی کم کرنے کو ہی فواد نے ہلکا پھلکا لہجہ اپنایا تھا۔

"پاپا جی۔۔۔ ماں جی کی وفات کے وقت میں صرف دس سال کا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں انہوں نے میرے لیے دلہن کے خواب بھی دیکھ لیے تھے؟"

"بیٹا جی۔۔۔ اک ماں اپنے بیٹے کی سر پر سہرا سجانے کے خواب اس کے پیدا ہوتے ہی دیکھنے لگتی ہے۔"

ان کی بات پر فواد ہنسا۔۔۔ اور ہنسا پھر ہنستا ہی چلا گیا۔۔۔ تو امجد صاحب نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔

"اس میں اتنا ہنسنے والی کیا بات ہے؟"

"پاپا جی۔۔۔ میرے سر پر اگر سہرا بندھ بھی جائے۔۔۔ تو ٹکے گا کیسے؟" اس نے کہتے ہوئے اپنے سر کی وگ اتاری تو کمرے میں جلتی لائٹس کی روشنی اس کی سنہری چکنی چندیا پر پڑ کر دو آتشہ ہو گئی تھی۔ جبکہ امجد صاحب ٹھٹک کر چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے اگلے پل انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بیٹا جی۔۔۔ فوراً" اسے چھپا لو۔۔۔ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ کہیں کہیں دیواروں کے کان کے ساتھ آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔"

"آپ بھول رہے ہیں پاپا جی۔۔۔ ایک نہیں کئی رشتے میری اس چمکتی چندیا کی وجہ سے منہ موڑ چکے ہیں۔ کسی کو میرا ساتھ منظور ہی نہیں ہے۔" اس نے افسردہ بناوٹی لہجے میں کہتے ہوئے وگ دوبارہ اپنے سر پر جمالی تھی۔

"تم اگر اس چٹیل میدان کا راز فاش نہ کرو تو رشتوں کے ٹھٹھ لگ جائیں۔۔۔ میری بات لکھ کے رکھ لو۔"

"پاپا جی۔۔۔ جن رشتوں کی بنیاد ہی میں جھوٹ یا فریب ہو۔ پھر ان رشتوں سے کوئی اچھی امید رکھنی بھی فضول ہے۔"

"تم کچھ بھی کہو۔ مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ شادی ایک بار ہوتی ہے۔ اس لیے خوب ٹھونک بجا کے ہی شادی کرنا۔"

"اور آپ بھی میری ایک بات یاد رکھنا... شادی کسی سے بھی ہو... ہونی جو اہی ہے... اس لیے شادی کا معاملہ قسمت پر رکھ کر... کسی سے بھی آنکھیں بند کر کے شادی کر لینی چاہیے۔"

"کسی سے بھی...؟" امجد صاحب کے لہجے و انداز میں بے یقینی اُمڈ آئی۔

"ہاں کسی سے بھی... بس جو دل کو اچھا لگے۔"

"کم از کم میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا۔" اس بار انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

"لیجیے پھر... اسی بات پر بج گئی سیٹی کوکر کی۔"

"اف... میں تو بھول ہی گیا تھا۔" اس بار ان کی دوڑ کچن کی جانب تھی۔

☼ ☼ ☼

اس صبح بلیک ٹریک سوٹ میں ملبوس... فواد جاگنگ کر کے لوٹا تھا لان میں بچھی کین کی کرسی سنبھال کر وہ تاول سے پسینہ خشک کر رہا تھا۔ جب پاپا جی کی جوس کے جگ اور گلاس کے ہمراہ آمد ہوئی جگ گلاس سینٹر ٹیبل پر رکھ کر وہ اک کرسی پر تھکے تھکے انداز میں ڈھیر ہو گئے تھے۔

"خیریت... پاپا جی اتنے ڈل کیوں لگ رہے ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا...!"

"طبیعت کا کیا بتاؤں بیٹا جی... سچ پوچھو تو یہ کچن کے کام میرے بس کے نہیں رہے۔"

"اب آپ پھر کہیں گے کہ گھر کے کاموں کے لیے ایک ماسی رکھ لی جائے۔"

"واہ... میرے منہ کی بات چھین لی تم نے۔" اگلے ہی پل ان کا لہجہ خوش گوار ہو گیا تھا۔

"تو آپ بھی کان کھول کر سن لیجیے پاپا جی اس گھر میں میں رہوں گا یا ماسی۔" اس کے قطعیت سے کہنے پر امجد صاحب تڑپ کر اس کے قریب آئے تھے پھر فلمی انداز میں وحید مراد کی کاپی کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اس اندھیری رات میں تم اکیلے کہاں جاؤ گے فواد۔"

فواد نے کچھ پل سوچا۔ پھر قدرے رضا مند و مصالحانہ انداز میں کہا۔

"تو چلیں... آج ٹاس کر لیتے ہیں۔"

"گڈ آئیڈیا... نکالو سکہ... چاند میرا۔"

فواد نے جیب سے سکہ نکال کر ہوا میں اچھالا تھا۔ پھر سینٹر ٹیبل پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم نے وٹینگ لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھتے کسی کو دیکھا ہے؟ اس کی نظریں اخبار پر اور دھیان چک پھیریوں میں ہوتا ہے... بالکل وہی کیفیت میری ہے۔"

"کھل جا سم سم... " فواد نے ڈرامائی انداز میں ہاتھ اٹھایا اور اگلے ہی پل اک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔

"کیا ہوا۔" پاپا جی نے گھبرا کر اس کی شکل دیکھی تھی۔

"پاپا جی۔" فواد کا لہجہ روتا ہوا سا تھا "ماسی تلاش کریں۔" بے ساختہ امجد صاحب نے ہوا میں اچھل کر یاہو کا نعرہ بلند کیا تھا۔ "مگر یاد رکھیے گا... ماسی اگر رکھ بھی لی جائے... تو کھانا آپ کو ہی پکانا پڑے گا۔" فواد کا انداز ہارا ہوا سا تھا۔

"تو پھر کوئی ایسی ماسی ڈھونڈنی چاہیے جو صرف ہمارے گھر کا کام کرے۔" امجد صاحب کا انداز پر سوچ تھا۔

"پاپا جی... اڑوس پڑوس میں ہزار کام والیاں آتی ہیں۔ کسی کو بھی پکڑ لیں... میرا مطلب ہے ماسی رکھ لیں۔"

"اب میں تمہارے مطلب کی ماسی کیسے تلاش کروں؟ جس میں ساری خوبیاں ہوں۔"

"بھئی میں خود گھر کے لیے ایک خوب صورت، پڑھی لکھی اور صاف ستھری ماسی تلاش کروں گا۔"

"بیٹا جی... کہنے اور کرنے میں فرق ہی کتنا ہے۔ تم نے کہہ دیا۔ اب کر بھی ڈالو ایک خوب صورت ماسی کی تلاش۔"

"اور اگر میرا اس پر دل آ گیا تو...؟"

"تو دو مسئلے ایک ساتھ حل ہو جائیں گے۔ ایک ماسی کا، دوسرا تمہاری شادی کا۔"

"پھر تو ماسی میں بیویوں والی خوبیاں ڈھونڈیں۔ یہ آپ نے ہی کہا تھا کہ عورت ہی گھر کو گھر بناتی ہے۔"
"تو عورت بناتی ہے۔ ماسی نہیں بناتی۔"
"ماسی عورت نہیں ہوتی کیا؟"
"عورت ہوتی ہے۔ مگر بیوی نہیں ہوتی۔"
"تو عورت کو بیوی بنتے کون سی دیر لگتی ہے پاپا جی۔"
"اف کم از کم میں تم سے نہیں جیت سکتا۔" وہ مایوسی سے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں ذرا باہر کی ہوا کھا آؤں۔"
"جی ہاں۔ جائیے ضرور جائیے کیونکہ اندر کی ہوا کھانے سے بہتر ہے بندہ "باہر کی ہوا" کھالے۔" فواد نے ان کے عقب سے ہانک لگائی تھی اور جوس گلاس میں انڈیل کر پرسوچ انداز میں سپ لینے لگا۔

☼ ☼ ☼

فواد ماسی کے لیے مان گیا تھا۔ امجد صاحب کے لیے یہ بھی کم نہ تھا۔ مگر اگلا مرحلہ اس سے بھی دشوار تھا۔ یعنی من پسند ماسی کی تلاش فواد کی شرائط کے مطابق۔ ماسی کی تلاش۔ ان کے لیے سچ مچ اک کار دشوار ثابت ہوا تھا۔ وہ ہر کسی ماسی میں کیڑے چن کر قطعیت سے اسے رد کردیتا کہ کبھی کبھی امجد صاحب کو لگتا۔ وہ جان بوجھ کر ماسی میں مین میخ نکال رہا ہے۔ سو وہ اک بار پھر اسے ستانے پر تل گئے تھے۔

اس روز بھی فواد۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگاتے ہوئے سخت بے زار نظر آرہا تھا۔ جبکہ امجد صاحب اس کے سامنے بیٹھے بے نیازی سے پلیٹ کو چمچہ سے بجارہے تھے۔

"دال' چاول' لوکی' اور یہ بھنڈی اف! او پاپا جی پھر بھنڈی؟ ابھی کل ہی تو آپ نے بھنڈی پکائی تھی۔ اور اتنا لمبا پانی۔ میں نے ڈبکی لگائی ہے۔" اس بار اس کا انداز دہائی دینے والا تھا۔ جبکہ امجد صاحب پر خاک نہ اثر ہوا۔ انہوں نے جان بوجھ کر چڑانے والا لہجہ اپنایا تھا۔

"بیٹا جی۔ میں کوئی خاندانی کک تھوڑی ہوں۔ مجھے تو بس یہ گنی چنی چیزیں ہی پکانی آتی ہیں۔ بس ان ہی پر گزارا کرو۔" بے نیازی ان کے لہجے میں عود کر آئی۔

"مگر میں روز۔ روز ایک جیسی چیزیں نہیں کھا سکتا۔ اور کم از کم آج کے دن تو ہرگز نہیں۔"
"کیوں۔ آج کیا مزدور ڈے ہے؟"
"پاپا جی۔ ہفتے میں ایک دن چھٹی کا ملتا ہے۔ اس میں تو ڈھنگ کا کھانا مل ہی جانا چاہیے۔"
"تو پھر ٹھیک ہے۔" امجد صاحب اطمینان سے ہاتھ جھاڑ کر اک طرف جا بیٹھے "اب سنڈے کو میں بھی چھٹی کیا کروں گا۔ اس کھانے کو آخری سنڈے کا کھانا سمجھ کر کھالو۔"
"پاپا جی۔ مذاق میں نہ ٹالیں۔ کچھ اور کریں نا۔"
"کچھ اور تو یہی ہو سکتا ہے کہ تم بازار جاکر دو کباب پراٹھا رول لے آؤ۔ ایک اپنے لیے۔ ایک میرے لیے۔"
"پاپا جی ایک رول میں میرا کیا بنے گا کچھ اور سوچیں۔"
"ہم۔ ہم۔ تو پھر جمبو سائز پزا آرڈر کردو۔ ایک اپنے لیے۔ ایک میرے لیے۔" اگلے ہی پل فواد کا موڈ بدل گیا۔
"ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔" اس نے تبھی موبائل اٹھا کر پیزا آرڈر کیا تھا۔ اور فون بند کرتے ہی کال بیل بج اٹھی۔ تو فواد کی حیرت انتہا کو جا پہنچی تھی۔
"ہائیں۔ اتنی جلدی پزا آگیا؟"
"بیٹا جی۔ یہ پاکستان ہے۔ یہاں وصولی کے کسی کام میں کبھی دیر نہیں ہوتی۔" جواباً" ان کا لہجہ خاصا لاپرواسا تھا۔
"پاپا جی۔ ابھی تو انہوں نے موبائل بھی نہ رکھا ہو گا۔"
"تو پھر تم دیکھو جاکے۔ لیکن یہ "وہ" ہی نہ ہو۔" انہوں نے وہ کو کھینچ کر آنکھ سے باہر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ مگر وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھنے لگا۔

"وہ کون پاپا جی۔۔۔؟"

"بھئی وہی۔۔۔ جو نظر نہیں آتا۔۔۔ بس مس بیل بجاتا ہے اور غائب۔" انہوں نے بے پروائی سے کہتے ہوئے پیر پسار لیے تو فواد کو اٹھنا پڑا۔ لاؤنج کا دروازہ پار کر کے مختصر سے احاطے کی اک جانب چھت کو جاتا زینہ اس کے نیچے فواد کی سرخ آلٹو۔ جبکہ گھر کے تین اطراف۔۔۔ گیلری کی دیوار کھینچی گئی تھی۔ سامنے صدر دروازہ تھا۔ اس نے صدر دروازہ وا کیا تو دائیں بائیں حق ہو سناٹا۔ وہ الٹے قدموں لوٹ آیا تھا۔

"کیا پتا۔۔۔ یہ واقعی "مس بیل" ہو۔ بجاتا نہ ہو' بجاتی ہو۔"

"جی ہاں۔۔۔ کیونکہ مسٹھاں۔۔۔ گھنٹیاں یہ سب مونث ہی تو ہوتی ہیں۔" پاپا جی نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے پھر چشمہ درست کر کے فواد کو کسی قدر مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ "فواد تم کچھ ایسی باتیں نہیں کرنے لگے۔ جیسے دیوانے بھوکے کو چاند بھی روٹی کی طرح نظر آتا ہے؟"

"پاپا جی۔۔۔ مس بیل گھر پر ہو یا موبائل پر۔۔۔ کبھی اس کی ٹینشن نہیں لینی چاہیے۔ ورنہ آپ خود ہائی پر ٹینشن کے مریض بن جائیں گے۔" اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے ان کی بات اڑا دی تھی۔ "ایک بار ایک نمبر مجھے سال بھر تنگ کرتا رہا۔ مس بیلز۔۔۔ اور ایس ایم ایس کر کر کے میرا بھیجا پلپلا کر دیا۔ میں نے کبھی ریسپانس ہی نہیں دیا۔ اگر میں چڑتا۔ تاؤ کھاتا تو اسے مزا آتا۔۔۔ اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا۔" اس کی بات کے دوران اک بار پھر کال بیل بجی تھی۔۔۔ اور بجتی ہی چلی گئی۔

"میرا خیال ہے۔۔۔ اب رائٹ بیل ہے۔" فواد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ صدر دروازے تک جا کر اس بار اس نے لینس کے ذریعے باہر دیکھا تھا۔ اور اگلے ہی پل اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔۔۔ باہر اک خوب صورت لڑکی پراندہ جھلاتے چیونگم چبا رہی تھی۔

"لگتا ہے۔۔۔ یہی "مس بیل" ہے اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ وا کیا تھا جبکہ لڑکی نے ناک سے پھسلتی عینک درست کر کے سراپا فواد کا جائزہ لیا تھا۔

"او جی۔۔۔ مجھے کام چاہیے۔" پراندہ جھلاتے گاؤدی لہجے میں کہتی وہ کھٹاک سے فواد کے دل کو چھو گئی۔

"ہائیں مجھے چاند چاہیے تو سنا تھا۔ مگر کام چاہیے۔۔۔؟"

"او جی۔۔۔ میں کام والی ہوں۔ ماسی۔۔۔ گاؤں سے آئی ہوں۔"

"ماسی۔۔۔ مطلب ماں۔۔۔" فواد نے کھینچا "سی ی ی۔۔۔" پھر معنی خیز انداز میں اسے تکا۔ "لیکن اتنی تو آپ کی عمر نہیں لگتیں۔ اگر تھوڑی ماڈ لک اپنا لو تو کسی ڈرامے میں آسانی سے چانس مل سکتا ہے۔"

"او جی۔۔۔ یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" اس بار وہ برا مان گئی تھی۔ "مجھے کسی نے بتایا تھا۔۔۔ آپ کو کام والی چاہیے۔"

"اوہ ہاں۔" اسے اچانک یاد آیا تھا۔ "جس کسی نے بھی بتایا بالکل ٹھیک بتایا ہے۔۔۔ آپ آئیے۔۔۔ اندر آئیے۔"

وہ فواد کی معیت میں لاؤنج میں داخل ہوئی تو اخبار دیکھتے پاپا جی نے چشمہ درست کر کے خاصی ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔

فواد نے خوشی سے استقبالیہ انداز و خوش گوار لہجے میں کہتے ہوئے انہیں مطلع کیا تھا۔ "مبارک ہو۔۔۔ مبارک ہو پاپا جی۔۔۔ انہیں کام چاہیے۔۔۔"

"سچی۔۔۔!" پاپا جی بے یقینی و سرخوشی سے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ "ارے واہ۔۔۔ انہیں کام چاہیے اور ہمیں کام والی۔ سمجھو بن گیا کام۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔" ان دونوں نے اک سرخوشی سے ہاتھ ملایا۔۔۔ تو وہ اک حیرت سے باری باری دونوں کو دیکھ کر گویا ہوئی تھی۔

"او جی۔۔۔ آپ دونوں میں سے باپ کون ہے۔ اور بیٹا کون۔۔۔؟"

"واہ۔۔۔ یہ پہلی کام والی دیکھی ہے۔۔۔ جو عینک لگاتی ہے اور نظر اسے پھر بھی ٹھیک نہیں آتا۔" پاپا جی کا موڈ

منٹوں میں خوش گوار ہو گیا تھا۔
"جناب یہ پاپا جی ہیں۔۔۔ یعنی باپ اور میں بیٹا فواد ۔۔۔ اصل میں پاپا جی نے میری ماں جی کے گزرنے کے بعد مجھے بالکل دوستوں کی طرح پالا ہے۔۔۔ اس لیے میں خود بھی کبھی بھول جاتا ہوں کہ یہ باپ ہیں اور میں بیٹا ۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ تمہیں کھانا پکانا آتا ہے؟"
"ہاں جی۔۔۔ کھانا پکانا۔" وہ انگلیوں پر گننے لگی۔ "لسی بلونا۔۔۔ بھینسوں کو چارہ۔۔۔ بکری کا دودھ۔۔۔"
"بس، بس، بس۔" پاپا جی نے ہاتھ اٹھا کر اس کی قینچی کی رفتار کو مات کرتی زبان کو بریکیں لگائیں "اتنا کافی ہے۔ تمہاری رہائش۔۔۔ کھانا پینا سب فری اور تنخواہ پانچ ہزار۔۔۔ ٹھیک ہے؟"
"پانچ ہزار؟" اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے کہا تھا "تے نالے کھانا پینا سب فری؟" اگلے ہی پل وہ لہجہ بدل کے قدرے ناراضی سے گویا ہوئی "اوجی آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔۔۔؟" پاپا جی اور فواد نے اک دوسرے کا منہ تکا پھر فواد نے کہا تھا۔
"ہم بھلا تم سے کیوں مذاق کریں ۔۔۔ ہماری شرط یہ ہے کہ تم کہیں اور کام نہیں کرو گی۔۔۔ منظور ہے؟"
"ہاہ۔۔۔ ہائے میری مت ماری گئی ہے جو کہیں اور کام کروں۔۔۔ کیسی گلاں کرتے ہو جی۔۔۔ پانچ ہزار۔" اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔
"بس تو پھر سمجھ لو کہ تمہاری نوکری پکی۔" فواد خوشی سے جھوما تو پاپا جی نے اس کے کان سے منہ لگا کر مشکوک لہجے میں کہا۔
"تمہیں اتنی خوشی کس بات کی ہے؟"
"بھئی انہیں کام مل گیا۔۔۔ ہمیں کام والی۔۔۔ بات خوشی کی ہے کہ نہیں؟" اس نے جواباً سرگوشی کی تھی تب ناگواری سے اس نے کہا تھا۔
"اوجی۔۔۔ یہ کیا آپ نے کھسر پھسر شروع کر دی ہے۔۔۔ مجھے صاف جواب دیں ناکہ میں اگلا گھر دیکھوں۔"
"اف۔۔۔" پاپا جی نے اپنا دل پکڑ لیا تھا "ایسی باتیں نہ کرو۔ میرا دل بڑا کمزور ہے۔"
"بھئی کہا تو ہے۔ اپنی نوکری پکی سمجھو۔۔۔ چلو اسی خوشی میں بتا دو کہ تمہارا نام کیا ہے؟" فواد نے کہا تھا۔
"نام تو ابھی رکھا ہی نہیں ہے۔" وہ بے دھیانی میں کہہ کے پھر سٹپٹا گئی تھی "اوجی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ جو دل چاہے رکھ دیں۔"
"گڈ پاپا جی۔۔۔ یہ مس بیل پر آئی ہیں۔۔۔ تو ان کا نام "مس بیل" رکھ دیں؟"
"او بیٹا جی۔۔۔ مس بیل پر تو لوگ تاؤ کھاتے ہیں۔ کچھ اور سوچو۔۔۔"
"ٹھیک ہے۔۔۔ نام کو پھر کبھی ڈسکس کریں گے۔" فواد نے کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا "ابھی تم جاؤ۔۔۔ اپنا کام شروع کرو۔"
"اچھا جی۔۔۔" وہ مڑ کر پراندہ جھلاتی کچن کی طرف چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے بہت کم وقت میں گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کچن کے کاموں سے امجد صاحب نے خاصی رہائی پائی۔۔۔ وہ بہت اعلا نہ سہی۔۔۔ گزارے لائق تو پکا ہی لیتی۔۔۔ اور ان دونوں کے لیے اتنا بھی کافی تھا۔
اس روز بھی پاپا جی اور فواد ڈائننگ ٹیبل پر ماسی کے پکے کھانے کے چٹخارے لے رہے تھے۔۔۔ جب امجد صاحب کو نمک کچھ کم محسوس ہوا۔
"اوہو۔۔۔ بھئی وہ اپنا کیا نام ہے اس ماسی کا۔" وہ اسے پکارتے پکارتے جھلا گئے تھے۔
"پاپا جی۔۔۔ اسے ماسی نہ کہیں۔۔۔ ماسی کہنے سے یہ ماں سی لگتی ہے۔"
"او۔۔۔ چھوڑو بھئی ہمارے ایسے نصیب کہاں ۔۔۔؟" کچن سے آتی ماسی کو دیکھ کر پل بھر میں ان کی ٹون بدل گئی تھی۔ "اوہو۔۔۔ ارے بھئی واہ بڑی انٹیلی جنٹ ہو بھئی میں نمک کے لیے ہی تمہیں پکار رہا تھا۔"
"ہاں۔۔۔ اور کھانا بھی بڑا مزے دار پکایا ہے۔" فواد

نے بھرپور تائید کی۔

"ہیں جی۔۔۔ سچی۔۔۔!"

"تو اور کیا۔۔۔" فواد نے اس کے ہاتھ سے نمک دانی لے کر اسے خاص الخاص نظروں سے تکا۔

"ارے۔۔۔ تم کہاں جا رہی ہو۔ تم بھی تو ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ نا۔"

"اچھا جی۔۔۔" خلاف طبع خاصی تابعداری کا مظاہرہ کرتی وہ قریب ہی کارپٹ پر پالتھی مار کے بیٹھ گئی۔۔۔ تو فواد نے ٹوکا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ کیا تم ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔۔۔ تم ماسی ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہم سے الگ ہو۔ انسان سب برابر ہوتے ہیں۔"

"فواد بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔ ہمارے ہاں کبھی کسی نے یوں کھانا نہیں کھایا۔"

"اچھا جی۔۔۔" ڈائننگ چیئر سنبھال کر اس نے ٹانگیں کرسی پر رکھ لی تھیں۔۔۔ پھر بریانی سے پلیٹ بھر کر جلدی جلدی لقمے لینے لگی۔

"ہاں۔۔۔ تو بھئی تمہارے نام کا معاملہ تو اٹک ہی گیا ہے۔"

"او چھوڑیں پاپا جی۔۔۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکارو۔۔۔ رہتا تو گلاب ہی ہے نا۔"

"او نا جی نا۔۔۔ مجھے گلابو نہ کہنا۔۔۔ گلابو تو تا جی فجے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

"تو پھر کیا کہیں سندری۔" فواد نے لہجے میں پیار سمو کر لگاوٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"ہاہ۔۔۔ ہائے کیا کہا آپ نے۔۔۔ باندری۔۔۔؟"

"باندری نہیں۔۔۔ سندری۔"

"سندری۔" وہ خوشی سے اچھل پڑی تھی "کنا سوہناں ہے جی۔۔۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

"سندری کا مطلب ہے خوب صورتی۔۔۔ سندر۔"

"ہائے میں مر جاواں۔۔۔ بس پھر یہی ٹھیک ہے جی۔۔۔"

"اور سنو۔۔۔ تم بھی مجھے فواد کی طرح پاپا جی ہی کہو گی۔۔۔ کبھی خود کو ملازم اور ہمیں مالک نہ سمجھنا۔"

"پاپا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ انسان سب برابر ہوتے ہیں سندری۔"

"ہائے ہائے۔۔۔ کتنے سوہنے ہو جی آپ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

امجد صاحب کو شادی دفتر سے فون کا انتظار تھا۔۔۔ اور فون تھا کہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔ وہ صوفہ پر پالتھی مارے۔۔۔ سر نیہوڑائے۔۔۔ بڑبڑا رہے تھے۔

"جیسی لڑکی فواد کو چاہیے۔۔۔ ایسی کہاں ملے گی۔۔۔ اس طرح تو فواد کی شادی مشکل ہو جائے گی۔ شادی کا بھی اک وقت ہوتا ہے۔ ابھی تک تو نہیں کی۔۔۔ ابھی نہیں کی تو کب کرے گا۔ کرے گا بھی کہ نہیں۔" ان کی سوچوں کا تسلسل پاس پڑے موبائل کی بیپ نے توڑا تھا۔ انہوں نے بنا اسکرین دیکھے ریسیو کر لیا۔

"ہیلو۔۔۔ جی میں امجد حسین بول رہا ہوں۔"

"او امجد کے بچے سن ذرا۔۔۔ ٹائم کیا ہوا ہے؟" اک کرخت آواز ابھری تھی۔

"ٹائم۔۔۔" انہوں نے اچنبھے سے کہتے ہوئے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ "صبح کے آٹھ بج رہے ہیں جی۔۔۔؟"

"صبح کے آٹھ۔۔۔ اور تو اتنی جلدی جاگ گیا بڈھے۔"

انہوں نے بھونچکا ہو کے اسکرین کو تکا تھا۔ نامعلوم نمبر تھا۔ کال ڈراپ کی جا چکی تھی۔ ان کی صورت پر زمانہ بھر کی بے چارگی امڈ آئی۔

"مس بیلز کے بعد۔۔۔ اب رانگ کالز۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گئے۔

فواد سن کر خوب ہنسا۔

"دنیا چاند پر پہنچ گئی۔ آپ ابھی تک میری شادی کے چکر میں پڑے ہیں۔"

"کیوں۔۔۔ کیا کمی ہے تم میں۔۔۔ سوائے کیلشیم کے۔۔۔ میرا مطلب ہے تم خوب صورت ہو۔۔۔ ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے ہو۔۔۔ ہزاروں میں تنخواہ ہے۔۔۔ پھر اور کیا چاہیے۔۔۔ اب اے بھوانی ٹنڈ کی نمائش نہ کرنا۔ ارے اندھے لنگڑے لولوں کو بھی رشتے مل ہی

جاتے ہیں۔"

"پاپا جی۔۔۔ پھر انہیں اندھی، لولی، لنگڑیاں ہی ملتی ہوں گی۔"

"ارے بھئی۔۔۔ کوئی لمبا چوڑا معیار تو ہمارا ہے نہیں۔۔۔ بس سادہ گھریلو لڑکی۔ جو گھر کو گھر بنادے۔"

"ہاں، اک چیز اور ہوتی ہے۔۔۔ اور وہ ہے اسٹیٹس بھئی رشتے برابری کی بنیاد پر ہی بہتر رہتے ہیں۔۔۔ ہاں۔"

"پاپا جی۔۔۔ اسٹیٹس سے بھی اہم ہوتا ہے سیرت و کردار جسے اس دور میں کوئی نہیں پوچھتا۔۔۔ بس لڑکی تعلیم یافتہ خوب صورت ہے۔۔۔ گھرانا اسٹیٹس والا ہے۔۔۔ پھر وہی لڑکی سسرال میں کچھ دن رہ کر بری بہو کیوں بن جاتی ہے؟ کیونکہ ہم سیرت و کردار کے بل بوتے پر کسی کو نہیں اپناتے۔۔۔ ہم ظاہریت پر مرتے ہیں۔۔۔"

"او یار۔۔۔ کہتے تو تم ٹھیک ہو۔۔۔ مگر دنیا داری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔۔۔ اب ضروری تو نہیں کہ ہمارے معیار کی لڑکی سیرت و کردار کی بری ہی نکلے۔ او تھنک پازیٹو۔۔۔ ہر گھر میں کئی کئی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھی ہیں۔"

"پاپا جی۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ لڑکوں کی شادی لڑکیوں سے بڑھ کر گمبھیر مسئلہ ہے اس کی اک وجہ اعلا معیار بھی ہے۔"

"یار۔۔۔ اعلا معیار کی تلاش میں کبھی کبھی اپنا ہی معیار گر جاتا ہے۔ مجھے فکر ہے تمہاری عمر ہی نہ نکل جائے کہیں۔۔۔ پہلے ایک نقص ہے۔۔۔ پھر دو ہو جائیں گے۔"

"لیجیے۔۔۔ تو پھر بجی گھنٹی۔۔۔" اس نے ٹالا۔

☼ ☼ ☼

سندری۔۔۔ کچن میں کھڑی بڑبڑا رہی تھی۔

"ہائے وے ربا۔۔۔ کیسا گھر ہے نہ جنریٹر۔۔۔ نہ یو پی ایس۔ ہائے او میرے ربا۔۔۔ میرا تے ساہ وی سک گیا۔ کچن بھٹی بن گیا بھئی۔"

اس نے جلتے جھلتے لاؤنج کی ڈائننگ پر کھانا چنا تھا۔۔۔ پاپا جی ڈائننگ چیئر پر بیٹھے پنکھا جھول رہے تھے۔

"بھئی گرمی کا حل یہ ہے نا۔۔۔ ہمت فین جب تک ہمت ہے۔ جھلتے رہو جھلتے رہو۔"

"اور جب ہمت ٹوٹ جائے تو؟" فواد اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔

"تو لائٹ کا انتظار کرو۔۔۔ دیکھو آ گئی نا لائٹ۔"

"لائٹ جاتی ہے تو جیسے زندگی رک جاتی ہے۔" فواد پاپا جی کے پاس آ بیٹھا۔

"ہاں سب کچھ ایک دم چل پڑا ہے۔ ایکٹو۔" وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

"کیا ہو گیا؟ ایکٹو؟ سندری تمہیں کیسے پتا کہ ایکٹو کسے کہتے ہیں؟" پاپا جی نے ٹھٹک کر مشکوک لہجے میں کہا تو وہ تنک اٹھی۔

"تا آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ مجھے تو آپ خود ایکٹو لگتے ہیں۔ چلتے پرزہ چالو۔" وہ نظریں ادھر ادھر گھما کر کچن کی طرف پلٹ گئی۔

"او یار۔۔۔ فواد یہ مجھے کیا کیا کہہ گئی ہے؟"

فواد کھل کر ہنسا "او جانے دیں پاپا جی کھانا شروع کریں۔" مگر ان کا موڈ ہنوز آف تھا۔ ڈشز کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سلاد چبانا شروع کر دیا۔۔۔ اگلے پل انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

"ہائیں۔۔۔ یہ کیا؟ سلاد میں کھیرا کیوں نہیں ہے؟ سندری۔۔۔ او سندری جب تمہیں پتا ہے کہ میں سلاد میں کھیرا کھاتا ہوں تو کیوں نہیں لائیں تم کھیرا؟" سندری۔۔۔ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوئی تھی۔

"او جی۔۔۔ مجھ سے اس طرح بات نہ کریں۔ میں نوکرانی ہوں۔۔۔ گھر والی نئیں ہوں آپ کی۔"

"ہمارے ایسے نصیب کہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے، جب تم مارکیٹ گئی تھیں تو کھیرا کیوں نہیں لائیں۔" پاپا جی کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

"او نا جی نا۔۔۔ میرا حساب کر دیں۔۔۔ میں ابھی یہ نوکری۔"

"ارے سندری۔۔۔" پاپا جی کے گلے پڑ گئی تھی۔ ڈر کر بات کاٹتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں پیار سے بولے "تم تو برا ہی مان گئیں۔"

"او مل جائے گا۔۔۔ کھیر اُف ایک دن کھیرا نہیں کھائیں گے تو فوت نہیں ہو جائیں گے۔" وہ ہاتھ نچا کر تیزی سے بولی تھی۔

"ارے سندری۔۔۔ میں اب دوبارہ زندگی میں کھیرے کا نام ہی نہیں لوں گا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔" فواد مزے سے کھانا کھاتا رہا تھا۔

"آگے مجھ سے اس طرح بات کی نا۔۔۔ تو اچھا نہیں ہوگا ہاں۔" وہ پراندہ جھلاتی مڑ گئی تھی۔

"اسے کہتے ہیں۔۔۔ جیسے کو تیسا۔۔۔" فواد ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لاکھ نخریلی۔۔۔ اکھل کھری۔۔۔ پٹاخا تھی۔ گھر کی گاڑی تو چلا ہی رہی تھی۔ امجد صاحب اور فواد کے لیے اتنا بھی بہت تھا۔ فواد کو اس کی چلبلی چٹخارے دار باتیں بڑا مزا دیتیں۔۔۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کا گھر میں دل لگنے لگا تھا۔ اس دن بھی وہ آفس سے جلدی لوٹ آیا۔

"آج آپ بڑی جلدی آ گئے جی۔۔۔ چائے لاؤں جی۔"

"چائے کے سوا جو کچھ بھی ہے، لے آؤ۔۔۔ سچ بڑی بھوک لگی ہے۔"

"ہیں جی۔۔۔ آپ نے لنچ نہیں کیا۔۔۔؟"

"تمہارے ہاتھ کا بڑا مزے دار سا لنچ جو کرتا تھا۔ سچ بڑا ذائقہ ہے تمہارے ہاتھ میں۔"

"میرے ہاتھ کی تو جی۔۔۔ ہر چیز ہی مزے دار ہے۔ آپ کبھی ٹرائی کر کے تو دیکھیں۔" سندری کا لہجہ معنی خیز اور دھمکاتا ہوا سا تھا۔

جواباً" فواد کا قہقہہ بڑا بے ساختہ تھا۔ "تمہاری اچھی باتیں سننے کے لیے ہی تو میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب میں لنچ گھر پر ہی کیا کروں گا۔"

"ہیں جی۔۔۔ پھر تو بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔۔۔ پہلے تو میں اور پاپا جی لنچ میں حلیم۔۔۔ نان چھولے منگا کر گزارا کر لیتے تھے۔"

"تو چلو پھر اسی بہانے تمہیں اور پاپا جی کو بھی مزے دار سا لنچ مل جایا کرے گا۔ ویسے تمہیں پزا بنانا آتا ہے۔"

"ہاں جی۔۔۔ سارے کھانے اور پزا بھی۔"

"سارے کھانے۔۔۔ یعنی امریکن کھانے بھی۔"

"او جی۔۔۔ پزا امریکن نہیں۔۔۔ اٹالین ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تمہیں کیسے پتا؟"

"ناں۔۔۔ کیا مطلب ہے آپ کا۔" کمر پر ہاتھ رکھ کر تیکھی نظروں سے اسے تکتے ہوئے کہا "میں ان پڑھ جاہل ہوں۔ تمیز نہیں ہے مجھے؟"

"ارے سندری۔۔۔ تم تو برا مان گئیں؟ بھئی مطلب صاف ہے۔ رات کھانے پر مجھے پزا ملے گا؟"

"اور اگر نہ ملے تو۔۔۔!"

"تو میں کچھ اور کھا لوں گا۔"

"یہ ہوئی نا بات۔۔۔"

☼ ☼ ☼

فواد کے کمرے کے سامنے سے گزرتے اس کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔۔۔ اپنے نام پر کان کھڑے ہوئے تو ادھ کھلے دروازے کی درز سے جھانکا۔۔۔ پاپا جی فواد کے بیڈ پر نیم دراز۔۔۔ جبکہ فواد رائٹنگ ٹیبل کے سامنے عینک لگائے کسی موٹی سی کتاب میں گم تھا۔

"بیٹا جی۔۔۔ مجھے یہ لڑکی فلرٹ یا فراڈ لگتی ہے۔ اس کی آنکھیں بڑی پراسرار سی ہیں۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے۔۔۔"

"کہ وہ کوئی چڑیل ہے۔" فواد نے سرعت سے ان کی بات اچکی تھی۔ "یا پھر کسی ساحل سے بھٹکی جل پری۔۔۔ یا پھر کوئی چھلاوہ پری۔" اس کا انداز چڑا ہوا۔۔۔ بے زار سا تھا "فار گاڈ سیک پاپا جی۔۔۔" امجد صاحب پر خاک نہ اثر ہوا۔ وہ اٹھ بیٹھے تھے۔

"مجھے تو لگتا ہے۔۔۔ یا تو یہ تمہیں پھنسا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔۔۔ یا پھر۔۔۔" ان کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "اس گھر میں ڈکیتی پڑوانا چاہتی ہے۔"

"ٹھنک پاپا پلیز پاپا۔۔۔ ہمارے گھر میں کون سے

خزانے دفن ہیں... اور مجھے پھنسا کے اسے کیا مل جائے گا۔ اس فارغ البال آدمی...." اس نے کہتے ہوئے وگ اتاری تھی۔

سندری کی آنکھیں چوپٹ کھل گئیں کمرے میں جگمگاتی لائٹس کی روشنی میں فواد کی چمکتی ہوئی ٹنڈ واضح تھی... بے ساختہ سندری کا ہاتھ اپنے لبوں تک چلا گیا تھا۔ "اس چندیا سمیت اگر سندری تجھی مجھے منظور کر لے... تو میری خوش قسمتی ہے۔"

"پاپا جی سنبھلے... پھر محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سندر نے غڑاپ سے اپنی گردن واپس کی... مگر کان اندر سے اٹھتی آواز پر لگا دیے۔

"او بیٹا... چھپاؤ اسے... کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔"

"ویسے یہ آپ کو پراسرار کیوں لگتی ہے؟" اس نے فی الفور تعمیل کی۔

"سندری کا رہن سہن... میرا مطلب ہے بڑی آسائشات کی عادی لگتی ہے۔"

"او پاپا جی... ماسیوں سے زیادہ آسائشات کا کون عادی ہو سکتا ہے؟ گھر ان کے حوالے کر کے بیگمات سیر و تفریح کرتی پھرتی ہیں... اور ماسیاں گھروں میں مزے کرتی ہیں... یہ بھی تو دیکھیں... اس کے آنے سے گھر کے کتنے کام آسان ہو گئے ہیں... بجلی کی طرح کام کرتی ہے۔"

"ہاں... اور بجلی ہی کی طرح کرنٹ بھی مارتی ہے۔"

"او جانے دیں پاپا جی... ہمیں اس کے مزاج اور رہن سہن سے کیا لینا دینا... ہمیں تو اپنے کام سے کام ہے نا۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہو۔" انہوں نے سائڈ ٹیبل سے ہینڈ فری اٹھا کر کانوں میں ٹھونس لی... اگلے پل ان کے پیر تھرک رہے تھے۔ فواد پھر سے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

مینوں رب دی سونہہ ' تیرے نال پیار ہو گیا

وی چنا سچی مچی ' وے چنا سچی مچی

سندری فواد کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرتے گنگنا رہی تھی۔ جب فواد نے عقب سے آکر "ہاؤ" کی تو وہ اچھل کر پلٹی تھی۔ پھر دل پر اک ہاتھ سینے پر رکھے اسے گھورتی چلی گئی تھی۔

"او جی... یہ آپ ہو؟ ہائے وے رہا... میرا تے ساہ وی سک گیا۔"

"بس! اتنا ننھا سا... چڑیا جیسا دل ہے تمہارا؟"

"او جی... مجھ سے زیادہ فری نہ ہوں۔ دماغ بڑا ٹیڑھا ہے میرا... ہاں۔" وہ پلٹ کر پھر سے کام میں لگ گئی۔

"ٹیڑھا ہی نہیں... گرم بھی ہے... آؤ تمہیں آئس کریم کھلا کر لاؤں۔"

"وہ کس خوشی میں۔" وہ پلٹ کر اک ہاتھ کمر پر رکھے پراندہ جھلانے لگی۔

"اس لیے کہ میں خود آئس کریم کھانے جا رہا ہوں۔"

"ہاہ... ہائے... کبھی نوکر مالک بھی ساتھ ' آئس کریم کھانے گئے ہیں؟"

"بھئی... تم دن رات کام میں لگی رہتی ہو۔ ملازم کو بھی فریش نیس کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں بھی تھکن ہو سکتی ہے۔"

"او نا جی... فیدا جی... مجھے نئیں کھانی آئس کریم۔"

"میں نے تمہارا کتنا خوب صورت نام رکھا تھا اور تم مجھے فیدا جی کہتی ہو...؟"

"وہ جی... ہمارے گاؤں میں نا... ایک گولے گنڈے والا تھا... بڑے شوق سے میں اس سے گنڈا لے کے کھاتی تھی۔ وہ جب گلی میں آکے ٹن ٹنا ٹن... گھنٹی بجاتا... تو لوگ پکارتے... فیدے، او فیدے۔"

"خدا کو مانو سندری... تم مجھے اس فیدے سے کمپیئر کر رہی ہو؟"

"ہاں تو انسان سے ہی کمپیئر کر رہی ہوں نا جی...

کی میچ (بھینس) سے تو نہیں۔"

"کمپیوٹر نہیں۔۔۔ کمہار۔۔"

"ہاں جی وہی۔۔۔ تو بس جی۔۔ جیسے اس فیدے کا گنڈا کھا کے۔۔ کلیجے میں ٹھنڈ پڑتی تھی نا جی۔۔ ایسے ہی آپ کو دیکھ کرتا جی۔۔۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔"

اس نے شرماتے مسکراتے کہا تھا۔

"ہائے میں صدقے جاواں۔۔۔ تم کتنی بھولی بھالی ہو نا سندری۔۔۔" وہ ہنسا تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی دفتر سے فون آ ہی گیا۔

"بھئی، لڑکی معقول ہو۔۔۔ پڑھی لکھی۔ خوب صورت گھرانا ہم پلہ ہو۔۔۔ بس یہی کچھ چاہیے۔ ہاں جی۔۔۔ ہمارا گھرانا۔۔۔ لڑکا' جاب سب کچھ تو آپ کے سامنے ہے۔۔۔ جی ہاں شکریہ۔"

فواد اسی وقت آفس سے لوٹا تھا۔

"ارے بھئی فواد۔۔۔ اچھے وقت پر آئے۔۔۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی بات چیت چل رہی تھی۔"

"اچھا۔۔۔ مگر کس سے؟ مجھے تو یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا۔"

"اوہو۔۔۔ بھئی شادی دفتر سے فون آیا تھا۔ بھئی میں نے تو صاف کہہ دیا۔ ہمیں اپر کلاس کی ماڈ اور پڑھی لکھی لڑکی چاہیے' ہاں۔۔۔ بیوی وہ' جو شوہر کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکے۔"

"بھئی یہ اپر کلاس کی فیشن ایبل ماڈ بیگمات کم از کم میرا آئیڈیل ہرگز نہیں۔" فواد نے نفی میں سر ہلایا۔

"او یار۔۔۔ شادی کے لیے۔۔۔ بندے کی یہی ڈیمانڈز ہوتی ہیں۔"

"آئیڈیل کو خوب صورتی میں تلاش کرنے والے لوگ' وقت ضائع کرتے ہیں۔۔۔ کیونکہ آئیڈیل اور تقدیر کا اگر ٹکراؤ ہو جائے تو آئیڈیل کی خوب صورتی فنا ہو جاتی ہے۔ آئیڈیل تو بس وہ ہے۔ جو آنکھوں کو اچھا اور دل کے قریب لگے۔"

"بھئی صاف بات ہے۔ دل تو صاف عقل کا دشمن ہوتا ہے' ہاں۔"

"او بابا جی سیدھی سی بات ہے۔ انسان جو سوچتا ہے۔ وہ ہوتا نہیں۔ ہوتا وہ ہے' جو تقدیر میں لکھا ہو۔ اس لیے شادی کے معاملے میں معیار کے چکر میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ بس جو دل کو اچھا لگے' آنکھیں بند کر کے اس سے شادی کر ڈالو۔"

"کہتے تو تم ٹھیک ہی ہو۔۔۔ مگر سوسائٹی میں عزت بھی تو رکھنی ہوتی ہے نا۔"

"بابا جی۔۔۔ عورت کی سب سے بڑی کوالٹی پتا ہے کیا ہے؟ وفا' وفا وہ نکتہ ہے۔ جس سے ساری گھر گرہستی کا سرکل گھومتا ہے۔"

"سچ کہتے ہو۔۔۔ کاش نیچر کھنگالنے کا بھی کوئی عدسہ یا آلہ ہوتا۔" وہ ہنسے تھے۔

★ ★ ★

سندری اس روز چھت پر کپڑے پھیلا رہی تھی۔ جب اک بال کھٹاک سے اس کی کمر پر آ کر لگی وہ بلبلا کر مڑی تو پڑوس کی چھت پر چند بچے کھڑے دانت نکال رہے تھے۔

"سوری مائی۔"

"لو کاکے۔۔۔ منہ سنبھال اپنا۔۔۔ اور میں تجھے مائی نظر آتی ہوں۔۔۔؟"

"سوری۔۔۔ ماسی۔"

"او ماسی ہو گی تیری ماں۔۔۔ تو نے گیند کس کو ماری ہے؟"

"ویسے ہی لگ گئی ہو گی۔۔۔"

"او۔۔۔ ایسے ہی نئیں لگتی ہے۔ چماٹ ماروں گی میں تیرے منہ پر۔"

"آپ دس مار لو۔۔۔ مگر بال تو دے دو نا!"

سندری نے ادھر ادھر دیکھا تو بال دھلے کپڑوں کی باسکٹ میں پڑی تھی۔

"او چل۔۔۔ کام کر اپنا۔۔۔ ادھر کوئی گیند شیند نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔ پہلے بھی تم نے ہی گملوں کے پیچھے ہماری بال چھپائی تھی۔"

بابا جی نے یہ ساری کھٹ پٹ سن کر سر تھاما تھا۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اسے آئے ہوئے ... اور اس نے ہمارے محلے سے پنگا لے لیا ہے۔" وہ چھت سے باسکٹ تھامے بڑبڑاتی... چلی آرہی تھی۔

"ایویں متھا خراب کرنے چلے آتے ہیں... ہونہہ!"

فواد نے اسے جالیا... سندری بچوں کو بال واپس کر دو..."

"او ناجی نا... ایویں واپس کر دوں... فیر تو ناجی... یہ ہر ویلے ہی میرا بھیجا کھایا کریں گے۔ او نئیں اے جی بال میرے پاس۔ دیکھو سندری! مجھے پتا ہے بال تمہارے پاس ہے۔

"پلیز واپس کر دو۔"

"ناجی نا... میں نئیں دیتی..."

"سندری اس طرح ریپو خراب ہو جاتی ہے۔"

"او... کیا خراب ہو جاتی ہے جی...؟"

"ریپو... یعنی لوگ ہمیں چور سمجھنے لگیں گے۔"

"او جی سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں... ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"پلیز ڈیئر... بال واپس کر دو؟" اس کے لہجے میں دنیا جہان کا پیار اُمڈ آیا تو سندری خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

"او... کیا بولا جی آپ نے؟"

"یہی کہ بال واپس کر دو۔"

"نئیں جی... اس کے ساتھ اک اور جو... بولا تھا ڈی ٹی ڈی۔"

"اوہاں... ڈیئر... بال واپس کر دو۔"

"اس طرح تو ناجی... میں اپنی جان بھی دے دوں... یہ لیجیے۔" اس نے جھٹ باسکٹ سے بال نکال کر اسے دے دی۔

"تھینک یو سندری اگر تمہیں بال چاہیے تو میں کل تمہیں ایسی ہی بال لا کر دے دوں گا۔"

"کل... یعنی تو مارو..."

"شاباش... آنے والے کل کو تو مارو کہتے ہیں... اور پرسوں کو؟"

"پرسوں کو؟! ایک اور مارو۔"

"او مائی گاڈ..."

✡ ✡ ✡

"ہوں... ہاں ہاں... اوہو... اس میں اتنا گھبرانے والی کیا بات ہے۔ بس کچھ دن کی تو بات ہے... ہم م م... اوہو بھئی کہا تو ہے احتیاط کریں میں خود کانٹیکٹ کر لوں گی... کیا کہا؟ اوہو آپ کو ادھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ کسی کو شک ہو جاتا تو؟ اچھا ذرا انتظار کریں۔"

محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتی وہ موبائل کان سے لگائے دھیمے مگر صاف و شفاف لہجہ میں بات کرتی... لاؤنج کا دروازے پار کر کے چھت کو جاتا زینہ عبور کر گئی تھی... فواد ادھر آیا تو پاپا جی کو لاؤنج کے جالی دار دروازہ سے ناک چپکائے اسی سمت تکتے پایا تھا۔

"مجھے یہ سندری کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔"

"کیوں... اس کی ناک ٹھیک پوزیشن میں نہیں ہے؟" اس نے اڑایا۔

"اس لڑکی کی حرکتیں کچھ مشکوک ہیں۔ ابھی تم خود جا کر دیکھو وہ چھت پر کیا کرنے گئی ہے۔"

"او پاپا جی... وہ دھلے کپڑوں کی باسکٹ لے کر چھت پر گئی ہے۔"

"تم نے غور سے نہیں دیکھا... باسکٹ خالی تھی۔"

"تو پھر وہ چھت سے کپڑے اتارنے گئی ہوگی۔"

"تم اس سندری کی کچھ زیادہ ہی حمایت نہیں کرنے لگے ہو؟" شاید تم بھول گئے ہو کہ اس گھر میں ماسی کے سب سے بڑے مخالف تم خود تھے۔"

"وہ اختلاف اب دم توڑ چکا ہے پاپا جی... مجھے کیا معلوم تھا کہ ماسیوں کی ایک قسم... سندری جیسی حسین و جمیل اور نوجوان بھی ہوتی ہے۔"

"فواد تمہارے لہجے سے مجھے عجیب سی بو آرہی ہے... کسی گڑبڑ کی بو۔"

"اور مجھے لگتا ہے آپ کے اندر جیمز بانڈ کی روح

حلول کر گئی ہے۔"

"تم ایک بار چھت پر جا کر دیکھو۔ پھر جو چور کی سزا وہ میری سزا۔"

امجد صاحب کے لہجہ میں کچھ ایسا تھا کہ اسے قدم بڑھانے ہی پڑے۔ سندری نچلی منزل پر کچھ اشارے کر کے کھٹا کھٹ قریب پڑی بوری سے لوہے کی گولیاں پھینک رہی تھی۔

"اچھا۔ تو یہ آپ ہیں جو کھٹا کھٹ چھت سے پتھراؤ کر رہی ہیں؟"

وہ بری طرح گھبرائی پھر اگلے پل اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"او جی۔ او سبزی والا۔ سن ای نئیں رہا اے۔"

"اچھا تو سبزی والا کیا مقناطیس سے بنا ہے۔ جو آپ یہ لوہے کی گولیاں پھینک کر اسے روک رہی ہیں؟"

"او جی۔ ادھر یہ گولیاں پڑی ہیں تے گولیاں ای پھینکنی ہیں نا!"

"اوہ۔ آئی سی۔" فواد نے سر ہلایا۔

"آئی سی نے پھڑی کیوں نئیں سی؟"

"اوہ گاڈ۔ تم نے کتنی کلاسیں پاس کی ہیں سندری۔"

"او جی۔ پڑھاتے میں نے چھ سال ہے پر پاس تین ای کلاسیں کی ہیں۔"

"واہ۔ اور ان تین کلاسوں پر تمہیں یہ ٹیچ سسٹم موبائل آپریٹ کرنا آتا ہے۔ تمہیں پتا ہے اس کی قیمت کیا ہے؟"

"نا۔ تو آپ کا مطلب ہے۔ میں نے اسے کہیں سے چوری کیا ہے۔" اس نے فواد کا ہاتھ بڑھتا پا کر موبائل پرے کیا۔ تو اس کے نازک دودھیا ہاتھ سے فواد کا مضبوط ہاتھ ٹکرایا۔ وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

"سچ مچ تمہارے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں۔ سندری۔"

"ہیں جی۔ خوب صورت ہاتھوں کی خوب صورتی بھاڑ میں بھی پڑ جاتی ہے۔ میرا سجا ہاتھ کھبے سے زیادہ بھاری ہے۔"

"اچھا کتنا بھاری ہے۔"

"یہ تو کھا کے پتا چلے گا۔" اس کا لہجہ ہنوز دھمکاتا ہوا تھا۔

"چلو جب تمہارے ہاتھ میرے ہاتھ میں آئیں گے تو پتا چل جائے گا۔" وہ شرارت سے کہہ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"سندری کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ وہ پاس پڑا ڈنڈا اٹھا کے اس کے پیچھے لپکی۔ "او فیدے میں تیرے ٹوٹے کر دیاں گی۔"

۞ ۞ ۞

فواد کی سرخ آلٹو۔ موڑ کاٹ کے نشاط منزل کے سامنے آکر رکی سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئی تھیں۔ گھر کے سامنے قاسو قصائی کھڑا بغدا لہرا رہا تھا۔ جبکہ سندری اس کے سامنے کھڑی کمر پر ہاتھ رکھے۔ کینہ توز چندھیائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی سودا لانے والی باسکٹ رکھی تھی۔

"او۔ تو یہ کیا گھر گھر جا کے کہتی پھر رہی ہے۔ میں گوشت خراب دیتا ہوں۔"

"او ہاں۔ جا بولا ہے۔ سنا تھا میں نے کسی سے۔"

"او کس سے سنا تھا۔ مجھے ناں بتا دے میں ٹوٹے کر دیاں گا۔" اس نے بغدا ہوا میں لہرایا۔

"کیوں ناں بتا دوں۔ جا نئیں بتاتی۔"

"او۔ سندری آگے تو نے اپنی گل کی نا۔ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

"او تجھ سے برا تے ہن وی کوئی نئیں اے۔"

"او سندری۔ دیکھ لوں گا میں تجھے۔"

"او چل او چل۔ کام کر اپنا۔ ایویں میرا امتحان خراب کر۔"

"بات بگڑنے لگی تھی۔ قاسو قصائی کا غضب اور سندری کی ڈھٹائی و دلیری عروج پر تھی۔ فواد نے

سندری کو پکارا تھا۔ آنکھ سے قاسو قصائی کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑبڑاتا چلا گیا تو سندری باسکٹ تھامے ان کے پاس چلی آئی۔

"کیوں بھئی سندری... کہاں چلیں؟"

"کچھ فروٹس اور سبزی لینی ہے جی... بابا جی نے کہا تھا۔ کہ آپ مجھے مارکیٹ تک لے جائیں گے۔"

"ہاں ہاں... کیوں نہیں آؤ بیٹھو۔"

وہ بیک ڈور کھول کر بیٹھنے لگی تو فواد نے ٹوکا۔

"ارے... آگے آکر بیٹھو... ایسے میں تمہارا ڈرائیور لگوں گا۔"

"میں ماسی ہوں... اور یہ نظر آتا ہے۔"

"انسان سب برابر ہوتے ہیں... تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے۔ اور تم تو ہمارے گھر کے فرد کی طرح ہو۔ چلو' چلو' جلدی' جلدی شاباش۔" اس نے پوری بے تکلفانہ و ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا۔ کہ اسے آگے بیٹھنا ہی پڑا... فرنٹ سیٹ سنبھل کر اسے لگاوٹ بھری نظروں سے تکا۔

"فیدا جی... آپ اتنے اچھے کیوں ہو...؟"

"میں اچھا ہوں... تبھی تو تم بھی مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔"

"اچھا جی... اچھی لگنے لگی ہوں؟ اچھی ہوں نہیں ؟"

"اچھی ہو... تبھی تو اچھی لگتی ہو... اور میرا خیال ہے کہ میں بھی تمہیں اچھا لگتا ہوں۔"

"آپ بھی نا جی... مجھے سچ مچ اچھے لگنے لگے ہو۔ فیدا جی۔" اس نے پلو مروڑتے ہوئے... مسکراتے شرماتے کہا تھا۔

"ہائے میں مرجاواں۔" سرخ آلٹو آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

بابا جی گھر میں داخل ہوتے ہی فواد کے کان میں گھسے تھے۔

"مجھے یہ سبزی والا' سندری کا مخبر لگتا ہے۔ اس نے سندری کے کان میں ایسا کیا کہا... کہ سندری نے اسے کھٹ پانچ سو کا نوٹ پکڑا دیا...؟"

"بابا جی... انسان کو اتنا جھوٹ نہیں بولنا چاہیے کہ وہ سچ کا ذائقہ ہی بھول جائے۔"

"یہ کس دانشور نے کہا ہے؟"

"وہی جو آپ کے سامنے کھڑا ہے۔"

"فواد... تمہارا خیال ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"میں سب سمجھتا ہوں۔ آپ اس لیے ماسی میں مین میکھ نکالتے ہیں کہ میں تنگ آکر اسے کام سے نکال دوں۔"

"مین میکھ...؟"

"ہاں... مین میکھ... نکتہ چینی... یعنی کہ فالٹس۔"

"فواد تم اس ماسی کی کچھ زیادہ ہی حمایت نہیں لینے لگے ہو۔"

"اگر ایسا ہے بھی... تو حرج ہی کیا ہے؟"

"کہیں تمہیں یہ ڈر تو نہیں کہ یہ ملازمہ تمہارے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔"

"ہاتھ سے اگر نکل بھی جائے تو کچن تو آپ کو ہی سنبھالنا پڑے گا نا بابا جی۔"

"نہ جانے کب آئے گا وہ دن... جب اس گھر کا چولہا چوکی تمہاری بیوی سنبھالے گی۔"

"او بابا جی... آپ بھول رہے ہیں۔ آپ کے بیٹے کو اس کی چندیا سمیت کون منظور کر رہا ہے۔ جب سے شادی دفتر میں نام لکھوایا ہے۔ چھیالیس رشتے مجھے ریجیکٹ کر چکے ہیں۔"

"تم سے ہزار بار کہا ہے۔ اس وگ سمیت شادی دفتر میں تصویر بھیجو پھر دیکھنا لڑکیوں کی لائن لگ جائے گی۔"

"اور جب میں وگ ہٹا کر بر دکھوے کے لیے پیش ہوں گا تو وہ ساری لائن چھٹ جائے گی۔ اور میری شادی کینسل۔"

"اف... ایسا تو نہ کہو فواد... تمہاری شادی کے لیے خواب تو میں نے بھی بڑے دیکھے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ ذرا اک دو مجھے بھی تو سنائیں۔" وہ ان کے اور قریب گھسا۔

"ایک تو یہ کہ میں تمہارے لیے لڑکی دیکھنے جاؤں گا تو خوب آؤ بھگت ہوگی۔ میں کسی نہ کسی بہانے اسے ریجیکٹ کر کے کسی اور گھر کی دعوت کا انتظار کروں گا۔"

"اور پھر جب آپ ہزار جگہ کی لڑکیاں ریجیکٹ کرنے کے بعد چھانٹ کر کوئی بہو لائیں گے تو پتا ہے کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا۔۔۔؟"

"آپ کی وہ من پسند۔۔۔ سلیکٹڈ بہو۔۔۔ ان سب ریجیکٹڈ لڑکیوں کی دل آزاری کا۔۔۔ آپ سے انتقام لے گی۔ ہاہاہا۔۔۔ اسے کہتے ہیں خدا کی مار جو لوگ بہوؤں کے ہاتھوں دکھ اٹھاتے ہیں۔ ان کی بدنصیبی ان کے اپنے ہاتھ کی کمائی ہوتی ہے۔"

"یوں نہ کہو فواد۔۔۔ تمہاری مرحومہ ماں کی روح تڑپ اٹھے گی۔۔۔"

"تو پھر آپ بھی سن لیں۔۔۔ بہو سلیکٹ کرنے کے معاملے میں آنکھیں بند کر کے کسی کو بھی اپنا لیں۔ چاہے۔۔۔!"

"چاہے۔۔۔؟"

"چاہے وہ سندری ہی کیوں نہ ہو۔۔۔" وہ کہہ کر بھاگ نکلا۔ اور پاپا جی کی تیوری اگر گرنے کی کامیاب اداکاری رہی۔

☆ ☆ ☆

اس دن سنڈے تھا۔۔۔ لاؤنج کی جھاڑ پونچھ کرتے۔۔۔ سندری نے فون کی بجتی بیل پر ریسیور اٹھالیا تھا۔۔۔ اگلے ہی پل اسے پتنگے لگ گئے۔

"او تجھے شرم نہیں آتی ہے؟ پرائے مردوں کو فون گھماتی ہے؟"

لاؤنج میں فراغت سے پیر پسارے۔۔۔ فواد نے اخبار کا کونا ہٹا کر دیکھا تھا۔

"او۔۔۔ میں تیری ماں لگتی ہوں۔۔۔ آئندہ ادھر فون نہیں کرنا ہاں۔"

"کس کا فون تھا سندری۔۔۔" اسے پوچھنا پڑا۔

"پتا نہیں جی۔۔۔ فیزی نام بتا رہی تھی۔۔۔ ہاں فائزہ۔"

"او سندری۔۔۔ وہ میری آفس کولیگ تھی۔" اس نے سر پیٹا۔

"کیا تھی جی۔۔۔؟"

"کولیگ۔۔۔ ساتھ کام کرتی ہے۔۔۔ اسے ضرور کوئی کام ہوگا۔"

"ہاں تو کام کی بات آفس میں کیا کرے نا۔۔۔ آپ نا جی۔۔۔ ایسی ویسی لڑکیوں کو گھاس نہ ڈالا کریں۔"

"کیوں۔۔۔ تمہیں کیا پرابلم ہے سندری۔۔۔؟"

"او جی۔۔۔ کوئی کڑی آپ سے بات کرے، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ جلیبی ہونے لگتی ہے۔"

"جلیبی نہیں۔۔۔ جیلسی۔"

"او ہاں جی۔۔۔ وہی۔۔۔ آپ نا ایویں کسی لڑکی سے بات نہ کیا کریں۔"

"اور کوئی لڑکی مجھے فون کرے اور میں اس کا جواب نہ دوں؟ میں تمہیں ایسا لگتا ہوں کیا؟"

"مجھے سب پتا ہے 'آپ کو نا جی۔۔۔ مجھ سے اتنا سا بھی پیار نہیں ہے۔'" اس نے سخت برا مانا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔۔۔ کیونکہ مجھے تو تم سے بہت سارا آآ آپیار ہے۔"

"ایک بات پوچھوں فیدا جی۔۔۔؟"

"تم سو باتیں پوچھو سندری۔۔۔"

"آپ کی نظر میں پیار کیا ہے۔۔۔؟"

"جو آنکھوں کو اچھا لگتا ہے۔ وہ دل میں اتر کر دل سے قریب ہو جاتا ہے۔ وہی اپنا ہوتا ہے۔ اسی سے پیار ہوتا ہے۔ اور پیار اپنا پن ہے۔"

"ہاں مگر کسی کو اپنا لینا محبت نہیں۔۔۔ کسی کو اپنا بنا لینا محبت ہے۔"

اور اس کے منہ سے اتنی گہری بات سن کر فواد چونک اٹھا تھا۔

"کبھی کبھی تم مجھے عجیب سی لگتی ہو۔۔۔ جیسے تم نے

خود پر کوئی ماسک چڑھا رکھا ہے... یا پھر... تم وہ نہیں ہو... جو نظر آتی ہو۔"

"او جی... آپ کو جو سمجھنا ہے سمجھا کریں۔" وہ فی الفور اپنے پرانے انداز میں لوٹ آئی۔ "مجھے ابھی بڑے کام پڑے ہیں۔"

"اچھا... اتنے مزے سے مجھ سے محبت کا اظہار کروالیا۔ اور اب تمہیں کام یاد آرہے ہیں؟" فواد نے اس کی کلائی پکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔

"او چھڈو جی... ہائے وے ربا... کوئی ویکھ نہ لے۔" وہ گھبرا گئی تھی۔

"سندری... تم واقعی اچھی ہو... بہت ہی اچھی۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

☼ ☼ ☼

سندری نے نہایت لاڈ، چاؤ اور دلار سے فواد کے لیے ناشتا کی ٹرے سجائی تھی... کچن سے نکل کر ڈائننگ لاؤنج سے گزرتے... درمیان میں صوفہ پر پیر پھیلائے... امجد صاحب نے ہاتھ بڑھا کر ٹرے سے انگور کا گچھا اٹھالیا تھا۔ سندری نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا... ٹرے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر ان کے ہاتھ سے گچھا واپس لیا اور ٹرے میں دوبارہ رکھ کر یہ جا وہ جا۔

فواد کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"او یار... یہ میرا گھر ہے میرا۔" ان کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا تھا وہ بھنا گئے۔

"آپ بھول رہے ہیں پاپا جی... آپ نے ہی تو کہا تھا۔ سندری اس گھر کی ایک فرد ہے۔"

"او یار... میں تنگ آگیا ہوں۔ اس چوہے بلی کے کھیل سے۔ میں اس سندری کی ٹکٹیں کرادوں گا۔"

"تو میں بھی سندری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔"

"میں اسے دوبارہ شہر آنے ہی نہیں دوں گا۔" پاپا جی اپنی ہی دھن میں تھے۔

"تو میں اس کے ساتھ گاؤں میں ہی رہ جاؤں گا۔" اس نے دوبدو کہا۔

"او یار... تم میرے بیٹے ہو کے اس سندری کی حمایت کررہے ہو؟" ہم نہیں خیال آہی گیا۔

"تو پھر تم بھی سن لو کہ اس گھر میں... میں رہوں گا یا سندری۔"

"پاپا جی... رات کے اس اندھیرے میں... آپ اکیلے کہاں جائیں گے؟" اس نے وحید مراد اسٹائل میں کہتے ہوئے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔

"کہیں بھی... لیکن اس گھر میں اب میں مر کر ہی واپس آؤں گا۔" وہ کہتے ہوئے منہ اٹھا کر باہر کی جانب چل دیے۔ فواد ہنس دیا کہ یہ گیدڑ بھبکیاں اب پرانی ہو چلی تھیں۔

"فیدا... لو فیدا جی... کتھے پھنس گئے ہو۔ واجاں مار مار کے میرا تے حلق سوکھ گیا۔"

سندری فواد کے کمرے سے پکار رہی تھی... وہ اگلے قدم میں وہیں تھا۔

"میں حاضر... آپ نے یاد کیا... میں حاضر۔ آپ نہ بھی یاد کریں تو میں حاضر..." اس نے لگاوٹ و شوق بھری نظروں سے چیختے چنگھاڑتے رنگ میں ملبوس... پراندہ جھلاتی... سندری کو تکا تھا۔

"اچھا تو آپ کو بتانا پڑے گا کہ میں کتنا یاد کرتی ہوں..." سندری کی آنکھیں بولنے لگیں۔

"تم تو وہی منگانے کے لیے بھی یاد کرسکتی ہو۔ کوئی خوب صورت لڑکی اگر یاد کرے تو..." اس نے چھیڑا اور وہ بدک اٹھی۔

"نا... تو کیا میں خوب صورت نہیں ہوں...؟"

"خوب صورت! اتنی کشش ہے تم میں جیسے زلزلے کا جھٹکا... سونامی کی لہر... یا پھر... یا پھر... نیلوفر..."

"ہیں جی... یہ نیلوفر کون ہے؟" کمر پر ہاتھ رکھ کر تپے ہوئے مشکوک انداز میں کہا۔

"نیلوفر کراچی کے ساحلوں تک آنے والی... ایک ایسی حسینہ تھی۔ جو اپنی جھلک دکھا کر دور کہیں گم ہو گئی۔ اور تم... تم تو گھر کی مرغی ہو نا... کڑی۔" اس

نے چڑایا۔

"اوفیدے... انسان بن... مجھے ککڑی بولتا ہے۔"

"ہاں... ککڑی... چل ککڑی۔" اس نے مزید چھیڑا پھر فواد آگے آگے... اور سندری پیچھے پیچھے۔

☼ ☼ ☼

فواد نے اپنی ساری الماری کھنگال ڈالی تھی۔ مگر اس کی مطلوبہ شرٹ مل کے نہیں دے رہی تھی۔

"اوپاپاجی... میری بلیو شرٹ نہیں مل رہی ہے۔"

"بلیو؟ اچھا وہ لائننگ والی... ہاں' وہ تو کل ہی سندری نے گلاس برنی والے کو دے کر ایک برنی لے لی ہے۔"

"کیا... میری نیو شرٹ... اوپاپاجی' آپ دیکھتے رہے۔ آپ نے روکا نہیں اسے۔"

"بھئی تم نے گھر کا سارا چارج اسے تھما دیا ہے۔ پھر میں کون ہوتا ہوں روکنے والا..." بے نیازی و تجاہل بھرا انداز۔

"میں سب سمجھتا ہوں... آپ یہ ساری حرکتیں اس لیے کر رہے ہیں کہ میں سندری کو نکال دوں۔"

"یہ سندری... اف... تم مانو یا نہ مانو... مجھے لگتا ہے... یہ انیم پیتی ہے۔"

"اچھا... آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے پاپاجی..."

"یار... یہ کسی بات کا سیدھا جواب ہی نہیں دیتی..."

"آپ بھول رہے ہیں پاپاجی... سیدھا جواب تو آپ بھی کسی بات کا نہیں دیتے... رات بھی میں نے دیکھا کہ آپ ٹول رہے تھے۔"

"کیا رہے تھے؟"

"ٹول رہے تھے... یعنی آگے پیچھے جھوم رہے تھے۔"

"یار... تم نے زبان بھی اس سندری جیسی استعمال کرنی شروع کر دی...؟"

"زیادہ باتیں نہ بنائیں پاپاجی... مجھے اپنی جیب چیک کرائیں... کہیں کوئی بوتل شوتل تو نہیں چھپا رکھی؟"

"او فواد... تم میری... اپنے باپ کی تلاشی لوگے؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے یار...؟"

"ہو تو آپ کو کچھ گیا ہے پاپاجی... آپ کو ہر سیدھی چیز الٹی نظر آنے لگی ہے۔"

"او فواد... تم مجھ پہ... اپنے باپ پر شک کر رہے ہو...؟"

"پاپاجی... شک تو مجھے پہلے تھا۔ اب تو مجھے یقین ہے۔"

"یار... تمہیں اپنے باپ پر بھروسا نہیں ہے...؟"

"ہاں نہیں ہے... یہ بھروسا آپ نے خود... اپنے ہاتھوں سے کھویا ہے پاپاجی۔"

"فواد..." شدت کرب سے اک چیخ مار کر وہ دھم سے صوفے پر اوندھے گر گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پاپاجی مجھے ہر وقت' ہر جگہ سندری ہی سندری نظر آنے لگی تھی۔"

"ہائیں پھر؟"

"پھر کیا؟"

کر دیا اظہار عشق ہم نے ٹیلی فون پر
لاکھ روپے کی بات تھی اور دو روپے میں ہو گئی

"یعنی تم اس کی... سندری کی محبت کا شکار ہو گئے؟"

"واہ... واٹ اے جینئس پاپاجی... اسی بات پہ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے۔"

"دیکھا... میرا شک درست نکلا نا... اس سندری نے تم پہ ڈورے ڈال کے تمہیں پھنسا ہی لیا نا..."

"تو یہ تو اس کی بدنصیبی ہے نا پاپاجی... خود ہی پچھتائے گی۔"

"اس دن تو تم کہہ رہے تھے کہ اگر سندری نے تم سے اظہار محبت کیا تو تم اسے جان سے مار ڈالو گے؟"

"جی ہاں... کیونکہ سندری سے اظہار محبت تو مجھے

کرتا تھا نا۔۔۔ اور وہ میں نے کر دیا۔"

"یہ لڑکی اتنی گہری ہے کہ کوئی اس کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"نا۔۔۔ تو مجھے اس کی تہہ تک پہنچنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ بھول گئے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ جو دل کو اچھا لگے آنکھیں بند کر کے اسے اپنا لو۔"

"تم کچھ بھی کہو۔۔۔ مگر سن لو فواد کہ تم ہرگز ہرگز اس سندری سے شادی نہیں کرو گے۔"

"تو کوئی بات نہیں۔۔۔ سندری مجھ سے شادی کر لے گی۔"

"اگر تم نے اس سندری سے شادی کا سوچا بھی تو میں پنکھے سے لٹک کر جان دے دوں گا۔۔۔ ہاں۔"

"پاپا جی۔۔۔ لوگ شادی کروانے کے لیے خودکشی کرتے ہیں۔۔۔ آپ شادی رکوانے کے لیے خودکشی کریں گے؟"

"تم کچھ بھی کہو یا کرو۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

"تو آپ بھی سن لیں پاپا جی۔۔۔ میری شادی ہو گی تو صرف اور صرف سندری سے۔۔۔ ورنہ نہیں ہو گی۔"

"فواد۔۔۔!" وہ بلبلائے تھے۔۔۔ اور فواد مسکراتا گنگناتا نکل گیا۔

لوٹتے سمے۔۔۔ فواد کا ٹکرا سندری سے ہوا تھا۔

"سندری تمہارے ان پراندوں کی کھیپ کب ختم ہو گی۔۔۔؟"

"نہیں جی۔۔۔ کیا ختم ہو گی؟"

"خدا کے واسطے سندری۔۔۔ تمہیں اس گھر کی بہو بننا ہے۔ کچھ تو خود کو پالش کرنے کی کوشش کرو۔"

"کیا مطلب؟"

"پلیز اپنے بالوں میں یہ من بھر تیل تھوپ کر پراندے کسنا چھوڑ دو۔۔۔ اتنے خوب صورت تمہارے بال ہیں۔۔۔ انہیں شیمپو کر کے کوئی اچھا سا اسٹائل دو۔۔۔ میں خود تمہیں کل پارلر لے کر چلوں گا۔۔۔ شاپنگ بھی کریں گے۔ خدا کے واسطے یہ زرد۔۔۔ نارنجی۔۔۔ اودے۔۔۔ نیلے۔۔۔ کپڑے۔۔۔ زری۔۔۔ نگینے اب دوبارہ نہ پہننا۔"

"او فیدا جی۔۔۔ آپ تو جی بڑا انسانیت۔۔۔ کردار۔۔۔ برابری سیرت و ریت کا ڈھول پیٹتے ہو۔۔۔ تو اب۔۔۔ کیا میرے بدلنے سے۔۔۔ میری اصلیت بدل جائے گی۔۔۔؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو سندری۔۔۔ مگر دیکھو۔۔۔ سوسائٹی کا بھی کچھ خیال کرنا پڑتا ہے نا۔۔۔ اب دیکھو۔۔۔ تمہارے گیٹ اپ کی وجہ سے کہیں تمہارا مذاق اڑایا جائے یہ بھی تو ٹھیک نہیں نا۔۔۔"

"کہتے تو آپ ٹھیک ہی ہو۔۔۔ پر فیدا جی۔۔۔"

"اوہو۔۔۔ جب مانتی ہو تو پھر بحث کیسی۔۔۔؟"

"ہاں جی۔۔۔ چھوڑو جی۔۔۔ مٹی پاؤ۔"

"چھوڑ دوں۔۔۔؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"ہاں جی۔۔۔ چھوڑ دو۔۔۔" وہ بے دھیانی میں تھی۔

"پکڑا کب تھا؟" وہ کہہ کر بھاگ نکلا۔۔۔ اور سندری اس کے پیچھے پیچھے۔

"او فیدے۔۔۔ میں تیرے ٹوٹے کر دیاں گی۔"

☼ ☼ ☼

پاپا جی کا خیال تھا کہ فواد کو سمجھا بجھا کر اس کا ارادہ بدل دیں گے۔ مگر نا!

"یار۔۔۔ اس سندری میں کوالٹی ہی کیا ہے۔۔۔ جو تم اسے لائف پارٹنر بنانے پر تل گئے ہو۔۔۔؟"

"او پاپا جی۔۔۔ کوالٹی تو آپ میں بھی کوئی نہیں ہے۔۔۔ آپ کو بھی تو آخر میں نے باپ بنا ہی رکھا ہے؟"

"اور بیٹا جی۔۔۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو۔۔۔ جیسے تم نے کسی گدھے کو باپ بنا رکھا ہے۔۔۔ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم اپنے ارادے سے باز نہ آئے تو اچھا نہیں ہو گا۔۔۔ ہاں۔"

"تو آپ بھی کان کھول کر سن لیں۔۔۔ میری شادی ہو گی تو صرف اور صرف سندری سے۔۔۔ ورنہ نہیں۔"

"خدا کو مانو یار۔۔۔ وہ ایک نوکرانی ہے۔"

"تو کیا نوکر انسان نہیں ہوتے یا ان کی شادیاں نہیں ہوتیں؟" باپ بیٹے کی تکرار پر سندری نے کان لگائے

تھے۔

"اوہو۔۔۔ مگر سندری سے ہی کیوں؟"

"مجھے اس سے محبت ہے یار۔۔۔"

"اگر وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے تو اسے آزماؤ۔۔۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟"

"اسے اپنی ٹنڈ دکھاؤ۔۔۔ وہ بھاگ جائے گی۔"

"پھر میں شادی کس سے کروں گا۔"

"تم اس کا انتظار کرنا۔۔۔ اگر وہ لوٹ آئے تو سمجھو تمہاری۔۔۔ اور نہ لوٹے تو سمجھو تمہاری تھی ہی نہیں۔"

"اور اگر وہ سچ مچ نہ لوٹی تو میری تو ایسی تیسی ہو جائے گی نا پاپا۔۔۔"

"پھر اس کے لیے کچھ اور سوچیں گے۔" انہوں نے ٹالا تو اس کی ٹون بدلی۔

"ویسے اس سندری میں دیہاتی ہونے کے علاوہ کوئی خامی؟"

"ہاں۔۔۔ بہت سی ہیں۔" وہ پرجوش ہو گئے "وہ ڈائننگ چیئر پر پیر رکھ کر۔۔۔ چائے میں پاپا ڈبو کے کھاتی ہے۔۔۔"

"آپ بھول رہے ہیں پاپا جی۔۔۔ کچھ عرصہ پہلے تک آپ خود بھی ایسے ہی ناشتا کرتے رہے ہیں۔"

"مگر مجھے انگریزی آتی ہے۔۔۔ اس سندری کو نہیں آتی۔"

"اگر آپ کو انگریزی آتی ہے۔ تو اس کی جگہ میں آپ سے تو شادی نہیں کر سکتا نا۔"

"فواد۔۔۔ اگر تم نے اس سندری سے شادی کی ضد نہیں چھوڑی تو۔۔۔!"

"تو۔۔۔؟"

"تو میں بھی شادی کر لوں گا۔"

"ہائیں۔۔۔ لیکن کس سے؟"

"اسی گھنٹی بجانے والی مس بلبل سے۔۔۔"

"ہاہ۔۔۔ ہاہ۔۔۔ یہ ایک ایسا لطیفہ ہے۔ جیسے کسی استاد نے کہا تھا کہ جو بچے غیر حاضر ہیں، وہ کھڑے ہو جائیں؟"

"فواد۔۔۔ اف خدایا۔۔۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟"

"یہ آپ ہی نے کہا تھا کہ ماسی کو بیوی بنتے کون سی دیر لگتی ہے۔"

"اوہو۔۔۔ اس وقت مجھے کیا پتا تھا کہ ماسی۔۔۔ عورت۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ عورت۔۔۔ بیوی۔۔۔ اوہو۔۔۔ ماسی۔۔۔ بھئی کیا مصیبت ہے۔۔۔ چلو ٹاس کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، مگر یاد رکھنا۔۔۔ ٹاس ہاروں کہ جیتوں۔۔۔ شادی تو میں نے سندری سے ہی کرنی ہے۔"

"اور تم بھی سن لو کہ ٹاس، سندری کے سامنے۔۔۔ بلکہ اسی کے ہاتھوں سے ہو گا۔"

"سندری۔۔۔ او سندری۔۔۔" اگلے ہی پل وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر تھی۔

"یہ سکہ پکڑو۔۔۔ اور ٹاس کرو۔" پاپا جی نے اسے سکہ تھمایا۔

"میں جی۔۔۔ پر کیوں جی۔۔۔؟"

"اوہو۔۔۔ باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ اور سکہ اچھالو۔" فواد نے کہا۔

"سندری نے سکہ اچھال کر مٹھی میں دبایا پھر ٹیبل پر الٹ دیا۔۔۔ پاپا جی نے آگے بڑھ کر چشمہ درست کیا۔ پھر سکہ دیکھ کر روتے لہجے میں فریاد کی۔

"فواد۔۔۔!"

"جی پاپا جی۔۔۔" وہ پرامید لہجے میں کہتا آگے بڑھا۔

"سندری کے والدین کو بلاؤ۔"

"یاہو۔۔۔"

☆ ☆ ☆

اس روز سندری کے والدین کی آمد متوقع تھی۔

"سوچتا ہوں۔ سندری کے والدین کی آمد پر انہیں کیا پروٹوکول دیا جائے؟"

"پاپا جی۔۔۔ یہ گاؤں کے لوگ بڑے سیدھے سادے اور معصوم ہوتے ہیں۔۔۔ یہ زیادہ ڈیمانڈنگ نہیں ہوتے۔"

"تمہیں نہیں پتا فواد۔۔۔ گاؤں کے لوگ ہی شہری بننے کی کوشش میں۔۔۔ اپنی چال بھول جاتے ہیں۔"

"پاپا جی۔۔۔ اب وہ آپ کے بیٹے کے سسرال والے ہیں۔ پلیز اس طرح تو ان کا ذکر نہ کریں۔۔۔ ذرا سوچیے اگر آپ گاؤں کے گنوار ہوتے۔۔۔ اور اس طرح آپ کا ذکر کیا جاتا تو۔۔۔؟"

امجد صاحب کی چشم شعور نے خود کو لمبے کرتے۔ دھوتی اور پگڑ باندھے دیکھا اور اگلے ہی پل وہ جھرجھری لے کر رہ گئے۔

"اسی بات پر ایک بار پھر۔۔۔ لیجیے پھر بجی مس بیل۔"

"او گاڈ۔۔۔ اس گھر میں جہاں۔۔۔ دیکھو گھنٹیاں، سیٹیاں۔"

"تو بجنے دیں پاپا جی۔" اس نے اخبار کھول لیا۔

"اوہ یار۔۔۔ مس بیل دینے والا تو صرف ایک بیل دے کے بھاگ جاتا ہے۔ جبکہ یہ گھنٹی تو بجے ہی چلی جا رہی ہے۔ دیکھ ہی لو فواد۔۔۔"

فواد کو ناچار اٹھنا پڑا۔۔۔ مگر یہ مس نہیں، رائٹ بیل تھی۔

اس نے گیٹ کے لینس نے آنکھیں گھما کر باہر جھانکا۔ مسٹر کے ساتھ مسز بھی تھیں۔

خدایا۔۔۔ کیا زمانہ آگیا۔۔۔ ہم مس بیلز کو ہی مس بیل کا کام سمجھتے رہے "اچھا تو یہ آپ ہیں، جو ہمارے گھر کے دروازے پر مس بیل دے کے جاتے ہیں۔ کہیے، کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی۔ سمجھ گیا۔ آپ کو ضرور کسی این جی او یا فاؤنڈیشن کے لیے ڈونیشن درکار ہو گا۔ لیکن پلیز اس وقت ہمیں کسی اور کا انتظار ہے۔"

"جی۔۔۔ ہمیں سارہ سے ملنا ہے۔" انہوں نے بمشکل فواد کو بریکیں لگائیں۔

"سارہ سے؟" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ "لیکن یہاں تو کوئی سارہ نہیں رہتی۔"

"او ہو۔۔۔ ارے بھئی بھول گئیں۔۔۔ یہ لوگ سارہ کو سندری کہتے ہیں۔" آپس میں بلند سرگوشی کی تو فواد

سندری کے نام پر اچھل پڑا۔

"اچھا۔ تو آپ سندری کے والدین ہیں؟ بھئی کمال ہے۔ تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔ آیئے آیئے۔ اندر آیئے۔" وہ انہیں اپنی سعیت میں لاؤنج تک لے آیا۔

"پاپا جی۔ یہ سندری کے والدین ہیں۔"

"سندری کے والدین! انہیں بھی حیرت کا جھٹکا لگا۔" سرتاپا دونوں کا جائزہ لیا۔ بیش قیمت نفیس سی ساڑھی میں۔ ماڈرن سی خاتون اور سوٹڈ بوٹڈ موصوف۔ سر پر کیپ۔ ہاتھ میں سگار۔

"نہیں نہیں۔ یہ سندری کے والدین نہیں ہو سکتے۔"

"کیوں سندری کے والدین پر کوئی لیبل یا ٹیگ لگا ہو گا۔ یا ان کے چہروں پر لکھا ہے کہ یہ وہ نہیں ہیں۔ ؟"

"شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ سندری جیسی ان پڑھ۔ دیہاتی لڑکی کے والدین اتنے اپ ٹو ڈیٹ کیسے ہیں۔" انہوں نے سگار کا کش لیا۔ فواد اور پاپا جی نے اک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر ایک ساتھ کہا۔

"جی ہاں۔ بالکل یہی بات ہے۔"

"اس کا جواب میں آپ کو دیتی ہوں۔" سندری لاؤنج میں داخل ہوئی تو۔ پاپا جی کا منہ کھلا رہ گیا۔ خوب صورت ہیئر اسٹائل میں۔ ماڈلک کے ساتھ۔ وہ صاف شفاف لہجے میں بولتی وارد ہوئی تھی۔

"میں سارہ ہوں۔ جسے آپ نے سندری کا نام دیا تھا۔"

"بھئی۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ یہ یہ سب کیا ہے؟" امجد صاحب الجھ سے گئے تھے۔

"بھئی بات صاف ہے۔ سارہ اک بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ پھر سارہ کو ماسی بننے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہاں جی۔" فواد نے کہا۔

"اس کا جواب میں آپ کو دیتا ہوں۔ سارہ کی شادی کے لیے ہم نے اسی شادی دفتر سے رجوع کیا تھا۔ جہاں فواد کے لیے رجسٹریشن کروائی گئی تھی۔ فواد کا رشتہ ہمارے حسب منشا ہی تھا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اک مخلص سچا اور کھرا لڑکا ہے۔ اور شادی کے معاملے میں صرف تقدیر یا انسانیت کو اہمیت دیتا ہے۔ شاید اسی لیے اپنی فارغ البالی کا نقص چھپانے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ تو سارہ یا سندری اس کے کھرے پن کو آزمانے کے لیے اس گھر میں ماسی بن کر آئی تھی۔"

"فواد۔ کی سوچ بالکل درست ہے۔ شادی کے لیے انسان کا معیار۔ اسٹیٹس۔ خوب صورتی یہ وہ۔" اس بار سارہ نے کہا تھا "نہیں آ کر انسان مات کھاتا ہے اور الزام دیتا ہے قسمت کو جبکہ خطاکار تو وہ خود ہے۔ زمانہ ایسا ہے کہ لوگ ظاہریت پر مرتے ہیں۔ اور ظاہریت پر مرنے والے مصنوعی لوگ۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی تھی۔ "کبھی محبت کر نہیں سکتے۔"

"اور جو محبت کر نہیں سکتے۔ وہ محبت پا نہیں سکتے۔" یہ جملا سارہ کی امی کی طرف سے تھا۔ یہی ہماری اور سارہ کی سوچ تھی۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ۔ آپ اس امتحان میں کامیاب رہے ہیں۔ بلاشبہ فواد اک کھرا مخلص لڑکا ہے۔ جس سے رشتہ جوڑ کر۔ سارہ یقیناً ہمیشہ خوش۔ شاد و آباد رہے گی۔"

"تو پھر کر لوں بات پکی۔" امجد صاحب مطمئن ہو کر مسکرائے تھے۔

"اجی۔ پکی اور پوچھ پوچھ۔" سارہ کے والد نے کہا۔

"یاہو۔ فواد فضا میں اچھلا تھا۔

☼ ☼

نادیہ احمد

حاصلِ زیست

اندھیرا بہت تھا اور چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بڑے سے میدان میں حشر بپا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں کوئی کسی کا مددگار تھا' نہ پرسان حال۔ لوگ وحشت کے عالم میں ایک دوسرے کو دھکیلتے کچلتے' خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس جم غفیر میں گھبرائی ہوئی پریشان کھڑی تھی۔ اچانک اس کی نظر اپنے وجود پہ پڑی جو گندگی سے لتھڑا ہوا تھا' اسے خود سے گھن آرہی تھی۔ وہ پلیدی اس کے سارے اعضا کو بدبودار کر رہی تھی۔ یک دم اس نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ دیکھا' جس کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے تھے۔ وہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے' ان کا رخ اس آگ کے بھڑکتے الاؤ کی طرف تھا۔ وہ چیخ رہی تھی' چلا رہی تھی' لیکن کوئی اس کی التجا نہیں سن رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اس بھڑکتی آگ میں دھکیلتے ایک مضبوط ہاتھ نے اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے اس کا بدن کانپ رہا تھا' وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ سائڈ لیمپ کو آن کر کے اس نے یہ تسلی کی کہ اس وقت اپنے کمرے میں ہی ہے۔ کمرے میں روشنی ہوئی تو اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں پہ گئی۔ وہ صاف تھے' لیکن اسے کسی نادیدہ غلاظت سے خود سے گھن آرہی تھی۔ اسی پل فضاؤں میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی' قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آرہی تھی۔ وہ سر جھکائے اذان کی آواز سنتی رہی اور پھر بستر سے اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ رگڑ رگڑ کر اپنا ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اس نے نہ دکھائی دینے والی نجاست کو دھونے کی کوشش کی۔ اچھی طرح وضو کر کے وہ باہر نکلی اور جانماز بچھا کر نماز فجر کی نیت باندھی۔

☼ ☼ ☼

"امی عائدہ کو اپنے پاس ہی رکھ لیں' میں پہلے ہی آپریشن کی وجہ سے بہت کمزوری محسوس کر رہی ہوں' اوپر سے شیراز اور سہیل کی دیکھ بھال اور اسکول کی ذمہ داریاں بھی تو مجھ اکیلی کو ہی دیکھنی ہیں۔"

نویرہ نے تین ہفتے کی بچی کو رابعہ بیگم کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پہ دنیا جہان کی اکتاہٹ تھی۔ یوں بھی وہ اس غیر متوقع حمل سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھی اور رہی سہی کسر عائدہ کی پیدائش پہ ہونے والے آپریشن نے پوری کر دی تھی۔ نو مہینے جس عذاب میں گزرے تھے اس کے بعد اس آپریشن نے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔ اسے کہاں خواہش تھی دو بیٹوں کے بعد تیسری اولاد کی۔ رابعہ بیگم کے ماتھے پہ چند سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

"عقل تو ٹھکانے ہے تمہاری جو ایسی باتیں کر رہی ہو۔ چند دنوں کی بات ہے' پھر تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی' خیر سے خود سنبھالنا اپنی بچی کو۔" وہ بیٹی کے آپریشن کا سن کر بھاگی دوڑی آئی تھیں اور اب اتنے دن سے نویرہ کے پاس ہی تھیں۔ بیٹی کے آرام کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے پچھلے تین ہفتے سے عائدہ کو سنبھالا ہوا تھا'

لیکن کل وہ واپس کراچی جارہی تھیں۔ گھر تو خاور کی بیوی نے اچھے طرح سے سنبھالا ہوا تھا، مگر ریاض صاحب کے فون پہ فون آرہے تھے۔ انہیں واپس جانا ہی تھا۔ نوریہ کی بات نے انہیں حیران کردیا تھا۔

"امی پلیز میری مشکل کو سمجھیں، مجھے عادت نہیں رہ گئی چھوٹے بچے سنبھالنے کی اور یوں بھی آپ کو پتا ہے مجھے اب مزید اولاد کی خواہش نہیں تھی، یہ تو پتا نہیں کیسے بے احتیاطی ہوگئی۔" رابعہ بیگم کو اس کی بات پہ غصہ آیا تھا۔

"اللہ کا خوف کر نوریہ، کیسی ناشکری کی باتیں کررہی ہے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمت۔ یہ کوئی یوں کفر بکتا ہے۔" نوریہ نے ماں کی بات سن کر پہلو بدلا۔

"آفاق میاں کو کیا کہوگی؟ وہ جانے دیں گے یوں اپنی اولاد کو میرے ساتھ۔" بیٹی کی اتری صورت دیکھ کر اچانک انہیں خیال آیا۔ اب تک اس پہلو پہ تو سوچا ہی نہیں تھا۔

"آفاق کو پہلے دو بچوں کی پروا ہے جو اس تیسری کی ہوگی۔ ان کا تو سارا وقت ان کی پہلی بیوی کا ہے۔ اوڑھنا بچھونا وہی تو ہے ان کا کاروبار... میری سوتن، میرا نمبر تو بعد میں آتا ہے اور اولاد اس کے بھی بعد... ذرا پوچھ کہ وہ تو یہ ہی کہنے کو ملتا ہے دولت کے ڈھیر پہ بٹھا رکھا ہے، پھر بھی تمہارے شکوے نہیں ختم ہوتے۔ اب بھی دیکھ لیں ایک بار بھی اس کو گود میں نہیں اٹھایا۔ کھڑے کھڑے آئے تھے اسپتال اور بس یہ جا وہ جا۔" نوریہ جل کر بولی۔

اسے آفاق سے شادی کے ابتدائی دنوں سے لے کر آج تک یہ ہی گلہ تھا کہ وہ اپنی کاروباری مصروفیات میں اس کو بالکل فراموش کردیتے تھے۔ اللہ کا دیا سب تھا اس کے پاس، لیکن کچھ نہیں تھا تو شوہر کی توجہ۔ دنیا رشک کرتی تھی اس کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مگر نوریہ کا دل مطمئن نہیں تھا۔ دو بچوں کی پیدائش نے جہاں اس کا رنگ و روپ ماند کردیا تھے، وہاں آفاق کی بے توجہی کا قلق بھی کچھ کم نہیں تھا اور یہ اس کے دل کا روگ بن گیا تھا۔ وہ ہر وقت جلی کٹی رہتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ آفاق کوئی بھنورا صفت تھے، وہ مضبوط کردار کا مالک تھے، بس ان کی ترجیحات مختلف تھیں۔ وہ نظریہ ضرورت پہ یقین رکھتا تھے۔ اپنے حساب سے وہ دولت کما کر اپنی فیملی کی تمام ضروریات پوری کررہے تھے اور بہت احسن انداز میں پوری کررہے تھے، پھر انہیں ان چاؤ چونچلوں کی کیا ضرورت تھی۔

"پھر وہی ناشکری کی باتیں۔ کبھی اپنے سے نیچے والوں کو بھی دیکھ لیا کرو۔" رابعہ بیگم جل کر بولیں۔ انہیں بیٹی کی یہ ناشکری زہر لگتی تھی۔ نہ لمبی چوڑی سسرال، نہ پیسے کی کمی۔ اس پر اپنی پیاری اولاد۔ خاوند نے بھی بلاوجہ روک ٹوک نہ کی تھی۔ پھر بھی نوریہ کے مزاج برہم رہتے تھے۔

"میں آپ کو ہر مہینے اس کا خرچا باقاعدگی سے بھجوا دیا کروں گی۔" نوریہ ایک بار پھر اسی بات پہ آچکی تھی۔ اس نے ماں کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"چلو ہٹو، اب کیا میں تمہارے پیسے کی محتاج ہوں کہ اس معصوم کے اخراجات بھی نہ اٹھا پاؤں گی۔" رابعہ بیگم نے ہاتھ جھٹکا۔ اسی اثنا میں عائدہ کے رونے کی آواز آئی۔

"سنبھالو اسے، بچی جاگ گئی ہے۔" انہوں نے اسے نوریہ کو سونپنا چاہا، مگر اسے کہاں پروا تھی۔ بیڈ پہ لیٹ کر کروٹ بدل لی۔ رابعہ بیگم کو تو آگ ہی لگ گئی۔

"اللہ جانے اس معصوم کے ساتھ کیا کرے گی یہ۔ میں ہی لے جاتی ہوں۔" وہ غصے سے بڑبڑائیں۔ نوریہ کی ہنسی نکل گئی۔ عائدہ کو سینے سے لگائے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ارے یہ تم نے بہت اچھا کیا اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ نعمان اور فریحہ تو بڑے ہوگئے ہیں، اب ہم اس چھوٹی سی گڑیا سے کھیلیں گے۔" رابعہ بیگم کی گود سے عائدہ کو لے کر ریاض صاحب نے اس کے ننھے ہاتھوں کو چوما۔ وہ آتے ساتھ ہی ساری بات ان کے

گوش گزار کرچکی تھیں، انہیں نویرہ کی سنگ دلی پہ غصہ تھا۔ ریاض صاحب نے ان کا موڈ بدلنے کی کوشش کی۔ عجیب تو انہیں بھی لگا تھا، مگر وہ اس موضوع پہ مزید کوئی بات کرکے ان کا غصہ بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔

"مجھے لگ رہا ہے ثمینہ کو میرا عائدہ کو یہاں لانا اچھا نہیں لگا۔" انہیں بہو کا بگڑتا منہ نظر آگیا تھا۔

"تو کون سا تم اسے بہو کے سپرد کررہی ہو۔ ہم دونوں ہیں نا اس گڑیا کا خیال رکھنے کے لیے۔" ریاض صاحب اس کی من موہنی صورت پہ فریفتہ ہورہے تھے۔ رابعہ بیگم کو انہوں نے خوب تسلی دلائی تھی۔ وہ قدرے مطمئن ہوگئی تھیں۔ عائدہ کے اخراجات ان کے منع کرنے کے باوجود نویرہ ہر ماہ باقاعدگی سے بھیجتی تھی، اس پر نانا، نانی اس کا دل و جان سے خیال رکھتے تھے۔ بچی کی صحت اور صورت دونوں ہی سب کی توجہ کھینچ لیتی تھی۔

"آنٹی اسے میں اپنے گھر لے جاؤں، تھوڑی دیر کے لیے۔ کچھ دیر تک چھوڑ جاؤں گی۔" چھ ماہ کی عائدہ کو گود میں اٹھائے پڑوس کی سعجیلہ نہال ہورہی تھی۔ وہ ان کے برابر والے گھر میں رہتی تھی، دونوں گھروں کا ملنا ملانا تھا۔ وہ نویں جماعت میں تھی اور ابھی کچھ دیر پہلے رابعہ بیگم کے لیے گھر نیاز کی بریانی لے کر آئی تھی۔ عائدہ کو ان کی گود میں دیکھ کر وہ بہت شوق سے اس کے متعلق پوچھنے لگی تھی اور پھر اس نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کی فرمائش کردی۔ رابعہ بیگم اس عمر میں بھی خاصی چاق و چوبند اور حوصلے والی خاتون تھیں، پھر بھی چھوٹی بچی کو دن رات سنبھالنا انہیں ہلکان کردیتا تھا۔ انہوں نے بخوشی اسے اجازت دے دی تھی۔ اچھا ہے وہ دو گھڑی کمر سیدھی کرلیں گی۔

اور پھر یہ جیسے روز کا معمول ہوگیا تھا۔ سعجیلہ شام میں روزانہ ایک گھنٹے کے لیے عائدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ عائدہ بھی اس سے مانوس ہوگئی تھی، نا صرف اس سے بلکہ ان کے گھر کے ہر فرد سے۔ اب

اگر کسی دن، کسی وجہ سے وہ ان کے گھر نہ جاتی تو سب گھر والے اسے مس کرتے تھے۔ خاص طور پہ سعجیلہ کا بھتیجا جو اس سے عمر میں چار سال بڑا تھا۔ وقت کے ساتھ دونوں کی خوب دوستی ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے پچھلے پہر اس نے کمپیوٹر آن کیا۔ گھر کے سب افراد اس وقت تک اپنی آدھی نیند پوری کرچکے تھے، سوائے اس کے، جس کے دن کی شروعات ہی دوپہر کو ہوتی تھی۔ پہلے تو دو گھنٹے موبائل فون پہ گپ شپ میں گزرے تھے اور اب بارہ بجے اس نے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا۔ اس کی ان ہی عادتوں کی وجہ سے اس کو سب ناپسند کرتے تھے، مگر اس نے کب کسی کی پروا کی تھی۔ بڑوں کی نصیحتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا۔ جہاں کسی نے کچھ کہا، چار جواب منہ پہ مارے اور خود کو کمرے میں بند کرلیا۔ ماں کو ہی منانا پڑتا۔ معافی تلافی کی جاتی، تب کہیں جاکر

کھانے کا لقمہ منہ میں جاتا۔

پہلے تو خیر تھی' سب اپنے ہی تھے' لیکن اب تو آئے دن گھر میدان جنگ بنا رہتا تھا' جب سے گھر میں بہو بیگم کی آمد ہوئی تھی' کوئی نا کوئی معرکہ ہو ہی جاتا تھا۔ وہ کون سی بے زبان تھی' چار دن تو لحاظ میں کچھ نہیں بولی' لیکن آخر انسان تھی۔ صبر ختم ہو گیا اور ایک دن ساری کسر پوری کر دی۔ بس اب تو کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جو دونوں کی لڑائی نہ ہوتی' اس پر بھائی بھی اب تو اپنی بیگم کا ہی ساتھ دیتے تھے' البتہ مما اور پاپا اس معاملے میں زیادہ تر خاموش رہتے تھے۔ یوں تو کوئی ان کی سنتا بھی نہیں تھا' لیکن وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ اگر انہوں نے کسی ایک کا بھی ساتھ دیا تو دوسرے کی کبھی یا ختم ہونے والی بدگمانی کا آغاز ہو جائے گا اور وہ تو تھی ہی سدا کی بدگمان۔ اگر اس کے مقابلے میں کوئی سنبل بھابھی کی سائڈ لیتا تو وہ کہرام مچاتی کہ سب یاد رکھتے۔

"ہیلو۔۔۔ کہاں تھی اتنی دیر سے۔۔۔" اس نے ابھی فیس بک پہ لاگ ان کیا ہی تھا کہ کھٹ سے میسج آیا۔ ایک شوخ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آئی۔

"فرینڈ سے بات کر رہی تھی۔" اس نے لکھا اور اگلے میسج کا انتظار کرنے لگی۔

"میں کب سے انتظار کر رہا تھا اور تم فرینڈ سے گپیں لگا رہی تھی۔" اداسی بھری شکل ٹیکسٹ کے ساتھ ابھری۔ وہ اس کے بے قراری کو انجوائے کر رہی تھی۔

"کیوں۔۔۔" سوال مختصر تھا' ساتھ میں شرارتی شکل۔ اسے پتا تھا وہ تپ جائے گا' لیکن اسے تو تپانے میں مزا آتا تھا۔

"کیوں کا کیا مطلب۔۔۔ (حیران شکل) تم نہیں جانتی میں کیوں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔" (آنسو) اندھیرے کمرے میں اس کا چہرہ چمکا۔

"بھول گئی۔۔۔ ذرا بتاؤ تو۔۔۔" وہ شوخ ہوئی۔

"کیونکہ تم میری جان ہو اور میں تم سے۔۔۔ بہت بہت بہت محبت کرتا ہوں اور۔۔۔" (لال رنگ کا دل)

"اور۔۔۔" وہ گلابی ہو رہی تھی۔

"اور یہ کہ بس اب اور انتظار نہیں ہوتا ہے۔ جلد ملنے کی کچھ تدبیر کرو' پلیز۔۔۔" اسے ہنسی آئی۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟" وہ اسکرین سے تھوڑا نزدیک ہو گئی تھی۔ دل کی دھڑکن یک دم تیز ہو رہی تھی۔

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں' تم سے جھوٹ کہہ سکتا ہوں بھلا۔" اپنے ان باکس میں چمکتے دو تین دوسری لڑکیوں کے پیغامات کو جلدی جلدی پڑھ کر اس نے اسے جواب لکھا۔

اس انٹرنیٹ کا یہ ہی تو کمال ہے' دوسری طرف آپ بھلے محفل میں ہوں' موج مستی ہلا گلا کر رہے ہوں اور دوسرے کو اپنی تنہائی کا رونا سنا سکتے ہیں۔ دس لڑکیوں سے ایک وقت میں باتیں کر رہے ہوں۔۔۔ کسی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ آپ کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ یہ سوشل میڈیا کی دنیا بے وقوفوں کی جنت ہے۔ اس نگری میں شکر خورے کو شکر ملتی ہے اور بہت سے مجنوں' فرہاد' رانجھے اپنی ان گنت لیلیٰ' شیریں اور ہیروں کے ساتھ عشق عاشقی کی بیلوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔ خیر اور شر تو دنیا میں ساتھ ساتھ ہے اور یہ آپ کی چوائس ہے کہ آپ شر کو چنتے ہیں یا خیر کو' مگر اکثر و بیشتر نا سمجھ اور جذباتی لوگ اپنی ناعاقبت اندیشی کے باعث شر کا انتخاب کرتے ہیں اور ایسی ہی ایک بے وقوف لیلیٰ' وہ بھی تھی جس نے خود کو حقیقی دنیا سے کوسوں دور رکھا ہوا تھا۔ جس کا عقل و خرد سے دور دور کا واسطہ نہیں تھا اور جو اپنی فرسٹریشن اور کم مائیگی کو اس مصنوعی دنیا میں کم کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نگری میں بہت سے دیوداس اور دیوداسیاں جذباتیت کو محبت کا نام دے کر بے وقوف بن رہے ہیں اور بے وقوف بنا رہے ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے اس نے بھی حقیقی دنیا سے فرار کی کوشش میں خود کو یہاں گم کیا ہوا تھا۔ حقیقت بہت تلخ تھی' چبھتی ہوئی اور دل کو کھانے والی۔ سکون یہاں تھا' وہ لوگ جنہیں وہ نہ نام سے جانتی تھی نہ

شکل سے مگر وہ سب اس کے دوست تھے۔ گھنٹوں ان سے بے مقصد چیٹ کر کے، جھوٹے اظہار محبت سن کر وہ خوش ہوتی تھی۔ راتوں کو جاگ کر گھر والوں سے چھپ کر غیر محرم سے عشقیہ باتیں کرنا آج کل اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ جیسے کسی کو نشے کی لت لگ جاتی ہے، بالکل اسی طرح اسے اس گناہ کی لت لگ چکی تھی اور پھر سارا دن وہ اس نشے کے خمار میں رہتی۔ کچھ دیر حیدر سے مزید عشق و محبت کی باتیں کر کے اس نے لاگ آف کر دیا تھا۔ حیدر اس کا واحد فیس بک فرینڈ نہیں تھا، بلکہ اس کے دوستوں کی فہرست کافی طویل تھی، لڑکوں کا نام بدنام ہے، وہ خود بہت بڑی فلرٹ تھی۔ کسی ایک لڑکے سے دل لگی کرتی اور پھر جب اس سے بور ہو جاتی تو اسے بلاک کر دیتی۔

آج کل اس کا زیادہ وقت حیدر سے باتیں کرنے میں گزرتا تھا۔ اسے وہ اچھا لگنے لگا تھا، کیونکہ وہ اظہار محبت بہت کھل کر کرتا تھا، ایسی باتیں جو لڑکیوں کے لیے باعث کشش ہوتی ہیں، اسے ان میں خاصا عبور تھا۔ وہ اس سے ملی نہیں تھی، لیکن دونوں نے ایک دوسرے کی تصویر دیکھی ہوئی تھی۔ وہ خاصا گڈ لکنگ تھا اور وہ بھی کچھ کچھ سیریس ہو رہی تھی۔ صبح کے چار بج رہے تھے اور اسے ہلکی ہلکی نیند آ رہی تھی۔ اس نے جماہی لیتے ہوئے کمپیوٹر بند کیا اور نرم گرم بستر پہ لیٹ گئی۔ حیدر کی رومانٹک باتوں کو سوچتے ہوئے اس کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بہت دیر تک بستر پہ کروٹیں بدلنے کے بعد وہ نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے اپنے نئے تراشیدہ بالوں کو برش کیا اور خود پہ ایک بھرپور نظر ڈالتا کمرے سے باہر نکل آیا۔ ڈائننگ ٹیبل پہ ملازم پہلے ہی ناشتا سرو کر چکا تھا، اسے دیکھ کر وہ فوراً باورچی خانے سے بھاپ اڑاتی چائے کا مگ بھی لے آیا تھا۔ اس نے ہلکی سی مسکراہٹ اور

شکریہ کے ساتھ گرما گرم چائے کا مگ لبوں سے لگا لیا۔

وہ چائے اور کافی بہت گرم پیتا تھا۔ عجلت میں مختصر سا ناشتا کرنے کے بعد اس کا رخ اب سامنے والے کمرے کی طرف تھا۔

پچھلے چار سال سے یہ بھی اس کے معمول کا حصہ تھا کہ وہ گھر سے نکلنے سے پہلے اور گھر آنے کے بعد لازمی چند منٹ اس کمرے میں گزارتا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا میل نرس چاق و چوبند انداز میں اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ بڑے سے بیڈ پہ پڑے فالج زدہ وجود کے اداس چہرے پہ اسے دیکھ کر مسکراہٹ آئی تھی۔ سلام کرنے کے بعد وہ بیڈ کے ایک کونے میں خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کے سپاٹ چہرے پہ کوئی بھی تاثر نہیں تھا۔ نرس اسے ہمیشہ کی طرح مریض کی دن رات کی روٹین بتا رہا تھا۔ نذیر کو ان کی طبیعت میں آج بھی کوئی بہتری نظر نہیں آئی تھی، لیکن نرس وہی معمول کی تسلی آمیز باتیں کر رہا تھا جو وہ پچھلے چار سال سے سن رہا تھا۔ چار سال پہلے جب وہ انہیں اپنے پاس لایا تھا اس وقت سے آج تک وہ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے سوا کچھ نہیں بولے تھے۔ ان کا بایاں حصہ مفلوج ہو چکا تھا اور کھانے پینے سے لے کر اٹھنے بیٹھنے یہاں تک کہ چلنے جلنے کے لیے بھی انہیں مددگار کی ضرورت تھی۔ ٹھیک پانچ منٹ تک وہ چپ چاپ ان کے بیڈ کے پاس بیٹھا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ نرس اب خاموش ہو چکا تھا۔

اس کے پاس آج بھی ان سے کہنے کے لیے کوئی لفظ نہ تھا، ماضی کے بہت سے دکھ انہیں دیکھ کر پھر سے تازہ ہو جاتے تھے مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دن میں دوبار اس کرب سے گزرنا پڑتا تھا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح نرس کو کچھ ہدایات کی تھیں اور ان کے دوائیوں کے اسٹاک کے متعلق پوچھا تھا۔ گھر کے باہر وردی میں ملبوس ڈرائیور جیپ اسٹارٹ کیے کھڑا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکلا، سیکورٹی گارڈ نے اسے دیکھ کر سیلوٹ مارا، جیسے ہی وہ جیپ کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھا، مستعد ڈرائیور نے گاڑی چلا دی تھی۔

☆☆☆

رات کو دیر سے سوئی تھی، تو اٹھنا بھی اسی حساب سے ہوا تھا، یوں بھی جب سے کالج سے چھٹیاں ہوئی تھیں اس کے لیے رات اور دن کا فرق ختم ہو گیا تھا۔

"ناشتا۔" بغیر سلام دعا کے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے کچن میں کھڑے لوگوں سے کہا۔ وہاں ملازمہ کے ساتھ اس وقت سنبل بھی تھی جو دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگی تھی۔

"اٹھ گئی مہارانی۔ بارہ بج رہے ہیں، یہاں دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا ہے اور انہیں اب ناشتا چاہیے۔" سنبل نے کی تو سرگوشی تھی، مگر اس کے کان سنبل کی طرف تھے۔ ملازمہ ہنڈیا میں منہ دیے خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ وہ ان باتوں کی عادی تھی۔

"تو آپ کو کیا اعتراض ہے، یہ میرے باپ کا گھر ہے، میں جب مرضی سو کر اٹھوں۔ اپنے کام سے کام رکھیں۔" وہ تپ کر بولی۔

"اور صغراں تم۔" اس نے ملازمہ کو مخاطب کیا۔

"چھوڑو یہ سب اور میرا ناشتا بناؤ پہلے۔" انگلی کے اشارے سے اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ صغراں بے چاری نے جلدی سے چولہے سے پتیلی اتاری اور فرائنگ پین رکھا۔

"بات کیسے کرتی ہو تم۔ تمیز نہیں تمہیں، ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتی ہو۔ اب وہ کھانا بنانا چھوڑ کر تمہیں ناشتا بنا کر دے۔ وقت پہ کیوں نہیں اٹھتی ہو۔" سنبل آج اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ جواب میں اس کی زبان بھی انگارے اگلنے والی تھی۔

"ہاں نہیں ہے تمیز۔ آپ ہیں نا تمیز والی۔ آئندہ میرے منہ مت لگنا اور ہاں جا کر یہ بھی اپنے اس زن مرید میاں کے کان میں ڈال دینا۔ ڈرتی نہیں ہوں میں کسی سے۔" سنبل کی عادت تھی وہ روزمرہ کی ہر چھوٹی بڑی بات جب تک میاں کو بتا نہ دیتی تھی اس کا

کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ خاموش رہتا تھا لیکن اب وہ بیوی کی ہمدردی میں بہن کو خوب سناتا تھا' یہاں تک کہ ایک بار تو اس کی باتوں پہ اتنا مشتعل ہوا کہ ہاتھ بھی اٹھالیا' وہ تو ماں نے درمیان میں آکر معاملہ رفع دفع کیا۔

☼ ☼ ☼

"سر آپ نے یہ فائل منگوائی تھی۔" اس کے اسسٹنٹ نے اس کی مطلوبہ فائل میز پہ رکھتے ہوئے کرسی سنبھالی۔ وہ جو اپنے سامنے پڑی فائل کو بہت انہماک سے پڑھ رہا تھا' اس کی بات سن کر چونکا۔

"ہاں۔ آں۔" سامنے پڑی فائل کو بند کرتے ہوئے اس نے میز پہ رکھی فائل کھولی۔ پہلے صفحے پہ نظر پڑتے ہی اس کی چوڑی پیشانی پہ بل نمودار ہوئے' اگلا صفحہ پلٹنے تک اس کے چہرے پہ اشتعال واضح تھا۔ چند منٹ خاموشی سے ان صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے غصے سے فائل بند کی۔ ہونٹ بھینچتے ہوئے اس نے سامنے بیٹھے اپنے اسسٹنٹ کو دیکھا' جو الرٹ بیٹھا اس کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔

"کل کی تیاری رکھنا' اس معاملے کو میں خود ہینڈل کروں گا اور خیال رہے کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔" گمبھیر لہجے میں اس کا انداز حکمیہ تھا۔

"آپ بے فکر رہیں سر' مجھے اس معاملے کی حساسیت کا پوری طرح اندازہ ہے۔" شبیر خان نے یقین دہانی کروائی۔

"گڈ۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں پہ کبھی شبہ نہیں رہا۔" اس کا لہجہ سنجیدہ ہی تھا' مگر اس بار چہرے کا تناؤ نسبتاً" کم تھا۔ شبیر خان اس سے سارا معاملہ ڈسکس کرکے اور وہ فائل اس کے پاس چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اپنے سامنے پڑی بند فائل پہ نظر ڈالتے ہوئے ایک بار پھر اس کے ماتھے پہ شکنیں ابھریں' گہری سوچ میں ڈوبے اس نے اپنی کرسی کی بیک سے سر ٹکا لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہی بات ہوئی تھی جس کا اسے پہلے ہی اندازہ تھا۔ سنبل نے گھر آتے ہی شیراز کو ساری روداد سنائی تھی' ساتھ میں دو اپنی طرف سے لگا کر بھی سنائی تھیں۔

"تم کیوں بلاوجہ اس کے منہ لگتی ہو۔ اگنور کردیا کرو۔" پچھلی بار بات اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی اور نورہ کے ساتھ آفاق نے بھی اسے سرزنش کی تھی' اسی لیے وہ خود پہ قابو رکھتے ہوئے بولا۔

"میں منہ لگتی ہوں یا آپ کی بہن کی زبان کو چین نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے' وہ کتنی بدزبان ہے۔" سنبل اسے ٹھنڈا پڑتا دیکھ کر جل کر بولی اور پھر جب تک شیراز کو اس حد تک مشتعل نہ کردیا کہ وہ پیر پٹختا عائدہ کے کمرے میں اس سے لڑنے چلا گیا وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔ شیراز نے پہلے اسے سمجھانا چاہا لیکن جب اس کے کان پہ جوں تک نہ رینگی تو وہ خاصا غصے میں آگیا تھا۔ وہ بھی کہاں رکنے والی تھی' بڑے بھائی کی وہ عزت افزائی کی کہ وہ دنگ رہ گیا اور پھر اس نے عائدہ کی شکایت نورہ سے کرڈالی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی' اپنے بڑے بھائی سے بدتمیزی کرتے ہوئے۔" اس کی بدتمیزی کو وہ کب سے نظر انداز کررہی تھیں' لیکن آج تو اس کی وجہ سے اچھا خاصا مسئلہ بن گیا تھا۔ شیراز نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر عائدہ کا یہی رویہ رہا تو وہ اپنی بیوی کو لے کر چلا جائے گا۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی' بس ان کی بات کا جواب دیا ہے۔ وہ ہی بلاوجہ ہائپر ہورہے تھے۔ خواہ مخواہ کی دھونس جمارہے تھے۔ مجھے اپنی زندگی میں کسی کی مداخلت پسند نہیں ہے۔ وہ بھائی چھوڑ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔" وہ ڈھٹائی سے بولی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی' تم اتنی بدتمیز بھی ہوسکتی ہو۔" وہ تاسف سے بولیں۔

"آپ نے میرے لیے کب سے سوچنا شروع کردیا' مجھے تو سالوں پہلے اٹھا کر پھینک چکی ہیں آپ' بوجھ تھی نا میں آپ کے لیے' آپ کی زندگی میں ان

چاہی تھی' اسی لیے آپ نے مجھے پیدا ہوتے ہی نانی کے حوالے کرکے اپنی جان چھڑالی اور آج جب میں اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزار رہی ہوں تو آپ سب کو حق یاد آرہے ہیں۔ میری تربیت کی فکر ہورہی ہے۔ میں نے اپنا بچپن اپنا گھر ہوتے ہوئے دوسروں کی دہلیز پہ گزار دیا' تب آپ کو خیال نہیں آیا میری تربیت کا۔ آج کوئی بھائی بن رہا ہے' کوئی ماں اور کوئی باپ بننے کی کوشش کررہا ہے۔ اس وقت کہاں تھے آپ سب جب مجھے ضرورت تھی آپ لوگوں کی۔ اپنے گھر کا تحفظ چاہیے تھا۔ جب مامی اور ان کے بچے میری انسلٹ کرتے تھے' مجھے طعنے دیتے تھے کہ میری مما کو میری کوئی ضرورت نہیں ہے' انہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔ میرا سارا بچپن' میری معصومیت' میری شخصیت آپ کی بے رحمی اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ آپ کی وجہ سے میری زندگی برباد ہوگئی۔" وہ زخمی لہجے میں کہہ رہی تھی اور نوریہ کا سینہ پھٹ رہا تھا۔ یہ پہلی بار نہیں تھا جب وہ ان سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ وہ اس کے الزامات اور نفرت کو برداشت نہیں کرپاتی تھیں' لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھیں' کیونکہ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ماضی کی غلطیاں کاغذ پہ کچی پنسل سے لکھی تحریر نہیں ہوتی ہیں جنہیں ربڑ سے مٹاکر کچھ اور لکھ لیا جائے۔ جو ہوچکا تھا' اسے بدلنا ممکن نہیں تھا اور عائدہ کا رویہ انہیں حال اور مستقبل کا خوف دلاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس گھر کے لوگوں سے یوں بھی اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ وہ شروع سے نانی کے گھر رہی تھی' اس لیے شیراز اور سہیل نے اسے کبھی اپنی بہن کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا' نہ ہی پیار اور جب واپس آئی تو لوگوں کے منفی رویے' ان کی باتیں اور افسوس نے اسے اپنی ہی ذات کے خول میں قید کردیا تھا۔ وہ کم عمری میں ہی ان سب کے لیے ذلت کا باعث بن گئی تھی اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اگر اس کے پاس آنے سے کتراتے تھے تو وہ خود انہیں اپنے تک رسائی کا موقع نہیں دیتی تھی۔ یہ گھر عائدہ کا بھی تھا' بالکل اسی طرح جیسے یہ گھر شیراز اور سہیل کا تھا' لیکن وہ دونوں یہاں حق سے رہتے تھے' لیکن عائدہ یہاں مجبوری سے رہتی تھی۔ شیراز اور سہیل کے دل میں اس کے لیے بس اتنی ہی جگہ تھی کہ وہ دونوں اسے اس گھر میں برداشت کررہے تھے اور خود اس کا دل بھی ان کے لیے ہر جذبے سے عاری تھا۔

وہ خود یہاں نہ واپس آنا چاہتی تھی' نہ ہی رہنا چاہتی تھی' لیکن وہ بے بس تھی' حالانکہ نانی کے گھر میں بھی اس کا کوئی اہم مقام نہ تھا اور اپنا پورا بچپن اس نے ثمینہ ممانی کی جھڑکیاں اور ان کے دونوں بچوں کی مقابلے بازی میں گزارا تھا' وقت کے ساتھ ان کے طعنے تشنے بڑھتے ہی چلے گئے تھے' لیکن وہاں نانی تھیں اور اکیلے میں بھلے وہ لوگ اسے کچھ بھی کہیں' لیکن نانی کے سامنے ان کی مجال نہیں تھی کہ عائدہ کو ایک لفظ بھی کہہ پاتے۔ نوریہ تو اسے ماں کے حوالے کرکے بھول ہی گئی تھی۔ مہینے کا خرچ بھجوا کر وہ اپنی ذمہ داری پوری کردیتی تھی یا پھر ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں نانی اسے پندرہ دن کے لیے لے آتیں' مگر یہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اسے واپس جانے کی جلدی ہوتی اور کوئی روکتا بھی نہیں تھا۔ عائدہ دس سال کی تھی جب وہ اپنی نانی کے گھر سے واپس اپنے والدین کے پاس آئی تھی اور اس وقت نوریہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا کہ اس نے اپنی حماقت اور خود غرضی میں اپنی اولاد کے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا تھا اور جس کا خمیازہ ایک دو دن یا چند مہینے نہیں بلکہ ساری عمر بھگتنا تھا۔

عائدہ تو پہلے ہی ان لوگوں کے دلوں سے کوسوں دور تھی' رہی سہی کسر اس وقت پوری ہوگئی۔ سب کے رویوں نے اسے اچھوت بنادیا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ اس نے خود کو اپنی ہی ذات کے خول میں بند کرلیا تھا۔ پہلے وہ خوف اور شرمندگی کے زیر اثر تھی' لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ شرمندگی' ڈھٹائی اور خود سری میں بدلنے لگی۔ پچھلے چند سال سے گھر

کے ہر فرد سے اس کے تعلقات خراب تھے۔ نہ وہ اس سے بات کرنا پسند کرتے تھے اور وہ خود بھی ان سے کہاں بات کرنا چاہتی تھی۔ دونوں بھائیوں کے سرد رویوں نے اسے شروع میں ہی باور کرادیا تھا کہ ان کے دلوں میں اکلوتی بہن کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ پہلے وہ روتی تھی، دل دکھتا تھا ان کی بے پروائیوں سے، لیکن اب تو جیسے وہ پتھر کی ہوگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی بہت آگے بڑھ چکی تھی، مگر ماضی کی سفاکی اپنے بدنما نشان اس کی شخصیت پہ ثبت کرگئی تھی۔ لاکھ چاہ کر بھی وہ وقت کسی طور بھول نہیں سکتی تھی اور نوریرا کے شکوؤں کے بعد وہ لمحے جیسے ایک بار پھر زندہ ہوجاتے تھے۔ نوریرہ کے کمرے سے جانے کے بعد اس نے بے حسی اور بدتمیزی کا چولا اتار پھینکا تھا اور اب کسی چھوٹے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ دماغ کے پردے پہ ایک بار پھر وہ سارے منظر ابھرنے لگے تھے۔

"آنٹی مجھے جوس دے دیں۔" وہ ثمینہ کا دوپٹا پکڑے توتلی آواز میں بولی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی کارٹون دیکھ رہی تھی، جب اس نے کچن سے فریحہ اور نعمان کو جوس کے گلاس تھامے نکلتے دیکھا۔ اس وقت وہ صرف چھ سال کی تھی۔ اپنے دونوں کزن کو دیکھ کر اس کا معصوم سا دل للچایا اور وہ بھی کچن میں چلی آئی۔ اس کی آواز سن کر دس سالہ نعمان اور نو سالہ فریحہ بھی آگئے تھے۔

"کوئی جوس نہیں ہے، چلو بھاگو یہاں سے۔" ثمینہ نے اپنا دوپٹا کھینچا۔ رابعہ بیگم سو رہی تھیں اور ان کی غیر موجودگی میں وہ اپنی پرخاش اچھی طرح نکالتی تھی۔

"مما اسے ہر وہ چیز چاہیے ہوتی ہے، جو ہمارے پاس ہو۔ یہ بہت لالچی ہے۔" فریحہ چڑ کر بولی تھی۔ ثمینہ اپنے خاوند یا ساس سسر کے سامنے تو کھل کر نہیں بول سکتی تھی، مگر ہاں اس نے عائدہ کے لیے اپنے

بچوں کے دل میں کدورت پیدا کردی تھی۔ شروع میں وہ دونوں اپنی دادی کی گود میں اسے دیکھ کر شوق سے پیار کرنے آتے تھے، مگر پھر ثمینہ نے ان دونوں کے دماغ میں زہر بھرنا شروع کردیا اور اب تو ان کو اس بچی سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

"سب تمہاری دادی کی سرچڑھائی ہے۔ دعا دو ان کو جنہوں نے تمہارا حق اس کو دے رکھا ہے۔" وہ جل کر بولی۔ حالانکہ رابعہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود ہر ماہ نوریرہ ٹھیک ٹھاک رقم عائدہ کے لیے بھیجتی تھی اور ثمینہ اس بات سے باخبر تھی، مگر پرائی چنگیر میں رکھی روٹی اپنی کہاں ہوتی ہے۔ بچے باتوں کے مطلب بھلے نہ سمجھیں، رویے سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی باتوں سے وہ اتنا تو جان ہی چکی تھی کہ وہ اسے ناپسند کرتے ہیں وہ نانو، نانا، ماموں کی طرح اس کا خیال نہیں رکھتے۔ چپکے چپکے آنسو بہاتی وہ ایک بار پھر لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اسی وقت لاؤنج کا دروازہ کھلا اور معجیلہ اندر آئی۔

"عائدہ کیوں رو رہی ہو؟" وہ اسے روتا دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ وہ عائدہ سے بہت اٹیچ تھی۔ اس کا دن نہیں گزرتا تھا جب تک وہ اسے ایک نظر دیکھ نہ لے، اس کے ساتھ کچھ وقت نہ گزار لے۔

"جوس چاہیے۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اسے جی بھر کر اس پہ پیار آیا تھا۔

"جوس چاہیے میری گڑیا کو، چلو میں جوس دیتی ہوں۔" ثمینہ کو بتا کر وہ اسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ جوس، کینڈیز اور اس کی من پسند آئس کریم اسے کھلا کر اب وہ اس کے ساتھ بیٹھی باتیں کررہی تھی۔ باتیں تو بس عائدہ کرتی تھی، وہ تو سنتی تھی اور ہنستی جاتی تھی۔ ڈھیروں سوال ہوتے تھے اس کے جن کے جواب دیتے وہ تھکتی نہیں تھی۔

"یہ آج اس وقت آئی ہوئی ہے۔" شارق نے لاؤنج میں کھیلتی عائدہ کو دیکھ کر سوال کیا۔ وہ آج دفتر سے جلدی گھر آگیا تھا۔

"ہاں میرا دل کررہا تھا، اس لیے آج میں اسے جلدی گھر لے آئی۔ رومی بھی تو نہیں ہے نا۔" منہ

بڑور...... سجیلہ نے بتایا۔

"آپ آج خیریت سے جلدی گھر آگئے ہیں۔" اچانک اس کا دھیان اس بات پر گیا۔

"ہاں آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی سر میں درد ہو رہا تھا، اس لیے سوچا گھر جا کر ریسٹ کرلوں۔" صوفے پہ بیٹھ کر وہ جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا۔

"امی کہاں ہیں؟" شارق نے یہاں وہاں نظر دوڑائی۔

"امی، خالہ کی طرف گئی ہیں۔ آپ حنا بھابھی کو ساتھ نہیں لائے؟" وہ اچانک یاد آنے پہ بولی تھی۔

"میں نے کال کی تھی اس کو کہہ رہی تھی دو تین دن تک آئے گی، ابھی اس کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شارق دھیمے لہجے میں کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"شارق بھائی میں آجاؤں؟" وہ بستر پہ کروٹیں بدل رہا تھا، جب عائدہ نے کمرے میں جھانکا۔ کچھ دیر سجیلہ کا سر کھانے کے بعد وہ اب حنا کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ سجیلہ کی سہیلیاں آگئی تھیں اور عائدہ اب جی بھر کر بور ہو رہی تھی کیونکہ وہ اپنی باتوں میں لگی تھیں۔ ایک تو رومی بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ تو وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ دونوں گھر میں بھاگتے دوڑتے، پھرتے تھے۔ پورا گھر سر پہ اٹھایا ہوتا تھا، لیکن وہ حنا کے ساتھ اپنی نانی کے گھر چلا گیا تھا اور عائدہ اکیلی ہو گئی تھی۔ رومی کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی وہ شارق سے پوچھنے چلی آئی تھی کہ وہ کب واپس آئے گا۔

"وہاں کیوں کھڑی ہو، اندر آجاؤ۔" شارق کے بلاوے پہ وہ خوش ہو گئی اور جلدی سے اندر چلی آئی۔

"آؤ بیٹھو" بیڈ پہ لیٹے ہوئے شارق نے اسے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بخوشی اس کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ کمرہ، یہ بستر اس کے لیے نیا تھا، نہ اجنبی وہ رومی کے ساتھ کھیلتے ہوئے کتنی بار یہاں اچھلتے کودتے تھے۔ اکثر حنا انھیں اس کمرے میں کارٹون لگا دیتی اور وہ دونوں بیڈ پہ چوکڑی جما کر بیٹھ جاتے تھے۔

"رومی کب تک آجائے گا؟" چہرے پہ اداسی لیے اس نے اپنا سوال کیا۔

"کل یا پھر پرسوں۔۔۔ کیوں تم اسے مس کر رہی ہو؟" شارق کا موڈ اچانک ٹھیک ہو گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کی بے زاری اور اکتاہٹ یکسر غائب ہو چکی تھی۔ تکیے کو تھوڑا اونچا کر کے سر اس پر ٹکاتا شارق عائدہ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سلیولیس فراک سے جھانکتے گورے بازوؤں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے عائدہ سے پوچھا۔

"ہاں بہت زیادہ۔ کتنے دن سے ہم ساتھ کھیلے نہیں ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"اسکول جا رہی ہو آج کل، اسکول میں تمہارا کوئی دوست نہیں۔" اس نے ایک اور سوال کیا، وہ عائدہ کا دھیان پوری طرح باتوں میں لگا چکا تھا۔

"جا رہی ہوں اور وہاں میرے دو دوست ہیں۔" عائدہ نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

"اچھا۔ کیا نام ہیں تمہارے دوستوں کے۔۔۔" شارق کا ہاتھ حرکت کرتا اب اس کے گالوں پہ چلا گیا تھا۔ وہ اسے اپنے دوستوں کی تفصیلات بتانے لگی تھی۔ چھ سال کی عمر میں اسے اپنے جسم کو چھوتے کسی مرد کے ہاتھوں کا مقصد ہرگز سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس سے سالوں سے مانوس تھی۔ وہ تو خوش تھی، بہت خوش، کیونکہ اسے شارق سے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس دوران وہ اسے کہاں کہاں چھو رہا تھا اور کیوں چھو رہا تھا، یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر وہ گھر واپس آگئی تھی اور پھر یہ اکثر ہونے لگا تھا۔ اور وہ اس کو ویسی ہی محبت سے تعبیر کرتی جیسی وہ رومی سے کرتا ہے یا پھر جیسے خاور ماموں فریحہ سے کرتے ہیں، لیکن اس کا معصوم ذہن محبت اور ہوس کے فرق سے ناواقف تھا۔

سجیلہ کی شادی ہو گئی، لیکن وہ پھر بھی وہاں آتی تھی کیونکہ اس کا دل اپنے گھر سے زیادہ یہاں لگتا تھا۔

وہاں تو ثمینہ کی ڈانٹ پھٹکار ہوتی تھی اور نعمان اور فریحہ کی تکرار ایسے میں یہ اس کی جائے پناہ تھی جہاں آکر وہ خود کو پرسکون محسوس کرتی تھی۔ اس دن حنا اپنے میکے گئی ہوئی تھی جب عائدہ وہاں رومی سے کھیلنے چلی آئی لیکن رومی کو گھر نہ پاکر اسے قدرے مایوسی ہوئی۔ اس دن نانی گھر نہیں تھیں اور ثمینہ ممانی کی زبان ہمیشہ کی طرح شعلہ افشانی کررہی تھی۔ وہ معصوم تو اپنی جان بچاکر وہاں آئی تھی لیکن اس بات سے بے خبر تھی کہ آج کا دن اس کی زندگی کا بدترین دن ہوگا اور اس دن کے بعد اس کے مقدر میں فقط سیاہی ہوگی۔

"رومی تو نہیں ہے عائدہ تم اندر آجاؤ۔" ہر بار کی طرح شارق اس سے بہت محبت سے ملا تھا۔ دس سال سے وہ اس گھر میں آرہی تھی تو نہ کوئی اجنبیت تھی نا ہی گھبراہٹ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ شارق آدمی کی کھال میں چھپا بھیڑیا اپنی ہوس کی آگ میں اس حد تک آگے نکل جائے گا کہ اس سے اس کی معصومیت اور حرمت بھی چھین لے گا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے آیا تھا کہ اچانک حنا گھر آگئی۔ عائدہ کی چیخ و پکار سن کر جب وہ بھاگی ہوئی کمرے میں آئی تو اس نے خوب واویلا کیا تھا پر افسوس وہ عائدہ کو بچانہ سکی تھی۔ عائدہ نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں حنا کو شارق سے جھگڑتے دیکھا تھا اسے کوستے دیکھا تھا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ نانی کے ساتھ وہاں نوریہ اور آفاق بھی تھے۔ اس نے نانی اور نوریہ کو زاروقطار روتے دیکھا تھا۔

اگلے دن وہ اپنے والدین کے ساتھ ان کے گھر چلی آئی تھی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کے بعد وہ بہت ڈری اور سہمی ہوئی تھی اور اس خوف میں اضافہ اس کے اردگرد موجود لوگوں نے کیا تھا۔ ثمینہ ممانی کی ذومعنی باتیں اور طنزیہ جملے رشتے داروں کی کھوکھلی ہمدردیاں اور نوریہ کا جھکا ہوا سر۔ اسے اپنا آپ مجرم لگنے لگا تھا۔ وہ سب کی بے عزتی کا موجب تھی۔ اس کے بھائی اس سے کھنچے کھنچے رہتے تھے وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی چلی گئی اس کے دل میں ان سب سے شکوہ بڑھتے گئے۔ پہلے اسے خود سے نفرت تھی لیکن جیسے جیسے وہ شعور کی دہلیز پر پہنچی اس کی نفرت کا رخ بدل کر اپنے گھر والوں کی طرف چلا گیا تھا۔

گزرے ماہ و سال میں کچھ بھی تو نہیں بھول پائی تھی وہ نہ ثمینہ کی باتیں نہ نعمان اور فریحہ کی طنز حنا بھابھی کا وہ ہذیان بکنا اور... اور شارق کی ہیبت ناک شکل۔ اسے سب یاد تھا۔ بہت کم عمری سے وہ اذیتوں کا زہر پیتی رہی تھی اور اب اس کی رگوں میں خون سے زیادہ زہر بھر گیا تھا۔ وہ یہ زہر اپنے پاس آنے والے ہر انسان میں منتقل کررہی تھی۔ اس زہر کا تریاق نہیں تھا۔ اسے جو دنیا سے ملا تھا وہ وہی تو نہیں لوٹا رہی تھی پھر کیوں سب اس سے شکایت کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟" ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پہ دنیا جہان کا کرب نمایاں تھا۔ آفاق احمد کو بھی بیوی کا چہرہ دیکھنے کی فرصت اس عمر میں ملی تھی۔ کئی سال سے ان کی صحت پہلے جیسی نہیں رہی تھی اور اب تو سارا کاروبار بیٹوں نے سنبھال لیا تھا۔ نہ وہ پہلے والا رعب تھا نہ طنطنہ ایسے میں شریک حیات کے سوا کون پوچھتا ہے۔

"خیریت ہی تو نہیں ہے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی آفاق مجھے عائدہ کو امی کے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنی زندگی پرسکون گزارنے کے لیے اسے بوجھ سمجھ کر امی کو پکڑا دیا۔ وہ بے چاری اچاچتے ہوئے بھی میری خوشی کی خاطر اسے لے تو گئیں لیکن میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میں اپنی پھول سی بچی کو اس کے گھر اس کے ماں باپ اور بھائیوں سے جدا کرکے ساری زندگی کے احساس کمتری میں مبتلا کررہی ہوں۔ میری غیر ذمہ داری کی وجہ سے میری بچی کی زندگی برباد ہوگئی۔ وہ جو کچھ کررہی ہے غصے اور ضد میں آکر کررہی ہے۔ میں اس کی گناہ گار ہوں۔ وہ یہ سب مجھے سزا دینے کے لیے کررہی ہے۔ ہم سب سے

اپنے ساتھ ہوئے حادثے کا بدلہ لینے کے لیے کرتی ہے ایسی حرکتیں، لیکن میں اسے کیسے سمجھاؤں وہ صرف ہمیں نہیں خود کو بھی تکلیف دے رہی ہے۔" یہ بات وہ کئی بار پہلے بھی ان کے سامنے دہرا چکی تھیں سو وہی تاسف و ملال۔

"دیکھو نوریہ اس مسئلے کا حل رونا دھونا نہیں ہے' بلکہ ہمیں بہت سوچ سمجھ کر اس سے بات کرنی ہوگی۔ اس پہ دباؤ ڈالنے یا اس پر غصہ کرنے سے وہ اور بھی خود سر ہو جائے گی۔ بہتر ہے اسے کچھ وقت دو۔ یوں بھی جوان بچے خواہ مخواہ کی روک ٹوک کرنے سے سرکش ہو جاتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ پلیز تم اس کے ساتھ تحمل اور ضبط کا مظاہرہ کرو اور میں باقی سب کو بھی سمجھاؤں گا کہ عائدہ سے پیار سے بات کریں اور جہاں تک ہو سکے اسے اپنائیت کا احساس دلائیں' تاکہ اسے ہماری محبت پہ اعتبار آئے۔" اتنا تو انہیں بھی نظر آ رہا تھا کہ اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے نفرت ہے تو ان کے دلوں میں اس کے لیے اپنائیت نہیں ہے۔ اپنے بیٹوں کے سرد رویے تو وہ بھی دیکھ ہی رہے تھے۔

"لیکن اسے سمجھانا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے' وہ کسی کی سنے تو پھر نا۔ اس نے تو قسم کھائی ہوئی ہے بات نہ ماننے کی۔" نوریہ کی بات بھی غلط نہیں تھی' وہ کہاں کسی کی بات سنتی تھی آفاق احمد نے انہیں حوصلہ رکھنے کو کہا تھا' یہ سب ایک دن میں ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا' جو کوتاہی ہو چکی تھی اس کی تصحیح کے لیے کچھ تو خمیازہ بھگتنا ہی تھا۔

☼ ☼ ☼

"عائدہ! تم ہماری اکلوتی بیٹی ہو اور ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتے ہیں۔ تم ہمارے پاس نہیں تھیں' مگر ہم تم سے غافل نہیں تھے میری بچی۔ اپنے دل سے کدورت کو نکالو۔ ہم تمہارے اپنے ہیں اور تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔" اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پہ رکھے وہ دھیمے مگر پراثر لہجے میں اس سے بات کر رہے تھے۔

"سب مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں' مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا اظہار میں اکثر آپ کے بیٹوں کی زبان سے سنتی رہتی ہوں۔" وہ استہزائیہ ہنسی ہنسی تھی۔

"لڑ جھگڑ کے' ہم سے نفرت کا اظہار کر کے تم ہمارے ساتھ اپنا دل بھی دکھاتی ہو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں آج کے بعد اس گھر میں کوئی تم سے اونچی آواز میں بات نہیں کرے گا' لیکن تمہیں بھی تھوڑا سا تعاون کرنا ہوگا۔ خود کو دھیما کرنا ہوگا اور پھر جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس کا ہاتھ تھامے وہ پریقین انداز میں بولے۔ انہوں نے نوریہ سے وعدہ کیا تھا' وہ عائدہ کو سمجھائیں گے اور اسے آہستہ آہستہ اپنے خلوص اور محبت کا یقین دلائیں گے' اس کے اعتبار کو بحال کریں گے۔

"کل میری فرینڈ کی سالگرہ ہے' اس نے مجھے انوائٹ کیا ہے' میں چلی جاؤں۔" حیدر کئی دن سے اس کے پیچھے پڑا تھا کہ اسے اس کے گھر ایک پارٹی میں آنا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر اپنی سالگرہ منا رہا تھا اور اس نے عائدہ کو بھی انوائٹ کیا تھا۔ وہ اتنے دن سے اسے یقین دلا رہی تھی کہ وہ کوشش کرے گی آنے کی' مگر آج گھر میں جو ماحول بنا ہوا تھا اسے یقین تھا اسے کوئی جانے کی اجازت نہیں دے گا' اب جو پاپا کو اس قدر محبت اور چاہت سے باتیں کرتے سنا تو سوچا کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔

"ہاں۔ ہاں ضرور جاؤ' بلکہ میں سہیل سے کہوں گا تمہیں خود پک اینڈ ڈراپ کرے گا۔" انہوں نے اس کی فرمائش پہ خوش دلی سے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن سہیل کا پک اینڈ ڈراپ۔ ہرگز نہیں۔ وہ تو حیدر سے ملنے جا رہی تھی' اب اسے کون سی سہیلی کے گھر لے کر جائے' سب الٹا ہونے والا تھا۔

"پاپا وہاں سب کالج کی پرانی سہیلیاں اکٹھی ہوں گی نجانے کتنی دیر لگ جائے اور سہیل بھائی کو میری خاطر دو چکر لگانے پڑیں گے' وہ بس مجھے صالحہ کی طرف

ڈراپ کردیں' واپسی میں وہ خود مجھے چھوڑ جائے گی۔" بیٹھے بیٹھے کیا خوب بہانہ سوجھا تھا۔ وہ صالحہ کے گھر اتر جائے گی مگر اندر جانے کے بجائے اسے حیدر باہر سے ہی پک کرلے گا۔ واپسی پہ وہی اسے گھر بھی ڈراپ کردے گا۔

"واہ! عائدہ کیا شان دار آئیڈیا ہے۔" اس نے خود کو داد دی' ساتھ ہی چہرے پہ ایک شگفتہ سی مسکراہٹ آئی۔ آفاق احمد کو تو اس کا مسکراتا چہرہ بھی پہلی بار دیکھنا نصیب ہوا تھا' ورنہ اتنے عرصے تو وہ اس کو بلتا' جھلتا دیکھ رہے تھے۔ ماتھے پہ تیوریاں اور پھولا منہ۔ وہ فوراً" مان گئے تھے۔

☆ ☆ ☆
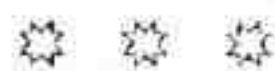
"کیا تمہیں پورا یقین ہے شبیر یہ وہی جگہ ہے؟" اے ایس پی عذیر نے اپنے ساتھ بیٹھے اہلکار کی طرف دیکھا۔ اس شان دار بنگلے کے باہر وہ دونوں اس وقت سادہ لباس میں تھے' لیکن ان کے پاس مکمل بیک اپ موجود تھا' جو ان کے ایک اشارے پہ بروقت پہنچ سکتا تھا۔

"جی سر۔ ہمارے انفارمر کے مطابق یہ ہی وہ جگہ ہے' پچھلے دنوں جو وڈیو انٹرنیٹ پہ اپ لوڈ ہوا تھا اور جس کی وجہ سے اس لڑکی نے خودکشی کرلی تھی اس سارے معاملے کی کڑی اس جگہ سے ملتی ہے۔" ایس ایچ او شبیر جو اس کا قابل ترین ماتحت تھا اسے ساری معلومات فراہم کررہا تھا۔

"تو پھر کیا خیال ہے اندر چلنا چاہیے؟" ساری صورت حال پہ غور کرنے کے بعد اس نے سنجیدگی سے کہا۔

کچھ ہفتے پہلے ایک ایسا سنسنی خیز واقعہ ہوا تھا۔ جس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ رباب نامی کالج اسٹوڈنٹس کی قابل اعتراض اعتراض وڈیو بنا کر اسے کافی عرصے سے بلیک میل کیا جارہا تھا اور اسے اس وڈیو کو انٹرنیٹ پہ اپ لوڈ کرنے کی دھمکی بھی دی جارہی تھی بعد ازاں وہ وڈیو انٹرنیٹ پہ اپ لوڈ کردی گئی۔ اپنے گھر والوں کے خوف اور بدنامی کے باعث اس لڑکی نے خودکشی کرلی تھی۔ نہ کسی نے اس کی رپورٹ کروائی تھی اور نہ ہی یہ خبر باہر نکل سکی تھی' جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فیملی اس حادثے کو چھپانا چاہتی تھی۔ اے ایس پی عذیر کو اس سانحہ کی خبر اس لیے تھی' کیونکہ فیملی نے اس سے اس سلسلے میں خود رابطہ کیا تھا اور اس واقعہ کی رازداری کا وعدہ لیا گیا تھا۔ ایس ایچ او شبیر کی مدد سے وہ کڑی سے کڑی ملاتا اس سارے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تھا۔ شبیر نے اسے چند روز پہلے جو فائل لاکر دی تھی اس کے مطابق یہ ایک اتفاقی حادثہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک پورا گروہ ہے جو لڑکیوں سے دوستی کرکے اور انہیں ورغلا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی نازیبا وڈیو بنا کر انہیں بلیک میل کرتے ہیں ان سے رقم بٹورتے ہیں اور لڑکیاں اپنی بدنامی کے خوف سے ان کے مطالبات مانتی ہیں۔ اس فائل کو پڑھنے کے بعد اے ایس پی عذیر کا دماغ اس وقت بھک کرکے اڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو حیدر؟" وہ آج پروگرام کے مطابق اپنی سہیلی کے گھر ڈراپ ہوئی تھی اور وہاں سے اسے حیدر نے مقررہ وقت پہ پک کرلیا تھا۔ وہ جتنا شان دار تصویر میں دکھتا تھا اس سے زیادہ زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔ عائدہ اسے دیکھ کر اچھی خاصی متاثر ہوگئی تھی اور کچھ ایسی ہی فیلنگ حیدر کی عائدہ کے لیے تھی۔ اس کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر کے برعکس وہ اس وقت دل کو چھو لینے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔ بلیک شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر اور اس کے دراز قد اور گوری رنگت کو چار چاند لگا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو طویل مدت سے جانتے تھے' یہ ہی وجہ تھی انہیں ایک دوسرے سے پہلی ملاقات میں نہ جھجک تھی' نہ ہچکچاہٹ۔

عائدہ اس سے پہلے صرف تفریح کی حد تک انٹرنیٹ پہ لڑکوں سے دوستیاں کرتی رہی تھی' لیکن یہ پہلی

بار تھا کہ وہ حیدر کی باتوں' اس کی شخصیت میں کشش محسوس کر رہی تھی۔ عائدہ کے گاڑی میں بیٹھتے ہی حیدر نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھا دی تھی' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور عائدہ کو احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس وقت کن سڑکوں پہ گھوم رہے ہیں۔ اس کا خیال تھا حیدر اسے کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں لے کر جائے گا' لیکن جب حیدر نے گاڑی ایک شان دار گھر کے سامنے جا کر روکی تو وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ گھبرا بھی گئی تھی۔

"یہ میرے ایک دوست کا گھر ہے' اس نے ایک پارٹی رکھی ہوئی تھی آج اور مجھ سے اصرار کر رہا تھا' میں ضرور آؤں۔ میں نے سوچا اکیلے آنے میں کیا مزا آئے گا' کیوں نہ یہ محفل تمہارے ساتھ انجوائے کی جائے۔" شوخ لہجے میں کہتا وہ گاڑی سے اتر آیا تھا۔ عائدہ کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

"لیکن تم نے مجھے بتایا بھی نہیں' اگر پہلے بتا دیتے تو...." حیدر نے اس کی سائڈ کا دروازہ کھولا' وہ ہچکچاتے ہوئے باہر نکل آئی۔ عائدہ کی بات ادھوری ہی رہ گئی تھی' کیونکہ گھر کے صدر دروازے سے حیدر کی ہی عمر کا ایک اور لڑکا نکل کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ حیدر نے عائدہ سے اس کا تعارف کروایا اور پھر وہ لڑکا جس کا نام حیدر نے کامران بتایا تھا کی سنگت میں وہ دونوں گھر کے اندر چلے گئے تھے۔

"تم رک کیوں گئیں؟ اندر آؤ نا۔" عائدہ نے لاؤنج میں پہلا قدم ہی رکھا تھا کہ اندر کا ماحول دیکھ کر وہ فریز ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے یہ سب اس نے شاید انڈین فلموں میں دیکھا تھا یا پھر چیپ قسم کے ڈراموں میں' لیکن حقیقت میں اس کی آنکھوں نے ایسا منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ قدم آگے نہیں بڑھا سکی تھی اور حیدر نے اس کا رکنا محسوس کر لیا تھا۔

"حیدر یہ سب کیا ہے؟" بے یقینی سے لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ نیم تاریک کمرے میں ڈسکو لائٹوں کے ساتھ وہ جگہ کوئی گھر نہیں بلکہ کلب لگتی تھی۔ وہاں کامران کے علاوہ بہت سے لڑکے لڑکیاں موجود تھے۔ ایک طرف بار بنا تھا جہاں ویٹر سب کو شراب سرو کر رہا تھا۔ لڑکیوں کے جسم پہ جو کچھ تھا اسے کپڑے نہیں کہا جا سکتا تھا' کیونکہ اس لباس کا مقصد جسم کو چھپانا ہرگز نہیں تھا۔ عائدہ جو خود بہت بولڈ اور پراعتماد تھی۔ یہ منظر دیکھ کر اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ آگیا تھا۔ تیز میوزک پہ کچھ لوگ ناچ رہے تھے۔ اس کے چہرے پہ حیرت اور پریشانی واضح تھی۔

"تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو عائدہ' یہ سب فرینڈز ہیں۔ آؤ میں تمہیں سب سے ملواتا ہوں۔" اس کی ناگواری کو خاطر میں نہ لا کر حیدر نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ اچھی خاصی پریشان ہو رہی تھی اور آج اپنے حیدر سے ملنے کے فیصلے پہ بری طرح پچھتا رہی تھی۔ مختلف لڑکے لڑکیوں سے اس کا تعارف کرواتا وہ اسے لے کر ایک صوفہ پہ بیٹھ گیا تھا۔ "شاید تم یہاں کمفو ٹیبل نہیں ہو' چلو ہم اوپر چلتے ہیں۔" حیدر اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے یک دم بولا تھا۔

"حیدر پلیز میں یہاں مزید نہیں رک سکتی' تم بس مجھے گھر ڈراپ کر دو۔" وہ التجائیہ بولی تھی۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے سوئٹ ہارٹ' ابھی تو ہم نے ٹھیک سے بات بھی نہیں کی۔" یہاں ویسے بھی بہت شور ہے' چلو ہم آرام سے اوپر والے روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں' پھر میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں گا۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ اس کا احتجاج سنے بغیر اسے اپنے ساتھ اوپر لے آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے یونیفارم کے بجائے وہ اس وقت سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا۔ اپنے تمام ذرائع کو بروئے کار لا کر بالآخر کڑی سے کڑی ملاتے وہ اس گروہ کے ہیڈ کوارٹر تک پہنچ گئے تھے۔ اسے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی تھی۔ ان غیر اخلاقی اور مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے ان لوگوں نے کسی گمنام اور ڈی گریڈ جگہ کو نہیں بلکہ اس شہر کے

نوش علاقے کو اپنا اڈہ بنایا ہوا تھا۔ یوں تو اس کے پاس اس جگہ کا سرچ وارنٹ موجود تھا اور وہ وہاں باقاعدہ پولیس کی نفری کے ساتھ چھاپہ مار سکتا تھا، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک معمولی سا جھول بھی اس معاملے کی نوعیت بدل دے۔

"جی فرمایئے؟" دوسری بار گھنٹی بجانے پر ایک چوبیس پچیس سالہ لڑکے نے دروازہ کھولا تھا جو ایک اجنبی کو دیکھ کر خاصا حیران تھا۔

"مجھے سلیم نے بھیجا ہے۔" عذیر نے ایک کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔ دروازہ کھولنے والے نے جانچتی نظروں سے اس ہینڈسم نوجوان کو دیکھا۔ سیاہ جیکٹ، سفید کیپس اور بلیو ڈینیم جینز میں وہ پرکشش لگ رہا تھا۔ لڑکے کے چہرے پہ کنفیوژن تھی۔ اس کی گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے عذیر دوستانہ انداز میں مسکرایا۔

"پلیز کم آن۔" لڑکے نے سوچتے ہوئے اسے اندر آنے کا کہا۔ عذیر نے سکون کا سانس لیا، اس کا تیر ٹھیک نشانے پہ لگا تھا۔

کامران کی سنگت میں انسپکٹر عذیر نے گھر کے مرکزی ہال میں قدم رکھا، جہاں اس وقت رنگ و نور کی محفل سجی تھی۔ مستی میں ڈوبے نیم برہنہ وجود اور ہوش و خرد سے بےگانہ نوعمر لڑکے لڑکیاں بےباکی سے ادھم مچا رہے تھے۔ اندر پارٹی پورے عروج پہ تھی۔ عذیر کے ماتھے پہ ایک لمحے کو ناگواری کا تاثر آیا اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے اپنے چہرے پہ مسکراہٹ سجالی، یوں جیسے یہ سب دیکھ کر وہ بہت انجوائے کر رہا ہے۔

"کیا چاہتے ہو؟" کامران نے اندر آکر اسے ایک بار اسٹول پہ بیٹھنے کو کہا اور پھر خود بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

"وہی جو دوسرے چاہتے ہیں۔ گڈ ٹائم۔" عذیر نے مسکراتے ہوئے اپنی بائیں آنکھ ماری۔ اس کی بات سن کر کامران نے قہقہہ لگایا۔

"مال لائے ہو؟" عذیر جو بہت محتاط انداز میں اردگرد کے ماحول کا جائزہ لے رہا تھا۔ کامران کی بات سن کر مسکرایا اور پھر اپنی جیکٹ کی جیب کو تھپتھپایا۔

"سیمی۔" کامران نے مجمع کی طرف منہ کرکے اونچی آواز سے ایک نام پکارا۔ اگلے ہی پل ہجوم کو چیرتی ایک دبلی پتلی اور بےباک لڑکی ان کی طرف چلی آئی۔ عذیر نے ایک اچٹتی نگاہ اس لڑکی پہ ڈالی۔

"سیمی تمہیں ان کے ساتھ جانا ہوگا۔" کامران کی آواز پہ اچانک عذیر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کو اپنا پلان چوپٹ ہوتا نظر آیا کیونکہ وہ یہاں سے جانے کے ارادے سے نہیں آیا تھا، بلکہ اسے تو ان لوگوں کو اعتماد میں لے کر اس جگہ کا مکمل تجزیہ کرنا تھا۔

"میرے پاس جگہ کا انتظام نہیں ہے، سلیم کہہ رہا تھا کہ تم لوگ جگہ بھی خود ہی مہیا کرتے ہو۔" وہ اعتماد سے بولا تو کامران کچھ سوچنے لگا اور سیمی کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔

"انہیں اوپر والے کمرے میں لے جاؤ۔" کامران کا حکم ملتے ہی اس نے بےتکلفی سے عذیر کا ہاتھ تھاما اور لاؤنج میں بنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل کی طرف آگئی۔ اوپر ساتھ ساتھ تین کمرے تھے، ان میں ایک کا دروازہ بند جبکہ دو کے دروازے کھلے تھے۔ عذیر، سیمی کی تقلید میں ایک کمرے میں داخل ہوا اور سیمی نے دروازہ بند کرلیا۔ کمرے میں داخل ہوکر عذیر نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر مسکرا کر سیمی سے کہا۔

"مجھے واش روم جانا ہے۔" سیمی نے ہاتھ کے اشارے سے کمرے سے ملحق باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔

"ہیلو شبیر۔ میں اس وقت اس گھر کے اوپر والے پورشن کے ایک کمرے میں ہوں۔ ہم بلاشبہ درست جگہ پہ پہنچ چکے ہیں۔ تم اگلے پانچ منٹ میں پوری نفری کو لے کر گھر میں چلے آؤ۔" اپنے فون پہ احکامات جاری کرنے کے بعد عذیر باتھ روم سے نکل کر دوبارہ کمرے میں آگیا جہاں اس وقت سیمی ہاتھ میں گلاس تھامے ڈرنک تیار کر رہی تھی۔ عذیر نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ پہ بندھی گھڑی پہ اک نگاہ ڈالی۔ اگلے

چند منٹ میں اس ماڈرن کوٹھے پہ پولیس کی ریڈ پڑنے والی تھی۔ اس نے دلچسپ مسکراہٹ سے سامنے بیٹھی سیمی کو دیکھا۔ لیکن اگلے ہی پل اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ جبکہ سیمی وہاں معمول کے انداز میں بیٹھی رہی۔

"بچاؤ..." کمرہ ایک نسوانی چیخ سے گونج اٹھا تھا۔

"یہ کس کی آواز ہے؟" کسی لڑکی چیخ و پکار کی آواز سن کر عذیر نے تشویش سے پوچھا۔

"یہ سب تو یہاں کا معمول ہے۔ تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ عذیر کے ماتھے پہ ناگواری کی شکن نمودار ہوئی۔

"پلیز کوئی بچاؤ مجھے..." اور اسی پل ایک بار پھر اسی لڑکی کی چیخیں اس کی سماعتوں سے ٹکرائیں۔ یہ سب اگنور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عذیر نے اپنے قریب کھڑی سیمی کو اس بار غصے سے دیکھا اور تقریباً "پھنکارا۔

"سچ سچ بتاؤ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں' ورنہ گولی مار دوں گا؟" سیمی اس کے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ ڈرتے ڈرتے سیمی نے اسے ساری بات بتا دی۔ عذیر بغیر کوئی لمحہ ضائع کیے برابر والے اس کمرے تک پہنچا تھا جہاں سے اس لڑکی کی مدد کے لیے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اس دوران اس نے انسپکٹر شبیر سے بھی جلد پہنچنے کا کہا تھا۔ سیمی اس افتاد پہ ششدر تھی' وہ جسے گاہک سمجھ رہی تھی وہ دراصل پولیس افسر تھا اور اس جگہ پوری پلاننگ کے ساتھ آیا تھا۔ بے بسی سے اس کے ساتھ چلتی وہ کمرے کے دروازے تک آئی اور عذیر کے کہنے پہ ہی اس نے کمرے کا دروازہ بھی کھلوایا تھا۔ سیمی کو پرے دھکیلتا عذیر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے ریوالور نے دروازہ کھولنے والے کی سٹی گم کر دی تھی۔

"پلیز میری مدد کریں' مجھے یہاں سے نکالیں' یہ مجھے دھوکے سے یہاں لے آیا ہے۔" عذیر کے کمرے میں قدم رکھتے ہی وہ لڑکی بے اختیار اس کے بازو سے لپٹ کر مدد کی درخواست کرنے لگی۔ اس کے لمبے کھلے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کا دوپٹا کمرے کے فرش پہ پڑا تھا۔ عذیر نے نرمی سے اسے کندھے سے الگ کیا۔

"آپ فکر نہ کریں' یہ لوگ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" اسی لمحے انسپکٹر شبیر کمرے میں داخل ہوا اور حیدر اور سیمی جو وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے انہیں دھر لیا۔

"تم وقت پہ پہنچ گئے شبیر' اس کمرے کی تلاشی بھی کرواؤ اور اس گھر میں موجود تمام لوگوں کو گرفتار کر لو۔" شبیر نے ایک نظر عذیر کے پاس کھڑی عائدہ کو دیکھا جو بے تحاشا گھبرائی اور سہمی ہوئی تھی اور پھر وہ حیدر اور سیمی کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔ عائدہ خود حیرت اور پریشانی کے ملے جلے تاثرات لیے وہاں کھڑی تھی' جب عذیر نے اس کا دوپٹا اٹھا کر اسے پکڑوایا۔ اگلے چند منٹوں میں پولیس کے چند اہلکاروں نے کمرے کی جامع تلاشی لی اور دیوار میں ایستادہ ایک عدد کیمرہ برآمد کیا جسے دیکھ کر عائدہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ اس کیمرہ کا مقصد جانتی تھی۔ آج اگر کچھ غلط ہو جاتا تو نہ صرف وہ بے آبرو ہو جاتی' بلکہ اس کی بدنامی کے اشتہارات کس انداز میں منظر عام پر آتے یہ سوچ کر اس کی روح تک کانپ گئی تھی۔

"بی بی آپ کو بھی ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔" انسپکٹر شبیر جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے گم صم کھڑی عائدہ کو مخاطب کیا۔

"مجھے...؟" اس نے خشک لبوں پہ زبان پھیری... الفاظ اس کے حلق میں کہیں اٹک گئے تھے۔

"میں تھانے نہیں جاؤں گی' میرے گھر والوں کو پتا چل گیا تو وہ مجھے جان سے مار دیں گے۔" وہ بے تحاشا رونے لگی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے موسلا دھار برس رہے تھے۔

"دیکھیں محترمہ آپ اس تمام واقعے کی چشم دید گواہ ہیں مدعی ہیں۔ آپ کو گرفتار تو نہیں کر رہے' لیکن قانونی کارروائی میں آپ کا بیان بہت اہمیت رکھتا ہے۔" شبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ سے کہا نہ میں آپ کے ساتھ نہیں

جاؤں گی۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہے میری بات۔" وہ بے بسی سے چلائی تھی۔

"شبیر۔۔۔ انہیں تھانے لے جانے کی ضرورت نہیں۔" اے ایس پی عذیر جو کمرے میں موجود پولیس اہلکاروں کو مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ خاموشی سے عائدہ کی باتیں سن رہا تھا۔

"یس سر۔" عذیر کے حکمیہ انداز پہ انسپکٹر شبیر کمرے سے نکل گیا اس کے ساتھ باقی تمام اہلکار بھی ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے۔ اب بس کمرے میں عائدہ اور عذیر ہی تھے۔

"آپ جا سکتی ہیں۔" عذیر کی بات پہ عائدہ نے ناقابل یقین حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی رم جھم مینہ برسا رہی تھیں۔ عذیر کے دو ٹوک اور سنجیدہ انداز پہ عائدہ کو سمجھ ہی نہیں آیا وہ اسے کیا کہے۔ وہ خاموشی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"آپ جائیں گی کیسے کیا آپ کے پاس سواری ہے؟" سنجیدہ اور مئودب انداز میں عذیر کی آواز عائدہ کی سماعتوں سے ٹکرائی اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ پلٹ کر اس نے کچھ بھی کہنے کے بجائے صرف نفی میں سر ہلایا۔

"چلیں میں آپ کو آپ کے گھر پہنچا دیتا ہوں۔" دوران سفر سوائے اس کے گھر کا ایڈریس پوچھنے کے ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

"سنیں۔" عائدہ کے گھر سے کچھ فاصلے پر عذیر نے گاڑی روک دی تھی۔ وہ گاڑی رکتے ہی دروازہ کھول کر باہر جانے لگی جب عذیر اس سے مخاطب ہوا۔ وہ بغیر کچھ کہے اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"آپ کا نام؟" سوال مختصر اور سنجیدہ تھا۔

"عائدہ آفاق۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ وہاں کیوں آئی تھیں؟" اگلا سوال سن کر عائدہ کو اپنی ہتھیلیوں میں نمی محسوس ہوئی۔ وہ ایک پولیس آفیسر کے ساتھ تھی جس نے بھلے اس کو تھانے نہیں جانے دیا تھا لیکن وہ اسے بغیر کسی انکوائری کے تو ہرگز جانے نہیں دے سکتا تھا۔

"مجھے وہاں حیدر لے کر گیا تھا۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"حیدر۔۔۔ اس کو آپ کیسے جانتی ہیں۔" عذیر کی بات پر عائدہ نے ایک پل کو سر اٹھا کر اسے دیکھا جو اس وقت عائدہ کو ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملا پائی تھی۔ دھیمے لہجے میں اس نے تمام بات عذیر کو بتا دی تھی۔ عائدہ کی بات سن کر عذیر نے مزید کچھ نہیں کہا اور جیسے ہی وہ گاڑی سے اتری اس نے گاڑی چلا دی۔ گاڑی تیز رفتاری سے چلتی چند لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے عائدہ اپنے گھر میں داخل ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بچے تم کل رات سے اپنے کمرے میں بند ہو، میں تو سمجھی تھی اپنی فرینڈ کی سالگرہ سے آئی ہو خوب انجوائے کیا ہو گا، تمہارا موڈ اچھا ہو گا لیکن تم نے ہمیں پریشان ہی کر دیا ہے۔ تمہارے پاپا بھی مجھ سے کئی بار تمہارے متعلق پوچھ چکے ہیں۔" نویرہ نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

کل گھر واپس آنے کے بعد وہ جس شاک کی کیفیت میں تھی نہ تو اس میں گھر والوں کا سامنا کرنے کی ہمت تھی نہ ہی ان کے کسی سوال کا جواب دینے کا حوصلہ۔ وہ کمرہ بند کیے بیٹھی تھی۔ تمام رات اس نے روتے ہوئے گزاری تھی۔ وہ پہلے ہی کہاں آباد تھی اور اپنی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی میں خود کو مزید برباد کرنے والی تھی۔

"میں تھک گئی تھی، اور آپ لوگ کیوں بار بار مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں۔ اگر میں کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی تو مجھے میرے حال پہ کیوں نہیں چھوڑ دیا جاتا۔ کیا مجھے اس گھر میں اتنا بھی حق نہیں۔" نویرہ کے بار بار دروازہ بجانے پر اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر بیڈ پہ جا کر اوندھے منہ لیٹ گئی تھی۔ یہ اپنی حالت

چھپانے کا ایک طریقہ تھا۔ کل رات سے وہ بارہا خود کو اپنی حرکتوں پہ اپنے رویے پہ کوس چکی تھی لیکن وہ اپنے ماں باپ کو اس جرم میں برابر کا شریک سمجھتی اپنا احتساب کرتے ہوئے اس نے خود کو جتنا بھی قصوروار ٹھہرایا ان دونوں کو بھی کٹہرے میں کھڑا پایا۔ آج تک اس کا تاسف، شرمندگی، ندامت ایک بار پھر غصہ ہٹ دھرمی اور گلے میں بدل چکا تھا۔ وہ ایک بار پھر وہی پرانی والی عائدہ تھی جس میں نفرت کا زہر بھرا تھا۔

"کیوں خفا ہو رہی ہو میری جان، تمہیں سب حق ہے۔ لیکن یوں خود کو کمرے میں بند کر کے اذیت کیوں دے رہی ہو۔" لاڈ سے اس کے بالوں کو سہلاتا نورہ کا ہاتھ اچانک تھم گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں آفاق صاحب کی باتوں کے بعد وہ عائدہ سے اس تلخی کی امید نہیں کر رہی تھیں۔ وہ بہت مان اور پیار سے اس کے پاس آئی تھیں۔ اس کی باتوں سے انہیں تکلیف تو ہوئی تھی لیکن انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے اسے پچکارا۔

"ممی پلیز۔ آپ جائیں یہاں سے۔" اس نے لیٹے لیٹے رکھائی سے کہا۔ اور تکیے میں اپنی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کی نمی کو جذب ہونے دیا۔

وہ لاکھ چھپاتی لیکن ماں تھیں۔ بھلے اس کو سالوں خود سے دور رکھا تھا لیکن اس کی آنسوؤں میں بھیگی آواز سے اس کا غم جان گئی تھیں۔ وہ اسے سینے سے لگانا چاہتی تھیں، اسے بتانا چاہتی تھیں کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہیں لیکن وہ جانتی تھیں یہ سب عائدہ کے لیے بار بار کہے گئے جملے ہیں اور اس کے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ اس کے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ رو رہی تھی اور اکیلے میں بھی اور رونا چاہتی تھی اس لیے انہوں نے اسے اکیلا چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ عائدہ کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ تمہاری بہت بڑی نیکی ہے جو تم ایک ایسے شخص کو گھر لے آئے ہو جو تمہارا سب سے بڑا گناہ گار ہے۔ اس کا اجر تمہیں اللہ ضرور دے گا۔" چائے کی پیالی سائڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے وہ عذیر سے تشکر آمیز لہجے میں بولی۔ عذیر کے نزدیک ان تعریفی الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے یہ سب کر کے کوئی میڈل سینے پہ نہیں سجانا تھا۔ یہ تو بس ایک فرض تھا جو وہ نبھائے جا رہا تھا اور اس کو نبھانا تھا جب تک اس کی زندگی تھی، جب تک ان کی زندگی تھی۔

"یہ سب میرا فرض ہے۔ وہ بھلے میرے جتنے گناہ گار سہی لیکن ایک قرض تو ہے نہ ان کا مجھ پر۔ بس اسی ناطے سے مجھے ذمہ داری اٹھانی ہے۔" چائے کے کپ کے کناروں پہ انگلی پھیرتے ہوئے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ جانتی تھی وہ کس کرب سے گزر رہا ہے۔ اتنے سال گزر گئے جب وہ خود اس ذلت، بدنامی کو بھلا نہیں پائی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا وہ سب کچھ بھول پاتا جبکہ اس نے تو اس ذلت اور بدنامی کے ساتھ ساتھ مشکلات بھی دیکھی تھیں۔

"فرائض یکطرفہ نہیں دونوں طرف سے ہوتے ہیں لیکن انہوں نے اس کی اہمیت کو کہاں سمجھا اگر سمجھا ہوتا تو ہمارا خاندان یوں نہ بکھرتا۔ ان کے گناہ کا بوجھ مجھے تم سے نظریں نہیں ملانے دیتا۔" اس نے ہتھیلی سے اپنی آنکھوں کے نم گوشوں کو صاف کیا۔ عذیر کے سنجیدہ چہرے پہ ایک بامعنی مسکراہٹ ابھری۔ عورت اپنا غم، اپنا درد آنسو بہا کر ہلکا کر لیتی ہے لیکن مرد اس کی طرح آنسو نہیں بہا سکتا۔ اسے یہ درد کا آتش فشاں اپنے اندر دبا کر رکھنا ہی ہوتا ہے تاکہ اس پر مضبوطی اور طاقت کا لیبل چسپاں رہے۔ اس نے اپنی بے بسی پر سر جھٹکا۔

"تم انہیں معاف کر دو عذیر۔ اس طرح شاید اللہ ان کی اذیت میں کمی کر دے۔" اپنی نشست سے تھوڑا آگے ہو کر وہ اس کا بازو تھام کر التجائیہ بولی۔

"وہ فقط ہمارے گناہ گار تو نہیں ہیں۔ وہ سب سے زیادہ جس کے گناہ گار ہیں اصل معافی انہیں اسی سے مانگنی ہے، جس کے ساتھ انہوں نے سب سے زیادہ برا کیا ہے کیا معلوم وہ آج کس حال میں ہو۔" وہ چاہ کر

خود کو تلخ ہونے سے روک نہیں پایا تھا۔ عذیر کی بات اس نے نظر [illegible] وہ مقام تھا جہاں آ کر ہمیشہ یہ بات ختم ہو جاتی تھی [illegible] اسے کچھ نہیں کہہ پاتے تھے۔ سو آج بھی آگے خاموشی ہی تھی۔

٭ ٭ ٭

"عائدہ۔" وہ بک شاپ سے نکل رہی تھی جب کسی نے اسے آواز دی۔ اس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا اور اگلے ہی لمحے اپنے قدم آگے بڑھا دیے۔

"کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟" عذیر اسے یوں جاتا دیکھ کر تیزی سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ عائدہ نے بے بسی سے لب کاٹے۔ وہ اس شخص کو کیونکر بھول سکتی تھی۔ وہ اس شام کو کس طرح بھول سکتی تھی۔ وہ اس حادثے کو کیسے فراموش کر سکتی تھی۔ حالانکہ اس واقعے کو دو ماہ گزر گئے تھے لیکن وہ ایک پل بھی اسے اپنے ذہن سے نکال نہیں پائی تھی۔

"جی کہیے؟" انتہائی روڈ انداز میں وہ سنجیدہ چہرے کے ساتھ بولی۔

"کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟" عذیر کی اگلی بات نے اسے حیران کر دیا۔ دل میں اچانک دس طرح کے وسوسوں نے سر اٹھایا۔ دل تو کر رہا تھا وہاں سے بھاگ جائے پھر بھی پتا نہیں کیسے اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تمہیں کتابیں پڑھنے کا شوق ہے؟" بک شاپ کے بالکل برابر میں بنی کافی شاپ میں بیٹھتے ہوئے عذیر نے کہا۔ عائدہ جانتی تھی کم سے کم یہ بات پوچھنے کے لیے تو اے ایس پی عذیر احمد نے اسے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت نہیں دی۔

"ہاں اچھا ٹائم پاس ہو جاتا ہے۔" عذیر نے ہلکی سی مسکراہٹ سے عائدہ کے بے زار چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے سامنے پڑی بلیک کافی میں شکر ملانے لگا۔

"تم اور کیا کرتی ہو سوشل میڈیا استعمال کرنے کے علاوہ۔" عائدہ سمجھ گئی کہ وہ کس بات کے متعلق کہہ رہا ہے۔ اندر ہی اندر عذیر کا یہ جملہ اسے خاصا شرمندہ

[illegible]
[illegible]
کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے تو یہ [illegible]

"میں یہ بات آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔" جواب اس قدر رکھائی سے آیا تھا کہ چند لمحے عذیر اس کا منہ دیکھتا رہا۔

"چلو جو ضروری بات ہو وہ ہی بتا دینا۔ اگلی بار کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پہ جاؤ تو مجھے انفارم کر دینا۔ ہر بار اتفاقات ممکن نہیں ہوتے۔" وہ اسے باقاعدہ چڑانے والے انداز میں بولا تھا۔

"کیا آپ نے یہاں مجھے میری انسلٹ کرنے کے لیے بلایا ہے۔" عذیر کی اس بات نے اسے تپا دیا تھا۔ ایک لمحے کو عذیر کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس بار اس کا لہجہ نرم اور انداز دوستانہ تھے۔

"میرا مقصد تمہاری انسلٹ نہیں اصلاح ہے۔" وہ ماں باپ کی محبت سے خائف تھی ایک غیر کے خلوص کو کس خاطر میں لاتی۔

"سب کو میری اصلاح کی فکر ہی کیوں کھائے جاتی ہے۔" عذیر چونکا۔

"سب کون؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میرے گھر والے انہیں بھی مجھ سے بہت شکایتیں ہیں۔" وہ آنسو پیتے ہوئے بولی۔

"تو تم ان کی شکایتیں دور کر دو۔" وہ اس کی بات پر حیران بھی تھا پریشان بھی۔

"کیسے کروں میں ان لوگوں کی شکایات دور جنہیں میرا خیال نہیں ہے۔" عائدہ یوں چڑ کر بولی جیسے اپنے ماں باپ یا پھر بھائیوں کے سامنے بولتی تھی۔

"اور ایسا تمہیں کیوں لگتا ہے۔" عذیر کو اچانک اس کی باتوں میں دلچسپی ہو رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے بیٹھی اس لڑکی سے دلی ہمدردی تھی جو کسی ری ایکشن میں اپنی زندگی برباد کر رہی تھی۔

"کیونکہ یہی سچ ہے کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کو یوں لوگوں کے حوالے کر کے بھول نہیں جاتے ہیں۔" وہ تلخی سے بولی تو عذیر اس کی بات سن کر ہنس

دیا۔

"ماں باپ اپنی اولاد کو کبھی نہیں بھولتے۔ یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔"

"آپ ایسا اس لیے کہہ رہے ہیں کیونکہ آپ کچھ نہیں جانتے۔"

"کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی۔" عذیر کی بات سن کر وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔ وہ تو اسے ٹھیک سے جانتی بھی نہیں تھی۔

"تم مجھ پہ اتنا اعتبار تو کر سکتی ہو۔" عائدہ کے صبر کے بند شاید ٹوٹ چکے تھے اسی لیے اس نے اپنا آپ عذیر کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ آنسوؤں کو روکنا کٹھن تھا انہیں پلکوں پہ سمیٹنے کی کوشش کی لیکن وہ موتی چھلک ہی گئے۔

وہ بیتے سالوں کا ہر لمحہ' وہ درد' وہ اذیت' وہ تنہائی' وہ تڑپ۔ عائدہ نے اسے سب بتا دیا۔ وہ جو اپنے خونی رشتوں سے کبھی اپنا غم نہیں کہہ پائی تھی' وہ جس نے اسکول و کالج میں دوست اس لیے نہیں بنائے کہ کوئی اس کا داغ دار ماضی نہ جان لے' وہ اپنا ذلت بھرا بچپن' اپنی بے حرمتی اور اپنی کم مائیگی اپنے سامنے بیٹھے اس اجنبی کو بتاتی چلی گئی۔ پتا نہیں کیا تعلق تھا اس شخص سے جو اس پر اتنا اعتبار کر بیٹھی یا شاید اس کے ضبط کا دریا بے قابو ہو گیا تھا۔ سب کچھ کہہ کر وہ اب اس کے سامنے بیٹھی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ وہ اس وقت ایک کافی شاپ میں ہیں اور ارد گرد گزرتے لوگ اسے دیکھ کر کیا سوچ رہے ہوں گے۔ بہت سے لمحے گزر گئے اور جب اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو اس نے نظریں اٹھا کر عذیر کو دیکھا۔ جو ایک ٹک حیرت و بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ عائدہ کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے کوئی عفریت دیکھ لیا ہو۔ نہ کوئی تسلی تھی نہ دلاسا۔ فقط خاموشی۔۔۔ اور یہ سکوت عائدہ کو بے چین کر رہا تھا۔

یقیناً سامنے بیٹھا یہ شخص اس وقت مجھے اچھوت خیال کر رہا ہو گا۔ میرے ناپاک وجود سے اس کو بھی گھن آتی ہو۔ میری اصلیت سن کر اب اس کو میری قسمت پہ میری پیدائش پہ افسوس ہو تا ہو گا۔ عائدہ کا ذہن عذیر کی خاموشی میں بدگمانی تلاش کر رہا تھا۔

کاش میں اسے یہ سب نہ بتاتی۔ پہلے ہی کون سا اچھا تاثر تھا اس پر جو اپنا ماضی بتا کر میں نے اس شخص کی نظروں میں اپنا آپ پاتال کی پستیوں میں گرا لیا۔ دل کو عجیب ملال ہوا تھا۔ وہ چور نظروں سے عذیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو اسے لگا شاید عذیر وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ جو وجود اس کے سامنے بیٹھا ہے وہ نظر کا دھوکا ہے۔ عذیر کی خاموشی اسے الجھن میں مبتلا کر رہی تھی۔

"عائدہ۔" یک دم وہ کسی گہری سوچ سے نکلا تو اس کی آواز میں نہ وہ پہلے والا رعب تھا نہ اعتماد۔ عائدہ کو اس کی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی تھی۔

"یہ رکھ لو۔" اپنی جیکٹ کی جیب سے ایک سی ڈی نکال کر اس نے میز پہ رکھی اور مزید کچھ کہے سنے بغیر وہ وہاں سے چلا گیا۔ عائدہ حیرت کی تصویر بنی اسے وہاں سے جاتا دیکھتی رہی۔ عذیر کی خاموشی نے اسے ہرٹ کیا تھا تو اس کے یوں کچھ کہے بنا چلے جانے نے شرمندہ۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ وہاں بیٹھی آج اپنی عذیر سے ملاقات کو سوچتی رہی اور پھر سامنے پڑی سی ڈی اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لی۔

☆ ☆ ☆

شاپنگ کرنے کا موڈ تو بہرحال غارت ہو چکا تھا۔ ماضی کی راکھ کریدنے سے اس میں دبی چنگاریاں ایک بار پھر وجود کو سلگا رہی تھیں۔ اور سونے پہ سہاگہ عذیر کے یوں بن کہے سنے چلے جانے سے وہ اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔ خود پہ شدید غصہ آ رہا تھا بھلا ضرورت ہی کیا تھی اسے ایک اجنبی کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی زندگی کی تلخ حقیقت بتانے کی۔ اس نے تو دنیا داری کے انداز میں بھی اسے کچھ نہیں کہا تھا الٹا ایسی حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ہمیشہ کی طرح اس نے خود کو کمرے میں بند کیا ہوا تھا۔ کچھ

دیر یوں ہی چپ چاپ وہ خالی الذہنی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ ذہن عجیب سی الجھن کا شکار تھا اور عائدہ جانتی تھی یہ وہ دکھ نہیں ہے جو اتنے سالوں سے اسے جکڑے بیٹھے ہے۔ اچانک اسے اپنے اردگرد سے خوف آنے لگا۔ پہلے عذیر کی خاموشی اور اب یہ خاموش کمرہ اسے ڈرانے لگے تھے۔ اسے شور چاہیے تھا بہت سا شور بہت سی آوازیں ہنگامہ۔۔۔

اچانک اسے کچھ خیال آیا اور پھر اس نے اپنا پاس پڑا بیگ اٹھا کر اس میں سے جلدی جلدی سارا سامان بستر پہ پھینکنا شروع کیا۔ اس سارے سامان سے اس نے وہ سی ڈی الگ کی جو عذیر نے اسے دی تھی اور پھر اپنے کمرے میں رکھے سی ڈی پلیئر میں لگا کر والیوم اونچا کر دیا۔ یہ ایک ایم پی تھری آڈیو سی ڈی تھی۔ عائدہ کو لگا شاید اس میں اس کا کوئی پیغام ہو یا پھر اس کی پسند کے گانے۔ چند لمحے سی ڈی لوڈ ہونے میں لگے اور پھر میوزک پلیئر کے اسپیکر سے جو آواز عائدہ کی سماعتوں سے ٹکرائی اس نے اسے شاک کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کا موڈ شدید خراب تھا۔ آج سے پہلے کسی نے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا وہ ہمیشہ بہت تحمل اور بردباری سے کام لیتا تھا لیکن آج اس کے عملے نے اس کا ایک اور روپ دیکھا تھا۔ اس کے غصے کی زد سے کوئی نہیں بچ سکا تھا یہاں تک کہ انسپکٹر شبیر کو بھی معمولی سی بات پہ اس نے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ وہ جو بلا ضرورت کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا تھا جس کے عملے کی وفاداری کا راز اس کے اچھے اخلاق میں پنہاں تھا آج ان سب کو اپنی شخصیت کا ایک دوسرا رخ دکھا رہا تھا۔ پورے تھانے میں چہ مگوئیاں چل رہی تھیں۔ سب لوگ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس بدمزاجی کی وجہ جاننا چاہتے تھے لیکن اتنی ہمت کسی میں نہیں تھی جو ایس ایچ او عذیر احمد سے پوچھتا کہ آخر اتنا غصہ کس بات پہ۔۔۔؟

آج وہ وقت سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا تھا آتے ہی اس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ ملازم رات کے کھانے کا پوچھنے آیا تو اسے بھی انکار کر دیا تھا۔ چار سالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ وہ صبح اس لاغر فالج زدہ وجود کو دیکھنے اس کے کمرے میں گیا تھا اور نہ ہی گھر واپس آ کر اس نے وہاں جانے کی زحمت گوارہ کی تھی۔ تمام دن وہ اگر کسی کے متعلق سوچتا رہا تھا کوئی اس کے حواسوں پہ سوار تھا تو فقط عائدہ۔

☼ ☼ ☼

"شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے بڑا مہربان نہایت رحم والا جزا کے دن کا مالک ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں ہمیں سیدھا راستہ دکھا ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا نہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے۔"

سی ڈی پہ کوئی لیبل نہیں تھا اور عائدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس سی ڈی میں قرآن پاک کی تلاوت ہوگی۔ جیسے ہی کلام اللہ کا آغاز ہوا عائدہ مایوسی سے سی ڈی پلیئر کو بند کرنے اپنی جگہ سے اٹھی اور جب تک وہ وہاں پہنچی سورۃ فاتحہ کے اردو ترجمہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ عائدہ نے بچپن میں نانی کی مہربانی سے قرآن پڑھا تھا اور اس کے بعد نہ تو کبھی کسی نے کہا اور نہ خود وہ اس پاک کتاب کے قریب گئی۔ اسکول کالج میں بھی کورس کی کتابوں میں جو پڑھا اس کا مقصد پاس ہونا تو تھا مگر ہدایت کے اس پیغام کو سمجھنا ہرگز نہیں تھا جو اللہ نے اپنے بندوں کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے ان پر انعام کی صورت اتارا تھا۔ اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔

"ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔"

کب کی تھی اس نے اللہ کی عبادت اور کب مانگی تھی اس سے مدد۔ اور کچھ نہیں تو اس بے سکونی اور کرب سے نجات کی دعا بھی کہاں مانگی تھی کبھی۔ اللہ

کی بارگاہ میں ہاتھ کیسے اٹھاتے ہیں وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

"ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے۔" وہ بھی تو گمراہوں میں سے تھی 'خود ترسی اور مظلومیت کی توجیہات کا لبادہ اوڑھے وہ کیا کچھ نہیں کر رہی تھی۔ ماں باپ کی نافرمانی اور تذلیل 'نامحرم مردوں سے 'دوستی' غیر اخلاقی گفتگو۔ اس پر بھی تو گمراہی کا ٹیگ لگا تھا۔ وہ بھی تو نافرمانوں میں تھی پھر کیونکر وہ اللہ کے غضب سے بچ سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سب ٹھیک تو ہے نا عذیر؟ مجھے ملازم نے فون کرکے بتایا تم پچھلے کچھ دنوں سے بہت پریشان ہو۔" وہ انتہائی فکر مندی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہت جلد تو آنا نہیں ہوپاتا تھا پھر بھی جس قدر ممکن ہوتا وہ وہاں آتی رہتی تھی۔ اس بار تو ابھی چند روز پہلے ہی ہو کر گئی تھی 'لیکن عذیر کے بدلتے مزاج اور چڑچڑے پن کی داستان جب گھر کے ملازم کی زبانی سنی تو خود کو روک نہیں پائی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں پھوپھو۔" اس نے نظریں چرائیں۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ دیکھو میں تمہاری پھوپھو ہی نہیں تمہاری دوست بھی ہوں 'یاد ہے بچپن میں تم اپنے سب مسائل صرف میرے ساتھ شیئر کرتے تھے۔ تو کیا ہوا جو ظالم وقت اور قسمت کی ستم ظریفی نے ہمارے درمیان فاصلے حائل کر دیے 'لیکن آج بھی تم مجھے ویسے ہی عزیز ہو میری جان۔" انہوں نے رسانیت سے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"قسمت.... کتنے بے بس ہیں ہم اس ظالم شے کے ہاتھوں 'کچھ بھی تو ہمارے بس میں نہیں۔ جب چاہتی ہے آسمان سے زمین پہ پٹخ دیتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کیا ہوجاتا اگر میں بھی امی کے ساتھ ہی اس حادثے میں مرجاتا۔" اس کی قنوطیت عروج پہ تھی۔ وقت گزر جاتا ہے 'لیکن دل کی سرزمین پہ جو دراڑیں پڑجاتی ہیں ان کو بھرنے میں زندگی گزر جاتی ہے۔

"کیسی باتیں کر رہے ہو عذیر؟ اللہ تمہیں میری بھی عمر لگا دے میری جان۔ تم تو بہت بہادر ہو پھر کیوں آج اتنی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو اور تو اور تم نے اپنے بابا کے پاس جانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔" عذیر کی باتوں سے اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ ایک فقط یہی تھا جو اس کا میکا تھا۔ اس کا خون تھا۔

"میں بہادر ہونے کی اداکاری کرتے کرتے تنگ آگیا ہوں پھوپھو۔ نہیں رہنا مجھے بہادر 'نہیں دکھنا مجھے مضبوط 'میں بتانا چاہتا ہوں سب کو کہ میں ایک انتہائی کمزور انسان ہوں۔ ایک ٹوٹے ہوئے خاندان کا فرد ہونے کے باعث میری شخصیت میں جو توڑ پھوڑ ہوئی ہے اس پہ پردے ڈالتے ڈالتے تھک چکا ہوں۔ کیوں جاؤں میں اس شخص کے پاس جس کی وجہ سے میں نے اور میری ماں نے ذلت و رسوائی سہی جس نے ایک نہیں تین تین زندگیاں برباد کیں۔ یہ کرب مجھے دن رات مارتا ہے کہ میں ایک ریپسٹ کا بیٹا ہوں جس نے ایک کمسن بچی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ آپ نہیں جانتی جب بھی آس پڑوس کے لوگ امی کے پاس آکر ماضی کے حوالے دیتے اور ان کو برا بھلا کہتے تھے تو امی گھنٹوں اکیلی روتی رہتی تھیں۔ میں سب جانتا تھا لیکن میں کبھی ان کے آنسو پونچھنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ میں کہاں سے بہادر ہوا۔ ارے میں تو اپنے سامنے بیٹھی اس لڑکی کو تسلی اور دلاسا بھی نہیں دے سکا جس کی زندگی سے بچپن کی معصومیت چھیننے والا کوئی اور نہیں میرا اپنا باپ تھا۔" وہ پھٹ پڑا تھا۔

اس دن عائدہ سے ملنے کے بعد عذیر پہ جو انکشاف ہوا وہ کسی الیکٹرک شاک سے کم نہیں تھا۔ سارا کچھ کسی فلم کی طرح ذہن کے پردے پہ چلنے لگا تھا۔ عائدہ کی آنکھوں میں جو اذیت تھی وہ عذیر سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا کہ وہ خود اس واقعے کا چشم دید گواہ تھا۔ اس دن شارق نے عائدہ کے ساتھ جو کیا اور اس کی چیخوں کی آواز پہ جنا کے ساتھ عذیر بھی اس کے پیچھے پیچھے

کمرے میں آیا تھا۔ اپنی بچپن کی دوست کو یوں روتا بلکتا دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہوا یہ سب اس وقت تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن اپنے ماں باپ کے جھگڑے چاچا کا اسے لے کر گھر چھوڑ کر چلے جانا اور پھر شارق کا طویل عرصے تک فرار۔ لوگوں کی باتیں کم عمری میں اسے سب کچھ سمجھانے کے لیے کافی تھیں۔

"کیا کہا تم نے؟ تم۔ عذیر تم اس لڑکی سے ملے؟ تم عائدہ سے ملے؟ کب ملے تم اس سے کہاں ملی وہ تمہیں؟" سجیلہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ چند ماہ کی عائدہ کو پہلی بار سجیلہ ہی اپنے گھر لے کر آئی تھی اور پھر سالہا سال اس بچی کا ان کے گھر سے رشتہ جڑا رہا۔ وہ ان کی زندگیوں سے دور چلی گئی مگر یہ رشتہ ختم نہیں ہوا فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کی باتیں دل کو سکون اور ہونٹوں کو مسکراہٹ نہیں بخشتی تھیں بلکہ ضمیر پہ بوجھ بڑھ جاتا تھا۔

عذیر نے بوجھل دل کے ساتھ اپنی اور عائدہ کی ملاقات حرف بہ حرف سجیلہ کو سنادی۔ وہ اسے کہاں اور کن حالات میں ملی وہ اس وقت کس طرح کے ذہنی بحران سے گزر رہی ہے کیسے اپنوں سے بدگمان ہے اور اس کا بدلہ اپنا آپ برباد کر کے لے رہی ہے۔ وہ سب اسے بتا تا رہا۔ سجیلہ بت بنی عذیر کی باتیں سن رہی تھی۔

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اس سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگوں گی بس ایک بار وہ میرے بھائی کو معاف کر دے۔" وہ اچانک ہوش میں آئی تھی۔

"آپ اس سے صرف اپنی غرض کے لیے ملنا چاہتی ہیں پھوپھو۔ آپ کو اس سے زیادہ اپنے بھائی کا خیال ہے؟ یہ جان کر بھی کہ وہ کس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے کتنی ابنارمل زندگی گزار رہی ہے آپ اس کے پاس جا کر بابا کے گناہوں کی معافی وصول کرنا چاہتی ہیں۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی بے تحاشا حیرت۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا لیکن میں اس خود غرضی کے لیے مجبور ہوں۔ جو سالوں سے اس بستر مرگ پہ زندہ لاش بنا پڑا ہے نا یہ میرا ماں جایا ہے۔ اس کی بے بسی اور لاچاری مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ شخص اللہ اور اس کے بندوں کا گناہ گار ہے اور یہ بھی کہ اسے اپنے کیے پہ نہ ندامت تھی نہ شرمندگی میں اسے اس طرح عبرت کی تصویر بنے نہیں دیکھ سکتی عذیر۔ کیا تمہیں اس پہ رحم نہیں آتا یہ شخص تمہارا باپ بھی تو ہے۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"اسی ایک رشتے کی حرمت کو سامنے رکھتے ہوئے میں امی کی وفات کے بعد انہیں اپنے پاس لے آیا تھا۔ میرا اللہ جانتا ہے میں نے اپنے فرائض سے غفلت نہیں برتی لیکن ان کے جرم کے لیے انہیں معاف بھی نہیں کر سکتا۔" دسمبر کی شام کی ساری سردی اس وقت عذیر کے لہجے میں اتر آئی تھی۔ سجیلہ محض لب کاٹتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے آپ سے ایک اجازت چاہیے؟" ناشتے کی میز پہ گھر کے سبھی افراد جمع تھے اور خلاف معمول آج عائدہ بھی وہاں ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ یہ بات سب لوگوں کے لیے حیران کن تھی۔ اس کے سونے جاگنے کے اوقات سے سب ہی واقف تھے مگر کسی نے اسے اس بات کا احساس نہ دلایا۔

"کیسی اجازت میری جان؟" نورہ اسے خوشی خوشی ناشتا سرو کر رہی تھیں۔ یوں تو پہلے بھی وہ اپنے کمرے تک محدود رہتی تھی لیکن کچھ عرصے سے اس کا رابطہ ساری دنیا سے کٹ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ بدل گئی تھی۔ بہت دنوں سے گھر کا ماحول پر سکون تھا۔ وہ بات بے بات لڑائی جھگڑے اب قصہ پارینہ تھے۔ نورہ اس کے یوں دھیمے لہجے میں اجازت طلب کرنے پہ تو اور بھی سرشار ہو گئی تھیں۔

"میں قرآن اکیڈمی جوائن کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بے حد اعتماد سے کہا ہدایت صرف انہی کو ملتی ہے جنہیں اللہ دینا چاہتا ہے اور وہ لمحہ ہدایت تھا جو عائدہ کی

زندگی کو بدلنے کے لیے کافی تھا۔ عذیر کی دی ہوئی قرآن کی آڈیو سی ڈی اس نے پچھلے چند ہفتوں میں کئی بار سنی تھی۔ ہر بار اس کا دل بے چین ہو جاتا تھا۔ کلام اللہ کا ترجمہ سنتے ہوئے اسے اپنے آنسوؤں پہ قابو نہ رہتا تھا ہر ایک لفظ اسے اپنے لیے اتری نصیحت لگتا بھٹکے ہوئے لوگوں کا بیان سن کر اپنی ذات آئینہ میں نظر آتی تاسف اور ملال بڑھ جاتا وہ ہدایت سے کتنی دور تھی ہر لحہ قسمت پہ شکوہ کناں رہی لیکن اس حقیقت سے دور کہ قسمت عطائے ربی ہے۔

برائی کا جواب بھلائی سے دینے کا حکم ہے اور غم پہ صبر کرنا اللہ کو پسند ہے جو عائدہ کے ساتھ ہوا وہ اس کا مقدر تھا لیکن اس نے اس کا ذمہ دار ہمیشہ اپنے والدین کو ٹھہرایا ان کو سزا دینے کی ٹھان لی اور خود کو دن رات بدلے کی آگ میں جلا کر خاک کر ڈالا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اس نبی کی امت میں سے تھی جنہوں نے پتھر کھا کر بھی دشمنوں کے لیے خیر کی دعا کی۔ جنہوں نے معافی کو اپنا طریق بنایا۔ وہ کس قدر بھٹکی ہوئی تھی اس بات کا احساس اسے قرآن کی تلاوت سننے کے بعد ہوا۔ وہ جو اس دن عذیر کے یوں چپ چاپ وہاں سے چلے جانے اور وہ سی ڈی اسے پکڑانے پہ حیران تھی اس پہ راز کھلا کہ کیوں عذیر نے اسے کوئی تسلی نہیں دی کیوں اس کے ساتھ ہوئی زیادتی پہ اظہار تاسف نہیں کیا۔ وہ ایک بار پھر اس کی ممنون تھی۔ بے شک کلام اللہ سے بہتر کوئی دلاسا نہیں۔

"قرآن اکیڈمی لیکن کیوں؟ تم نے تو قرآن پڑھا ہوا ہے۔" نوریہ کو اس کی بات سن کر تعجب ہوا تھا یوں بھی ان کا گھرانہ نام کی حد تک تو مسلمان تھا لیکن عملی زندگی میں دین سے دوری کا یہ عالم تھا کہ فرائض پورے کرنا بھی مشقت لگتا تھا اگر والدین گھر میں دینی ماحول رکھیں تو اولاد کی دینی و دنیاوی تربیت کرنا سہل ہوتا ہے مگر جو محض دنیا داری میں مبتلا ہو جائیں وہ دنیا کی مشقت میں تھک جاتے ہیں پھر بھی تہی دامن رہتے ہیں۔

"پڑھا ہوا ہے لیکن نہ تو اس کی سمجھ رکھتی ہوں نہ

اس کی عملی زندگی میں اہمیت معلوم ہے۔ اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ میرا داخلہ کسی قرآن اکیڈمی میں کروا دیں۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا اور پھر اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے سامنے پڑی ناشتے کی پلیٹ میں رکھا آملیٹ ختم کیا اور خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"یہ اچانک اس کو کیا ہو گیا ہے؟" وہ ڈائننگ روم سے نکلی تو نوریہ نے اپنے اندر کی حیرت کو باہر نکالا۔

"کوئی نیا تماشا کرنے کی سوجھی ہو گی۔" اس سے پہلے کہ کوئی اور اس بات پہ اپنی رائے کا اظہار کرتا عنمل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ نوریہ ہی نہیں آفاق صاحب نے بھی اس کی بات پہ سر اٹھا کر دیکھا۔

"تم چپ رہو۔" ماں اور باپ کو اپنی بیوی کی طرف دیکھتا پا کر شیراز نے اسے گھر کا۔

"عائدہ اگر قرآن کلاس میں جانا چاہتی ہے تو اسے جانے دو۔ شیراز تم کل ہی عائدہ کا داخلہ کسی نزدیکی قرآن اکیڈمی میں کرا دینا۔" آفاق صاحب نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اس سے آگے کسی کو بات کرنے کی جرات ہرگز نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

یہ حقیقت جاننے کے بعد کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کی بربادی کے زخم آج بھی کسی ناسور کی طرح عذیر کے دل میں ہرے ہیں وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ وہ دن فقط عائدہ کے لیے ہی قیامت نہیں تھا وہ قیامت عذیر پر بھی ٹوٹی تھی۔ اس دن عائدہ کے بچپن کو مسخ کرنے کے بعد شارق وہاں سے فرار ہو گیا تھا لیکن شارق کی بدنامی اور مکروہ فعل کی داستان جنگل کی آگ کی طرح ہر سو پھیل گئی۔ حنا اور شارق کی علیحدگی عذیر کے لیے ایک اور ذہنی اذیت تھی۔ باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں سی زندگی گزارنے کا کرب وہی جانتا ہے جو اس تکلیف سے گزرا ہو۔ وہ عائدہ کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسا دینا چاہتا تھا۔ اس کے آنسوؤں کو پونچھنا چاہتا تھا ان دونوں کا گناہ گار ایک ہی شخص ہے وہ اسے کیسے بتاتا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ اس دن وہ اس بک شاپ سے قرآن پاک کی تلاوت والی سی ڈی لینے آیا تھا جہاں اس کی عائدہ سے اتفاقی ملاقات ہوئی اور بے ساختہ عذیر نے وہ سی ڈی نکال کر عائدہ کو دے دی۔ بے شک کلام اللہ دلوں کے لیے تسکین کا باعث ہے اور اس کی طرح عائدہ بھی تو سکون کی متلاشی تھی۔ کچھ ایسی ہی باتیں سوچتے ہوئے کب وہ سجیلہ کی طرف چلا آیا اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

"میں عائدہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں پھوپھو۔" ہم کیا چاہتے ہیں یہ کبھی کبھی ہم خود نہیں سمجھ پاتے ہیں برسوں جس شے کی تلاش میں ہلکان ہوتے ہیں جس کو پالینے کی دعائیں کرتے ہیں جس کا ورد آپ کو جینے نہیں دیتا اچانک اسے سامنے دیکھ کر پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد وہ پتھر بولا بھی تو کیا۔

"عائدہ سے شادی۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو عذیر؟" سجیلہ کو اس کی ذہنی حالت میں شبہ ہوا تھا۔

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو آپ نے سنا ہے اور میں چاہتا ہوں آپ عائدہ کے گھر جا کر رشتے کی بات کریں۔" اتنے سالوں میں اس نے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں بار دل میں یہ تمنا کی تھی کہ بس ایک بار قدرت اسے عائدہ سے ملا دے وہ جو اس کے بچپن کی ساتھی تھی اس کی دوست تھی بس ایک بار وہ یہ جان پائے کہ وہ کیسی ہے؟ کیا وہ خوش ہے؟ بس ایک بار اس کا سامنا عائدہ سے ہو جائے وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اتنے سالوں میں کوئی ایک دن ایسا نہیں گزرا جب اس نے عائدہ کو یاد نہ کیا ہو وہ اسے کبھی بھول نہیں پایا نہ اس کے ساتھ ہوئی زیادتی کو۔ یہ جاننے کے بعد کہ وہ خوش نہیں وہ خود کو تکلیف پہنچا رہی ہے اپنے اپنوں کو دکھ دے رہی ہے وہ کیسے پرسکون رہ سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چلا آیا تھا لیکن دل پہ دھرا بوجھ کچھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ پچھتاوے کچھ اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ وہ سجیلہ کو کیسے سمجھاتا کہ اس وقت اس کے دل پہ کیا گزری ہے۔

"دیکھو عذیر میں جانتی ہوں شارق بھائی کے گناہوں کا بوجھ تم اپنے ضمیر پہ محسوس کرتے ہو اور تمہیں عائدہ سے ہمدردی ہے لیکن کفارے کا اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہو سکتا۔" سجیلہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کے لیے زندگی میں بہترین کی خواہش مند تھی اس کے نزدیک عذیر کا یہ فیصلہ ہرگز دانش مندانہ نہیں تھا۔

"کفارہ؟" وہ زیرلب بڑبڑایا اور اسی پل عائدہ کا سراپا اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ سلیقے سے اوڑھی بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپے وہ اس وقت قرآن اکیڈمی سے نکل رہی تھی۔ وہ کتنی مختلف لگ رہی تھی، کتنی پاکیزہ اور مقدس۔

"آپ کب جائیں گی اس کے گھر؟" اس کا انداز حتمی تھا یوں جیسے اس نے سجیلہ کی بات سنی ہی نہ ہو۔

"اگر ان لوگوں نے انکار کر دیا جو شارق بھائی نے کیا اس کے بعد وہ اس رشتے کو کیسے منظور کریں گے؟" فی الوقت ایک یہی توجیہہ اس کے ذہن میں آئی۔ اسے کسی نہ کسی طرح تو عذیر کو اس ارادے سے باز رکھنا تھا۔

"جانتا ہوں اسی لیے آپ ان پہ یہ ظاہر مت کریں۔ انہیں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے یوں بھی وہ لوگ ہمیں ذاتی طور پہ نہیں جانتے ہیں۔" وہ جیسے سب کچھ طے کر کے بیٹھا تھا۔ اس نے جس قطعیت سے سجیلہ کو یہ سب کہا اس کے بعد سجیلہ کے پاس اب مزید اس رشتے کی مخالفت کی گنجائش نہیں تھی یوں بھی وہ اپنے معاملات میں خود مختار تھا اور اگر سجیلہ اس کی بات نہیں مانتی تو وہ کوئی دوسرا حل نکال سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے مزاج کی تبدیلی کو گھر کے ہر فرد نے محسوس کیا تھا۔ پہلے تو ہر وقت ذرا ذرا سی بات پہ گھر میدان جنگ بنا رہتا تھا اور اب یہ عالم تھا کہ کئی کئی دن گزر

جاتے وہ بی اچھا ہے زیادہ کسی سے بات ہی نہیں کرتی۔ وہ اب بھی زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔ اسے قرآن اکیڈمی جاتے خاصا وقت ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کا احساس جرم شدید ہو رہا تھا۔ دل ہر وقت بوجھل رہتا تھا۔ خود کو مظلوم سوچ کر اس نے اب تک ہر وہ کام کیا تھا جسے اللہ نے ناپسندیدہ کہا ہے اور اب وہ باتیں یاد آتیں تو پچھتاوے اور بھی شدید ہو جاتے تھے۔ اس رات بھی بہت دیر تک وہ یہی باتیں سوچتی رہی تھی اور پھر رات کے کسی پہر روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس نے خواب میں جو جگہ دیکھی وہاں اندھیرا بہت تھا اور چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ بڑے سے میدان میں حشر بپا تھا۔ اس بھاگ دوڑ میں کوئی کسی کا مددگار تھا نہ پرسان حال۔ لوگ وحشت کے عالم میں ایک دوسرے کو دھکیلتے کچلتے خود کو بچانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس جم غفیر میں گھبرائی ہوئی پریشان کھڑی تھی۔ اچانک اس کی نظر اپنے وجود پہ پڑی جو گندگی سے لتھڑا ہوا تھا، اسے خود سے گھن آ رہی تھی۔ وہ پلیدی اس کے سارے اعضا کو بدبودار کر رہی تھی۔ یک دم اس نے ایک بہت بڑا آگ کا الاؤ دیکھا جس کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے تھے۔ وہ لوگ اسے کھینچتے ہوئے لے جا رہے تھے ان کا رخ اس آگ کے بھڑکتے الاؤ کی طرف تھا۔ وہ چیخ رہی تھی چلا رہی تھی لیکن کوئی اس کی التجا نہیں سن رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے اس بھڑکتی آگ میں دھکیلتے ایک مضبوط ہاتھ نے اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ خوف اور دہشت سے اس کا بدن کانپ رہا تھا وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ بیڈ سائڈ لیمپ کو آن کر کے اس نے یہ تسلی کی وہ اس وقت اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہی ہے۔ کمرے میں روشنی ہوئی تو اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں پہ گئی، صاف تھے لیکن اسے کسی نادیدہ غلاظت سے گھن آ رہی تھی۔ اسی پل فضاؤں میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی، قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اذان کی آواز سنتی رہی اور پھر بستر سے اٹھی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ رگڑ رگڑ کر اپنا ہاتھ منہ دھوتے ہوئے اس نے اس نہ دکھائی دینے والی نجاست کو دھونے کی کوشش کی۔ اچھی طرح وضو کر کے وہ باہر نکلی اور جائے نماز بچھا کر نماز فجر کی نیت باندھی۔ نماز پڑھتے ہوئے بھی اس کے ذہن پہ فقط وہی خواب حاوی تھا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو زبان نے ساتھ نہ دیا۔ کس منہ سے وہ اللہ سے کچھ مانگتی بس زار و قطار روتی رہی لیکن ذہن میں وہ خواب ایک بھیانک سچائی کی طرح نمایاں تھا۔ وہ اس خواب کو کسی طور اپنے حواسوں سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ اسی لیے پورا دن الجھی الجھی رہی۔

"عائدہ آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔" صالحہ بخاری اس ادارے کی معلمہ تھیں جہاں عائدہ قرآن کی تعلیم لے رہی تھی۔ وہ بہت نفیس طبع اور شائستہ مزاج کی مالک تھیں۔ عائدہ نے جب یہاں آنا شروع کیا تو ان کے لب و لہجے اور انداز بیان کی وجہ سے وہ بھی انہیں بہت زیادہ پسند کرنے لگی تھی۔ اس نے دیکھا تھا لڑکیاں ان سے بہت قریب ہیں ان سے ہر بات بلا جھجک کہہ دیتی ہیں اور اپنے مسائل ان سے باآسانی ڈسکس کرتی ہیں۔ عائدہ کم گو تھی جلد کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی کجا اپنے مسائل کسی سے کہتی۔ وہ صالحہ بخاری کو پسند کرتی تھی لیکن ان کے قریب نہ تھی۔

"نہیں آپا جی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اگلا پورا دن بھی وہ خواب اس کے حواس پر پوری طرح سوار تھا۔ اس کا دھیان کلاس سے بار بار ہٹ رہا تھا۔ شاید صالحہ بخاری نے اس کے رویے کو محسوس کیا تھا۔ وہ کلاس سے نکلنے والی سب سے آخری لڑکی تھی۔ کمرے میں اس وقت ان دونوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

"میں نے نوٹ کیا ہے آپ یہاں کسی سے زیادہ بات چیت نہیں کرتی ہیں، بہت خاموش رہتی ہیں۔

میں نہیں جانتی یہ آپ کی طبیعت کا حصہ ہے یا لوگوں سے دور رہنے کی ایک سعی۔" ان کا لہجہ ہمیشہ کی طرح شائستہ تھا۔

"میں کم بات کرتی ہوں، یہ میری عادت ہے۔" اس نے بمشکل مسکرانے کی کوشش کی۔ پریشان تو وہ تھی اور پریشان ہونے سے زیادہ وہ خوف زدہ تھی لیکن کیا یہ بات کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا۔

"کم بولنا اچھی عادت ہے لیکن یوں سب سے الگ تھلگ رہنا اور دل کی باتوں کو دل میں رکھنا اچھی بات نہیں۔ جو باتیں دل کو پریشان کریں ان کو کہہ دیتے ہیں۔ اس طرح دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کوئی دوسرا آپ کی وہ پریشانی حل کر دے۔" وہ فقط معلمہ نہیں تھیں اس کلاس کی ہر لڑکی سے ان کا رویہ دوستانہ تھا، لڑکیاں خود ان سے اپنے مسئلے بانٹتی تھیں۔ وہ بہت عرصے سے عائدہ کی خاموشی نوٹ کر رہی تھیں لیکن آج عائدہ کی پریشانی اس کے چہرے اس کے ہر عمل سے عیاں تھی اسی لیے انہوں نے اس سے بات کرنے کی ٹھانی۔

"آپا... وہ... میں..." وہ فقط پریشان نہیں تھی بلکہ خوف زدہ تھی۔ اسے تسلی اور دلاسا تو بہرحال چاہیے تھا۔ ایسے میں صالحہ بخاری کے محبت بھرے جملوں نے اسے ہمت دلائی۔

"بولو بچے...؟" وہ شفقت سے کہتی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"آپا انسان سے زندگی میں جانے انجانے میں بہت سی غلطیاں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں ہم لاکھ چاہ کر بھی وہ وقت واپس نہیں لا سکتے جب ہم سے وہ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں۔ بھلے آگے جا کر ہم اس برائی کے راستے سے پلٹ بھی آئیں تو ان ماضی کے گناہوں سے چھٹکارا کیسے پائیں کیونکہ ہر ایک عمل کا ریکارڈ تو اللہ کے پاس محفوظ ہے پھر اس کی سزا سے کیسے بچا سکتا ہے۔" یہ وہ سوال تھا جو اسے رات دن پریشان کر رہا تھا۔ آخر ایسا کیا کرے۔ جو ماضی کی غلطیوں کے عذاب سے چھٹکارا پائے۔

"کیا آپ نے کبھی توبتہ النصوح کا لفظ سنا ہے؟" وہ دھیمی سی مسکراہٹ سے بہت نرم لہجے میں گویا ہوئیں۔ عائدہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"توبہ کا مطلب ہوتا ہے اپنے چھوٹے بڑے تمام گناہوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنا، جانے انجانے میں ہوئے ہر گناہ کی معافی مانگنا اور گناہ فقط یہی نہیں جو ہم برائیوں میں مبتلا ہو کر اللہ کی نصیحت سے دور ہو جاتے ہیں بلکہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کرنا بھی گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ اور جانتی ہو توبتہ النصوح کیا ہے؟ توبتہ النصوح یہ ہے کہ ہر طرح کے گناہوں کو چھوڑ دیا جائے، ان پہ پشیمان ہوا جائے اور ہمیشہ یہ عزم رکھا جائے کہ دوبارہ کبھی کوئی گناہ نہیں سرزد ہوگا۔" ان کے بات کرنے انداز دل میں اترنے والا تھا۔

"تو کیا ہر گناہ کی معافی مل جاتی ہے؟" وہ بہت الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ صالحہ بخاری نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"اللہ کے آگے بندہ ہاتھ پھیلائے اور خلوص نیت سے کسی چیز کی تمنا کرے تو اسے ہمارے پھیلے ہاتھوں سے حیا آتی ہے۔ سورۃ نور میں واضح حکم ہے کہ "نجات کا رستہ توبہ میں ہے۔"

ایسا کیسے ممکن ہے کہ ہمارے جانے انجانے میں کیے گناہوں کی توبہ قبول نہ کی جائے۔ بس شرط یہ ہے کہ وہ سب دوبارہ دہرایا نہ جائے اور ایسا عمل جس سے اللہ کے کسی بندے کی حق تلفی ہوئی یا دل آزاری ہوئی تو اس سے بھی معافی مانگنی چاہیے۔" اس دن صالحہ بخاری سے باتیں کرنے کے بعد وہ گھر واپس آئی تو بہت ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔ یہ جان کر اللہ بندوں پہ دروازے بند نہیں کرتا اور کچھ بھی ہو جائے تو [illegible] ہمیشہ کھلا رہتا ہے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

رات صلاۃ التوبہ پڑھنے کے بعد اس نے اللہ [illegible] دل سے اپنے ہر اس فعل کی نہ صرف [illegible] معافی [illegible] بلکہ نویرہ اور آفاق سے بھی اپنی تمام [illegible] مانگی تھی جس پہ ان دونوں نے اسے [illegible] معاف کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکا بہت اچھی پوسٹ پہ ہے۔ مجھے تمہارے بابا کو تو بہت پسند ہے اگر تم راضی ہو تو بیٹا اس رشتے کے لیے ہاں کردیں۔" نویرہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ لگتا تھا سالوں بعد قدرت ان پہ یوں مہربان ہوئی ہے۔ پہلے عائدہ میں آنے والی وہ مثبت تبدیلی اور اب اس کی شادی کی بات۔ وہ پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

"میرے لیے رشتہ؟ میری شادی کیسے ہوسکتی ہے؟" اس کا لہجہ مایوس اور آواز مدھم تھی۔

"کیوں نہیں ہوسکتی تمہاری شادی؟ کیا کمی ہے تم میں خوب صورت ہو، پڑھی لکھی ہو، اچھے خاندان سے تعلق ہے تمہارا۔ ایسی لڑکی کو تو ہر کوئی ہنس کر اپنی بہو بنا کر لے جائے گا۔" نویرہ نے اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا وہ لوگ جانتے ہیں میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے؟" اس نے مایوسی سے سوال کیا۔ اس سفاکانہ سچ پہ نویرہ کو شاک لگا تھا وہ خود کو کتنا بے مول سمجھتی تھی انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

"نہیں وہ نہیں جانتے اور ایسی بات انہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اللہ اللہ کرکے اتنے سالوں کے بعد تو اس بات پہ گرد جمی ہے اور تم ایک بار پھر گڑے مردے اکھاڑنا چاہتی ہو۔" ان کے لہجے میں پریشانی واضح تھی۔

"میں پہلے ہی آپ کے لیے بہت سے مسائل کھڑے کرچکی ہوں ممی اور یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ سب لوگ مزید کسی پریشانی میں مبتلا ہوں۔ آپ میری شادی کرنا چاہتے ہیں تو بے شک کردیں مجھے اس بات سے ہرگز کوئی اعتراض نہیں وہ کون ہے کیا کرتا ہے میں آپ سے یہ سوال ہرگز نہیں پوچھوں گی میرے والدین ہونے کے ناطے آپ نے یقیناً میرے لیے بہترین فیصلہ کیا ہوگا لیکن ممی میری صرف ایک شرط ہے وہ جو بھی ہے اسے آپ کو میری زندگی کا اتنا بڑا سچ بتانا ہوگا۔ میں کسی کو دھوکا دے کر اس کی زندگی میں ہرگز شامل نہیں ہوسکتی۔" عائدہ کی آنکھوں کی نمی نویرہ سے پوشیدہ نہیں تھی یہ وہ عائدہ نہیں تھی کہ جو زبان سے زہر میں بجھے تیر برسائی اور سب سے چھپ کر تکیے میں منہ چھپائے زار و قطار روتی تھی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو عائدہ؟ ان لوگوں سے یہ بات کرنے کے بعد کیا عزت رہ جائے گی ہماری۔ رشتے داروں اور قریبی ملنے جلنے والوں میں سے تو کسی کا حوصلہ نہ ہوا کہ آگے بڑھ کر تمہارا ہاتھ مانگتے۔ اب جو اگر قسمت مہربان ہوئی ہے اور کسی نے آگے بڑھ کر رشتے کی بات کی ہے تو اسے خود بھگا دوں۔" انہوں نے محبت سے اس کی آنکھوں کے نم گوشوں کو صاف کرتے ہوئے رسانیت سے کہا اور اپنے سینے سے لگالیا۔

"ممی کسی کو اس کے مقدر سے زیادہ نہیں ملتا۔ جو میرے نصیب میں لکھا ہے وہ مجھے ہر حال میں ملے گا اس لیے آپ اس بات سے پریشان ہونا چھوڑ دیں۔" نویرہ کے سینے پہ سر ٹکائے وہ آج پرسکون تھی۔ سالوں بعد وہ دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے کے اتنے قریب آئی تھی۔

"ہاں ہوں تمہاری کیسے پریشان ہونا چھوڑ دوں میری بچی۔ تمہیں کیا لگتا ہے وہ اتنا بڑا پولیس آفیسر جب اسے تمہارے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی کا پتا چلے گا تو وہ تم سے شادی کے لیے راضی ہوگا؟ ویسے بھی اتنا اچھا رشتہ تو قسمت والوں کو ملتا ہے۔ عذیر اے ایس پی آفیسر ہے۔ باپ بیمار ہے اور بس ایک پھوپھی ہے۔ تمہارے بابا اور بھائیوں کو بھی وہ بہت اچھا لگا ہے۔" اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے انہوں نے اپنی بات اسے سمجھانے کی ایک اور کوشش کی۔

"کیا کہا آپ نے۔۔۔ کون؟ اے ایس پی عذیر؟" وہ اچانک ان کے سینے سے جدا ہوئی تھی۔ چہرے پہ بے پناہ حیرت لیے اس نے ناقابل یقین انداز میں نویرہ سے پوچھا۔

"ہاں۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟" نویرہ کو اس کا یوں سوال کرنا چونکا گیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ میں۔۔۔ میں نہیں جانتی۔" عائدہ نے اٹکتے ہوئے کہا اور نظریں جھکالیں۔ نویرہ کو اگر وہ یہ بتادیتی کہ وہ عذیر کو جانتی ہے تو پھر اسے باقی ہر بات بھی بتانا ضروری ہو جاتا۔

"آفاق سے بات کرتی ہوں کہ وہی اسے سمجھائیں۔" نویرہ نے اپنے طور اسے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"ممی۔۔۔" عائدہ کی آواز پہ نویرہ نے پلٹ کر دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ اس رشتے کے لیے ہاں کردیں۔" اپنے ناخنوں کو کھرچتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی بات سن کر نویرہ کے چہرے پہ بے اختیار خوشی امڈ آئی۔ آگے بڑھ کر انہوں نے محبت سے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور اسے ایک بار پھر سینے سے لگالیا۔

☆ ☆ ☆

جہازی سائز پلنگ پہ وہ سرخ جوڑے میں ملبوس کسی شاعر کی غزل کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ اس کا رنگوں میں بھیگا دلکش سراپا۔۔۔ قیمتی زیورات اور عروسی جوڑے میں قیامت ڈھا رہا تھا۔ مہندی میں رنگی ہتھیلیوں کی نمی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ اس وقت بے تحاشا گھبرائی ہوئی تھی۔ عذیر سے بہت عرصے بعد اس کا سامنا ہونے والا تھا۔ اس دن نویرہ نے جب اسے عذیر کے رشتے کے متعلق بتایا تو بے ساختہ اس کے منہ سے شادی کے لیے ہاں نکل گئی۔ وہ خود اپنی اس کیفیت پہ حیران تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ عذیر اس کی زندگی کی ہر تاریک پہلو کے متعلق جانتا ہے کیسے وہ اس سے شادی پہ رضامند ہو گئی وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اب جب اس کا سامنا کرنے کا وقت آیا تو اس کے اندر شدید بے چینی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ وہ قدرے سنبھل کے بیٹھ گئی حالانکہ دل اس وقت دھک دھک کر رہا تھا۔

"کیا تم میرے ساتھ چلوگی۔ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔" عذیر کا انداز سنجیدہ تھا۔ وہ جو پلکیں جھکائے بیٹھی تھی اس کی بات سن کر حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی جو اس وقت کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ بنا کچھ کہے وہ بیڈ سے اٹھی اور اپنا بھاری لباس سنبھالتی عذیر کی تقلید میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ عذیر کا رخ شارق کے کمرے کی طرف تھا۔ بند دروازہ کھول کر اس نے ایک لمحہ اپنے پیچھے کھڑی عائدہ کو گردن گھما کر دیکھا جیسے تصدیق کرنا چاہتا ہو اور پھر اگلے پل وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ عائدہ بھی کچھ جھجکتے ہوئے اس کمرے میں چلی آئی۔ کمرے میں موجود میل نرس ان دونوں کو دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔ عذیر نے اسے باہر جانے کے لیے کہا اور پھر دروازہ بند کرلیا۔ عائدہ بے تحاشا حیرت مگر خاموشی سے کبھی عذیر اور کبھی بستر پہ لیٹے شارق کو دیکھ رہی تھی جو ان دونوں کو اپنے کمرے میں دیکھ کر خاصا خوش دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ میرے بابا ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے یہ اس بستر پہ معذوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ نہ تو بول سکتے ہیں نہ ہی چل سکتے ہیں۔ میں نے اپنے طور پہ ہر کوشش کی کہ ان کا بہترین علاج ہو سکے لیکن ان کی حالت میں سدھار نہیں آیا۔" شارق کے بستر سے چند قدم دور کھڑے عذیر نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کے پیچھے کھڑی عائدہ شارق کو دیکھ رہی تھی عذیر کی آواز پہ چونک کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"زندگی میں ہم سے بہت سی ایسی کوتاہیاں اور گناہ سرزد ہو جاتے ہیں جو کسی دوسرے کی زندگی کو ہمارے اعمال کی کتاب سے زیادہ سیاہ کر دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ان کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے عائدہ! انہوں نے جس کے ساتھ جو بھی زیادتی کی ہے ان میں سرفہرست تم ہو۔ یہ سب سے بڑھ کر تمہارے گناہ گار ہیں۔" وہ مٹھیاں بھینچے کہہ رہا تھا اور عائدہ اس کی بات کے پس منظر سے

بے خبر اسے سمجھنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ وہ چپ ہوا تو کمرے میں ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔

"میرے گناہ گار...!" کمرے کی خاموشی کو عائدہ کی حیرت میں ڈوبی آواز نے توڑا۔ عذیر نے اس پل مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بلا کا کرب تھا۔ شاید جو درد دل میں تھا وہ چہرے سے بھی عیاں تھا۔

"نہیں غور سے دیکھو عائدہ۔ کیا اس چہرے میں تمہیں رتی بھر شناسائی نہیں ملتی؟ ان جھریوں کے پیچھے پنہاں اس شبیہ کو پہچانو کیا یہ بستر مرگ پہ پڑا انسان تمہیں اپنا مجرم نظر نہیں آتا۔ یہ وہی شارق احمد ہے جس نے سالوں پہلے تمہارے بچپن میں زہر گھولا تھا۔" وہ بولا تو عائدہ کو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آیا۔ حیرت بے یقینی سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ کبھی اپنے سامنے، بیڈ پہ لیٹے شارق کو دیکھ رہی تھی اور کبھی اپنے سامنے کھڑے عذیر کو۔

گزرے ماہ و سال نے ماضی کا ہر نقش مٹا دیا تھا۔ کیسے یقین آئے کہ سامنے لیٹا نحیف انسان وہ عفریت ہے جس نے عائدہ کی زندگی برباد کردی۔ کیسے مان لے اس خوبرو بوجیہہ مرد کی صورت اس کے بچپن کے ساتھی روحی کی ہے۔ جو جب بھی یاد آیا درد بھی ساتھ لایا۔ اسے لگا وہ پاگل ہو جائے گی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت لگا تھا اسے عذیر کی ان تمام باتوں کو سمجھنے میں جن کے متعلق سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہو رہی تھی۔

اس دن عائدہ کی بات سن کر اس کا یوں خاموش ہو جانا اور پھر سب کچھ جانتے ہوئے شادی کا پیغام..... ہر بات سمجھ چکی تھی۔ اسے لگا اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اور اس پل جب اس کی نظریں شارق کے بندھے ہاتھوں پہ پڑی جو نجانے کس وقت اور مشکل سے کانپتے ہوئے اس سے معافی کا سوال کر رہے تھے۔ وہ نہ تو اس وقت کچھ کہنے کی حالت میں تھی اور نہ مزید کچھ سننا چاہتی تھی اس لیے بنا کچھ کہے وہ کمرے سے واپس چلی آئی۔ عذیر خاموشی سے اسے کمرے سے جاتا دیکھتا رہا۔ شارق نے عذیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لب ہلا کر کچھ کہنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ عذیر بوجھل قدموں سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ ایک بار پھر سارے زخم تازہ ہو گئے تھے جن کو بھول جانے کے لیے لاکھ جتن کر چکی تھی۔ پہلے والی عائدہ ہوتی تو شارق کا منہ نوچ لیتی۔ اس کو نقصان پہنچا کر اپنے اندر سکون اتار لیتی لیکن آج سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ وہ عائدہ رہی تھی نہ وقت نہ حالات۔ لیکن آنسوؤں پہ کس کا اختیار تھا وہ پہلے بھی بہاتی تھی اور اب بھی بہہ رہے تھے۔ روتے ہوئے اس کی ہچکیوں کی آواز کمرے کی خاموشی میں گونج رہی تھی جب عذیر کی کمرے میں موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے بے دردی سے اپنی گیلی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا۔

"یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو تمہارا مجرم ہے اور اس رشتے کے ناطے میں لاکھ چاہ کر بھی ان کے لیے اپنا دل سخت نہیں کر پایا میں اپنے باپ کو اس معذوری اور بے بسی کی کیفیت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکا لیکن عائدہ تم ہرگز یہ مت سمجھنا میں انہیں اس جرم کے لیے معاف کر چکا ہوں جو انہوں نے تمہارے ساتھ کیا میں تمہیں پورا اختیار دیتا ہوں چاہو تو انہیں سزا دے کر اپنا بدلہ چکا لو۔" وہ سنجیدہ اور مضبوط لہجے میں بولا۔ عائدہ نے اس کی بات سن کر گردن گھمائی۔

"کہتے ہیں انسانوں کے معاملے میں ہمیں ویسا ہونا چاہیے جیسے ہم اللہ سے اپنے لیے گمان کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اللہ ہمیں معاف کردے پھر یہ حوصلہ ہم کیوں نہیں دکھاتے۔ میں کون ہوتی ہوں کسی کو سزا دینے والی جب اللہ کی ذات سزا و جزا کے لیے موجود ہے۔ اپنی بہت سی نادانیوں کے لیے میں تو خود اس کے سامنے جھولی پھیلائے معافی کی منتظر ہوں۔ کیا یہی کم ہے اللہ نے اس شخص کو یوں بے بس ولاچار میرے سامنے لا کھڑا کیا جس سے میں اس دنیا

میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ وہ شخص فقط میرا تو نہیں اللہ کا بھی گناہ گار ہے اور جس کی سزا کا تعین اللہ کر چکا ہے اسے میں سزا کیوں نہ کردوں۔ میں نے انہیں معاف کیا۔"

وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ عائدہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے رخساروں پہ آنسوؤں کی لکیریں نمایاں تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا عائدہ کا دل اتنا بڑا ہو سکتا ہے۔ وہ اس ایک لمحے سے خوف زدہ تھا جب عائدہ کو یہ پتا چلے کہ وہ کوئی اور نہیں شارق کا بیٹا ہے تو وہ کتنا واویلا مچائے گی لیکن وہ اس کی شخصیت میں آتی تبدیلی سے بے خبر تھا۔ وہ بہت بدل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان کی شادی کو ایک مہینہ ہونے والا تھا۔ عائدہ نے ایک بار پھر قرآن اکیڈمی جانا شروع کر دیا تھا۔ گھر میں پچھلے ہفتے شارق کی موت کے بعد سے لوگوں کا آنا جانا لگا تھا اس لیے وہ باقاعدگی سے اپنی کلاسز نہیں لے پائی تھی۔ لیکن اس ہفتے سے اس کی روٹین بحال ہو گئی تھی۔ اس تمام عرصہ میں عائدہ کی عذیر سے کوئی خاص انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو سکی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خاموش رہتی تھی اور عذیر کی موجودگی میں بہت ریزرو ہو جاتی تھی۔ عذیر کا اپنا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا اور کچھ اس کے کام کی نوعیت ایسی تھی وہ اسے بہت زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا۔

"آپ کے لیے سوپ لائی تھی۔" وہ بیڈ پہ لیٹا تھا عائدہ نے ٹرے اس کے پاس رکھی تو وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پچھلے کچھ دنوں سے وہ عائدہ کے رویے سے ڈسٹرب تھا۔ وہ شارق کو معاف کر چکی تھی تو پھر عذیر سے اس کا یوں کھنچے کھنچے رہنا یہ بات اسے دن رات پریشان کر رہی تھی۔ آج کل وہ گھر بھی لیٹ ہی جا رہا تھا کچھ تو کام کی وجہ سے گھر واپسی کا کوئی وقت نہیں تھا اس پر عائدہ کی پریشانی۔ گھر سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب بھی کام سے فارغ ہو کر وہ بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑا رہا تھا جب سامنے سے آتی ایک

تیز رفتار موٹر سائیکل کو بچاتے اس کی اپنی گاڑی کا کنٹرول چھوٹ گیا۔ ایکسیڈنٹ معمولی نوعیت کا تھا لیکن عذیر کے دائیں ہاتھ میں ٹھیک ٹھاک چوٹ آئی تھی۔ ٹانگ پہ آئی چوٹوں کے باعث ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے بائیں ہاتھ سے سامنے پڑے پیالے سے چکن کارن سوپ لینا چاہا۔ وہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔

"میں کھلادوں؟" عذیر کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اس نے بے تاثر چہرے کے ساتھ عائدہ کی طرف دیکھا مگر کچھ کہا نہیں لیکن وہ اب اس کے پاس بیڈ پہ بیٹھی چمچے سے اسے سوپ پلا رہی تھی۔

"آپ کی بینڈیج بدلنے والی ہے میں ڈرائیور کو کہہ دیتی ہوں وہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے گا۔" اس کی اگلی بات نے عذیر کو مزید حیران کر دیا تھا۔ دس باتوں کے جواب میں ہاں یا نہیں سے کام چلا لینے والی عائدہ آج اس سے خود بات کر رہی تھی۔ شاید اس کو میرے حال پہ ترس آرہا ہے۔ وہ سوچے بغیر نہیں رہ پایا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی تکلیفوں کے اتنے طویل عرصے تک ناز اٹھانے کی عادت نہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولا۔

"بینڈیج بدلنا ضروری ہے ورنہ کیسے پتا چلے گا زخم بھر رہا ہے یا نہیں۔" سوپ کا پیالہ ختم کر کے وہ پاس پڑی کتاب پڑھنے لگا۔ عائدہ برتن واپس رکھ کر کمرے میں آئی تو اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ اس میں سے مرہم اور بینڈیج نکال کر اس نے عذیر کے دائیں ہاتھ پہ لگی پرانی بینڈیج اتاری۔ زخم ابھی بھرا نہیں تھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگتا ہے میں نے تم سے شادی کر کے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے۔" وہ اس کے زخموں پہ مرہم لگا رہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا ہاتھ رک گیا اور اس نے نظریں اٹھا کر عذیر کی طرف دیکھا جو بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے میرے ساتھ نہیں یہ زیادتی اپنے ساتھ کی۔ میں کسی طرح آپ کے لائق نہیں تھی۔" وہ ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔ عائدہ اب مرہم لگا کر ہاتھ پہ دوبارہ بینڈیج کر رہی تھی۔

"جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر یہ کفارہ آپ کو ادا نہیں کرنا چاہیے تھا اور میں جانتی ہوں جلد آپ اپنے اس فیصلے پہ پچھتائیں گے۔" اس نے نظریں ملائے بغیر کہا۔ اس کی بینڈیج مکمل ہو چکی تھی۔ وہ اب سارا سامان واپس فرسٹ ایڈ باکس میں رکھ رہی تھی۔

"میرا کوئی جرم نہیں تو میں کفارہ کس بات کا کروں گا؟" اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم اگر ایسی باتیں سوچتی ہو تو اس کا مطلب تمہارے دل میں میرے لیے سرے سے کوئی جذبات ہیں ہی نہیں اور ایک میں ہوں کہ۔۔۔" عذیر نے اچانک اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ سنجیدہ نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا عائدہ کو اس کی نظریں کنفیوز کر رہی تھیں وہ اس پل وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی کیسے بتاتی اسے کہ وہ اس کی زندگی میں کیا مقام رکھتا تھا۔ جب نورین نے اسے عذیر سے شادی کی نوید سنائی تو دل خوش گماں نے یہی جانا کہ یہ سب محبت ہے، لیکن اس رات جب عذیر نے اس پہ وہ سچ آشکار کیا تو سب سے پہلے اسے جس بات نے اداس کیا وہ یہ تھی کہ عذیر نے اسے شادی کسی جذباتی وابستگی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ احساس جرم و پچھتاوے کے زیر اثر کی ہے۔ کتنا چوٹ پہنچا رہا تھا یہ خیال کہ اس کا وجود ان چاہا ہے۔

"اس بات کی کیا اہمیت کہ میرے دل میں آپ کا کیا مقام ہے جبکہ آپ کی مجھ سے شادی کی وجہ کیا تھی، وہ سچ مجھے ہماری شادی کی پہلی رات ہی پتا چل گیا تھا۔" اس نے عذیر سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ اس وقت بستر پہ اس کے

اتنے قریب بیٹھی تھی کہ اس کی سانس کی آواز بھی سن سکتی تھی اور وہ بھی اس وقت اس کے دل کی دھڑکنیں بھی گن رہا تھا۔

"میرے لیے یہ بات بہت اہم ہے کیونکہ اس ایک بات پہ ہماری آنے والی پوری زندگی کا انحصار ہے اور جس چیز کی تم بات کر رہی ہو وہ بھی تمہارے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ تم سمجھتی ہو تم بہت بدل گئی ہو اپنی ہر کمزوری پہ قابو پا چکی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم آج بھی بدگمان ہونے میں ایک لمحہ نہیں لگاتی ہو۔ فرد جرم عائد کرنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" اس نے ایک ایک لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔

"ایک مرد ہو کر یہ بات اگر آپ کے لیے اہمیت رکھتی ہے کہ میرے دل میں آپ کا کیا مقام ہے تو آپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ بات میرے لیے کتنی اہم ہوگی کہ آپ کی زندگی میں آپ کے دل میں میری کیا جگہ ہے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے آخر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟" وہ روانی میں بول رہی تھی اس بات سے بے خبر کہ پاس بیٹھے عذیر کا موڈ اچانک بدل گیا تھا۔ وہ اسے بولنے پہ مجبور کر چکا تھا اور اس مقام پہ لے آیا تھا جہاں اس کی غلط فہمی کا خاتمہ کیا جا سکتا تھا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے اقرار محبت میں پہل اصولاً مجھے ہی کرنی چاہیے تھی۔" عذیر کا لہجہ جس قدر سنجیدہ تھا اس کی آنکھوں میں اتنی ہی شرارت بھری تھی۔ عائدہ بس ایک پل اس کی آنکھوں میں دیکھ پائی اور پھر اس نے نظریں جھکا دیں۔

"میں یہ سامان رکھ کر آتی ہوں۔" اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور پا کر وہ جلدی سے اٹھی۔ لیکن اگلے ہی پل عذیر نے اسے پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچ کر اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"تو کیا تم نہیں جاننا چاہتی میرے دل میں تمہارا کیا مقام ہے؟ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟" وہ اب شرارت کے موڈ میں تھا۔

"میرے دل کی بنجر زمین تمہاری محبت کی پھوار کی منتظر ہے عائدہ! اس دشت محبت میں آبلہ پائی کا ثمر تمہاری چاہت کے نخلستان سے سیراب ہونا ہے۔ کیا میرے نصیب میں یہ محبت کی بارش نہیں لکھی؟" اس کے گالوں پہ انگلی پھیرتے ہوئے وہ گمبھیر آواز میں بولا تو عائدہ کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

"اس صحرا نوردی میں میں بھی ہمسفر ہوں۔ ایک پیاسا دوسرے پیاسے کو کیونکر سیراب کر سکتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"محبت کی بارش صحرا میں بھی سیلاب لا سکتی ہے اور میں آج اس طوفان میں تمہارے ساتھ بہہ جانا چاہتا ہوں۔ کیا مجھے اجازت ہے۔" اسے سینے سے لگاتے ہوئے عذیر نے اس کے ریشمی بالوں پہ بوسہ دیا۔ بالوں کا جوڑا کھل کر اس کی کمر پہ آبشار کی مانند پھیل گیا۔

"میں اس محبت کی برسات میں چند لمحے نہیں بلکہ تمام عمر بھیگنا چاہتی ہوں عذیر۔" اس کے سینے میں منہ چھپائے اس نے سرگوشی کی۔ ایسا لگ رہا تھا اس پل زمانے ٹھہر گئے ہوں گردش ماہ و سال تھم گئی ہو، بھٹکے ہوؤں کو منزل مل گئی، برسوں کی تلاش ختم ہوئی اور دو چاہنے والوں کو ان کی محبت مل گئی۔

چہرے پہ میرے زلف کو پھیلاؤ کسی دن
رازوں کی طرح اترو میرے دل میں کسی شب
میں اپنی ہر اک سانس اسی رات کو دے دوں
دستک پہ میرے ہاتھ کی کھل جاؤ کسی دن
سر رکھ کے میرے سینے پہ سو جاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو برس جاؤ کسی دن

آپ کا پیغام سہیلیوں کے نام

وہ دوست احباب اور مصنفین جو آپ سے دور ہیں اور آپ چاہتی ہیں کہ انہیں کوئی پیغام دیں اس کے لیے آپ قلم کا سہارا لیں اور ہمیں ارسال کر دیں ہم اسے شائع کر کے اس کی خوشبو سے قارئین کے ذہنوں کو بھی معطر کریں گے اور کیا خبر کہ "کوئی" آپ کی صدا کا منتظر ہو۔

ماریہ یاسر

امل کی کہانی

وہ غصے سے منہ پھلائے ساری زور آزمائی چپاتیاں بیلنے میں کر رہی تھی۔ گو کہ اس کا یہ غصہ کوئی نیا نہ تھا۔ ہر دوسرے دن منان کی کسی نہ کسی بات پر اس کا منہ غصے سے پھول ہی جاتا تھا۔ ارے پھول۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں آپ غلط سمجھے ہیں وہ والا "پھول" نہیں جناب "کپا" والا پھول اور ہر دوسرے دن اس پھولے پھولے سے منہ کی وجہ تو بس ایک ہی تھی جو شادی شدہ خواتین کی اکثریت کی ہوتی ہے۔ گو کہ یہ کوئی بہت بڑی وجہ نہیں جس پر کوئی معرکہ سرانجام دیا جاتا یا پھر شوہر نامدار سے ناراض ہو کے میکے سدھار اجاتا اور پھر لاکھ منتوں، مرادوں اور واسطوں کے بعد واپسی کی راہ لی جاتی۔ لیکن اتنی چھوٹی "وجہ" بھی نہ تھی کہ امل منان جیسی حساس اور منہ پھٹ لڑکی سے "ہضم" ہو جاتی۔

بس یوں سمجھ لیجیے کہ "وجہ" ایسی ہے کہ نا نگلی جائے اور نہ اگلی۔ اب کسی پرائے گھر کی بات بتاتی میں کوئی اچھی تھوڑی ہی لگوں گی، لیکن بتانی بھی ضروری ہے، پیٹ کا درد کیسے ٹھیک ہو گا جو یہ بات اپنے تک رکھنے سے انکاری ہے۔ چلیے پھر آپ سب سنیے امل کی کہانی اسی کی زبانی، لیکن ایک وعدہ چاہیے کہ کسی کو بھنک بھی نہ پڑے کہ میں نے آپ سے کچھ ذکر کیا ہے منظور ہے؟

★ ★ ★

"امل یار کدھر ہو ذرا میرے موزے تو آ کے نکال دو مجھے آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔" وہ جو ساس کا ناشتا بنانے میں زور و شور سے مصروف تھی، منان کی دوسری آواز پر جھنجلا اٹھی۔

"منان رات کو میں نے آپ کے موزے، رومال اور ٹائی نکال کے بیڈ کی سیدھی طرف والی کرسی پر رکھے ہیں۔" اس نے وہی معمول کا جملہ دہرایا۔

"یار وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے تم آ کے ڈھونڈ دو۔" رات کا سالن گرم کر کے ٹرے میں رکھتی امل تپ گئی۔

"کیا کروں ان کا، سمجھ میں نہیں آتا۔ میں کچن سنبھالوں یا پھر ان کے تکیے سے لگ کے بیٹھ جاؤں۔ ابھی تو بچوں کے لنچ بھی ریڈی کرنے ہیں۔ اسی لیے سب کچھ رات کو تیار رکھتی ہوں کہ صبح کوئی پرابلم نہ ہو لیکن یہ تو خود ایک پرابلم ہیں اور وہ بھی سیریس والی۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

"کیا بات ہے بہو، آج ناشتا ملے گا یا ایسے ہی رہنا پڑے گا سارا دن۔" ساس کی آواز کان میں پڑتے ہی اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔

"حد ہو گئی ہے، آنٹی بھی یوں ناشتے کی پکار کر رہی ہیں۔ جیسے ایک منٹ کی دیر سے ان کی کالج وین چھوٹ جانی ہے۔" اس نے بڑبڑاتے ساری چیزیں ٹرے میں رکھیں۔ اپنی ہی مثال پر اسے ہنسی آنے لگی۔ ہنسی دباتے ناشتا ساس کے سامنے رکھا اور واپس کچن کی طرف پلٹنے لگی۔

"یار آ رہی ہو کہ میں بنا موزوں کے ہی جاؤں۔" منان کو اپنی پڑی تھی۔

"آ رہی ہوں بابا، بنا موزوں کے جوتوں میں کیسے

لگیں گے، رکیے میں آتی ہوں۔" اسے منان کی دھمکی پر پھر سے ہنسی آنے لگی۔

"یہ دیکھو نا، کہاں ہیں موزے۔ تم کب سے چیخ رہی تھیں کہ کرسی پر ہیں دیکھو ذرا ہیں کہیں؟" وہ کسی ننھے بچے کی طرح اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لایا اور عین کرسی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جہاں اس کے گھر کا جوڑا، گیلا تولیہ اور بنیان بے یار و مددگار پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ وہ غصے سے بھنا گئی۔

"میں نے خود اپنے ہاتھوں سے یہاں رکھے تھے رات کو۔" ساری چیزیں۔ ایک ایک کر کے بازو پر منتقل کرتے اس کی زبان بھی صفائی دے رہی تھی کہ اچانک ان کپڑوں کے نیچے پڑے موزے اپنی موجودگی کا چیخ چیخ کے اعلان کرنے لگے۔ "ایک تو آپ اپنی ساری چیزیں ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں، پھر غصہ مجھ پہ۔ ایک دفعہ یہ اتنا قیمتی سا زو سامان ہٹا کے تو دیکھ لیتے۔ لیکن نہیں، مجھے تو تنگ ضرور کرنا ہوتا ہے۔ رات کو سب کچھ تیار رکھتی ہوں، لیکن پھر بھی صبح صبح۔" وہ بولنے پر آئی تو منان کی کھسیانی ہنسی کو بھی ان دیکھا کر دیا۔

"ممااِدھر کیا کررہی ہیں۔ مجھے ناشتا دیں' لیٹ ہورہی ہوں میں...." فضا نے سونے پر سہاگہ والی انٹری ماری تو امل کے کانوں سے دھواں اٹھنے لگا۔ جسے منان بھانپ چکا تھا' کھسکنے میں عافیت جانی' پر امل کی عقابی نظروں سے بچ نہ سکا۔

"ہاں... ہاں... اب چوروں کی طرح نکل لیں آپ۔ کام جو پورا ہوگیا آپ کا' مجھے ستا کے۔ توبہ ہے گھر ہے یا چڑیا گھر۔ یہاں وہاں پکاریں آوازیں چیخ و پکار...."

"یار نہیں نظر آئے موزے کیا کروں۔ تم بھی تا سامنے نہیں رکھتی۔ غلطی تمہاری ہی ہے' اب مجھے کیا پتا کہ یہاں رکھے ہوئے میں نے جلدی جلدی میں رکھ دیے کپڑے بنا دیکھے۔" اب کے وہ صفائی دے رہا تھا۔

"ہاں ہاں... میری ہی غلطی ہے۔ جو آپ سے امید رکھتی ہوں کہ میرا احساس کریں گے۔ پر آپ کہاں؟ میں تو نوکر ہوں کام کرتی جاؤں اور اف تک نہ کروں۔ کیا کیا کروں صبح اتنا شارٹ ٹائم ہوتا ہے۔ کچن دیکھوں۔ آپ کی ماں اور آپ کے بچوں کو دیکھوں یا پھر آپ کی آوازوں پر ہر دو سیکنڈ بعد بھاگتی دوڑتی آؤں۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔ کچھ تو خیال کریں۔" اس کی آواز بھیگنے لگی۔

"بس بھی کرو۔ پھر سے مت شروع ہوجانا اب۔ دو کام کیا بول دیے' پورا لیکچر ہی دے ڈالا۔ کوئی انوکھا کام نہیں کرتی تم جو یوں واویلا مچا رہی ہو۔ اور گھر کا کام ہوتا ہی کتنا ہے۔ جو تم یوں شور کرتی رہتی ہو۔ دو برتن دھو لیے تو کچن نپٹ گیا۔ جھاڑو یہاں گھمایا وہاں اڑایا۔ تو بھئی صفائی ختم۔ برتن میں ساری سبزیاں' دالیں ایک ساتھ چڑھا کے خود میکے فون گھما ڈالا۔ جب بول بول کے گلا خشک ہونے لگا تو پانی پینے کچن میں گئیں' چولہا ہانڈی تیار۔ پھر اس کے بعد ہوتا ہی کیا ہے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کے دوسروں کی چغلیاں کھانا۔ اور گپیں۔ گھر کے کام ہی کتنے ہوتے ہیں جو تم خود کو مظلوم ظاہر کررہی ہو۔ ارے پتا تو تمہیں جب لگے کہ باہر نکل کر نوکری کرنی پڑے۔ تب میں پوچھوں گا۔ گھر کا سکون تمہیں چڑیا گھر لگتا ہے تو باہر تمہیں لگ پتا جائے۔"

وہ جب بولنے پر آیا تو اگلی پچھلی ساری کسر ان پانچ منٹ میں نکالتا ہوا تیار ہوتا رہا۔ آئینے میں کنگھا کرتے ایک طنزیہ سے نگاہ اس پر ڈالی جو اتنی عزت افزائی پر ہک دک سی کھڑی روبوٹ لگ رہی تھی۔ شادی کے ان بارہ سالوں میں اس نے بہت بار منان سے اسی قسم کے جملے سنے تھے' لیکن آج تو کچھ زیادہ ہی ہوگیا۔ وہ خود تو جاچکا تھا' لیکن امل بت بنی آنسوؤں سے بے خبر جانے کتنی دیر یونہی کھڑی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس بار سچ میں روٹھ گئی تھی' بس چپ چاپ کام کیے جاتی' جہاں سے آواز پڑتی اسی طرف لبیک کہتی مڑ جاتی۔ لیکن اس بار دل ٹوٹ چکا تھا۔ کیا تھا اگر میں نے احساس کروانے کے لیے دو کام گنوا بھی دیے۔ انہوں نے تو میری ان بارہ سالوں کی محنت کو رائگاں کر ڈالا۔ ٹھیک کہتے ہیں' میں نے اتنے سالوں میں کیا ہی کیا ہے سوائے ٹی وی دیکھنے' چغلیاں کھانے اور گپیں لڑانے کے۔ ان کے دونوں بچے تو یونہی بڑے ہوگئے خود سے جیسے سبزیاں' پھل' خود پھلتے پھولتے ہیں۔ لیکن پھر بھی سبزیاں پھل لگانے والا کتنی محنت کرتا ہے' تب جا کے وہ پھلتے پھولتے ہیں' یہ تو پھر انسان ہیں۔ ان بارہ سالوں میں۔ گھر میں بھلا کیا کام۔ سارا سارا دن میں تو آرام فرماتی ہوں۔ کام تو بس یہ ہی کر کے آتے ہیں۔ وہ دل برداشتہ سی خود ہی حساب کتاب کرنے میں لگی تھی۔ آج چوتھا دن تھا۔ لیکن منان نے اس کی خاموشی کا پوچھنا تو دور نوٹ تک نہ کیا۔ اسے اپنے سارے کام ٹائم پر مل رہے تھے۔ باقی گیا بھاڑ میں۔ پر اس بار بات امل کے دل کو لگی تھی۔ سو وہ کافی دیر تک سوچ بچار کر کے اٹھی تو مطمئن سی تھی۔

☼ ☼ ☼

اتوار گزر چکا تھا۔ پیر کی صبح اجلی اجلی اور گرم سی

تھی۔

"گھر میں کام ہی کیا کرتی ہو تم۔ آج بتاتی ہوں کہ کیا کام کرتی ہوں میں۔" بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ بڑبڑائی۔

ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی' اتنے میں منان کا الارم بج اٹھا جو وہ روز لگا کر سوتا تھا۔

"ارے تم ابھی تک سو رہی ہو' یہ کیا۔" وہ آنکھیں ملتا اٹھا تو اسے یونہی پڑے دیکھ کے پورے ہوش میں آگیا۔ "ابھی اٹھو گی تو ناشتا کب بناؤ گی اور میں آفس کب جاؤں گا۔" وہ اسے جھنجوڑتے بڑبڑانے لگا۔

"فٹافٹ اٹھ جاؤ' میں نہا کے تیار ہو رہا ہوں' تم جلدی سے ناشتا ریڈی کرو۔" وہ الماری کھولے بولے جا رہا تھا۔ امل بظاہر آنکھوں پر ہاتھ رکھے تھی' لیکن چور نظریں اسی پر ٹکی تھیں۔

"یہ کیا' میری آفس کی شرٹ ایسے ہی پڑی ہے' پریس نہیں کی تم نے۔ میں پہن کے کیا جاؤں گا۔" اسے صحیح معنوں میں شاک لگا تھا۔ "جلدی سے پہلے شرٹ استری کرو' ناشتا بعد میں بنانا۔"

"اس ٹائم کہاں لائٹ ہوتی ہے۔ آنے میں تو کافی وقت ہے ابھی۔ آپ ایسا کریں وہ پچھلی پہن لیں۔" اس نے لیٹے لیٹے مشورے سے نوازا۔ بھلا ہو جو لائٹ نہ تھی۔ اس نے واپڈا والوں کو پہلی بار شاباشی دی۔

"لیکن وہ تو گندی ہے' تم نے رات کو استری کیوں نہیں کی۔" وہ بوکھلا چکا تھا۔ امل آفس یونیفارم کے بارے میں اس کا حساس ہونا اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے ڈھیلے سے لہجے میں بولی۔

"رات کو یاد ہی نہ رہا۔" وہ غصے سے اسے گھورنے لگا۔ اونٹ پہاڑ کے نیچے آچکا تھا۔ وہ اونٹ کی حالت سے لطف اندوز ہونے لگی۔

"یہ کیا' تم ابھی تک یونہی پڑی ہو' ناشتا نہیں بنایا' ابھی تک ساڑھے سات بج چکے ہیں' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ غصے اور شاک کی انتہاؤں کو چھونے لگا۔ آخر کو ان بارہ سالوں میں پہلی بار جو ہوا تھا ایسے۔ وہ اسے زور سے جھنجوڑ رہا تھا۔ امل نے آنکھیں مسلتے اٹھنے کی

ایکٹنگ کی۔ ہنسی تھی کہ اب چھوٹی کہ اب۔ بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول رکھا۔

"اوہ' پتا نہیں کیسے میری آنکھ لگ گئی۔ مجھے پتا ہی نہ چلا۔ رکیں میں ابھی بنا دیتی ہوں ناشتا۔"

"بڑی مہربانی آپ کی۔ ایک اور کرم فرمادیں' مجھے موزے دے دو' میں جا رہا ہوں آفس۔" غصے سے منہ پھولا ہوا تھا۔

"اچھا رکیے... میں واش روم سے آکے دیتی ہوں۔" وہ جان بوجھ کے باتھ روم گھس گئی اور منہ پر پانی ڈالتے ہنسنے لگی۔ اپنے پلان میں وہ کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ کافی دیر گزرنے پر منان باقاعدہ دروازہ پیٹتے دہائیاں دے رہا تھا۔ ساس کا ناشتا' دونوں بچیوں کے اسکول' اسکول اور منان کے موزے' موزے یہ ساری آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں' لیکن وہ خود پر جبر کیے تھوڑی دیر' تھوڑی دیر کرتی رہی۔ جب ساری آوازیں تھک ہار کے خاموش ہوئیں تو وہ آرام سے باہر آئی۔ ساس خود ہی چائے کا کپ بنائے پی رہی تھیں۔ منان بھی خود ہی ڈھونڈ ڈھانڈ کے موزے پہن کے جا چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے ناشتا بنا کے ساس اور بچیوں کو کرایا اور خود بھی چائے کا مگ لیے ٹی وی آن کر دیا۔ قسمت مہربان ثابت ہوئی' ساس ناشتے سے فارغ ہو کے کسی رشتہ دار سے ملنے چل پڑیں۔

"بات سنو بہو!" جاتے جاتے وہ پلٹی تھیں۔

"جی بولیں۔" "یہ تم ہر وقت مجھے اور میرے بیٹے کو کام کا اتنا جتاتی کیوں رہتی ہو۔ تم کوئی انوکھی عورت تو نہیں جو یہ سب کرتی ہے اور پھر گھر میں کام ہی کتنا ہوتا ہے جو ہر وقت ہمیں سناتی رہتی ہو۔ آج بھی میرا بچہ غصے سے بنا کچھ کھائے پیے چلا گیا۔ کچھ فکر ہے تمہیں' منان کے بعد اب وہ کھڑی اسے لیکچر دینے لگیں تو امل کو نئے سرے سے دکھ نے گھیر لیا۔

"اچھا آنٹی آئندہ میں خیال رکھوں گی اور آپ ٹھیک بول رہی ہیں' گھر میں کام ہی کیا ہے۔" اس نے ساس کے ناشتے کی خالی ٹرے جو واپس کچن میں لے جانے کے لیے اٹھائی تھی' واپس میز پر رکھ دی اور

کمرے میں آ کے ٹی وی آن کر دیا۔

☼ ☼ ☼

ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھول کے قدم اندر رکھے ہی تھے سامنے لاؤنج میں کھیلتی دونوں بچیوں پر نگاہ پڑی تو تھوڑا سا حیران ہوا کیونکہ اہل بچیوں کی پڑھائی کے لیے بہت پوزیسیو تھی۔ کچھ بھی ہو جاتا وہ فضول میں کبھی چھٹی نہ کراتی تھی ان کی اور آج وہ یوں رات کے کپڑوں میں بکھرے بال جو کچھ پونی کے اندر اور کچھ رف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ بنا کچھ کھائے پیے آفس چلا تو گیا تھا، لیکن ایک بجے ہی طبیعت نڈھال سی ہونے لگی تو جلدی آف لے کر گھر آگیا، لیکن گھر کی خاموشی اور خراب حالت نے اسے پریشان کر ڈالا۔

"یہ کیا تم دونوں آج اسکول نہیں گئیں اور مما کہاں ہیں تمہاری۔" اس نے صوفے پر اپنا کوٹ پھیلاتے کہا، لیکن اگلے ہی پل اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا، کیونکہ وہ کوٹ ناشتے کے گندے برتنوں پر رکھ چکا تھا۔ انڈے کی خالی پلیٹ توس بچا ہوا اور چائے کا بچا کچا کپ جو اس کے کوٹ کے بوجھ کو سہہ نہ پایا اور لڑھک سا گیا اور اس کی اس ادا پر بچی کھچی ٹھنڈی چائے نے کوٹ سے لپٹ کر دہائی دی تھی۔ اس کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

"کہاں ہے تمہاری ماں، یہ کیا حال بنایا ہوا ہے گھر کا اس نے۔" کوٹ وہیں چھوڑا اور اہل کو آوازیں دیتا آگے بڑھا ہی تھا کہ بال پاؤں کے نیچے آنے سے پیر پھسلا اور وہ اپنا توازن سنبھال نہ پایا اور سیدھا زمین بوس ہو گیا۔ ایک زبردست سی دھاڑ منہ سے برآمد ہوئی، جس پر بچیوں نے گھبرا کر وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔ اندر آواز سن کے اہل دوڑتی ہوئی باہر آئی اور چند پل میں ساری صورت حال سمجھ میں آنے پر ہنسی روکنے کے لیے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔ منان کی توجہ اپنی شرٹ کی طرف گئی جو زمین پر گرنے سے تھوڑی سی گیلی ہو چکی تھی۔ وہ نئے سرے سے جھنجلایا۔

"کیا مصیبت ہے بھئی۔" وہ چلایا۔ اہل بھاگ کے کمرے میں جا کے لیٹ گئی۔ شکر تھا کہ ساس گھر پر نہ تھیں۔ اب کے اس نے رخ کچن کی طرف موڑا۔ اسے لگا کہ آج بنا کھائے پیے جانے کی وجہ سے اہل اس کے لیے اچھے سے کھانے کا انتظام کر رہی ہوگی۔ زمین پر بکھرے کھلونوں اور جوس سے بچ بچا کے وہ صوفے کی طرف آیا، جہاں بچیوں اور اس کے بکھرے کپڑے، گیلا تولیہ، کنگھا اور جانے کیا کیا پھیلا ہوا تھا۔ اس کے منہ کا زاویہ مزید بگڑا۔ کچن میں قدم رکھا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا، وہاں کی حالت تو لاؤنج سے بھی گئی گزری تھی۔ سنک گندے برتنوں سے سجا اور بھرا ہوا تھا۔ وہ پیاس پر قابو پاتے ہوئے باہر کو نکلا۔ جلد بازی میں دیکھے بنا پاؤں رکھا جو پانی سے آدھی بھری بوتل پر جا پڑا، جو نہ جانے کس کونے کھدرے سے نکل کے اپنا دیدار کرانے آئی تھی۔ یہ تو شکر ہوا کہ اس نے بروقت کچن کے دروازے کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور یوں دوبارہ زمین بوس ہونے سے بچ گیا۔

"اف ف ف۔۔۔ شکر۔۔۔ بچ گیا۔"

اندر لیٹی اہل آنے والے مجازی خدا سے نپٹنے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ "اہل کہاں ہو تم، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے گھر کی۔" آخر وہ کمرے میں داخل ہو ہی گیا جہاں کا منظر یاہر سے ذرا بھی مختلف نہ تھا۔ کم و بیش ویسا ہی بکھراوا تھا وہاں بھی۔ منان کے کپڑے، موزے، بنیان، گیلا تولیہ یہاں وہاں پھیلا تھا۔ موزے ڈھونڈنے کے چکر میں وہ صبح صبح الماری سے کافی کچھ نکال کے میز پر ڈھیر کر چکا تھا۔ وہ سب ابھی بھی اسی جوں کی توں حالت میں موجود تھا اور اس سب سے بے نیاز بیڈ پر مزے سے لیٹی اہل جو بہت ہی انہماک سے کارٹون دیکھنے میں مشغول ہو چکی تھی۔

"ارے آپ آگئے آج اتنی جلدی۔" وہ اٹھ کے بیٹھی۔

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ عروہ اور رمنا آج اسکول کیوں نہیں گئیں، ابھی کدھر ہیں اور کھانا نہیں

بنایا ابھی تک تم نے۔ آخر پورا دن تم کرتی کیا رہی ہو۔" وہ غصے میں کھولتا ایک ہی سانس میں پوچھ گیا۔ جو مزے سے دوبارہ لیٹ چکی تھی۔

"جواب کیوں نہیں دے رہیں۔ کھانا کیوں نہیں بنایا۔ پتا بھی ہے کہ صبح ناشتا نہیں کیا تھا میں نے اتنی بھوک لگ رہی ہے۔ کب پکے گا اور کب میں کھاؤں گا۔" وہ غصے سے دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔

"بس آج میرا موڈ نہ تھا کام کا۔ اس لیے نہیں کیا۔" اس نے مزے سے کہتے ہوئے چینل چینج کیا۔

بکھرے بال' بازو میں پکڑی گیلی شرٹ جو اپنی آپ بیتی سنانے میں مصروف تھی۔ تھکا تھکا انداز۔ ایک پل کے لیے اس کے دل کو کچھ ہوا' لیکن اس نے خود پر قابو رکھا۔

"واٹ... کیا کہا تم نے' یہ کیا مذاق ہے واٹ ربش وہ غصے سے تنا' اسے گھور رہا تھا۔ کیا مطلب اس سب کا' کھل کے بتاؤ۔" اس نے جیسے ہار مان لی تھی۔

"مطلب وطلب کچھ نہیں ہے۔ آپ ہی تو ان بارہ سالوں میں کہتے آرہے ہیں کہ میں گھر میں کرتی ہی کیا ہوں تو آج میں نے وہ سب نہیں کیا جو میں ان سالوں میں کرتی آرہی ہوں۔ میں آپ کو کچھ بھی جتا نہیں رہی۔ بس آپ آج اچھی طرح سے دیکھ لیں کہ میں گھر میں کرتی کیا ہوں۔ کیونکہ آج آپ کو سمجھ میں آجائے گا کہ عورت گھر میں کیا کرتی ہے۔ سب آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ کیونکہ آج میں نے آپ کے طعنوں کے مطابق صرف ٹی وی دیکھا اور فون پر گوسپ کیں۔" کہتے ہوئے ایک پل کے لیے اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ منان اپنی خراب اور بکھری حالت کو بھلائے ہنسنے لگا' بے ساختہ ہنسنے لگا۔

"یار اچھا سبق سکھایا تم نے مجھے میری باتوں کا۔ یہ پریکٹیکل کرانا ضروری تھا کیا۔ دو دفعہ اتنی بری طرح گرا ہوں کچھ پتا ہے تمہیں۔ تم مجھے منہ سے کہتیں یا لکھ کے دیتیں تو بھی میں تسلیم کرلیتا کہ ہر عورت کی طرح تم بھی بہت کچھ کرتی ہو اپنے شوہر' بچوں اور گھر کے لیے۔" وہ بے چارگی سے ہنستے ہوئے بولا۔

"اگر پریکٹیکل نہ کرواتی تو آپ کو ٹھیک سے سمجھ میں نہ آتا نا۔" اس نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا اور کچن کی طرف چل پڑی۔

☆ ☆ ☆

اب آئی سمجھ کہ کیا وجہ تھی' لیکن کسی کو بتایے گا مت کہ میں نے پول کھولا اہل کا اور اس سب کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آپ سب بھی اپنے اپنے "منانوں" کے ساتھ یہی سب کرتے رہیں۔ سب لاتوں کے بھوت نہیں ہوتے' کچھ باتوں سے بھی مان جاتے ہیں اس لیے... اچھا مجھے اجازت دیں' آج کے لیے اتنا کافی ہے' لیکن پھر حاضر ہوں گی منان کی نئی رپورٹ لے کر کہ اس کی سمجھ میں بات واقعی آئی ہے یا پھر ابھی اور بھی امتحان باقی ہیں تب تک اجازت۔

☆ ☆

منشا محسن علی

تیسری قسط

یہ ان دنوں کی بات ہے جب پیرس میں خوب سردی پڑتی تھی۔ ناک کان سرخ ہو جاتے تھے۔ وہ دونوں اپنے وجود کے وزن سے بھی زیادہ وزن کے اونی کپڑے پہنے منہ سے دھواں اڑاتی پیرس کی سڑکوں پر شان بے نیازی سے چلتی تھیں اور پیرس کے جن باشندوں کو سردی نہیں بھی لگتی تھی وہ بے چارے اور خطرناک حد تک معصوم انسان فیریا اور ماریانا کو ڈھکا چھپا دیکھ کر ٹھٹھر جاتے تھے۔ ناک بہنے لگتی کان سرخ ہو جاتے تھے۔

"اُف۔۔۔ اتنی سردی۔" دونوں کے قل قل کرتے قہقہے پیرس روڈ پر بکھر جاتے تھے۔ کیفے کے بیرونی شیشے پر "کلوزڈ" کا بورڈ لٹکاتی وہ دونوں ضروری سامان خریدنے مارکیٹ آئی تھیں۔

"لسٹ تمہارے پاس ہے ناں؟" ماریانا کو نئے سرے سے تشویش ہوئی تھی۔ خیر ایک آفاقی سچائی یہ بھی ہے کہ تشویش کا دوسرا نام "ماریانا" ہے۔۔۔

"یس۔۔۔ ڈونٹ وری۔۔۔ لسٹ میرے موزے میں ہے۔" فیریا کے جواب نے ماریانا کو مجسمہ کر دیا۔

"بدتمیز۔۔۔ کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی۔۔۔ کوٹ کی جیب میں ڈال لیتیں تم۔"

"کوٹ کی اندرونی جیب چوہوں نے سلامت چھوڑی ہو تو۔۔۔" اگلی نے دانت پیس ڈالے تھے۔

وہ دونوں خراماں خراماں چلتی مارکیٹ گھومتی رہیں۔۔۔ ونڈو شاپنگ کے بعد کہیں جا کر اصل خریداری ہوتی تھی۔ مارکیٹ کیا تھی۔۔۔ شیشوں کا چوکور اور دائروی گھر تھی۔۔۔ سورج نکلتا تو شیشے آنکھیں چندھیانے پر مجبور کر دیتے۔ "کچھ لوگ بھی تو دھوپ میں پڑے شیشے سے ہوتے ہیں نظریں چندھیا جاتی ہیں انہیں دیکھ کر۔"

ماریانا لسٹ پر نظریں دوڑا رہی تھی "چاکلیٹ فلیورز، کریم، کافی کے ڈبے، شوگر، براؤنیز۔۔۔ اور تو کچھ نہیں رہتا ناں۔۔۔؟" فیریا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹرالی کو آگے دھکیلا تھا۔ ادھر ادھر سے چیزیں اٹھا کر وہ ٹرالی میں ڈالتی جا رہی تھی۔ "تم مجھے سن تو رہی ہو ناں۔۔۔؟" استفسار ہوا۔

"نہیں۔۔۔ بہری ہوں۔" بے نیازی سے جواب ملا۔

"کوئی شک نہیں۔" ماریانا کہہ کر دوسرے سیکشن کی طرف مڑ گئی تھی۔۔۔ فیریا گنگناتی ہوئی سامنے سے آتے دراز قد شخص سے ٹکرائی تھی۔۔۔ زمین و آسمان ایک ہو گئے تھے۔۔۔ جب حالت سنبھلی سامنے دیکھا تھا۔

"میم۔۔۔ آر یو اوکے۔۔۔؟" میم نے سر تھاما ہوا تھا۔

"اوکے" کہاں سے ہوتی۔۔۔؟

"تم ہمیشہ سے ہی اندھے ہو یا پھر لڑکیوں کو دیکھ کر بن جاتے ہو۔۔۔؟" سوال پر سوال ٹھاہ کر دیا گیا تھا۔ ڈیرک نے اس گلابی گلابی نظر آتی لڑکی کو دیکھا تھا۔۔۔ نظر جم گئی۔۔۔ اٹھ ہی نہ سکی تھی۔

"آپ کی خوب صورتی نے مجھے مسمرائز کر دیا ہے۔" فیریا گڑبڑا کر آگے بڑھنے لگی تھی۔

"آوارہ کہیں کا۔۔۔" آوارہ پیچھے پیچھے آنے لگا تھا۔

"اپنا نام تو بتا دیں پلیز۔۔۔" فیریا نے مڑ کے دیکھا، ٹرالی سے کافی کا فل سائز ڈبا اٹھا کر اس کے سر پہ دے

ناولٹ

مارا۔۔۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ ماریانا ادھر سے آئی اور فیریا کو بازو سے پکڑتی آگے بڑھ گئی تھی۔۔۔ ڈیرک کو شیشے کے گھر میں کھڑے کھڑے گلوب والی وچ کی وہ خطرناک حد تک پراسرار مسکراہٹ یاد آئی۔

"پیارے لڑکے۔۔۔ تمہیں محبت ہو گی اور ضرور ہو گی۔۔۔ پہلی نظر کی محبت۔۔۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔"

اور ڈیرک کو اپنا جواب بھی یاد آیا تھا۔

"مجھے کبھی محبت نہیں ہو گی۔"

"محبت پر رکھتی ہے۔۔۔ کبھی بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت اڑان بھرتی پہنچ جاتی ہے۔" پیرس میں گھومتی گھامتی محبت ڈیرک کے پاس اڑان بھرتی پہنچ گئی ہے۔۔۔!

"تمہیں ضرورت کیا تھی اس کے سر پر کافی کا ڈبا دے مارنے کی؟" ماریانا کیفے کے باہر جا کر "کلوزڈ" کا بورڈ لٹکا آئی تھی اور اب فیریا کی کلاس لے رہی تھی۔۔۔ فیریا پیرس کی سب سے بے نیاز ترین لڑکی بنی بند کیبنٹ کھول رہی تھی۔

"کمینہ فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ نام پوچھ رہا تھا۔"

"تو بتا دیتیں ناں تم۔۔۔ کون سا قیامت آ جاتی۔" اگلی بھی کم بے نیاز نہیں تھی۔

"تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو ماریانا۔۔۔؟" واقعی میں اسے دھچکا سا لگا تھا۔

فوم ڈسٹر سے ڈسٹ صاف کرتی ماریانا نے پلٹ کر اسے دیکھا اور سنک کی طرف بڑھ گئی۔

"اخلاقیات بھی کسی چیز کا نام ہے۔۔۔ نام پوچھ رہا تھا تو تم بتا دیتیں۔۔۔ سمپل۔۔۔ بائی دا وے۔۔۔ نرا ہی تھا سے گو کارہ بنی تم ہی اندھی بنی جا رہی تھیں وہ بے چارہ تو آرام سے ریکس ٹیک پڑھتا آ رہا تھا۔"

"تم کیوں اس کی اتنی سائیڈ لے رہی ہو؟ کہیں۔۔۔؟" اور لفظ "کہیں" کتنا خطرناک تھا ماریانا جانتی تھی۔

"میں اسے نہیں جانتی۔۔۔ بس ایک بار اس کی تصویر میگزین کے کور فوٹو پر دیکھی تھی۔"

"پھر تو پکا موسٹ وانٹڈ پرسن ہو گا۔۔۔ شرط لگا لو۔۔۔"

ایک ایک کپ ٹرے میں سنبھال کر رکھتی ماریانا نے مڑنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

بد تمیز لڑکی۔۔۔ وہ کسی امیر فیملی کا لڑکا ہے۔۔۔ اور خاصا خوب صورت ہے۔"

ایپرن کی ڈوریاں کس کر باندھتی فیریا بھی اس کے قریب چلی آئی تھی۔۔۔ اب وہ دونوں مل کر کرسٹل کے کپ سیٹ کر رہی تھیں۔۔۔ ونڈو پر سے پھر شٹل رہی تھی۔۔۔ روڈ پر کچھ لوگ خراماں خراماں چلتے نظر آتے تھے۔

"بہر حال کافی کے ڈبے سے وہ مر نہیں گیا۔" فیریا نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی تھی۔

"اقدام قتل تھا سیدھا سیدھا" ماریانا نے ڈرانے کی کوشش کی۔۔۔ اگلی مسکراتی ہوئی ایپرن کھونٹی پر لٹکاتی آگے بڑھ گئی تھی۔۔۔ وہ میز پر خالی ٹشو باکس اٹھا رہی تھی۔۔۔ میزوں کے کناروں پر کرسٹل کے گلدان رکھے تھے جن میں ایک ایک ٹیولپ کا پھول سجا ہوا تھا۔۔۔ وہ تھکن سی محسوس کر رہی تھی تو کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور ماریانا کو کام کرتا دیکھنے لگی تھی۔۔۔ وہ کیبنٹ میں ترتیب سے چیزیں رکھتی مگن سی اپنا کام کر رہی تھی۔۔۔! ادھر ماریانا نے سوئچ بورڈ پر ہاتھ مارا تو ست رنگی برقی روشنیاں جل اٹھیں۔۔۔ کھڑکی کے پار ہلکی ہلکی شام چھا چکی تھی۔۔۔ دور دور تک چمکتے نیون سائن نظر آ رہے تھے۔۔۔!

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھی بھاپ اڑاتے کافی کے کپوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"اپنا کپ اٹھاؤ ورنہ کافی ٹھنڈی ہو جائے گی۔" ماریانا نے متوجہ کیا تھا۔

"دل نہیں چاہ رہا۔۔۔" عجیب سی قنوطیت طاری تھی۔

"چاکلیٹ ڈال دوں؟" وہ فکر مند ہوئی تھی۔۔۔ کافی کے کپوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔" ماریانا کافی پیتی رہی وہ سامنے چپ سی بیٹھی رہی تھی۔۔۔ پھر اچانک بول اٹھی تھی۔

"منعم مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتا۔۔۔؟" ماریانا کو اچھو لگا تھا۔۔۔ اس نے ٹشو باکس سے ٹشو کھینچا تھا۔

"کبھی کبھی محبت ایک ہاتھ کی تالی ہی رہتی ہے۔۔۔ جو بجتی ہی نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔"

"ہر کسی کو ایسا لگتا ہے مگر مرتا کوئی بھی نہیں۔۔۔ پرانے لوگ مر جاتے ہوں گے آج کل کوئی نہیں مرتا۔"

ماریانا بے نیازی سے کہہ کر دوبارہ کافی پیتی رہی تھی۔۔۔ اور فیریا اپنا کافی کا کپ اٹھا کر سنک کی طرف آگئی۔۔۔ کافی بہا دی اور روتی رہی۔

کاش۔۔۔ محبت بھی کافی کی طرح ٹھنڈی ہوتی تو کہیں بہا دی جاتی اور دل کا کپ کسی اور تجربے کے لیے تیار رہ جاتا۔۔۔ کیسی افسانوی بات ہے۔۔۔!

☼ ☼ ☼

گلاس ڈور دھکیلتا وہ اندر داخل ہوا تھا۔۔۔ یوں لگا ٹھہر گیا۔۔۔ پتھر ہو گیا، وہ وہی تھی جو ایپرن باندھے پنسل جوڑا بنائے اپنی ساتھی لڑکی سے کچھ کہہ رہی تھی۔۔۔ آرکسٹرا کی مدھم دھنیں گھٹنے بڑھنے لگیں۔۔۔!

ڈیرک جیسے خود کو کسی ڈینجر لائن پر کھڑا محسوس کر رہا تھا۔۔۔ آگے بڑھتا تو موت پیچھے ہٹتا تو بھی۔۔۔! اس کا دل چاہا گلوب والی وچ کا گلا دبا آئے۔ محبت کا پرندہ آرکسٹرا کی دھن پر پھڑپھڑا رہا ہے۔۔۔! وہ قدم قدم چلتا کاؤنٹر تک آیا تھا۔۔۔ پنسل جوڑے والی مڑی تھی اور اسٹیچو ہو گئی تھی۔

"پلیز۔۔۔ ایک کپ کافی" ڈیرک بے نیازی سے یہ کہہ کر ٹیبل کی طرف بڑھ گیا تھا یوں لگا جیسے پہچانا ہی نہ ہو۔۔۔ فیریا کے ہاتھ سے زمین بوس ہوئے کپ کی ٹوٹی کرچیاں سمیٹتی ماریانا نے اسے گھورا تھا۔

"جاؤ۔۔۔ اب اسے کافی دے آؤ۔"

"ہم۔۔۔ میں دے آؤں؟" فیریا کی رنگت فنا ہونے لگی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ تم ہی دے آؤ۔۔۔ وہ کھا نہیں جائے گا تمہیں لگتا ہے وہ سب بھول چکا ہے۔" ماریانا نے جیسے تسلی دی تھی۔

کافی کا کپ ٹرے میں سجاتی وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ڈیرک تک آئی تھی۔۔۔ وہ بالکل بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔۔۔ کافی کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"سر آپ کی کافی۔۔۔"

وہ متوجہ ہوا۔۔۔ سر کو خم دے کر مسکرایا "تھینک یو مس۔۔۔"

"یور آر ویلکم" جان بچی سو لاکھوں پائے کا مصداق وہ واپس جا رہی تھی جب پیچھے سے آواز آئی تھی۔

"ایکسکیوزمی۔۔۔"

"یس۔۔۔" وہ حیرت سے فوت ہوتے ہوتے بچی تھی۔۔۔ جانے کیا کہنے والا تھا۔۔۔!

"شوگر ملے گی۔۔۔؟" وہ دنیا کا معصوم ترین انسان بن گیا۔۔۔ وہ دانت پیس رہی تھی۔۔۔ مسکرائی۔

"یقیناً"۔۔۔ "میں لے کر آتی ہوں۔" ہانپتی کانپتی وہ ماریانا تک آئی تھی۔۔۔ "لگتا ہے سب بھول بھال گیا

ہے۔۔۔ ورنہ میں تو سمجھی تھی کہیں اقدام قتل کی پاداش میں اریسٹ کروانے نہ آگیا ہو۔ اس یہ کیا؟" وہ بولتی ہوئی چپ ہوئی تھی۔ ماریانا کو ٹوٹے کپ کی کرچی چبھی تھی۔۔۔ انگلی سے خون بہہ رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا۔۔۔ معمولی سا کٹ ہے۔۔۔ ابھی خون رک جائے گا۔۔۔ تم اسے کافی دے آئیں۔۔۔؟"

زخم پر برف رگڑتی وہ پوچھ رہی تھی۔۔۔ فیریا شوگر اٹھاتی اس تک پہنچی تھی۔۔۔ دنیا کا معصوم ترین انسان کافی کا آخری گھونٹ لے رہا تھا۔۔۔ فیریا کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

"اب تو کافی پی لی۔۔۔ یو آر لیٹ۔۔۔" ڈیرک اس کی حواس باختگی نوٹ کر چکا تھا۔

"سوری سر۔۔۔ وہ اصل میں۔۔۔؟" ماریانا سے باتوں میں مگن وہ بھول ہی چکی تھی۔

"نو سوری۔۔۔ کبھی کبھی شوگر فری کافی پینا اچھا لگتا ہے۔۔۔ آپ بھی پی کر دیکھیے گا۔" ٹیبل پر پیسے رکھتا وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔۔۔ گوتم بدھ کا مجسمہ بنی وہ اب تک وہیں کھڑی تھی۔

"پلیز۔۔۔ ٹیک آسائیڈ۔۔۔" وہ تھوڑا ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"لبو نہیں کا۔۔۔" دراز قامت شخص اس بڑبڑاہٹ پر رکا۔۔۔ پلٹا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔۔۔؟"

"ناں۔۔۔ نہیں۔" وہ بمشکل مسکرائی تھی۔۔۔ وہ آگے بڑھ گیا تھا۔۔۔ کاؤنٹر پر رکا جہاں ماریانا زخمی انگلی پر ٹشو رکھے کھڑی تھی۔۔۔ خون رک نہیں رہا تھا۔۔۔ ٹشو خون کی سرخی سے بھیگ چکا تھا۔

"اینی ہیلپ۔۔۔؟" اپنائیت سے پوچھا گیا۔۔۔ ماریانا کی آنکھیں باہر ابلنے کو تیار۔۔۔!

"نہیں۔۔۔ شکریہ۔۔۔" انجرڈ لیڈی نے درد سے بمشکل اپنی سسکی روکی تھی۔ دراز قامت شخص انگریزی دھن گنگناتا گلاس ڈور دھکیلتا باہر نکل گیا تھا۔۔۔!

"تم نے اس کی مسکراہٹ دیکھی تھی۔۔۔؟"

"ادھر میں رخصت سفر باندھ لوں اور تمہیں اس کی مسکراہٹ کی پڑی ہے۔" نڈھال سی وہ کرسی پر جھول رہی تھی۔

"کمینہ۔۔۔ انجان بننے کا ڈرامہ کر رہا تھا۔۔۔ بدتمیز نہ ہو تو۔۔۔ خیر دفع کرو۔۔۔ تمہیں ڈاکٹر ٹانی کے پاس لے چلوں؟" ڈاکٹر ٹانی پیرس اسٹریٹ کے جانے مانے نیم حکیم خطرہ جان تھے۔۔۔ اور ماریانا کی ناپسندیدہ ہستی تھی

"سیدھا سیدھا آپریشن کر دے گا۔۔۔ سائیکو بڈھا۔"

"مرضی ہے تمہاری۔۔۔ میں نے تو مشورہ دیا تھا۔" نروٹھے پن سے کہتی وہ ریفریجریٹر سے سیب اٹھا کر کھانے لگی تھی۔

"اپنے پاس رکھو۔۔۔ اپنا عظیم مشورہ۔۔۔"

پھر ڈیرک اکثر کافی پینے آتا رہا۔۔۔ پہلے پہل وہ عجیب سا خوف محسوس کرتی رہیں۔۔۔ پھر مطمئن ہو گئیں اب بقول ان کے ڈیرک دنیا کا شرارتی ترین شخص تھا۔

☼ ☼ ☼

ڈیرک کا باپ جیکسن بانف تھا جو کہ ایک کروڑپتی انسان تھا اور اس نے شادی نہیں کی تھی بلکہ اس نے ڈیرک کو بھی کوڑے کے ایک ڈھیر سے اٹھایا تھا۔ وہ واقعی ایک شاندار شخص تھا جب ڈیرک اٹھارہ سال کا ہوا تو اس نے اپنے اسٹڈی روم میں ڈیرک کو سامنے بٹھا کر سب سچ سچ بتا دیا تھا۔۔۔ یہ الگ بات تھی کہ اس سچ سے واقف صرف وہ دونوں ہی تھے۔۔۔ باقی دنیا اس سے لاعلم تھی۔۔۔!

دنیا کے سامنے وہ مثالی باپ بیٹا تھا۔۔۔ جو شام کا کھانا ہمیشہ اکٹھے کھاتے تھے۔۔۔ اکٹھے جم جاتے تھے پبلک لائبریریوں کی خاک چھانتے تھے۔۔۔ ہر سہ پہر اپنے کتوں کو ٹہلانے لے جاتے تھے۔

ڈانس پارٹیز میں کپل ہو جاتے تھے اور لوگ ان کے رقص کے شیدائی تھے۔۔۔ پیانو تو ایسی بجاتے تھے کہ لوگوں کو حیرت آمیز سرور سے "بت" کر دیتے تھے۔

کافی ہمیشہ بدمزا اور بری بناتے تھے اسی وجہ سے

پیرس اسٹریٹ کی کافی شاپس سے استفادہ کرتے تھے کھانا اچھا یا برا ... یا پھر بہت اچھا۔ بہت بڑا خود ہی بناتے تھے اور شوق سے کھاتے تھے۔ اجب بھی ان کے پالتوں کتوں کو نزلہ ' زکام ہو جاتا تو ویٹرنری ڈاکٹرز کے پاس چکر لگائے جاتے تھے۔ جیکسن باف پرندے پالنے کے حق میں نہیں تھے... ان کے کئی پرندے ڈیرک آزاد کر چکا تھا۔

"پاپا... وہ آزادی چاہتے ہیں۔"

جیکسن باف سگار سلگاتے شدومد سے سرہلاتے رہ جاتے تھے... اکثر ان کا اختلاف شاعری کی صورت سامنے آتا کچن میں پہلا کپ ٹوٹتا "کیٹس جیسی شاعری کوئی نہیں کر سکتا۔"

"ولیم ورڈز ورتھ کی شاعری بے مثال ہے۔" دوسرا کپ ٹوٹتا... اور پھر خاموشی... ہولی چرچ کی گھنٹی بجتی تو دونوں بے نیازی سے سیڑھیاں چڑھتے وہاں پہنچتے... کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا جاتا اور واپسی پر دعاؤں کی بابت دریافت کیا جاتا تھا "کون سی دعا مانگی ...؟"

آپ کی لمبی عمر کی... "غور سے دیکھا جاتا تھا۔

"آپ نے ...؟"

"تمہاری لمبی عمر کی دعا مانگی۔" سرہلایا جاتا تھا۔ جامنی پھولوں والی سڑک پر ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کر وہ کہتے تھے۔

"ہم دنیا میں لمبی عمر پانے والے انسان ہو سکتے ہیں۔" اور یہ تو نہ پورا ہونے والا قصہ ہے... " ڈیرک باف اب اپنے تعلق کو نرائی اینگل کی شیپ دینا چاہتا ہے۔ وہ 'جیکسن باف اور فیریا...!

☼ ☼ ☼

بستی کھوکھر کی سڑک پر لاریوں کے گزرنے کا شور رات گئے تک جاری رہتا تھا... اور لاریوں پر بجتا میوزک جس سے ڈرائیورز خوب لطف اندوز ہوتے تھے... انڈین ' پنجابی ' سرائیکی... طرح طرح کے گانے سننے کو ملتے تھے... اور انہی گانوں کے کچھ بول

جیدی کی زبان پر چڑھ جاتے تھے اور گنگناہٹیں طویل تر ہو جاتیں۔

اماں پہلے تو نظر انداز کر جاتیں مگر اب نہیں... بالکل بھی نہیں...!

سنہری دھوپ بستی کھوکھر پر اتری ہوئی تھی... گندم کی سنہری بالیاں ہوا سے ہلکورے لیتیں تو یوں لگتا ہر طرف سونا پگھل کر گر رہا ہو... دیسی گلاب کے کھیتوں پر شہد کی مکھیوں اور تتلیوں کا ہجوم گھیرا ڈالے نظر آتا تھا۔ جیدی پلنگ پر لمبے لمبے جھونٹے لیتا ہوا بلند آواز سے گا رہا تھا۔

"میڈا یار لے دا... میڈا پیار لے دا..."

روٹیوں پر مکھن لگاتی اماں یہ سب ملاحظہ کر رہی تھیں... "وے بے ہدایتا... پہاڑے یاد کر لے...."

بے ہدایتا مزید تانیں بلند کر رہا تھا۔

"ونگ میڈی سونے دی... اتو بندی اے چولے نال۔" ادھر تان لمبی ہوئی ادھر آم کی شاخ پر لپٹی رسی سرکی... دھم دھڑام...! جیدی الٹی قلابازیاں کھاتا زمین پر ڈھیر ہوا پڑا تھا... اماں بھاگ کر لپکیں۔

"ہائے میرا لال... کہا بھی تھا ہولے ہولے جھونٹے لے... مگر ہاں تب مووڑا اٹھ رہے تھے۔"

لنگڑاتا ہوا وہ اٹھا تھا... اماں سہارا دے کر بان کی چارپائی تک لائیں... اسے بٹھایا اور لسی کا گلاس پیش کیا روٹیوں کی طرف پلٹیں تو دیکھا ایک روٹی کوا چونچ میں بمشکل دبائے آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

"چلو خیر ہے... اس بے ہدایت کا صدقہ نکل گیا۔"

خاکستری چڑیاں آم کا بور گرا رہی تھیں... لیپے ہوئے فرش پر بور کا ڈھیر لگا ہوا تھا... وہ روٹی لے کر جیدی کے پاس آن بیٹھیں... "آ میرے نال روٹی کھا لے... آم کا اچار ہے۔"

"نئیں کھانی روٹی۔"

"ہائیں... کیوں نہیں کھانی...؟" اماں حیران تھیں۔

"بس... میں نے نہیں کھانی۔" وہ الٹا لیٹا زمین کو گھور رہا تھا۔

"لے لو... خود با ہمدروانگوں چھلانگاں مار دا تلے آ پیا اس... تے ناراضی روٹی تے۔" وہ ہنسی تھیں اماں کی ہنسی سے وہ تپ گیا تھا۔

"آپ ہنسیں کیوں...؟"

"تو کیا کروں...؟" روٹی پرے رکھ دی تھی۔

"میرا مذاق اڑایا..." وہ جیسے روٹھ گیا تھا...

"پتر... مائیں کبھی اولاد کا مذاق نہیں اڑاتیں، اماں کو تو یہ فن آتا ہی نہیں۔" وہ لقمے کر کے اسے کھلانے لگی تھیں۔ کچھ روٹی کے بھورے فرش پر بھی پھینک رہی تھیں... چڑیاں آتیں... چگ کر اڑ جاتیں۔

"آپ اور ابا 'بیلی' سے زیادہ پیار کرتے ہیں ناں...؟" اب وہ نئی بات پر آ گیا تھا۔

اماں نے ہاتھ میں پکڑی اچار کی پھانک کٹوری میں رکھ دی... گیابھن بھینسوں کے ڈکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں... اماں نے بچے کھچے بھورے زمین پر ڈالے... خاکستری چڑیاں ہجوم کی شکل میں زمین پر آ کر چلنے لگیں... اماں دوپٹا آنکھوں پر رکھ کر رو دی تھیں۔

"وے جیدی... دھیاں نال فرق آ کے سوال نہ کیتے کر... دھیاں وی ویہڑے دی چڑیاں ہوندیاں... اڑ جاندیاں تے ول نئیں آندیاں..."

"اڑ کیوں جاندیاں...؟" جیدی کی نظریں سب سے چھوٹی چڑیا پر تھیں... بھوری پھرتیلی...

"ہم ماں باپ پالتے ہیں... جوان کرتے ہیں... اور پھر اگلے دھڑلے سے لے جاتے ہیں... بیٹیاں جاتی ہیں تو پھر نشانیاں ہی چھوڑ جاتی ہیں۔" اماں نے سارے آنگن کو نظر بھر کے دیکھا تھا۔

"بیلی بھی چلی جائے گی...؟" وہ سوال بڑا بھاری تھا... اور جواب بھاری ترین...

"ہاں چلی جائے گی وہ بھی چلی جائے گی۔" اماں جواب تلے دب گئیں۔

"بیلی چلی گئی تو میں تو ہوں گا ناں آپ کے پاس...." جیدی نے گرم روٹی پر مکھن کو پگھلتے دیکھا تھا۔

"بیٹیاں ماں باپ کو بوڑھا نہیں ہونے دیتیں ہے۔۔۔ اور بیٹے۔۔۔" اماں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔
پوری بات کرنے سے انہیں خوف آیا تھا۔
"اور بیٹے اماں۔۔۔؟" رلی کے بھورے ختم ہو گئے چڑیاں اڑ گئیں سونی سونی زمین پڑی رہ گئی۔
"بیٹے جوان ہو جائیں تو ماں باپ کو ہی بھول جاتے ہیں۔۔۔ خبر تک نہیں لیتے۔۔۔ اور بیٹیاں اگلے گھر جا کر بھی پچھلے گھر کی بازگشت ساتھ رکھتی ہیں۔"
"سارے بیٹے ماں باپ کو بھول جاتے ہیں۔۔۔؟" آم پر بیٹھی چڑیوں نے بور گرایا تھا۔
"سارے نہیں۔۔۔ بس کوئی کوئی۔۔۔" اماں نے خاموشی سے اسٹیل کے ٹفن میں ابا کا کھانا باندھ کر اسے پکڑا دیا تھا "جا۔۔۔ چھیتی جا کر پیونوں وے آبھکا ہوگا۔"
جیدی ٹفن تھامے گاؤں کی گلیوں سے بھاگتا دوڑتا گزرتا ہوا کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔۔۔ کچی پکی گلیاں تھیں جو برسات کے موسم میں جل تھل ہو جاتی تھیں۔ کچے گھر تھے۔۔۔ کچے گھروں کی بھی بہتات تھی آوارہ کتے گھومتے رہتے تھے۔۔۔ وہ ٹفن تھامے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا جب ٹھٹک کر رکا۔۔۔ تھما اور پلٹ کر دیکھا تھا۔۔۔ گھنے پیپل کی چوٹیوں پر کال کلیچیوں کے اکٹھ بیٹھے تھے۔۔۔ اور گھنے پیپل کی چھاؤں تلے میراثنی گھڑے پر چھلا بجاتی گا رہی تھی۔۔۔ چاندی کے چھلے اور اس کی آواز میں بڑی اداسی تھی۔

ساڈا چڑیاں دا چنبا وے۔۔۔!
بابل اسی اڈ جانڑاں
ساڈی لمی اڈاری وے
اساں مڑ نئیں آنڑا۔۔۔!

جیدی نے اپنی آنسو چھلکاتی آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا تھا۔
"بیلی نخریلی۔۔۔ تو بہت بری ہے۔۔۔ ہر وقت یاد آتی رہتی ہے۔" اور کال کلیچیاں سر اٹھا کر جیدی کو روتا دیکھتی ہیں۔۔۔!
راستوں کی دھول بیلا بنت فاروق احمد اور جیدی ابن فاروق احمد دونوں بھائی بہن کی محبت پر رشک سے بیٹھ جاتی ہے۔
میراثنی نے دور جاتے جیدی کو دیکھا اور گھڑے پر چاندی کا چھلا ہولے سے بجایا۔۔۔!

جنجھاں وے ویر ہوندے سکھ ہو۔۔۔!
او بہناں بھاگاں والیاں۔۔۔!

دھوپ اپنا سفر ختم کرتی سہ پہر کا اشارہ ہوئی ہے۔۔۔!

✲ ✲ ✲

لائبریری میں بالکل خاموشی تھی پن ڈراپ سائیلنس۔۔۔ جب ساتویں بار روشی کی کھی کھی گونجی تو صدف نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا تھا۔۔۔ مگر روشی پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا۔۔۔ لائبریرین نے وہیں سے اخبار پر پیپر ویٹ دے مارا تھا۔
"پلیز۔۔۔ کیپ کوائٹ گرلز۔۔۔"
روشی نے کھا جانے والی نظروں سے لائبریرین کو دیکھا تھا۔۔۔ صدف غصے سے دبی دبی آواز میں بولی تھی۔
"اب اگر تم بولیں تو میں تمہارا گلا دبا دوں گی۔"
"کیا مجھے کچھ کہا۔۔۔؟" روشی نے راجہ گدھ سے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔۔۔ خطرناک حد تک معصومیت۔
"دفعو۔۔۔" (دفع کی جمع)۔
"شکریہ۔۔۔"
اکنامکس کی مخلوق اخبار پڑھ رہی تھی۔۔۔ انگلش والیاں کیٹس، شیلے پر تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔ پولی سائنس والی رودابہ حکومت کے بارے میں جذباتی اور قابل اعتراض جملے بول رہی تھی۔
ریحانہ نے سر پیچھے گھمایا "بہن۔۔۔ اللہ کے واسطے خاموش رہو۔۔۔ ہم پر پہلے ہی بہرے پن کا شبہ کیا جاتا ہے۔"
صدف نے ورق الٹا تھا "سیاست تو ایسا موضوع ہے جس پر ہر کوئی بحث کرنے شروع ہو جاتا ہے۔"
روشی نے پھر کھی کھی شروع کر دی تھی۔ صدف نے سخت نظر ڈالی تھی۔
"بانو قدسیہ کی راجہ گدھ کے کور میں یونس بٹ کی

شیطانیاں تو نہیں پڑھ رہیں۔۔۔؟"

"جی نہیں راجہ گدھ ہی ہے۔"

ابھی بات منہ میں ہی تھی کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کی کشمالہ اور صوفی دوپٹے بندھ جانے کی وجہ سے کرسی سے لڑکھڑا کر گری تھیں۔۔۔ کتابوں پر جھکے سر اٹھے۔۔۔ قہقہوں کی جفت قطاریں بندھ گئیں۔ صوفی نے خفت سے گرہ کھولی تھی ہوڈودس (کس نے کیا یہ۔۔۔؟)

راجہ گدھ کی سنجیدہ قاری نے سر اٹھا کر دیکھا تھا

"ڈونٹ نو۔۔۔"

کشمالہ اور صوفی بے چاری دروازہ پار کر گئیں۔۔۔ روشی پراسرار سی ہنسی ہنستی رہی تھی صدف نے چوری پکڑی تھی "تم نے کیا ناں یہ سب۔۔۔؟"

ابلاغیات کی اسائنمنٹ بناتی ریحانہ نے جواب دیا تھا "روشی نے نہیں کیا۔"

"تو پھر۔۔۔؟" صدف حیرت سے مڑنے لگی تھی۔

ریحانہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا "میں نے کیا ہے کیونکہ پچھلے ہفتے انہوں نے میرے اور بیلا کے ساتھ یہی کیا تھا۔ تب کتنی شرمندگی ہوئی تھی۔"

صدف نے نفی میں زور زور سے سر ہلایا تھا "برے کے ساتھ برا نہیں کرتے۔"

روشی نے راجہ گدھ کا صفحہ موڑا تھا "بہن۔۔۔ تم تو چپ ہی رہو۔"

ریحانہ اور روشی ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی تھیں۔۔۔ صدف تلملائی تھی "بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو تم دونوں۔۔۔"

ایک ساتھ جواب ملا تھا "شکریہ۔۔۔ شکریہ۔"

"تین سر اکٹھے اوپر اٹھے۔۔۔ لائبریرین سر پر کھڑا تھا گرلز آئی وارن یو۔۔۔ نو مور ٹھی کھیز۔۔۔" وہ گیا تو تینوں کی نظریں "متجھے" ہوئیں۔۔۔ روشی نے سرگوشی کی تھی "بیلا کہاں ہے۔۔۔؟"

"وہ تو فوٹو کاپیز کرانے گئی تھی۔۔۔ وہاں آج کل بہت رش ہوتا ہے وہیں دیر ہو گئی ہوگی۔۔۔ وہ آتی ہوگی اب چپ کر کے پڑھو بس۔" اور وہ "چپ" کر کے پڑھنے میں لگ گئیں!

"ہائے جانے کیوں میں نے فوٹو کاپیز کروانے کی ذمہ داری خود تن تنہا لے لی۔۔۔ وہ تینوں اب لائبریری میں بیٹھی گپیں لگا رہی ہوں گی" وہ خود کو کوس رہی تھی۔۔۔ ساری یونیورسٹی کو آج ہی کاپیز کرانے کا خیال آیا تھا۔۔۔ سارے لڑکے، لڑکیاں جمع تھے۔۔۔ جانے پہلے یہ ساری مخلوق کہاں رہتی تھی جو آج اچانک اکٹھی ہو گئی تھی اس کا تو پچھتاوا ہی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا روشنی میں جانے کہاں سے دیوار آ گئی تھی۔۔۔ بیلا نے سر اٹھایا تھا۔۔۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔۔۔ دراز قامت، روشن پیشانی پر بکھرے گھنے بال، ستواں کھڑی ناک۔۔۔ اور دوسری طرف وہ کھڑی تھی ہجوم سے حواس باختہ سی موٹی آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔۔۔!

"السلام علیکم۔" منعم نے سلام کیا تھا۔

بیلا نے چونک کر جواب دیا تھا "وعلیکم السلام۔"

"کیسی ہیں آپ۔۔۔؟" بیلا کو حیرت ہوئی تھی وہ دھوپ میں اس کے پاس کھڑا یہ سب کیوں کر رہا تھا۔۔۔؟

"جی۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔" اسے جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"آپ کیوں کھڑی ہیں اتنی دھوپ میں۔۔۔؟" بڑی تشویش سی تھی منعم کے لہجے میں۔

"میں کاپیز کروانے آئی تھی" بیلا نے ہاتھ میں تھمی فائل اسے دکھائی تھی۔

"اس طرح تو یہاں کھڑے کھڑے آپ کو رات ہو جائے گی۔۔۔ لائیں مجھے دیں میں کروا لاتا ہوں" وہ مسکراتا ہوا آفر کر رہا تھا۔

"ناں۔۔۔ نہیں میں خود کروا لوں گی۔۔۔ آپ کا بہت شکریہ۔" اس نے سہولت سے منع کر دیا تھا۔

"میں واقعی ابھی کروا دوں گا۔۔۔ آفٹر آل۔۔۔ ہم کلاس فیلو ہیں۔"

"رش کم ہو رہا ہے۔۔۔ میں کروا لوں گی" بیلا نے ہجوم کی طرف اشارہ کیا تھا۔۔۔ وہاں رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس جانے کتنی لڑکیاں تھیں۔۔۔ شوخ۔۔۔ حسین۔۔۔ طرح دار۔ منعم نے بیلا کی طرف دیکھا تھا۔۔۔ سادہ

سا لباس ' سر پر دوپٹا اوڑھے ' آنکھوں میں پھیلتا کاجل سے صاف کیا تھا۔ یہ منظر منعم علی نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا تھا۔
یہ وہ اس ماحول میں بڑی "مس فٹ" سی لگ رہی تھی۔

"آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟" وہ سوال تھا تو بہت عجیب تھا۔

"نہیں۔" وہ جواب تھا تو عجیب تر تھا۔ منعم علی کو کبھی اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ بے نیازی سی دوپٹے کے پلو سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے....؟"

"بالکل نہیں۔" اس نے واضح نفی میں جواب دیا تھا۔ ساری نظریں ان پر تھیں۔

"کیوں اعتبار نہیں آپ کو مجھ پہ....؟"

"میں اجنبیوں پر اعتبار نہیں کرتی۔ مجھے اپنے کام خود کرنے کا شوق ہے۔" وہ یہ کہہ کر ذرا پرے جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اور منعم علی نے یہ فاصلہ بڑے غور سے دیکھا تھا۔ وہ آہستہ سے چلتا اس تک آیا تھا۔

"مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا بیلا فاروق۔"

وہ جا رہا تھا۔ ہر ہر آنکھ اس کی طرف پلٹ رہی تھی۔ بیلا چپ چاپ کھڑی زمین کی طرف دیکھتی رہی تھی دھوپ میں دیوار بنا کھڑا تھا تو کتنا سکون سا تھا۔ دیوار گری تھی۔ دھوپ سر پر جم کر کھڑی ہو گئی نغمانہ اشتیاق سے اس کی طرف آئی تھی "کیا کہہ رہا تھا ۔۔۔؟"

بیلا نے فائل کور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا تھا "سر عارف کی اسائنمنٹ کا پوچھ رہا تھا۔"

"اوہ اچھا...." یہ کہہ کر نغمانہ آگے بڑھ گئی تھی ....!

اسد کی تجویز پر گومگو کی کیفیت میں مبتلا منعم علی نے اب بیلا فاروق کو پچھاڑنے کا پکا فیصلہ کر لیا تھا دو گھنٹے کی مشقت کے بعد جب بیلا فری ہوئی تو وہ تینوں غائب تھیں۔ منتوہال ' قائد اعظم بلاک ' لائبریری چھاننے کے بعد وہ تینوں کینٹین میں کوک اڑاتی پائی گئیں۔ وہیں حمد نے بیلا کی پھیلی آنکھوں کا کاجل ٹشو

⁂ ⁂ ⁂

اردو ادب کی تاریخ کا پیریڈ منتوہال میں سر عارف لیتے تھے۔ وہ چاروں کھاپی کر وہیں آگئی تھیں۔ ساری کلاس سر عارف کی طرف متوجہ تھی۔ جب روشی نے ہاتھ کھڑا کیا تھا۔ ساری کلاس اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ شاید اس نے لیکچر سے متعلق کوئی اہم سوال کرنا تھا۔ مگر روشی کا سوال توقعات کے برعکس تھا۔

"سر ہم کھڑکی کے پاس بیٹھ جائیں۔ ہمارا تو پنکھا بھی نہیں چل رہا" پنکھا واقعی خراب تھا اور لرز رہا تھا۔ سر عارف نے عینک کو ناک کی نوک پر رکھا تھا۔

"اوہ.... آپ نیکسٹ رو میں آجائیں۔" فائلز سنبھالتی وہ تینوں لپک جھپک آگے بڑھ گئیں۔ بیلا وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔

"بیلا فاروق آپ منعم علی کی بائیں طرف خالی کرسی پر بیٹھ جائیں۔"

"نو سر.... میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ وہیں پہلے والی جگہ پر بیٹھی رہی تھی۔ منعم علی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا اور تبھی غیر ارادی طور پر بیلا کی نظر بھی اٹھی تھی۔ آنکھیں چار ہوئیں اور پھر جھک گئیں۔ کلاس ختم ہونے کے بعد سب باہر نکلے تو وہ آخر میں باہر آئی تھی۔ تبھی روشی نے اسے پیغام دیا تھا۔

"سر عارف تمہیں اپنے روم میں بلا رہے ہیں۔"

وہ اپنی فائلز ان تینوں کو تھماتی راہداریاں پار کرتی قائد اعظم بلاک کی طرف آئی تھی۔ سر عارف وہیں ہوتے تھے۔ اس نے ہولے سے دستک دی تھی۔

"یس کم ان...." سر کی گمبھیر آواز آئی تھی۔

وہ دوپٹا سر پر جماتی اندر آئی تھی۔ منعم علی کو پہلے سے وہاں موجود دیکھ کر ٹھٹکی لیکن پھر بے تاثر چہرے کے ساتھ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔!

سر عارف ریوالونگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ "جی بیلا

"کیسی ہیں آپ۔۔۔؟"

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ مدھم لہجے میں جواب دے رہی تھی۔

منعم خاموش بیٹھا تھا۔ وال کلاک کی مدھم سی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

"کیا لیں گے آپ دونوں۔۔۔ چائے یا کافی۔۔۔؟"

"جی کچھ نہیں۔" دونوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا تھا۔ سر مسکرا دیے تھے۔

"آپ دونوں کو یہاں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ یونیورسٹی میں تقریری مقابلہ جات ہو رہے ہیں اور اس سلسلے میں اردو اسپیچ کے لیے میں نے بیلا فاروق اور انگلش اسپیچ کے لیے منعم علی آپ کا نام دیا ہے۔ آپ دونوں کو کوئی اعتراض تو نہیں۔۔۔؟" پیپر ویٹ گھماتے انہوں نے دونوں کو دیکھا تھا۔

"جی نہیں۔۔۔" آوازیں ٹکرا گئیں۔

"آپ دونوں اس یونیورسٹی کے ہونہار اسٹوڈنٹس ہیں۔۔۔ ہمیں آپ پر فخر ہے۔ اب آپ دونوں جا سکتے ہیں۔" وہ دونوں شکریہ ادا کرتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ منعم نے اسے راستہ دیا تھا۔۔۔ وہ باہر آگئی تھی۔ وہ کوریڈور میں چلتی جا رہی تھی جب پیچھے سے آنے والی آواز پر رکی تھی۔

"ایکسکیوزمی بیلا۔"

"یس۔۔۔" ٹھہری آنکھوں میں آج کل کاجل بھی ٹھہرا ہوا تھا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" منعم علی نے تمہید باندھی تھی۔۔۔ بیلا اچھنبے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جی کہیے۔۔۔"

"کیا ہم دوست ہو سکتے ہیں۔۔۔؟" سب آوازیں ٹھہر گئیں۔

"آپ یہاں دوستیاں کرنے آتے ہیں؟" سوال میں حیرت تھی۔۔۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔

"میرا مطلب۔۔۔" منعم کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ کیا کہے۔۔۔ وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"مگر میں یہاں دوستیاں کرنے نہیں آئی۔۔۔ میں صرف اور صرف یہاں پڑھنے آتی ہوں۔" یہ کہہ کر بندھے ہاتھ گراتی وہ وقار اور تمکنت کے ساتھ کاریڈور میں چلتی ہوئی جا رہی تھی۔۔۔!

انا کی مسمار عمارت کی راکھ سمیٹتا منعم علی وہیں کھڑا رہا تھا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی سے وہ ہاسٹل پہنچی تو کاؤنٹر پر عفت گھومنے والی کرسی پر گھومتی نظر آئیں۔۔۔ چہرے پر بلا کا تجسس تھا ہاتھوں میں کوئی بھاری ناول تھا۔۔۔ ساتھ ساتھ وہ کرسٹل کے باؤل سے سونف اٹھا کر بھی کھا رہی تھیں۔ بیلا پر نظر پڑی تو وہ مسکرائیں۔

"آؤ بیلا۔۔۔ آج دیر ہو گئی تمہیں۔۔۔ تمہاری دوستیں تو ابھی یہاں سے گزری ہیں۔" "میں پڑھنے میں مگن تھی تو دیکھو ذرا میری سونف چوری کر لی۔" بیلا نے فائلز کاؤنٹر پر رکھ دی تھیں۔

"ایسی عادتیں روشنی کی ہی ہیں۔"

ہال کا پنکھا اپنی ازلی خوفناک آواز کے ساتھ لرز رہا تھا۔ بیلا کو نئے سرے سے خوف محسوس ہوا تھا۔

"پلیز میم۔۔۔ اسے تو ٹھیک کروائیں۔۔۔ دیکھیں تو کیسی خوفناک آواز دیتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں ضرور خیر میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔" انہوں نے سونفوں والا باؤل بیلا کے آگے کر دیا تھا۔۔۔ ایک آفاقی سچائی یہ بھی ہے کہ ایسی بھلائی پورے ہاسٹل میں عفت صرف بیلا کے ساتھ ہی کرتی ہیں بیلا بھی سونف ٹونگنے لگی تھی "کس بات کا۔۔۔؟"

"اچار کا۔۔۔ بہت مزے دار ہے۔۔۔ پورے بھکر میں ایسا اعلا اچار نہیں ملتا۔"

"جی۔۔۔ میری اماں ایسا ہی بناتی ہیں۔۔۔ مربہ بھی بہت مزے کا بناتی ہیں۔" بیلا نے مزید بتایا تھا۔

"او سچی۔۔۔ پلیز اگلی بار مربہ بھی منگوا دینا۔۔۔ دیسی مزے دار ہوگا۔" عفت کے منہ میں پانی آگیا تھا۔

آئے موسم رنگیلے سہانے
جیا نہیں مانے۔۔۔!

تو چھٹی لے کے آجا بالما۔۔۔!
ڈسٹر اٹھائے لٹکتی مٹکتی چنبیلی اندر آئی۔۔۔ باؤل سے سونفوں کی مٹھی بھری اور سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی ساری دنیا کی بے نیازی اس وقت چنبیلی میں آگئی تھی۔۔۔ عفتی میم نے زور سے کاؤنٹر پر ہاتھ مارا تھا سونف اچھل گئی "اے چنبیلی۔۔۔"
سیڑھیاں چڑھتی وہ تھمی۔۔۔ پلٹ کر دیکھا "یس۔۔۔ آپ نے مجھے کچھ کہا" معصوم مسکراہٹ۔
"اے لڑکی۔۔۔ تیری یہ حرکات و سکنات میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔"
"حرکات و سکنات کی وضاحت کریں گی آپ۔۔۔؟" چنبیلی سیڑھیوں پر پھسکڑا مارے بیٹھ گئی تھی۔
"شریف لڑکیوں کے ایسے لچھن نہیں ہوتے۔۔۔" عفت غصے سے گھومنے والی کرسی پر کچھ زیادہ ہی گھوم گئیں۔
"اور شریف عورتیں بھی چوری چوری منٹو کے افسانے نہیں پڑھتیں۔"
دھپاک دھپاک سیڑھیاں چڑھتی وہ اوپر بھاگ گئی تھی۔۔۔ بیلا ہنسی چھپاتی گری ہوئی سونف واپس باؤل میں ڈال رہی تھی "دیکھا۔۔۔ دیکھا مجھے "عورت" کہہ گئی۔۔۔ میں بتا رہی ہوں میں اسے کسی دن ڈس مس کر دوں گی۔"
عفت لرزتی کانپتی دوبارہ کرسی پر گر گئیں۔۔۔ بیلا ان کی حالت کے پیش نظر دوپہر کے کھانے کا بھی نہ پوچھ سکی تھی۔۔۔ عفت نے دوبارہ خود کو ناول میں غرق کر لیا تھا۔ بیلا تھکے تھکے قدموں سے فائلز اٹھاتی اوپر آ گئی تھی۔۔۔!
اوپری منزل پر الگ ہی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔۔۔ صوفی آئینہ تھامے بیٹھی رو رہی تھی۔
آکنامکس کی لڑکیاں اس کے گرد جمع تھیں "ارے ہمیں تو دکھاؤ یار۔۔۔ کچھ تو پتا چلے۔۔۔ پھر کوئی تدبیر سوچیں گے۔" بیلا آگے بڑھی تھی۔
"کیا ہوا ہے۔۔۔؟"
"روشی نے صوفی کا ایک آئی برو اڑا دیا ہے۔۔۔ بے چاری نے بہن کی منگنی پر جانا تھا" افسوس کی ملی جلی آوازیں تھیں۔۔۔ روشی بار بار صوفی کا ہاتھ تھام رہی تھی جسے بار بار وہ جھٹک رہی تھی۔
"یار۔۔۔ قسم لے لو جو میں نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہو۔۔۔ وہ تو میرا ہاتھ بہک گیا۔۔۔ ایک تو تمہارے آئی برو تمہاری اسکن کلر سے میچ کرتے ہیں۔۔۔ آئی پرامس۔۔۔ میں ٹھیک کر دوں گی کچھ نہ کچھ۔۔۔"
صوفی نے آئینہ پرے رکھا اور روشی کو دیکھا "آئی پرامس۔"
وہ سب احتیاطی تدابیر پر غور و فکر کرنے لگیں تو بیلا کمرے میں آگئی۔۔۔ صدف اور ریحانہ میٹرس پر بیٹھی تھیں۔
"کہاں رہیں تم۔۔۔؟"
"سر نے تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا کہا ہے۔۔۔ وہیں تھی۔" وہ دوپٹا تہہ کر کے الماری میں رکھ رہی تھی۔
"واؤ۔۔۔ یقیناً" تم ہی جیتو گی۔" وہ بھی الماری بند کر کے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔ سارا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ دور نیم کے درخت نظر آ رہے تھے۔۔۔ آسمان پر چند کونجیں سفر میں تھیں۔۔۔!

☼ ☼ ☼

روسٹرم پر وہ کھڑی تھی۔۔۔ سر پر سلیقے سے دوپٹا اوڑھے بیلا فاروق نے اپنی دلیلوں اور مضبوط انداز سے ہر کسی کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔۔۔ ہر کوئی دنگ رہ گیا تھا۔۔۔ روشی بمشکل تالیاں بجانے سے خود کو روک رہی تھی۔

"جب اسلام عورت کو تعلیم کا حق دیتا ہے تو باقی پھر پیچھے کیا رہ جاتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبے میں عورت نے اپنا آپ منوایا ہے۔۔۔ ایک اچھی ماں، اچھی بہن اور بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ عورت ایک ڈاکٹر، وکیل، انجینئر کیوں نہیں ہو سکتی؟ اصل مقصد تعلیم حاصل کرنا ہے کو ایجوکیشن پر سوال اٹھانے والے یہ تو یاد رکھیں کہ یونیورسٹی تک پہنچنے والا لڑکا یا لڑکی اتنا میچور

ہوتا ہے کہ اپنے اچھے برے کو بخوبی سمجھتا ہے... انہیں پتا ہے کہ یونیورسٹی پڑھنے کی جگہ ہے یا پھر دوستیاں پالنے کی؟ بات سوچ کی ہے سوچ کے بدلنے سے ہی سب ہوگا... عورت کی تعلیم روکنے والا بھی معاشرہ ہی ہے... پاکستان کی عورت کو دوسرے ممالک کی عورت کی طرح پڑھنے لکھنے کی مکمل آزادی ہونی چاہیے... تعلیم یافتہ عورت ہی تربیت یافتہ نسل کی ضامن ہوتی ہے۔"

ہال کے گرد سے پردے اٹھا دیے گئے تھے... روشنیوں میں نہائی بیلا بنت فاروق نے شان کے ساتھ یہ بازی جیت لی تھی... اور ادھر انگلش کے تقریری مقابلے میں منعم علی فاتح تھا... دونوں پوزیشنیں ان کی یونی کی تھیں... دونوں کو اکٹھا اسٹیج پر بلایا گیا تھا... انعام سے نوازا گیا تھا!

منٹو ہال تالیوں، قہقہوں کی بازگشت سے گونج اٹھا تھا...! وہ اکٹھے سیڑھیوں سے اتر رہے تھے۔

"میں اتنا برا بھی نہیں ہوں جتنا آپ مجھے سمجھتی ہیں۔" دھیمے لہجے میں کہتا وہ آگے بڑھ گیا تھا وہ وہیں کھڑی رہی تھی... وہ تینوں آکر بیلا سے چمٹ گئی تھیں۔

"ہائے بیلی... ہم نے کہا تھا ناں کہ ونر تم ہی ہوگی... بہت بہت مبارک ہو۔"

کشمالہ سیلفی اسٹک تھامے ان کی طرف آئی تھی "آؤ... گروپ سیلفی لیتے ہیں۔"

روشنی چمکی اور مسکراہٹیں بکھیرتا لمحہ وہیں قید ہو گیا تھا... منٹو ہال کی دیواریں مسکرائی تھیں...! منعم نے دور سے بیلا کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا... وہ ہنسی طلسم میں لپٹی ہوئی تھی... مسحور کن سی...! اصدف نے فرضی مائیک اس کے سامنے بناتے ہوئے کچھ بولنے کو کہا تھا... وہ ہنستی ہوئی رونے لگی تھی۔

"یہ جیت میرے ابا کے اس اعتبار کے نام، جو انہوں نے اپنی بیٹی پر کیا۔"

وہ انگلی کی پور سے آنکھ کا آنسو پونچھ رہی تھی... جب مڑتے ہوئے نظر اٹھی تھی... روشن پیشانی والا وہ خوبرو شخص ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا... بیلا کو یہ سب عجیب لگا تھا... اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب منعم علی سے بات کر کے پوچھے گی کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟

بیرن ہوا سے سویٹ پی کی بیلیں لہرا رہی ہیں... ڈیزی کے پھولوں پر تتلیاں رقصاں ہیں...! محبتوں کے اشاروں کا سمے ہے... اور سمے کس کا ہوا ہے؟ مگر بار بار ایسا نہیں ہوتا ہر بار بھی ایسا نہیں ہوتا۔

منٹو ہال کی دیواریں سرگوشیاں کرتی ہیں...!

"بیلا بنت فاروق کی ہنسی منعم علی کو ٹھٹکا دیتی ہے... ساکت کر دیتی ہے۔"

☆ ☆ ☆

"کیا ہم کسی بھی جنم میں اچھے دوست نہیں ہوں گے...؟" ڈیرک نے چوتھی بار فیریا سے پوچھا تھا۔

"تم میں ایسا کیا ہے کہ میں تم سے دوستی کرنے پر مجبور ہو جاؤں؟" کپ میں کریم الٹتی وہ پوچھ رہی تھی۔

"خوب صورت ہوں... اچھی صحبت میں رہتا ہوں... اچھا پیانو بجاتا ہوں... اور کیا چاہیے؟" وہ منہ لٹکائے کرسی پر بیٹھا تھا... کیفے کی روشنیوں میں فیریا کو وہ موم کا گڈا لگا تھا۔

"تم ایک بہت برے کافی میکر ہو" وہ اب ٹشو سے ہاتھوں پر لگی کریم صاف کر رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے اچھی کافی بنانا سیکھ جاؤں گا... آئی پرامس۔"

"مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے..." جوڑے کی پنسل کھولتی وہ سوچ میں پڑ گئی ہے...!

"کم از کم کتنا وقت...؟" موم کا گڈا جیسے پگھلنے لگا ہے...!

"دو گھنٹے پانچ منٹ تین سیکنڈ" فیریا نے ایپرن کو کھونٹی سے لٹکا کر آخری فیصلہ سنا دیا تھا اور پھر پیرس کے وقت نے سٹاپ واچ پر مستقل نظریں جمائے شخص کو غور سے دیکھا تھا... ایک گھنٹہ... دوسرا گھنٹہ... دو منٹ... اور...!

وقت تمام ہوا تو وہ جواب کے لیے اس تک پہنچ گیا تھا۔۔۔ وہ آگے امتحان لینے کو کھڑی تھی۔

"دوست کون ہوتا ہے۔۔۔؟"

"موسم نہیں ہوتا۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"وہ کبھی نہیں بدلتا۔۔۔ موسم بدل جاتے ہیں۔"

"میں تم سے دوستی نہیں کر سکتی" فیریا نے کینڈل کو شعلہ دکھایا۔۔۔ روشنی۔۔۔ پھر اندھیرا ہو گیا موم کا وہ خوبرو سنہری گڈا پگھل رہا ہے۔۔۔ پگھل گیا ہے۔۔۔!

"کیوں۔۔۔؟"

"میں نے صرف ایک دوست بنایا ہے۔۔۔ میرے لیے اور اس جیسا کوئی نہیں۔۔۔ وہ ایک ہی ہے منعم علی۔" ڈیرک باف۔ جو ایک براکالی میکر ہے۔۔۔ اس دن اس نے کتنی بار "بری" کافی بنا کر پی تھی۔۔۔! جیکسن باف کو اس دن کتاب نہیں پڑھنی پڑی تھی انہوں نے ڈیرک باف کو پڑھا تھا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

طارق راتوں کا چاند آسمان پر نظر آ رہا تھا۔۔۔ اکا دکا تارے بھی آسمان پر سجے ہوئے تھے۔۔۔ ہلکی ہوا کی چھیڑ سے آم کا بور گرنے لگتا تھا دور گلاب کے کھیتوں پر چاندنی ترچھے رخ سے گرتی تھی اور دیکھنے والے سر اٹھا کے نیلے آسمان کو تکے جاتے جو چاندنیاں لٹاتا تھا "بے شک تجھ سے بڑھ کر کوئی تمثال گر نہیں۔۔۔ تو اپنی تخلیق میں واحد اور یکتا ہے۔"

فاروق احمد حقہ گڑگڑا رہے تھے۔۔۔ اماں پیڑھی پر بیٹھی اپنے خیالوں میں غرق تھیں۔۔۔ تارے گنتا جیدی جانے کب سے نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔۔۔ بستی ٹھوکر کی گلیوں میں وقفے وقفے سے آوارہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں گونج جاتی تھیں۔۔۔! فاروق احمد نے حقہ گڑگڑانا روک کر انہیں دیکھا تھا "خیریت تو ہے۔۔۔ آج چپ ہو۔۔۔؟"

خیالوں کی بھول بھلیوں میں اماں راستہ بھٹک گئیں۔۔۔ "ہاں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔"

"تو چپ نہ ہوا کر۔۔۔ تیری چپ سے میرے دل میں ہول اٹھتے ہیں۔" وہ جیسے جھنجلا گئے تھے۔

"میں ایک بات سوچ رہی تھی فاروق احمد۔" اماں نے گرہ کھولنی شروع کر دی تھی۔۔۔ فاروق احمد نے حقہ پرے رکھ دیا اور چارپائی کی ادوائن کسنے لگے تھے۔۔۔ ہلکی ہلکی ہوا اب بھی چل رہی تھی۔۔۔ ڈربے میں بند مرغیوں کی آواز کبھی کبھی گونج جاتی تھی "کیا سوچ رہی تھیں؟"

"میں سوچ رہی تھی کہ ہم نے بیلی کو سولہ جماعتیں پاس کروانے کی تو سوچ لی مگر آگے اسے اگلے گھر بھی تو جانا ہے ناں۔۔۔ اس کے جوڑ کا لڑکا کہاں ملے گا۔۔۔ پوری بستی میں تو ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔" ان کی فکر جائز تھی۔ فاروق احمد کے ادوائن کستے ہاتھ رک جانے لگے۔۔۔ بیٹی کے نام پر چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"فکر نہ کر بھلیے لوکے۔۔۔ سب چنگا ہوگا۔۔۔ اوپر والے کو جو منظور ہوگا وہی ہوتا ہے۔۔۔ اور بیلی صرف ہمارا ہی نہیں پوری بستی کا نام روشن کر رہی ہے۔۔۔ ہماری بیلی تو پہلی اینٹ ہے رفتہ رفتہ عمارت جڑ جائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ نلکے کی طرف بڑھ گئے تھے۔۔۔ نلکے کی دھاتی ہتھی پر زور دیا تو پانی شڑڑ۔۔۔ شڑڑ کرتا چھلک اٹھا تھا کلی کر کے اور چہرہ اچھی طرح صاف کر کے وہ چارپائی پر ٹک گئے تھے۔۔۔ بائیں طرف جیدی سو رہا تھا۔۔۔ جھک کر اسے چٹا چٹ چوم ڈالا تھا۔۔۔ اماں غصہ ہوئی تھیں۔

"آئے ہائے۔۔۔ معصوم کچی نیند میں ہے۔۔۔ جاگا تو ساری رات نہیں سوئے گا تارے گنتا رہے گا۔"

ابا خاموشی سے مسکراتے رہے تھے۔۔۔ اماں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"آم کاٹ دوں۔۔۔؟"

سوچوں میں گم ابا چونک گئے تھے "کہاں سے آئے ہیں۔۔۔؟"

"عاشاں والے دے گئی تھی کل دوپہر کو۔۔۔ ان کے باغ

سے آئے ہیں۔"
"چلو لے آؤ... مل کر کھاتے ہیں۔"
اماں گھڑونجی پر دھرے گھڑے میں ہاتھ ڈال کر دو آم نکال لائی تھیں... چھری بہت ڈھونڈی مگر نہ ملی... ابا نے موبائل کی ٹارچ جلادی۔ اماں موبائل تھامے کمرے میں چلی گئیں... ذرا روشنی ہوئی تو چھٹے پر رکھی چھری نظر آئی چھری اٹھا کر واپڈا والوں کو چار پانچ سنائی باہر آئی تھیں... تبھی تو کیا کا وہ موبائل بجنے لگا تھا۔
اماں نے موبائل فاروق احمد کی طرف بڑھادیا تھا... اسکرین جل بجھ رہی تھی۔ ابا نے موبائل کان سے لگایا تھا اماں نے اشارے سے پوچھا تھا... انہوں نے چپ رہنے کا اشارہ کیا تھا۔
"السلام علیکم" لاؤڈ اسپیکر سے بیلا کی آواز آئی تھی... اماں نے آم کاٹنے روک دیے تھے۔
"وعلیکم السلام... کیا حال ہیں بیلا... ؟" بیٹی کی آواز سن کر فاروق احمد باغ باغ ہو جاتے تھے۔
"میں بالکل ٹھیک ہوں ابا... آپ سنائیں۔ اماں اور جیدی کیسے ہیں؟" وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔
"سب ٹھیک ہیں... تم اور تمہاری سہیلیاں کیسی ہیں... ؟" سہیلیوں سے تو شاید پورا گاؤں ہی واقف تھا۔ گلابوں کی خوشبو سے لبریز ہوائیں اڑیں اور آکر آنگن میں ٹھہر گئیں... چاند ہنستا کھڑا رہا...!
"میں بھی ٹھیک ہوں اور وہ سب بھی اچھی ہیں۔" بیلی ہنسی تھی۔
"شکر ہے... شکر ہے۔" ابا نے اس کی ہنسی سلامت رہنے کی چپکے سے دعا کی تھی۔
"اماں کیا کر رہی ہیں اور جیدی... ؟" بیلا ہاسٹل کی کھڑکی میں کھڑی دور دور تک نظر آتی شہر کی روشنیاں دیکھ رہی تھی۔
"جیدی خراٹے لے رہا ہے اور تیری ماں آم کھا رہی ہے۔" انہوں نے شرارت سے اماں کو دیکھا تھا جو بار بار بات کروانے کا کہہ رہی تھیں مگر ابا کا اپنا دل ہی نہیں بھر رہا تھا۔
"ہاہا... اچھا... چوری چوری کھا رہی ہیں؟ چلیں بات کروائیں" بیلا کھڑکی کے پٹ سے لگی کھڑی تھی... دوسری طرف روشی آکر کھڑی ہو گئی تھی... چہرے پر ملتانی مٹی لگائی ہوئی تھی اور صرف پلکیں جھپکتی نظر آتی تھیں۔
"ہاں... بیلی کیسی ہے میری دھی... ؟" اماں کان کے پیچھے بال اڑستی موبائل احتیاط سے لگاتی دور جا کر بات کرنے لگی تھیں... فاروق احمد نے ہانک لگائی تھی۔
"چار قدم دور دروازہ لنگھ جا... مجھ سے باتیں چھپائی جا رہی ہیں واہ میرے مولا... واہ۔" اماں نے وہیں سے میزائل داغا تھا۔
"تسی چپ کر کے بیٹھو۔ دھی نال گلاں وی ناں کراں۔"
"اماں... میں ٹھیک ہوں... آپ دونوں کی پھر لڑائی شروع ہو گئی؟" وہ زور سے ہنسی تھی... صدف بوتل کھول رہی تھی... گیس بے قابو ہو کر باہر نکلی سارا امنہ جھاگ سے تر ہو گیا...!
"ایمہ جیون جوگا لڑوا اے... سات پنڈ سے میرے رشتے آئے تھے مگر تیرا پیو متھے پے گیا۔" روشی کی ہنسی شروع ہوئی... ملتانی مٹی جھڑ گئی... ریحانہ نے وارن کیا تھا۔
"ادھر دفع ہو... دانت نکالتی رہیں تو جھریاں پڑ جائیں گی۔"
بیلا نے گہری سانس لی تھی "اماں اپنا خیال رکھا کریں... مجھے آپ کی بڑی فکر لگی رہتی ہے" وہ واقعی فکر مند تھی اماں پٹتی تھیں... جیون جوگا نفاست سے آم کی قاشیں نوش فرما رہا تھا... اماں نے تپ کر رخ موڑ لیا تھا۔
"میری فکر نہ کیتی کر... اپنا دھیان رکھ... او کڑیاں کیسی ہیں... ؟" وہ روشی، ریحانہ، صدف کا پوچھ رہی تھیں۔
"ٹھیک ہیں اماں... آپ کو سلام کہہ رہی ہیں۔" بیلا نے سلام پہنچایا تھا۔
اماں کچے فرش پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کبھی انہیں اپنے گاؤں لے آنا۔" بیلا نے ان تینوں کی طرف دیکھا تھا جن کے سر شدومد سے ہل رہے تھے۔

"جی اماں۔۔۔ ضرور آئیں گی سردیوں کی چھٹیوں میں۔۔۔ ابا سے ذرا بات کروائیں۔"

اماں فاروق احمد کی طرف پلٹیں تو دیکھا کٹوری میں آم کی گٹھلیاں ہی پڑی تھیں۔

"نیک بخت۔۔۔ بڑے اعلا آم ہیں۔۔۔ یہ گٹھلیاں فجر ویلے کچی زمین میں دبا دینا۔" مزے سے اتنا کہہ کر وہ گھر سے باہر گلی میں آ گئے تھے۔۔۔ خصوصی باتیں گلی میں ہوتی تھیں۔ چٹکتی چاندنی اور خوشبو سے گلیاں مہک رہی تھیں۔۔۔ تارے ٹمٹمار ہے تھے۔

"ابا چاندنی ہے۔۔۔؟"

"ہاں بیلی۔۔۔ بہت زیادہ۔"

"خوشبو۔۔۔؟"

"شمار ہی کوئی نہیں۔"

"اور "وہ" ہیں۔۔۔؟" بیلا بنت فاروق نے پہیلی سامنے رکھ دی ہے۔

"قطاروں میں ہیں۔" فاروق احمد نے پہیلی بوجھ لی ہے۔

"سچی ابا۔۔۔" وہ مچل گئی تھی۔

"مچی۔۔۔" ابا ہنسے تھے۔ "نیم کے درختوں پر اور گلیوں میں جگنوؤں کی قطاریں ہی قطاریں ہیں۔۔۔ تمہیں بھیج دوں۔۔۔؟"

"ہر بار کہتے ہیں اور بھیجتے نہیں۔" وہ روٹھنے لگی ہے۔۔۔ "کیوں نہیں بھیجتے۔۔۔؟"

"مٹھی بند کرو اور پھر کھولو۔" وہ منانے لگے ہیں۔۔۔ تو کیا وہ بھیجنے لگے ہیں۔۔۔؟ مٹھی بند ہوئی۔۔۔ کھلی۔۔۔ چاند قہقہہ لگا گیا۔ "ابا جگنو آ گیا۔"

"کچھ باتیں کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں جیسے جگنو، جیسے خوشبو اور جیسے م۔ح۔ب۔ت۔۔۔ محبت۔"

"ابا وہ اگلے سمسٹر کی فیس دینی ہے۔" وہ ہمیشہ جھجک کر یہ بات کہتی تھی۔۔۔ اور وہ واری ہو جاتے تھے بیٹی پہ۔

"جھلی۔۔۔ فکر نہ کر اس بار گندم کے خوشے بوجھ سے جھکے ہوئے ہیں۔۔۔ خوب برکت ہو گی۔۔۔ سو بوریاں پکی ہیں اور پیو سے پیسے دھڑلے سے مانگا کر۔۔۔ تیرا حق ہے۔" بند مٹھی وہ کھول رہی تھی۔۔۔ نم آنکھوں سے ہنس دی تھی۔

"آپ بھی ناں۔"

"اچھا چل بیلی تو بھی آرام کر۔۔۔ میں نے آم کی قاشیں تیری ماں کے لیے جیب میں چھپا رکھی ہیں دے آتا ہوں کہیں غصے میں جلدی اس کی آنکھ ہی نہ لگ جائے۔۔۔ تمانی چھوٹی چھوٹی باتیں دل پر لے لیتی ہے۔ چڑی جتنا تو اس کا دل ہے۔" وہ قہقہہ لگاتے گلی سے گھر داخل ہو گئے تھے۔

بیلا نے ہاسٹل کے درختوں پر کچھ جگنو منڈلاتے دیکھے۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔ سوچا کھڑکی بند کر دے مگر پھر کھلی ہی چھوڑ کر آ گئی۔۔۔!

طاق راتوں کے چاند کی روشنی بیلا بنت فاروق اور فاروق احمد کی محبت کے نام ہے۔

☼ ☼ ☼

مطالعہ گاہ کی کھڑکیوں کے پار اندھیری رات ٹھہری ہوئی ہے۔۔۔ وہ سر تھامے رائٹنگ ٹیبل کے پاس بیٹھے تھے ٹیبل پر کھلی کتاب میں پین رکھا ہوا تھا جس کی نیلی روشنائی کتاب کے اوراق میں جذب ہوتی جا رہی تھی چائے کے کپ پر موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔۔۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے۔

"کبھی کبھی ہم دنیا کی رونقوں میں، ہجوم میں ایسے گم ہو جاتے ہیں کہ پھر ہمیں اپنا آپ بھی نہیں ملتا۔۔۔ میں نے ساری زندگی کسی مشین کی طرح گزاری ہے۔۔۔ دنیا کی دوڑ میں جانے کیا کیا پیچھے چھوٹتا گیا خبر ہی نہ ہوئی پتا بھی نہیں چلا۔۔۔ دولت کا ڈھیر ہے مگر سکون کا ایک پل بھی نہیں۔۔۔ کیسا لگتا ہے جب آپ ساری زندگی "کچھ" جمع کرتے رہیں اور آخر میں خبر ہو کہ اس کی تو ضرورت ہی نہیں تھی۔۔۔ لوگوں کی نظروں میں میں ایک کامیاب بزنس مین ہوں میں نے ہمیشہ تعریف

"واہ واہ ہمیشہ ہی ہے... دعاؤں سے خزانوں سے خالی ہوں... میرے بیٹے کو لگتا ہے میں اس کی پروا نہیں کرتا... کیا میں واقعی نہیں کرتا؟ یہ سب اس کا ہی تو ہے... مگر شاید دولت کچھ ہوتی ہی نہیں اصل شے تو "وقت" ہوتا ہے۔ جو بند مٹھی سے ریت کی طرح سرکتا جارہا ہے... اسے تو روک بھی نہیں سکتے... زندگی کا کیلنڈر ختم ہو رہا ہے اور میرے پاس تو صرف اور صرف "خسارے" ہیں اور یہ جو خسارے ہوتے ہیں ناں دنیا جہان کی بھیانک ترین شے ہوتے ہیں نیند چھین لیتے ہیں... سکون ختم کردیتے ہیں... باقی کیا رہ جاتا ہے؟ تنہائی، وحشت، افسردگی اور موت کا انتظار... گھڑیال کی سوئیاں کبھی پیچھے نہیں جاتیں... یہ وقت کی بڑی وفادار ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں... اور میں نہ تو وقت روک سکتا ہوں اور نہ ہی گھڑیال کی سوئیاں... مگر میری مٹھی میں تھوڑا سا وقت باقی ہے... مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے۔"

وہ ہولے ہولے چلتے کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے تھے... باہر "رات" سفر میں تھی اور اندر منعم علی کے والد کی "ذات" سفر میں تھی... رات اور ذات کے یارانے بڑے پرانے ہیں۔

☼ ☼ ☼

چھاجوں چھاج برستی اچانک بارش میں اردو ڈپارٹمنٹ والوں کا "ادبی بیٹھک" کا موڈ بن جاتا ہے اور ادبی بیٹھک میں جی بھر کے "بے ادبیاں" کی جاتی تھیں... ادھر پہلی بوند گری اور ادھر منٹو ہال میں اردو کا افسانوی ادب پڑھتی افسانوی مخلوق نے ادبی بیٹھک کا شور مچا دیا... سر شکور ہزار منتوں اور ترلوں کے بعد کہیں جا کر راضی ہوئے تھے... پھر کیا تھا فانکز اٹھا کر قائداعظم بلاک کی طرف دوڑ لگا دی گئی تھی کیونکہ ادبی بیٹھک کی مخصوص جگہ وہی تھی۔

روشی نے خطرناک حد تک سنجیدہ لطیفہ سنا کر حاضرین کو داد طلب نظروں سے دیکھا تھا مگر جواب میں خطرناک حد تک خاموشی ہی ملی تھی... روشی بڑبڑائی تھی "ہونہہ... سینس آف ہیومر سے عاری بھیں۔"

صدف نے آرٹ پر کوئی تقریر کی تھی اس کے لیے چار پانچ تالیاں بجا دی گئیں... ریحانہ نے کسی بھی مقابلے میں حصہ لینے کی غلطی نہیں کی تھی وہ ہمیشہ سے ایسا ہی کرتی ہے اور وہ اچھی "سامع" ہے۔

بیلا نے آنکھیں بند کیں... کھولیں... نظر سامنے اٹھی تھی وہ سامنے بیٹھا تھا بیلا نے نظریں جھکا کر راؤ تہذیب حسین کی غزل سنائی تھی... مدھم لہجہ نفیس ادائیگی... قائداعظم بلاک میں خاموشی ٹھہر گئی تھی۔

سفر میں زندگی کے کوئی بھی رستہ نہیں دیتا
کڑی ہو دھوپ تو گھر کا شجر سایہ نہیں دیتا
یہاں ہر رنج و غم، درد و الم خود ہی اٹھانا ہے
کسی کو اپنی خوشیوں کا کوئی لمحہ نہیں دیتا
اسی کو جاگنا ہے رت جگے جس کا مقدر ہیں
کسی کو اپنی آنکھوں کا کوئی سپنا نہیں دیتا
اٹھانا ہے ہمیں کو زندگی کا بوجھ مرنے تک
کہ جب تک زندگی ہے کوئی بھی کاندھا نہیں دیتا
کیا تھا اعتبار اک شخص پر اس دن کو روتا ہوں
کوئی اپنا بنا کر یوں کبھی دھوکا نہیں دیتا
خدا ہی ہے جو رکھتا ہے ہمیں اپنی پناہوں میں
کسی کے واسطے کوئی یہاں پہرا نہیں دیتا
گلہ تہذیب غیروں کا کسی سے کس لیے کیجیے
یہاں تو ساتھ مشکل میں کوئی اپنا نہیں دیتا

قائداعظم بلاک جانے کتنے منٹ تک تالیوں سے گونجتا رہا تھا... بیلا تمکنت سے مسکراتی واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی منعم علی خوب صورت چال چلتا ڈائس پر آیا تھا اور بھکر کے نوعمر شاعر حسن علی کی غزل گنگنایا تھا۔

کبھی یہ ہجر اور کبھی یہ وصال صاحب
کر دیا ہے عشق نے جینا محال صاحب
کٹ رہا ہے اذیتوں میں میرا ہر پل
ان محبتوں نے دیا ہے فقط ملال صاحب
کتنا نہ تھا جن کے بغیر زندگی کا اک پل

بغیر ان کے گزار دیے کئی سال صاحب
آجاتے ہیں اچانک آسمان سے زمین پر
یوں بھی آنا ہے انسانوں پہ زوال صاحب
اب زمانہ محبت پر کچھ نہیں کہتا
لگا ہے فتویٰ کہ عشق ہے حلال صاحب
جواب محبت پر کیوں سل گئے تیرے ہونٹ
اتنا مشکل تو نہیں پوچھا سوال صاحب
چاند بھی دیکھے اسے تو اپنا عکس سمجھے
مت پوچھو اس کے حسن کا احوال صاحب
بھوک نے پھر پھنسا دیا ہے پنچھیوں کو حسن
دکھے دانے مگر نظر نہ آیا جال صاحب

قائداعظم بلاک تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ بیلا نے خود پر عجیب سا خوف اترتا محسوس کیا تھا۔

محبت کا آکٹوپس تھا یا کچھ اور۔ اسٹیچو پلے شروع ہو رہا تھا یا پھر ہو چکا تھا۔؟

فائلز اور بیگ اٹھاتی وہ قائداعظم بلاک سے باہر آ گئی تھی۔ اسپرائگ کے گملوں سے وہ ٹکراتی پھر رہی تھی مور پنکھ ساکت کھڑے تھے۔ بیلا بنت فاروق احمد قائداعظم بلاک سے دور قدیر خان بلاک کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ "اگر محبت ایک لمحہ ہے تو وہ اس لمحے کی زد میں بھی نہیں آئے گی۔ کبھی نہیں۔" تماش بین وقت نے زور سے اس سوچ پر ٹھٹھا لگایا ہے۔

کچھ ساعتوں کی خاموشی محبت کے لمحے کے نام کر دی گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

منعم علی آٹھ گھنٹوں بعد لاہور پہنچ گیا تھا۔ جب وہ ہوٹل پہنچا تو فیریا ریسٹ کر کے فریش ہو چکی تھی۔ وہ اسے اپنے سامنے یوں یہاں دیکھ کر حیرت آمیز سی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

"واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز یار۔" وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ فیریا کی اٹھی نظریں جھکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ جینز پر اسکائی بلیو ٹی شرٹ پہنے، پیشانی پر بکھرے بال، زرد بلب کی طلبی سی روشنی میں وہ فیریا کو یونانی دیوتاؤں سی آن بان والا لگا تھا۔ وقت رک گئے۔ وہ پلک تک بھی نہ جھپکے۔

"مجھے آنا تو تھا ہی۔ میں تم سے کہہ چکی تھی کہ میں یہ دیکھنے آؤں گی کہ کہیں تم مجھے بھول تو نہیں گئے ہو" بے ساختہ کہا اس کا ہاتھ رکا تھا۔

"میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں؟" منعم نے تعجب سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بار بار اسے دیکھتی تھی پھر نظر جھکا لیتی تھی۔

"تم بھول سکتے ہو منعم۔ میں نہیں بھول سکتی" وہ پراسرار سا مسکرائی تھی۔ مسکراہٹ کا اسرار کمرے میں گھومنے لگا تھا۔

"دوست، دوستوں کو کہاں بھول سکتے ہیں۔ خیر۔ ماریانا کیسی تھی؟" کارپٹ کے نقش و نگار دیکھتی وہ چونکی تھی۔

"شی واز فائن" نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ دل تھا کہ برابر دھڑکے جا رہا تھا۔ وقت تھا کہ تھمتا ہی نہ تھا۔

"مال روڈ پر واک کرنے چلیں؟ پھر دو گھنٹے بعد تو بھکر کو روانہ ہو جائیں گے" منعم نے پروگرام ترتیب دیا تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر وہ واک کر رہے تھے۔ سڑک کنارے لگے درختوں پر نارنجی پھول ہوا سے چھوٹ کر سڑک پر گرتے تھے۔ سڑکیں پھولوں سے اٹی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ منچلے انہیں یوں دیکھ کر پاس سے سیٹی بجاتے گزر جاتے۔

"لوگ ہمیں ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟" منعم شرارت سے مسکرایا تھا۔ ہلکی ہوا چلی تھی پھول اڑ کر فیریا کے بالوں میں سج گیا تھا۔

"اسٹاپ اینڈ اسٹیچو۔" وہ رک گئی۔ تھم گئی۔ مجسمہ بن گئی تھی۔ محبت کی پکار یونہی بے جان کرتی ہے۔ وہ اس کے بالوں میں پھنسا نارنجی پھول نکالتا ہوا کہہ رہا تھا۔

"لاہور والے پیرس کی فیری کو دیکھ کر مبہوت ہو رہے ہیں۔"

مبہوت تو وہ خود ہوئی کھڑی تھی۔ پاکستان کا دل

لاہور ہوتا ہوگا مگر فیریا کا دل تو بھگر میں تھا۔ وہ دوبارہ خراماں خراماں چل رہے تھے۔۔۔ نارنجی خوشبوئیں نثار ہو رہی تھیں۔

فٹ پاتھ کی گھاس نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر سو گئی۔۔۔ وقت جاگ رہا تھا اور محبت کہاں تھی۔

"چھلیے کھاؤ گی۔۔۔؟" وہ ایک چھلیے والے کو روک رہا تھا۔۔۔ وہ ٹشو جیسے باریک پھوں کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے تھوڑا سا منہ میں رکھا تھا۔۔۔ مٹھاس منہ میں گھل سی گئی تھی۔

"اسے کھانا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔۔۔ کتنا نفیس ہے ناں؟" وہ زور سے کھلکھلائی تھی۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ یونہی مسکراتا رکھے فیری" جاگتے وقت نے سرگوشی فیریا کی سماعتوں میں الٹ دی ہے۔

"تم نے مجھ سے کچھ کہا؟" نفاست سے لچھا کھاتی وہ چونک کر پوچھنے لگی تھی۔۔۔ ہوا سے اس کے بال اڑ رہے تھے۔

"تم ہنستی ہوئی، بہت پیاری لگتی ہو۔" گمشدہ محبت یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔۔۔ درختوں کی چوٹیوں پر فاختائیں ہولے ہولے جھول رہی تھیں۔

"ویسے پیاری نہیں لگتی۔۔۔؟" وہ خفا ہونے کی بس کوشش ہی کر سکتی تھی اور کر رہی تھی۔

"اں۔۔۔ ویسے کم پیاری لگتی ہو۔" وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔۔۔ اور وہ مسکراہٹ فیریا کو پتھر کر دیتی تھی۔

تبھی فیریا کے پاؤچ میں رکھا موبائل بجنے لگا تھا۔۔۔ اس نے جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھا اور موبائل کان سے لگا لیا تھا دونوں فٹ پاتھ کے سنگی بنچ پر بیٹھ گئے تھے۔۔۔ ہر لرزتی نظر ان پر ٹھہر رہی تھی۔

"آپ نے تو انوائٹ نہیں کیا ناں؟" وہ کسی سے بات کرتی خفا ہو رہی تھی۔

"اب کس نے انوائٹ کیا ہے؟" پوچھا جا رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔ دل کی دعوت پر آئی ہوں۔" وہ ہنسی تھی۔

"دل کی مانتی ہو؟" جواب میں قہقہہ ابھرا تھا۔

"آپ نہیں مانتے؟" بات دلچسپ تھی۔۔۔ منعم قطاروں میں کھڑے درخت گن رہا تھا۔

"میری تو عمر گزر بھی چکی" ادھر سے ٹھنڈی آہ سنائی دی تھی۔۔۔ فیریا آسمان کی چوٹیوں پر بادل دیکھ رہی تھی۔

"تمہارا سفر تو ٹھیک گزرا ناں۔۔۔ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔۔۔ وہ گہری سانس لے رہی تھی۔

"جی ہاں۔۔۔ بہت اچھا گزرا۔"

"وہ کدھر ہے؟" سرگوشی میں انہوں نے پوچھا تھا۔ فیریا نے ہنسی دبائی تھی۔

"بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھا ہے۔" بنچ کے دوسرے کنارے پر بیٹھے شخص نے غور سے اسے دیکھا تھا۔

"وہ تمہیں دیکھ رہا ہے؟" بلا کا تجسس تھا انداز میں۔۔۔ اور اندازہ بھی۔۔۔ جو کہ ہمیشہ غلط ثابت ہو جاتا تھا۔

"میری ایسی قسمت کہاں۔" دنیا جہان کی اداسی حاضر ہو گئی ہے۔

"بڑا بدذوق ہے پھر تو۔۔۔" نفی میں سر ہلاتے لہجے میں ساری دنیا کا افسوس بھر لیا گیا۔

"آخر بیٹا کس کا ہے۔۔۔" فیریا نے دوسرے کنارے بیٹھے شخص کو نثار ہوتی نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں بدذوق ہوں؟" دوسری طرف سے بھرپور انداز میں برا منایا گیا۔

"آپ۔۔۔ آپ تو۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑ گئی تھی۔۔۔ ادھوری بات اور پوری "چپ" سے ان دونوں کی گہری شناسائی تھی دونوں کی رمزیں سمجھ جاتے تھے۔۔۔ لاہور کی ہوا پردہ پوش بن گئی ہے۔۔۔ منعم علی بنچ سے تھوڑا دور ٹہل رہا تھا درختوں کی چوٹیوں پر بیٹھی امن فاختائیں اڑ گئیں۔۔۔ نارنجی پھول تنہا رہ گئے تھے۔

"فیریا؟" انہوں نے دور سے پکارا تھا فیریا کو لگا آواز کہیں پاس سے آئی ہو بہت ہی قریب سے۔۔۔

"جی۔۔۔" وہ جیسے سرگوشی میں بولی تھی۔۔۔ ہوائیں سرگوشیاں سن لیتی ہیں اسرار بوجھ لیتی ہیں۔

"پاکستان کو تمہیں کچھ دینا چاہیے۔۔۔ مگر تمہیں دینے کے لیے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں تمہیں اکیلے واپسی کا سفر کرتے کیسے دیکھ پاؤں گا۔" وہ رو رہے تھے لاہور کی ہوائیں بھیگنے لگی تھیں۔

"خود کو اکیلے واپس جاتے تو میں بھی نہیں دیکھ سکوں گی۔" آنکھوں سے آنسو ہاتھوں کی پشت پر گرتے ہیں۔

"تم۔۔۔ تم رو رہی ہو؟" وہ بے چین ہو گئے تھے۔۔۔ فیریا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سسکی دبائی تھی۔

"آپ رو رہے ہیں۔"

"تم ساری دنیا سے چھپا سکتی ہو مگر مجھ سے کبھی نہیں۔" اب وہ غصے میں تھے وہ جانتی تھی۔

"میں مسکرا رہی ہوں۔۔۔ سچی" وہ ٹشو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔۔۔ ٹشو سے آنکھیں پونچھ رہی ہو گی۔" فیریا کے لیے لگایا گیا ان کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔۔۔ منعم بے زار ہو کر دوبارہ بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔

"اسے لگتا ہے آپ اس سے محبت نہیں کرتے آپ کو صرف عمارتیں کھڑی کرنے کا شوق ہے۔۔۔ وہ آپ کو ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔۔۔ یا پھر اس نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی وہ غور سے منعم علی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے خوبرو چہرے پر بے زاری تھی۔

"مجھے محبتیں جمع کرنے کا فن نہیں آتا فیریا۔۔۔ بزنس میں کامیاب ترین شخص رشتوں کے معاملے میں زیرو ہوتے ہیں۔۔۔ تم اگر مجھ سے رابطہ نہ کرتیں اور اس سب کا احساس نہ دلاتیں تو میں یہ کبھی نہ جان سکتا۔۔۔ تم ایک اچھی لڑکی ہو فیریا۔" وہ مسکراتے ہوئے رونے لگے تھے۔

"آپ رو رہے ہیں؟" وہ بے چین ہو گئی ہے۔۔۔ منعم نے اب غور سے فیریا کو دیکھا تھا۔

"نہیں، نہیں آنکھ میں کچھ چلا گیا شاید" انہیں اچھے بہانے بنانے بھی نہیں آئیں گے۔

"دنیا والوں کے جیسے بہانے آپ پر بالکل نہیں جچتے۔۔۔ آپ کچھ نیا سوچیں۔" وہ ہمیشہ کی طرح مشورہ ہی دے سکتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ فون رکھتا ہوں۔۔۔ وہ یقیناً" تلملاتا ہوا تمہیں گھور رہا ہو گا۔۔۔ جلدی آؤ۔۔۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔" وہ واقعی پاس بیٹھا تلملاتا ہوا اسے کڑے تیوروں کے ساتھ گھور رہا ہے۔

"کس سے اتنی لمبی ہنس ہنس کر گفتگو ہو رہی تھی۔"

"دوسرے کنارے بیٹھا وہ شخص خفا ہو رہا ہے۔۔۔ اینگری مین۔"

"تمہیں میری ہنسی نظر آ گئی۔۔۔ آنسو نظر کیوں نہیں آئے۔" وہ یہ صرف سوچ ہی سکی تھی۔

"تھا کوئی عزیز شخص" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ دونوں مال روڈ کی سڑکوں پر گرے نارنجی پھولوں کو قدموں تلے کچلتے آگے بڑھ رہے ہیں۔۔۔ پردہ پوش ہوائیں اپنا وجود چاک کر دیتی ہیں۔۔۔ برہنہ ہو جاتی ہیں۔

"پاکستان کے پاس فیریا کو دینے کے لیے سارے رشتے ہیں۔۔۔ دوستی کے 'احترام کے' شفقت کے مگر پیرس کی فیریا کے لیے یہاں "محبت" نہیں ہے۔"

✲ ✲ ✲

ڈھلتی سہ پہر کو وہ چاروں اسٹوڈنٹ آئس کریم پوائنٹ پر جمع تھیں۔۔۔ روشی نے واویلا مچایا تھا کہ وہ اپنی کامیابیوں کی انہیں ٹریٹ نہیں دیتی۔۔۔ یہ ایک وائٹ جھوٹ تھا اور ایک آفاقی سچائی یہ بھی ہے کہ ان کے گروپ میں "واویلا کوئین" روشی ہی ہے۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر واویلے مچاتی ہے۔۔۔ دکان میں وہ لیڈیز حصے کی طرف آ گئی تھیں۔۔۔ سہ پہر شام سے ملاقات کو تیار کھڑی تھی۔۔۔ پوری دکان سبز اور ہلکی نیلگوں روشنی سے جگمگا رہی تھی۔۔۔ ہلکا ہلکا میوزک بھی بج رہا تھا۔۔۔ روشی زبان کے ساتھ ساتھ پاؤں بھی چلا رہی تھی۔۔۔ ریحانہ نے اس کے پیروں کی طرف اشارہ کیا تھا "اسے تو بند کرو۔"

"کیوں؟" واویلا کوئین نے بھنویں سکیڑ کر دیکھا

تھا۔ ریحانہ نے تپ کر ہاتھ جوڑ دیے تھے۔
"دفع ہو۔۔۔ مرو جو بھی کرو۔"
"ایک تو تم دونوں ہر جگہ شروع ہو جاتی ہو۔۔۔ چپ کر کے بیٹھی رہو۔" صدف نے بڑی بی بن کر ہمیشہ کی طرح ٹوکا تھا اور ہمیشہ کی طرح خاک بھی اثر نہ ہوا تھا۔
بیلا نے آرڈر نوٹ کروانا تھا "روشی کون سا فلیور کھاؤ گی؟" کافی غور و فکر کے ساتھ روشی نے کہا تھا۔
"اورنج۔"
"ریحانہ تم۔۔۔؟" ریحانہ آئس کریم کے معاملے میں کبھی نہیں سوچتی۔
"بائے میرے لیے تو اسٹرابری منگوانا۔" بیلا نے سر ہلاتے ہوئے صدف کو دیکھا تھا۔۔۔ صدف اور بیلا کی پسند ناپسند اکثر سیم ہوتی ہے۔
"ہمیشہ کی طرح ونیلا پلیز۔" آرڈر نوٹ کروا دیا گیا تھا۔۔۔ کچھ لمحے بعد وہ اپنے اپنے کپ سامنے رکھے آئس کریم کھا رہی تھی۔
"یہ آئس کریم اتنی جلدی کیوں پگھل جاتی ہے؟" ایسے سوال روشی ہی کرتی ہے۔
"آئس کریم بے چاری بہت حساس ہوتی ہے ذرا سی تپش بھی برداشت نہیں کر سکتی۔" ایسے جواب ریحانہ ہی دے سکتی ہے۔ ان کے سروں کے اوپر ہی لمبی تاروں والے بلب جل بجھ رہے تھے۔۔۔ سبز نیلگوں روشنی۔
"دنیا کی حساس ترین شے پھر آئس کریم ہی ہوئی؟" روشی نے مزید استفسار کیا تھا۔ کاش وہ ایسے سوال سر شکور کے لیکچر کے دوران کرے تو ان کی فیورٹ اسٹوڈنٹ بن جائے۔
بیلا نے آئس کریم کی مٹھاس منہ میں گھلتی ہوئی محسوس کی تھی سارے وجود میں ٹھنڈک سرایت کر رہی تھی۔
"نہیں۔۔۔ سب سے حساس انسان ہی ہوتا ہے۔" بیلا نے کچھ سوچ کر جواب دیا تھا۔
"وہ کیسے؟" صدف نے خالی کپ ڈسٹ بن کی طرف اچھالا تھا۔
بیلا نے بھی خالی کپ میں چمچہ رکھ کر ڈسٹ بن کی طرف اچھال دیا تھا اور آگے ہو کر گویا ہوئی تھی۔
"یہ جو انسان ہوتا ہے ناں بہت حساس ہوتا ہے۔۔۔ ذرا سی چوٹ سے، رتی جتنی تکلیف سے واویلے پر اتر آتا ہے پھر اللہ سے وعدے کرنے لگتا ہے مگر پتا ہے صدف۔۔۔ یہ تکلیفیں، آزمائشیں ہمیں بہادر بنانے کے لیے آتی ہیں۔۔۔ دکھ کی بھٹی میں انسان کندن ہو کر نکلتے ہیں۔۔۔ پھر ہر تکلیف، مشکل گلاب کے پھول کی مار جیسی لگتی ہے۔۔۔ ہلکی سی۔۔۔ معمولی سی۔۔۔ جو آپ سے ٹکرا کر خوشبو چھوڑ جاتی ہے۔۔۔ یہی زندگی ہوتی ہے۔"
وہ تینوں کاؤنٹر تک آئی تھیں۔۔۔ روشی بیگ بھول آئی تھی واپس بیگ اٹھانے بھاگی تھی۔ بیلا نے بیگ سے پیسے نکال کر کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کی طرف بڑھائے تھے۔ اس شخص نے پیسے نہیں اٹھائے تھے۔
"مس۔۔۔ میں یہ پیسے نہیں لے سکتا۔" اس کے چہرے پر بڑی عجیب سی مسکراہٹ تھی۔
"مگر کیوں۔۔۔؟" بیلا نے حیرانی سے پہلے پیسوں کو اور پھر اسے دیکھا تھا۔
"آپ کا بل پے ہو چکا ہے۔" وہ ان تینوں کو گھور رہا تھا۔ انہوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔
"کس نے پے کیا ہے؟" بیلا نے پوچھا تھا۔۔۔ "ان صاحب نے" بیلا نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی طرف دیکھا تھا جہاں منعم علی، اسد اور چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھڑا انہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔ شاید وہ بھی اپنے گروپ کو ٹریٹ دینے وہاں لایا تھا بیلا نے مڑ کر دکان دار کو سخت تیوروں کے ساتھ گھورا تھا۔
"آپ یہ پیسے رکھیں اور ان صاحب کے پیسے انہیں واپس کر دیجئے گا۔" وہ تینوں باہر سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر روشی کا انتظار کرنے لگی تھیں۔۔۔ خانسر روڈ پر ٹریفک کی چہل پہل تھی۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔۔۔ دور دور تک نیون سائن جگمگا رہے تھے۔
"منعم نے ہمارا بل پے کیوں کیا۔۔۔؟" ریحانہ پوچھ

رہی تھی۔ بیلا نے اکتا کر جواب دیا تھا۔
"مجھے اب الہام تھوڑی ہوا ہے۔ ایک تو روشی بدتمیز آکر نہیں دے رہی۔"
تبھی وہ باہر آیا تھا۔ روشنیاں اس کے وجود پر رخ سے گر رہی تھیں۔ مردانہ کلون کی خوشبو بکھر گئی تھی۔ وہ ان کے قریب آیا تھا "آخر ہم کلاس فیلوز کا ایک دوسرے پر اتنا حق تو بنتا ہی ہے۔" وہ شاید شکوہ تھا۔ بیلا سکون سے ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔
"مسٹر منعم علی یہ ایک ایسا ریلیشن نہیں، جہاں آپ حقوق کی بات کریں۔ اور دوسری بات ہم کلاس فیلوز ہیں یہ بات صرف ہم اور آپ جانتے ہیں۔ باقی زمانہ نہیں جانتا۔ انگلیاں ہم پر ہی اٹھیں گی۔ سو آئندہ خیال رکھیے گا۔" منعم علی نے پس منظر میں جلتی بجھتی روشنیوں کے آگے کھڑی دلیل سے باتیں کرتی بیلا بنت فاروق کو خاصے غور سے دیکھا تھا۔ وہ لڑکی عام نہیں تھی اور عام ہو بھی نہیں سکتی تھی۔
"آئی ایم سوری۔ اگر آپ کو برا لگا ہو تو" وہ معذرت کر رہا تھا۔ تبھی بیگ چیک کرتی روشی باہر آئی تھی۔
"ارے منعم آپ۔؟" اس نے ابھی ابھی منعم کو دیکھا تھا۔
"چلو روشی۔ دیر ہو گئی ہے۔ عفی میم غصہ ہوں گی۔" روشی نے ان تینوں کو حیرت سے دیکھا تھا۔
"ارے۔ عفت میم اور چنبیلی کی آئس کریم بھی پیک کروانی ہے۔"
"بھکر میں اور بھی آئس کریم پارلرز ہیں فی الحال چلو یہاں سے۔" بیلا نے اس بار غصے سے کہا تھا۔ وہ چاروں روڈ کنارے چل رہی تھیں۔ تبھی ریحانہ نے ہولے سے کہا تھا۔
"بیلا۔ اتنی بڑی بات نہیں تھی" بیلا رک گئی تھی۔
"چھوٹی چھوٹی باتیں ہی ہم لڑکیوں کے آگے پہاڑ کھڑے کرتی ہیں۔"
ریحانہ چپ ہو گئی تھی۔ روشی نے بیگ سے موبائل نکال کر وقت دیکھا پھر مطمئن ہو کر واپس رکھ دیا تھا۔
"آخر ہوا کیا ہے۔ مجھے بھی تو پتا چلے" روشی کو تجسس نے گھیرا تھا۔
"کچھ نہیں ہوا" صدف نے بے پرواہ سے انداز میں روشی کے تجسس کو ابدی نیند سلا دیا تھا۔
اسد پارلر سے نکل کر باہر آیا تھا۔ سیڑھیوں کے پاس کھڑے منعم کا کندھا تھپکا تھا۔
"ارے کیا کیا باتیں ہوئیں؟"
"بیلا فاروق بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اسد۔" منعم پر سوچ انداز میں گویا ہوا تھا۔
"ارے یار۔ تو بھی تو گھاگ شکاری ہے کہاں چوکنے دے گا۔ دانہ ڈال اور تماشا دیکھ۔" وہ دونوں ہاتھ پر ہاتھ مارتے اندر چلے گئے تھے۔ خانسر روڈ کی روشنیاں ہجوم ہو گئی ہیں۔ نیلی، پیلی۔ سبز خوشبوئیں فٹ پاتھ پر آوارہ گھوم رہی ہیں۔ شام مردہ اور اداس سی ہے۔
محبت تماش بینوں کے لیے تماشا نہیں۔ بلکہ محبت تو خود ایک تماش بین ہے۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم کے قدیم گھڑیال نے رات کے دو بجے کا گھنٹہ بجایا تھا۔ آواز راہداریوں، دریچوں میں گھومتی گھماتی بازگشت ہو گئی تھی۔ وہ گاؤن پہنے اوپری منزل کی گرل کے ساتھ ٹکے نیچے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں "وہ" بیٹھا تھا۔ ارد گرد سے مکمل طور پر بے نیاز سا کین کی کرسی پر بیٹھا ان کے قد آدم لیمپس کی زرد روشنی میں کوئی کتاب پڑھتا ہوا۔ ہر سطر اس کے چہرے کے تاثرات بدل دیتی تھی۔ بدل رہی تھی۔
"ہمم۔ لگتا ہے آدھی رات کو کوئی ہورر ناول پڑھا جا رہا ہے۔ انہماک دیدنی ہے۔" جیکسن نے اپنے آپ سے ننھی منی سی سرگوشی کی تھی۔ پھر دبے پاؤں چلتے احتیاط سے ادھر ادھر دیکھتے وہ اس کے

کمرے کی طرف بڑھے تھے۔۔۔ ہولے سے دروازے کھولا۔۔۔ کمرے میں اماوس پھیلی ہوئی تھی سوئچ بورڈ پر ہاتھ رکھا۔ کھٹ کھٹ روشنیاں جل اٹھیں۔۔۔ وہ اماوس "پورے چاند" میں ڈھل گئی تھی آگے ہو کر وائٹ بورڈ پر ڈالا ہوا بلیک پردہ کھینچا۔۔۔ وائٹ بورڈ ایک ہی نام سے بھرا ہوا تھا۔۔۔ وہ دم سادھے دیکھتے رہے۔۔۔ پیچھے چاپ ابھری۔۔۔ اور چار سیکنڈ بعد پرسکون سی آواز۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟"

"یہ میرا سوال ہے یہ سب کیا ہے؟" وہ مڑ کر پوچھنے لگے تھے۔۔۔ وہ الماری میں کتاب رکھنے لگا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے۔۔۔؟" وہ حیران تھے ایسا اطمینان تو انہیں قیامت تک بھی نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔

"تم نے ایبسٹریکٹ آرٹ کی کلاسز جوائن کرلیں؟ تو کیا بورڈ تجریدی آرٹ سے سجا نظر آرہا تھا؟"

"نہیں تو۔۔۔ آپ کو کس نے کہا؟"

"تمہاری حرکات و سکنات کہہ رہی ہیں۔" وہ کاؤچ پر بیٹھ گئے۔ وہ روم فریج کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"ہمم۔۔۔" اور یہ "ہمم" کتنا اور کس حد تک خطرناک تھا وہ دونوں جانتے تھے۔۔۔ اور سمجھتے بھی خوب تھے۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" ناریی نگاہیں۔۔۔ سوچ۔۔۔ پرکھ کرتی ہوئی۔۔۔ وہ سیب کتر رہا تھا۔

"آپ سے کچھ چھپانا آسان تو نہیں ڈیڈ۔۔۔" لہجے میں افسوس کی بھاری مقدار تھی۔ افسوس۔۔۔

"ہاں۔۔۔ مجھے ٹیلی پیتھی آتی ہے اور یہ انداز۔۔۔ اطمینان ڈیرک باف کو قیامت تک نصیب نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اچھل ہی تو پڑا تھا۔۔۔ سیدھا ہوا۔۔۔ الفاظ گم ہو گئے۔

"آپ۔۔۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں؟" کیا حیرانی تھی۔

"میں جھوٹ نہیں بولتا۔" بے نیازی تھی تو کمال تھی۔۔۔ اداکاری تھی تو لاجواب تھی۔

"آپ ہمیشہ سچ بھی تو نہیں بولتے۔" تاسف سے سر ہلایا گیا۔۔۔ سیب اچک لیا گیا۔۔۔ "آپ کبھی نہیں بدلیں گے۔"

"میں کیوں بدلوں۔۔۔ جیسا ہوں ویسا ہی ٹھیک ہوں۔۔۔ انرجیٹک۔۔۔ ہینڈسم۔" لہجے میں فخر مفقود تھا۔

"جی۔۔۔ آپ کو آدھی رات کو میرا روم چیک کرنے کی زحمت کیوں ہوئی؟" وہ لہجہ ہرگز بھی سخت نہیں تھا۔۔۔ مگر انہیں لگا تھا چاندنی کھڑکیوں سے باہر کھسک گئی۔۔۔ اماوس ٹھہر گئی۔۔۔ اور اماوس کا ٹھہرنا؟ اذیت و وحشت۔

"تم بدل رہے ہو ڈیرک۔۔۔ اور یہ سچ ہے تم اس کو جھٹلا نہیں سکتے۔۔۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ میرا وہم ہے۔ وہم ایسے نہیں ہوتے وہم تو اور طرح کے ہوتے ہیں۔ میں اسٹڈی میں گھنٹوں تمہارا انتظار کرتا رہتا ہوں مگر تم نہیں آتے۔۔۔ کیوں نہیں آتے؟ میں آج کل اکیلے کافی پینے نہیں جا سکتا۔۔۔ تم جو نہیں ہوتے۔۔۔ میں گھر پر کافی بنا کر پی رہا ہوں اور تم جانتا چاہو گے کہ میں کتنا برا کافی میکر ہوں۔۔۔ جوڈی کتنا بیمار تھا تم نے کہا تھا اکٹھے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے۔۔۔ میں اور جوڈی تمہارا انتظار کرتے رہے۔۔۔ میں سو گیا۔۔۔ اور وہ تکلیف سے مر گیا۔۔۔ جانے کیوں مجھے اس مردہ حیوان کی آنکھیں سوال کرتی نظر آئیں۔۔۔ اس کی آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ ڈیرک کیوں نہیں آیا؟ میرے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا ہے مگر اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ ادیب 'فلاسفر' کہتے ہیں انسان حساس ہوتے ہیں۔۔۔ مگر ڈیرک حساس تو حیوان بھی ہوتے ہیں۔۔۔ ہم نے تو حیوانوں کی آنکھیں پڑھی ہیں ناں۔۔۔ تمہیں تو پتا ہوگا۔۔۔ ہر کسی کو ہونا چاہیے۔۔۔ تمہارے انتظار نے مجھ سے میرا جوڈی چھین لیا۔۔۔ اسے میں آدھی رات کو ایک گمنام جگہ گڑھا دبا کر پھینک آیا تھا۔۔۔ اور میں نے تو پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔ تم جانتے ہو ناں کہ کتنا چھوٹا سا دل ہے میرا۔" ڈینز کی مہک مردہ ہے۔ وقت جامد۔۔۔ سانسیں اتھل پتھل۔۔۔ وہ روتے روتے ہنسے تھے۔۔۔ ہنسی کیا تھی؟ کرب ڈھیا۔

ڈیرک باف کو یاد آیا تھا۔۔۔ "ہاں اس نے حیوانوں

کی آنکھیں پڑھی ہیں۔" وہ کسی اہرام کی الماری میں بجی "ممی" ہو گیا ہے۔ اور جیکسن باف کا چہرہ درد ہو گیا ہے۔

"میں تمہیں یہ سب کہہ کر شرمندہ نہیں کرنا چاہتا ... بالکل نہیں ... بس میں تو ... میں تو یہ چاہتا ہوں کہ اس سب کے پیچھے وجہ کیا ہے ... تمہارا بدلنا مجھے تکلیف دے رہا ہے۔" وہ واقعی تکلیف میں تھے اور یہ شاید پہلی بار تھا ... ورنہ تو وہ شگفتہ اور شوخی سے بھرپور انسان تھے۔

"ممی" میں جیسے جان پڑ گئی تھی ... وہ دھیرے دھیرے چلتا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تھا ... سارا پیرس روشنیوں میں بھیگا ہوا تھا۔

"جب آپ ایسا کچھ کہتے ہیں تو واقعی مجھے شرمندہ کر رہے ہوتے ہیں ... یہ بھی اک سچ ہے جسے آپ جھٹلا نہیں سکتے ... اور آپ اسے میرا وہم بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ میں جانتا ہوں ... وہم ایسے نہیں ہوتے وہ تو اور طرح کے ہوتے ہیں آئی نو دیٹ آئی ایم رونگ بٹ پلیز ٹرائی ٹو انڈراسٹینڈ می ..." وہ پزل بن گیا ... بٹ گیا ... الجھ گیا ... تو کیا جوڑا جائے؟ جوڑنے والا بھی کھڑکی میں کھڑا ہو گیا ... عقب میں اداسی ناچتی رہی ... اداسی کیا ہے؟ خالی رات ... اندھیری۔

"تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔" پزل کا ایک ٹکڑا سرک گیا ... ڈیرک نے غور سے انہیں دیکھا تھا۔ تو کیا وہ ...

"تمہاری آنکھیں تمہاری اچھی دوست نہیں ہیں ... تبھی تمہارا ساتھ نہیں دیتیں۔ میری دوست ہیں ... مجھ سے سب کہہ دیتی ہیں۔" ڈیرک باف کی آنکھیں کتاب ہیں اور جیکسن باف ان آنکھوں کے قاری ... دلچسپ ترین معمہ۔

"تو میری آنکھوں سے ہی میرے بدلنے کی وجہ پوچھ لیں" وہ جل کر بولا تھا ... خفگی پیٹھ موڑ لی گئی تھی۔ کندھے پر ہاتھ رکھا ... اپنی طرف موڑا ... وہ موم کا گڈا مڑ بھی گیا تھا ... وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے رہے ... دیکھتے رہے۔

"آج تمہاری آنکھیں تمہارا ساتھ دے رہی ہیں۔" وہ بے بس ہو گئے۔ وہ بس انہیں دیکھتا رہا۔ ڈرائنگ روم کے گھڑیال نے تین بجے کا گھنٹہ بجایا تھا ... آواز کھڑکیوں، بالکونیوں میں قید ہو گئی تھی۔

"آپ کافی بنانا سیکھ گئے ہیں ناں؟" وہ موضوع بدل رہا تھا ... پزل مزید الجھا ... اسرار ہو گیا۔

"ہمم ..." انداز خطرناک وقت متحرک ... سانسیں متوازن ... تو قصہ ختم؟

"کافی پئیں ..." تجویز تھی تو بھونڈی سی مگر قبول کر لی گئی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ چلتے کچن تک آ گئے ... وہ اسٹول گھسیٹ کر بیٹھ گیا ... وہ کافی پھینٹنے لگے تھے ... دور کہیں وائلن بج رہا تھا ... وہ آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔

"آئی ایم سوری ... میں شرمندہ ہوں۔" انہوں نے کپ دھوتے ہوئے پلٹ کر غور سے دیکھا تھا۔

"تو کیا میں نے واقعی تمہیں شرمندہ کر دیا؟" وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے تھے۔ "اُف ... جیکسن دی گریٹ۔"

"ہاں ... آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"اور ہر بار تمہاری شرمندگی مجھ سے ناقابل معافی خراج مانگتی ہے ... تم بہت برے ہو۔" وہ اداس ہو گئے تھے۔

"ہاں ... میں ہوں" ڈیرک ان سے زیادہ اداس ہو گیا تھا ... اسے جوڈی یاد آ رہا تھا ... اس کا رشین ڈاگ ...

"میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا ... یاد رکھنا" کپ اس کے سامنے ٹیبل پر پٹخ دیا گیا ... خود سلیب پر بیٹھ کر کافی کی چسکیاں لینے لگے ... ڈیرک نے بھاپ اڑاتے کپ کو دیکھا تھا۔

"آپ معاف کر دیتے ہیں ... یاد رکھا کریں۔" وہ چپ سے بیٹھے رہے "تھوڑی سی شوگر ملے گی؟" خطرناک حد تک محتاط انداز اپنایا گیا تھا۔

"میں تمہارا نوکر نہیں ہوں سمجھے" غصے سے ناک لال ہو گئی ... نگاہیں غضب ناک۔

"سمجھ گیا۔" معصوم انسان نے معصومیت کی انتہا کر دی۔۔۔ خیر وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تو کرتا آرہا ہے۔

"اچھا۔۔۔ سنیں۔" ڈیرک نے کافی کی چسکی لی۔۔۔ اور انہیں مخاطب کیا تھا۔

"ہمم۔۔۔" وہ نہیں جانتے تھے "ہمم" کے بعد کیا خطرناک جواب آنے والا تھا۔

"مجھے محبت ہو گئی ہے۔۔۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ۔۔۔ آئی ایم ان لو۔۔۔" پزل پھٹ گیا۔ ٹکڑے۔۔۔ بکھر گئے۔۔۔ جیکسن باف کے ہاتھ سے آدھا کافی سے بھرا کپ چھوٹ کر فرش پر جا گرا ہے۔۔۔ افسوس "چاند" ہو گئی ہے۔۔۔ اففف۔

☼ ☼ ☼

"ننھی لڑکی تمہارے بال بہت پیارے ہیں انہیں کبھی کٹوانا مت۔۔۔ ویسے بھی پوڈل ہیئر کٹ تم پر بالکل نہ جچے گا" مفت مشورہ تھا جو ماریانا نے بڑی مشکل سے برداشت کیا تھا۔۔۔ وہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ مشورے کا بوجھ زیادہ تھا یا اس سامان کا جس سے وہ لدی پھندی ہوئی تھی۔ وہ بیگ میں چابیاں ڈھونڈ رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔ چابیاں تو فیریا کے پاس تھیں۔" سامان سمیت وہ وہیں سیڑھیوں پر ڈھیر ہو گئی تھی۔۔۔ جہاں پہلے سے ہی "وہ" بھی ڈھیر ہوئے بیٹھے تھے۔

گلاس ڈور پر کلوزڈ کا بورڈ لٹکا ہوا تھا اور وہ پچھلے سترہ منٹ سے خوشبوؤں کے شہر میں خوشبو اڑاتے کیفے کے باہر بیٹھے تھے تھری پیس سوٹ، قیمتی گلاسز، مہنگی خوشبو۔۔۔ ہر آتا جاتا اس گریس فل سے شخص کو دیکھ کر حیران ضرور ہوتا تھا جو مکمل طور پر ارد گرد سے بے نیاز بند کیفے کے کھلنے کے انتظار میں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔۔۔ انگلیاں ٹیکسٹ ٹائپ کر رہی تھیں۔

"میں کہاں ہوں۔۔۔ ذرا اندازہ لگاؤ" ساتھ شریر ایموجی بھی بھیج دیا گیا۔

"چاند پر۔۔۔" ایسے بدتمیزانہ ریپلائی ڈیرک کی طرف سے ہی آسکتے تھے۔۔۔ دل چاہا کاش ٹیکسٹ کے ساتھ تھپڑ بھی بھیج دیں۔

"غلط۔۔۔ ہمیشہ کی طرح" دانت کچکچاتا جواب اگلے کو قہقہے پر مجبور کر گیا تھا۔۔۔ آنکھیں ہنس اٹھی تھیں۔

"جب پتا ہے کہ میں ہمیشہ غلط اندازے لگاتا ہوں تو پھر پوچھا کیوں؟" شرارت کے ریپر میں لپٹا جواب موبائل اسکرین روشن کر رہا تھا۔۔۔ جیکسن نے آتے جاتے چند راہگیروں کو گھور کے دیکھا اور پھر آخری مسیج ٹائپ کیا "آئی ہیٹ یو۔۔۔"

"آئی نو۔۔۔ (میں جانتا ہوں)" اکٹھے چار پانچ روتے دھوتے ایموجی موصول ہو گئے۔۔۔ جیکسن نے موبائل پاکٹ میں ڈال دیا اور دھیرے دھیرے گنگنانے لگے تھے۔۔۔ لوگ سنتے 'رکتے اور پھر شریر سی ہنسی ہنستے آگے بڑھ جاتے تھے۔۔۔ اسٹریٹ سنگر۔

I am missing you !
My fairy my crush !
I am looking for you !
Please look at me !

ٹیکسی رکی اور سامان سے لدی پھندی ماریانا ہانپتی کانپتی کیفے کی طرف آئی۔۔۔ رکی۔۔۔ ٹھٹکی۔۔۔ پھر آگے بڑھی تھی۔

"یس۔۔۔؟" ماریانا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔۔۔ گنگناہٹ رکی۔۔۔ نظریں اٹھیں۔۔۔ چند ثانیے پوسٹ مارٹم ہوتا رہا۔۔۔ ماریانا گڑبڑائی پھر بوکھلا کر بولی تھی۔

"آر یو او کے۔۔۔؟ (آپ ٹھیک ہیں۔۔۔؟)"

"میں تو ٹھیک ہوں مگر میرا بدتمیز بیٹا اٹک گیا ہے۔ خیر لڑکی پیاری ہے۔۔۔" وہ سوچ سوچ کر مسکراتے رہے۔ لگے ہاتھوں ماریانا کے بالوں کی تعریف بھی کر ڈالی اور اسی وقت ماریانا کو فیریا کی بات یاد آئی تھی۔

"یسوع مسیح کے واسطے ماری۔۔۔ تم اپنے ان خوفناک وچ جیسے بالوں سے نجات حاصل کر کے پوڈل ہیئر کٹ کروا لو۔۔۔ بہت پیاری لگو گی۔" اور ماریانا نے بالوں کا گھونسلا دائیں بائیں گھماتے ہوئے سوچا تھا ان کی بات مانے یا پھر فیریا کی؟

"میں تجھے مشورے دیتا ہوں۔" وضاحت کی گئی ...وہ بیگ میں چابیاں ڈھونڈتی رہی۔
"تم کیفے کب اوپن کروگی... میں پچھلے سترہ منٹ سے ویٹ کررہا ہوں۔"
"آپ صرف کافی پینے کے لیے اتنا ویٹ کررہے ہیں؟" ماریانا کی آنکھیں حیرت سے ابلنے کو تھیں... یا حیرت۔
"ہاں لڑکی... تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا۔" بھرپور طریقے سے برا منایا گیا تھا "بے وقوف لڑکی... ہمم۔"
"وہ کیفے کھلا ہے آپ وہاں سے کافی پی لیتے" ماریانا نے ڈوم تک کیفے کی طرف اشارہ کیا تھا... وہ نفی میں سرہلانے لگے۔
"نہیں بے وقوف لڑکی... مجھے آپ کے کیفے کی ہی کافی پینی ہے... مجھے بتایا گیا ہے یہاں ورلڈ کی اچھی کافی ملتی ہے۔" لہجے میں یقین سا تھا۔ ماریانا کو لفظ "بے وقوف" پر خاصا اعتراض ہوا تھا مگر کافی کی تعریف کے بدلے یہ اعتراض اپنی موت آپ ہی مرگیا تھا۔
"آپ کو کس نے بتایا یہ؟" خطرناک حد تک ضروری سوال پوچھا گیا تھا۔ "کون ہے ایسا خیر خواہ۔"
"آف کورس... میرے بیٹے نے۔" معمولی حد تک ضروری جواب ملا تھا۔
"بیٹا... ہمم۔" اس سے پہلے کہ وہ "بیٹے" کا شجرہ نسب کھنگالتی اس کے بیگ میں رکھا موبائل بجنے لگا تھا۔
"ہیلو ماریانا... وہ چابیاں تو میرے بیگ میں ہیں... میں اور ڈیرک کٹلری کا سامان خرید چکے ہیں... پانچ منٹ تک پہنچ جائیں گے۔"
"فیریا پلیز جلدی آنا" ماریانا نے موبائل بیگ میں رکھا اور انہیں دیکھا جو پاکٹ سے موبائل نکالے ٹیکسٹ ٹائپ کررہے تھے اور اسی انہماک میں وہ ماریانا کی گفتگو نہیں سن پائے تھے... روڈ کنارے درخت، لوگ بھاگتے دوڑتے جارہے تھے... وہ ٹیکسی کی ونڈو سے باہر دیکھتی رہی... اور ڈیرک اسے دیکھتا رہا۔

وقت جامد... لمحات ساکن... محبوب حاضر... نظر اٹھے تو جھک نہ سکے... آکٹوپس ہے محبت... چھوڑتی ہی نہیں... بے بس کردیتی ہے... میسج ٹون بجی تھی... اس نے میسج اوپن کیا تھا۔
"اسے پوڈل ہیئر کٹ کا مشورہ ہرگز نہ دینا... مجھے یقین ہے تم ایسا ضرور کروگے پیشگی خبردار کررہا ہوں۔" وہ مشورہ تھا... واہ۔
"فیری... تم پوڈل ہیئر کٹ کیوں نہیں کروالیتیں؟" محتاط انداز میں بے نیاز حسینہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔
"آر یو میڈ... کیسے بے ڈھنگے اور بے تکے مشورے دیتے ہو تم۔" ملامتی نظروں سے ڈیرک کو جیسے ڈوب مرنے پر اکسایا گیا تھا وہ سارے راستے پھر کچھ بولنے کی غلطی نہ کرسکا تھا ٹیکسی کیفے کے سامنے رکی... اور ادھر ڈیرک کی چلتی سانس رکی تھی سامنے ہی تو "وہ" اور ماریانا گپیں ہانکتے نظر آرہے تھے... وہ دونوں تیز تیز چلتے سامان اٹھاتے ان تک آئے تھے فیریا کیفے کھول رہی تھی... وہ ان تک آیا تھا۔
"آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟" بے بسی تھی تو انتہا کی تھی۔
"کافی پینے آیا ہوں۔" بے نیازی جیکسن باف تک آکر ختم شد... واہ بے نیاز جیکسن باف... ماریانا نے مڑ کر کہا تھا۔
"آیئے سر... میں آپ کو کافی بنا کردیتی ہوں۔" وہ شاداں و فرحاں اندر گھس گئے۔
"واؤ... ونڈرفل... بہت اچھا ڈیکوریٹ کیا ہوا ہے۔" وہ کلر اسکیم کانٹنگ 'برانڈز' سے متاثر ہوئے تھے ماریانا مسکرائی تھی۔
"تھینک یو..." فیریا اور ڈیرک سامان سیٹ کرنے لگے تھے... ماریانا بھاپ اڑاتی کافی ان تک لے آئی تھی۔
"سنو... اچھی لڑکی کیا یہ خوب صورت سالڑکا تمہارے کیفے کا ملازم ہے؟" تجسس سے دریافت کیا گیا تھا ماریانا قل قل کرتی ہنسی تھی۔
"ارے نہیں... اسے بس دوست ہی سمجھیں...

الٹر ہماری ہیلپ کروا دیتا ہے۔" اسپون اسٹینڈ پر چمچ اٹکاتے ڈیرک نے مڑ کر خاص طور پر اس ہنسی ٹھٹھول کو ملاحظہ کیا تھا۔

"تو یہاں سے کافی مفت پی کر جاتا ہے؟" ڈیرک سے نظریں چار ہوئیں۔ وہ اطمینان سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔

"نہیں۔۔۔ پے کرتا ہے مگر کبھی کبھی ہم اسے فیور دے دیتے ہیں۔"

"کیسا لڑکا ہے؟" معنی خیز سا سوال تھا۔۔۔ گلدان میں ٹیولپ لگاتی ماریانا نے جواب دیا۔

"بہت اچھا۔" وہ سوچنے لگے تھے "اے لو۔۔۔ لڑکی تو پہلے سے ہی متاثر ہے۔" انہیں ڈیرک کی بات یاد آئی تھی گزشتہ رات والی۔

"جانے کیوں مجھے لگتا ہے فیریا مجھے زیادہ پسند نہیں کرتی۔۔۔ وہ شاید صرف دوست سمجھتی ہے مجھے۔۔۔ مگر میں اسے سب کچھ سمجھتا ہوں ڈیڈ۔۔۔ آئی ایم سو وریڈ۔۔۔ فیلنگ ہوپ لیس۔"

جیکسن نے کافی کا کپ پرے کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے ٹشو باکس سے ٹشو کھینچا۔۔۔ منہ صاف کیا۔ وہ تینوں کاؤنٹر پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔۔۔ جیکسن نے کچھ سوچتے ہوئے گلدان سے ٹیولپ نکال لیا۔ کاؤنٹر تک آئے ٹیولپ ماریانا کے بالوں کے گھونسلے میں اڑس دیا۔۔۔ دی گھونسلا کوئین۔

"یو آر آ گڈ گرل فیریا۔۔۔ آئی ایم امپریسڈ۔۔۔ (تم ایک اچھی لڑکی ہو فیریا' میں متاثر ہوں) یقیناً" تم میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے پوڈل ہیئر کٹ نہیں کرواؤ گی۔" ماریانا حیران ہوئی پھر قہقہہ لگا کر ہنس دی تھی۔

"میں فیریا نہیں ہوں۔ ماریانا ہوں۔۔۔ فیریا یہ ہیں۔" اس نے ڈیرک کے ساتھ کھڑی اس گلابی کانچ کی گڑیا کی طرف اشارہ کیا تھا وہ ہکا بکا تھے اُفف۔۔۔ مائی گاڈ ڈیرک وہاں بھی ہنس رہا ہے اس نے جھک کر سرگوشی کی تھی۔

"ڈیڈ۔۔۔ آپ تو واقعی چاند پر پہنچے ہوئے ہیں۔"

جیکسن دنیا جہان کا شرمندہ ترین شخص بنا کھڑا ہے۔

"ڈیرک یاف تمہاری محبت نے تمہارے باپ کو شرمندہ کروا دیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

وہ سر عارف کے روم میں اسائنمنٹ کے سلسلے میں مدد لینے آئی تھی۔۔۔ تبھی سر کے کوئی ملنے والے آ گئے تو وہ آہستہ سے کمرے کے عقب میں لائبریری سیکشن کی طرف آ گئی تھی جو سر عارف کے روم کے ساتھ ہی اٹیچ تھا۔۔۔ وہ کتابوں کی ورق گردانی کرتی وہیں کھڑی سر کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھی یہ ساری گفتگو واضح طور پر اس کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔۔۔ وہ الجھ سی گئی تھی۔

"وہ بیٹا ہے میرا۔۔۔ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہا ہے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ جو بھی کیا اس پر شرمندہ ہوں۔۔۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ میں دولت اکٹھی کرنے میں لگا رہا اور وقت ریت ہو گیا پھسل گیا پتا ہی نہیں چلا۔" وہ بے بسی کی انتہا پر تھے۔

"میں نے کبھی بروکن فیملیز کے بچوں کو اس طرح متحرک اور ایجوکیشن کے معاملے میں سیریس نہیں دیکھا جتنا آپ کا بیٹا ہے۔۔۔ آپ نے اسے کوئی کمی نہیں ہونے دی میں جانتا ہوں۔۔۔ مگر شاید آپ کو خبر نہیں دولت کے انبار' اسٹیٹس یہ سب چیزیں ثانوی ہوتی ہیں۔۔۔ اصل چیز تو محبت' پیار' شفقت اور وقت ہوتا ہے جس کی اہمیت سے آپ انکار نہیں کر سکتے۔" پین ہولڈر میں اٹکاتے سر عارف نے انہیں جیسے آئینہ دکھایا تھا۔۔۔ دبیز غالیچوں سے سجے اس کمرے میں علی صاحب نے اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا تھا۔۔۔ کاش وہ وقت واپس لا سکتے اور وقت کے لیے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لی جائے' ایڑیاں رگڑی جائیں وقت ہاتھ نہیں آتا۔۔۔ پل۔۔۔ لمحہ۔۔۔ ساعت۔۔۔ غائب۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔۔۔ مجھے ہرگز بھی آپ سے

انسلاف نہیں مگر میں چاہتا ہوں وہ مجھے معاف کردے اسے اس کی ایگو اس بات کا اجازت نہیں دیتی۔۔۔ آپ اسے سمجھائیں پلیز۔۔۔"

"میں پوری کوشش کروں گا" سر عارف نے انہیں تسلی دی تھی۔۔۔ بیلا کتاب کے ورق الٹتی رہی۔

"آپ کیا لیں گے چائے کافی۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ پلیز۔۔۔ کچھ نہیں چاہیے۔" انہیں واقعی کسی چیز کی طلب نہیں تھی۔۔۔ وہ وہاں سے اٹھ کر سر سے ہاتھ ملاتے چلے گئے تھے بیلا نے "جیمی" کو ریک میں رکھا اور سر کی طرف آنے ہی لگی تھی کہ ٹھٹک گئی۔۔۔ خاموشی میں منعم کی آواز گونجی تھی۔

"مے آئی کم ان سر۔۔۔؟" وہ اندر آنے کی اجازت چاہ رہا تھا۔۔۔ ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے وہ مسکرائے تھے۔

"یس۔۔۔ کم ان۔" وہ اندر آکر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔۔۔ بیلا وہیں دیوار کے ساتھ لگی کھڑی رہی۔۔۔ بریسلیٹ گھماتی رہی۔ سر عارف نے منعم کی طرف بغور دیکھا اور علی صاحب کی آمد کے متعلق مطلع کیا تھا۔۔۔ وہ استہزائیہ مسکراتا رہا تھا۔

"وہ سفارش کے لیے آئے تھے آپ کے پاس؟" وہ کتنے ٹھنڈے لہجے میں بات کر رہا تھا۔۔۔ سارا ماحول جیسے برف ہو گیا تھا۔

"والدین کو سفارش کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔۔۔ بٹ اٹس پارٹ آف لائف ہے۔۔۔ ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے" وہ اسے سمجھا رہے تھے وہ ٹکٹکی باندھے ہولڈر میں لگا نیلی روشنائی والا پین دیکھتا رہا۔۔۔ دیکھتا رہا۔۔۔ یہاں تک کہ سارے منظر نامے پر نیلی روشنائی سی بکھر گئی۔

"میں نے دس سال تک اپنے گھر کی راہداریوں، باغیچوں، پردوں کے پیچھے "باپ" نامی رشتے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر ان دس سالوں میں، میں ہمیشہ ناکام رہا۔۔۔ کالی تاریک راتوں میں جب آسمان برسنے کے ساتھ گرجتا بھی تھا۔۔۔ آسمان کا برسنا خوف نہیں تھا مگر آسمان کی گرج بہت بھیانک ہوتی ہے۔۔۔ بہت میں وہ ڈر۔۔۔ خوف آج بھی آدھی راتوں کو اٹھ اٹھ کر فیل کرتا ہوں۔۔۔ دس سال بعد علم ہوا جس رشتے کو میں گھر کے برآمدوں، راہداریوں میں ڈھونڈتا رہا وہ تو "کبھی" وہاں تھا ہی نہیں وہ تو سرحد پار دولت کی جمع تفریق میں لگا رہتا ہے۔۔۔ میں تو ایک بیٹا تھا ایسا کھلونا جو رشتوں کے بیچ تماشا دکھاتا رہا میں کل بھی تنہا تھا۔۔۔ آج بھی ہوں نیلے منظر میں سسکیاں لیتی نمی رچ گئی ہے وہ خوبرو شخص سسکیاں لے رہا تھا۔

"مجھے کھلونے کے ڈھیر نہیں چاہیے تھے کبھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی تو نہیں مجھے تو بس ایک محبت کی نظر فقط ایک تھپکی چاہیے تھی جو زندگی کا احساس دلائے اور کہے کہ منعم علی تم تنہا نہیں ہو۔۔۔ میں ہوں تمہارے ساتھ میری طرف دیکھو مجھے محسوس کرو اور میرے ساتھ کیا ہوا؟ کھلونے تو مل گئے بہت سارے مگر وہ ایک نظر، وہ تھپکی آج تک نہیں ملی۔۔۔ ایسی چیزیں بازار سے نہیں ملتیں سر میں نے ان کی بہت تلاش کی ہے کھوج کی ہے مگر ملیں ہی نہیں۔" نرم غالیچے آنسوؤں کے بوجھ سے تھم گئے۔۔۔ زمین پر ساکت پڑے رہے بیلا کہانی کا ثانوی کردار بنی ساکت کھڑی ہے اسے اپنے الفاظ یاد آگئے۔

"ہونہہ۔۔۔ منعم علی اپنے ماں باپ کا لاڈلا بگڑا ہوا بیٹا۔۔۔ ایسے لوگ بڑے لاپروا ہوتے ہیں۔"

کسی کو جانے، سمجھے، سوچے بغیر اتنی جلدی رائے کیوں قائم کرلی جاتی ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے وہ ایسا کیسے سوچ سکتی تھی؟

"ممی، ڈیڈی سب اپنی اپنی زندگی میں بزی ہیں۔۔۔ دونوں مجھے گھر میں رکھے کسی قیمتی شو پیس جیسی بھی حیثیت بھی نہیں دیتے۔۔۔ ایسا کیوں ہوتا ہے سر؟ انسان شو پیس بھی تو نہیں ہوتے اولاد شو پیس نہیں ہوتی۔" وہ ٹشو سے آنسو پونچھ رہا تھا۔۔۔ گھنی پلکیں آنسوؤں سے بھاری ہو رہی تھیں۔۔۔ بیلا نے کتابوں کی اوٹ سے اسے دیکھا تھا دل تھا تو کہاں تھا؟ وہ سینے پر ہاتھ رکھتی اسے دیکھتی جا رہی تھی۔۔۔ روشن پیشانی پہ آتے بکھرے بال آنسوؤں سے بھیگی وہ اداس

آنکھیں... دل تو اچھلا اور آنکھوں کے سمندر میں کود پڑا۔ بیلا بنت فاروق احمد بے خبر کھڑی رہی۔ ہواؤں نے تالی بجانے کی ٹھانی۔ وقت اشارہ ہوا۔ "شش ..." سر عارف نے ہولڈر سے پین نکال لیا تھا اور کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگے تھے... پرسوچ انداز' کھڑکیوں سے دھوپ گر رہی تھی۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط ہو۔ تم نے سب سچ کہا... وقت کے آزمائے ہوؤں کو اور نہیں آزمایا کرتے... والدین نے اپنا فرض نہیں ادا کیا تو کیا تم انہیں ساری زندگی انہیں بلیم کرتے رہو گے اب وقت تمہارا ہے اور سارے فرض بھی... یہ جو ماں باپ ہوتے ہیں ناں اولاد کو اخروٹ کی چھال سے لگتے ہیں سخت... کڑوے... مگر اندر سے یہ بھی مکھن سے ہوتے ہیں ذرا سی حدت سے پگھل جاتے ہیں... یہ جو اولاد ہوتی ہے ناں لاٹھی ہوتی ہے اس کو گھن نہیں لگنا چاہیے۔ تم بھی ایسی لاٹھی ہو جس کو ناراضی کا گھن لگا ہوا ہے اور جس دن یہ لاٹھی کمزور ہوئی تو سمجھو والدین بھی گر جاتے ہیں... تم لاکھ ان سے ناراضی کا اظہار جتاؤ مگر ایک سچ تو یہ ہے کہ انہیں گرتا تم کبھی نہیں دیکھ سکو گے" وہ چلتے چلتے اس کی پشت پر آن کھڑے ہوئے تھے... کندھوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

"کاش تم نے ان کے قدموں کی ٹوٹی چال کو دیکھا ہوتا۔" انہیں علی صاحب کے ٹوٹے قدموں کی وہ لٹی پٹی سی چال نظر آئی تھی۔

"آپ نے میرے گزرے سالوں کے انتظار' صبر کو نہیں دیکھا۔ سر میرے اکیلے پن' تنہائی کو نہیں دیکھا؟" وہ سر اٹھا کر پوچھنے لگا تھا... بیلا نے وقت اور سانسوں کو ایک ساتھ چلتا رکتا محسوس کیا تھا شیشوں میں بند کتابیں دم سادھے پڑی تھیں۔

"تمہاری تنہائی' تمہارا صبر' تمہارا انتظار تمہارا وجود سلامت رکھے ہوئے ہے مگر یہ جو اپنی غلطیوں کا اعتراف اور گلٹ ہوتا ہے ناں یہ تو جان لے لیتا ہے فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" پین ہولڈر میں اٹکا دیا گیا وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میں کوشش کروں گا کہ سب بھول جاؤں۔" وہ مدھم لہجے میں بولا تھا... بیلا بمشکل سن سکی تھی۔ دیواروں کے کان ہوتے ہیں اور دیواروں کی "آنکھیں" بھی ہوتی ہیں جو ٹکٹکی ہوتے دیکھتی ہیں... یہ دلچسپ "سامع" ہوتی ہیں مگر افسوس "یہ" گونگی ہوتی ہیں سارے کھیل چپ کے ہیں... کھیل تماشا اور زندگی۔

"صرف کوشش کرو گے؟" وہ آگے ہو کر شرارت سے پوچھنے لگے تھے وہ انگلی کی پور سے آنکھیں صاف کر رہا تھا۔

"یہ جو ہماری انا ہوتی ہے ناں سر... اس سے کہیں زیادہ طاقتور محبت ہوتی ہے۔ جو ہمیں ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ انا کی لڑائی میں اکثر محبت جیت جاتی ہے... شاید معاف تو میں انہیں کب کا کر چکا ہوں... مجھے اپنی پروا نہیں... بالکل نہیں مگر ان کی ذرا سی اداسی' ذرا سا گلٹ مجھے توڑ گیا ہے دولت کے فارمولے ازبر کرنے والا کچھ کچھ محبت کی فارمز بھی جانتا ہے... آپ کا شکریہ سر۔" وہ ان کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے باہر نکل گیا تھا... طلسم ٹوٹا تھا" وہ "شہزادی جیسے کسی سحر سے آزاد ہوئی تھی... مستنصر حسین کی کتاب جیسے بیلا کے ہاتھ سے چھوٹ کر دبیز قالین پر گری تھی۔ گلا سز ٹشو سے صاف کرتے سر عارف مسکرائے تھے۔

"بیلا فاروق... اب آپ سامنے آسکتی ہیں۔" کتاب جگہ پر رکھتی وہ گڑبڑا کر باہر آئی تھی۔

"وہ... مم میں سر۔" اسے سمجھ نہ آیا تھا کہ کیا کہے... بے چاری۔

"اٹس او کے... ایسا ہوتا رہتا ہے ڈونٹ وری سامنے تشریف رکھیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ سر عارف تھوڑا سا آگے ہو کر بولے تھے "بیلا... ہمیشہ ایک بات یاد رکھیے گا زندگی میں اگر رشتوں کے سلسلے میں فیصلہ درپیش ہو تو انا کو بھول جائیے اور تب صرف اور صرف اپنے دل کی خوشی کو سامنے رکھیے گا... فائدے میں رہیں گی۔"

یہ "فائدے" کی بات دیواروں نے سن لی تھی اور اپنے پلو سے باندھ لی تھی... گونگی دیواریں۔

نیلا اور سرا اردو ڈرامہ ڈسکس کرنے لگے تھے۔۔۔ دھوپ قائد اعظم بلاک میں گھومتی پھرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

مار کٹاری مر جاؤں۔۔۔

میں تو یار بن جی نہیں پاؤں۔۔۔

فلاپ فلموں کی فلاپ ہیروئنز کی طرح پوز بناتے ہوئے چنبیلی ہال کے جالے صاف کررہی تھی۔۔۔ آواز کے سر ہوسٹل میں ادودھم مچا رہے تھے۔

"مرجاؤ۔۔۔ مرجاؤ۔۔۔ خس کم جہاں پاک" اطمینان سے میٹھی میٹھی یہ بے عزتی کاؤنٹر سے ہی آئی تھی اور بقول چنبیلی کے اس کی ذات سے ذاتی پرکاش "کاؤنٹر" والی کو ہی ہوتی ہے۔۔۔ چنبیلی اسٹول پر کھڑے لڑکھڑا کر فرش پر ڈھیر ہوگئی۔۔۔ فائن آرٹس کی نیلم ایزل اور رنگ اٹھائے گزری۔۔۔ رکی چنبیلی کو ہلایا جلایا۔۔۔ سانسیں بند۔۔۔ آنکھیں بھی بند۔۔۔ پلکوں پر گرد کے طوفان ٹھہرے ہوئے تھے۔۔۔ نیلم کی روح فنا ہوگئی تھی۔۔۔ مڑ کر عفت کو دیکھا تھا۔

"میم اسے دیکھیں سانس ہی نہیں لے رہی؟" ہال کا پنکھا پوری رفتار سے گھوم رہا تھا عفت نے پانچ سونف منہ میں اکٹھے ڈالی تھیں۔

"نی نیلم دھوکا نال کھائیں نرا ڈرامہ ہے ایسے ڈھیٹ اور بدتمیز لوگ اتنی جلدی جہنم واصل نہیں ہوتے بلکہ مجھ جیسے معصوم لوگوں کے سینے پر مونگ دلنے کو صدیوں زندہ رہتے ہیں" تاسف سے سر ہلایا گیا تھا۔

"لیکن عفتی میم واقعی بے چاری سانسیں نہیں لے رہی۔۔۔" نیلم کو چنبیلی سے خوف آنے لگا تھا۔۔۔ مردہ وجود۔۔۔ چلتا پنکھا۔۔۔ عفت نے وہیں بیٹھے بیٹھے چنبیلی کا جائزہ لیا اور فتویٰ جاری کردیا۔

"ہیلتھ اینڈ فزیکل والیوں سے آج کل یوگا اور سانسوں کی مشق کی ٹریننگ لے رہی ہے جیسے وہ فتنہ پرور اور مکار عورتیں ہیں یہ انہی کی سردار ہے۔" پٹ سے آنکھیں کھلیں۔۔۔ ہر طرف گرد ہی گرد نظر آئی تھی۔

"میں کہاں ہوں؟" وہ تازہ تازہ کھاسے نکلی ہے۔

"بس۔۔۔ مریخ پر ہو۔۔۔" کاؤنٹر والی کی محظوظ ہنسی۔۔۔ دل چاہا گلا دبا دے۔۔۔ کاش دل چاہے اور سب ہو گزرے۔۔۔ سب۔۔۔ نیلم نے ایزل اور کلر سنبھال کر چنبیلی کو تادیبی نظروں سے دیکھا۔

"یہ کیا تھا۔۔۔؟" چنبیلی نے خطرناک حد تک طویل انگڑائی لے کر جواب دیا تھا۔

"بس۔۔۔ ذرا سی آنکھ لگ گئی تھی۔" نیلم پاؤں پٹختی آگے بڑھ گئی۔۔۔ عفت نے چٹخارہ لیا تھا۔

"اُف۔۔۔ چنبیلی تم کتنی مکار عورت ہو۔" قہقہہ چنبیلی کا دل راکھ کر گیا۔

"عورت ہوگی تم۔۔۔ مجھ سے جیلس ہوتی رہتی ہو۔۔۔ اور مجھ سے آواز نیچی رکھ کے بات کیا کرو۔۔۔ مقروض ہو تم میری۔۔۔ چار ماہ کی تنخواہ ضبط کر رکھی ہے۔" چنبیلی نے فائدہ اٹھایا۔۔۔ مقابل وہیں "سواہ" ہوگیا۔۔۔ سواہ مطلب جل کر خاک۔۔۔ جی ہاں۔

"عورت ہوگی تم۔۔۔ تمہارے ہوتے سوتے" عفت نے زور سے ٹیبل پر ہاتھ مار کر اپنا ہی نقصان کیا تھا۔۔۔ "اوئی" چنبیلی دوبارہ اسٹول پر چڑھ گئی تھی۔۔۔ دوپٹا کمر کے گرد باندھ کر ہفتہ صفائی مہم شروع ہوگئی تھی۔

"پردیسی، پردیسی جانا نہیں۔۔۔ مجھے چھوڑ کے مجھے چھوڑ کے۔"

"یہ جس پردیسی کا ذکر ہو رہا ہے خوب جانتی ہوں۔۔۔" باسی کڑھی میں ابال اٹھ رہے تھے۔۔۔ چنبیلی کی بے نیازی۔۔۔ صدقے۔

سچ کہتے ہیں دنیا والے پیار نہ کر

پیار تو ہے اک روگ برا اس روگ سے ڈر

کاؤنٹر سے بال پین اڑتا ہوا آیا اور کمر پر ٹھاہ کرکے لگا۔۔۔ چنبیلی کی چلتی زبان رکی تھی۔۔۔ مڑ کے دیکھا تھا۔

"قانون پڑھنے والیوں کو بلا کر پوچھوں کہ اقدام قتل پر کون سی دفعہ نافذ ہوتی ہے۔"

"اے لو۔۔۔ بال پین سے کوئی نہیں مرتا۔" عفت

نے واقعی ناک پر بیٹھی مکھی اڑائی تھی۔۔۔ لڑکی ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔

"وہ چنبیلی تو گلاب کی پنکھڑی سے بھی نازک ہے۔" جانے گررہے تھے نازک سی لڑکی تندہی سے مگن تھی۔

"نازک۔۔۔ ایں؟" عفت کو ہارٹ اٹیک اب ہوا کہ تب ہوا۔۔۔ حیرانی چہرے پر گڑی تھی۔

"خاتون آپ مجھے ڈسٹرب کر رہی ہیں۔۔۔ مہربانی کر کے اپنی ایکسپائرڈ سونف اور رومانی ناول لے کر یہاں سے تشریف لے جائیں ورنہ۔۔۔ خاتون جانتی ہیں چنبیلی صرف دھمکی نہیں دیتی۔"

"ورنہ۔۔۔؟" عفت نے مقابل کا "قاتلانہ" ارادہ جاننے کو ابرو اٹھا کر دیکھا تھا۔ مقابل اسٹول سے اتر کر کاؤنٹر تک آئی۔۔۔ مٹھی بھر سونف "سرعام" ہتھیا لیے گئے اور کہہ دیا گیا۔

"ہمم۔۔۔ تو ورنہ ہوگا یہ کہ اگلے دو ہفتے مجھے شدید بخار رہے گا۔۔۔ صفائی بالکل نہیں ہوگی اور تیسرے ہفتے ہاسٹل کی خوفناک حالت دیکھ کر ہارر فلموں کے ہارر ڈائریکٹر صاحبان شوٹنگ کی اجازت مانگیں گے۔" آنکھیں زور سے میچ کر عفت کے آگے پراندہ لہرایا گیا

"پراندہ میرا لال نی۔۔۔ تے اکھ میری وچ کجلے دی دھاری۔"

☼ ☼ ☼

فاروق احمد نے فصلوں پر آئے پکھی کبھی نہیں اڑائے تھے جبکہ دوسرے کسان پکھیوں کو فصلوں سے دور رکھنے کے کئی طریقے آزماتے تھے۔ غلیل سے نشانے باندھے جاتے۔۔۔ بناوٹی انسانوں کے ڈھانچے جو بھس سے بھرے ہوتے تھے فصل کے عین بیچ میں گاڑے جاتے تھے اور پکھی دھوکا کھا جاتے تھے اور سارے دھوکا کھائے ہوئے پکھی فاروق احمد کی فصلوں میں ٹہلتے۔۔۔ کھاتے۔۔۔ چگتے اور چونچ میں دانہ ڈالے آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔۔۔ جیدی پوچھتا تھا۔

"ابا۔۔۔ آپ پکھیوں کو فصلوں سے اڑاتے کیوں نہیں جیسے باقی سارے کرتے ہیں۔۔۔ یہ تو ساری فصل اجاڑ دیں گے۔" وہ پیپل کے موٹے تنے سے ٹیک لگائے حقہ پی رہے ہوتے تھے۔

"نہیں اوئے۔۔۔ سنوار نے، اجاڑنے کا اختیار تو صرف اوپر والے کو ہے۔"

"مگر ابا۔۔۔ سارا دانہ تو یہ چگ جاتے ہیں۔۔۔؟" پیپل کے پتے ادھر ادھر بیرن ہوا سے اڑتے پھرتے تھے۔

"ان کا رزق ہمارے کھیتوں میں ہے اس سے ہم انہیں روک نہیں سکتے۔۔۔ یہ بھی بال بچوں والے ہوتے ہیں۔۔۔ اور پھر ان کا چھوٹا سا توڈھڈ (پیٹ) ہوتا ہے۔۔۔ کتنا کھاتے ہوں گے؟ اللہ سوہنڑے کی مخلوق ہیں۔"

"یہ دانہ چگ کر آسمان کی طرف کیوں دیکھتے ہیں ابا۔۔۔؟" جیدی مٹی کے ڈھیلوں کی اونچی پہاڑی بنا رہا تھا۔

"یہ اپنے مالک کا شکر ادا کرتے ہیں اور ہمارے رزق میں برکت کی دعا کرتے ہیں۔۔۔" حقہ گڑگڑاتے وہ ہولے سے مسکرائے تھے۔

"انہیں دعا کرنا آتا ہے؟" مٹی کے ڈھیلوں کی پہاڑی گر پڑی تھی۔۔۔ ڈھیلے بکھر گئے۔۔۔ وہ تاسف سے دیکھتا رہا۔

"انہیں سب آتا ہے۔۔۔ سب۔" ان کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ سوچ میں تھے حقہ پرے رکھ دیا تھا۔ بستی کھوکھر سے گزرتی واحد کچی سڑک پر روڑی ٹریکٹر گزر رہے تھے۔۔۔ سڑک کٹی پھٹی سی پڑی تھی گزرنا محال ہوتا تھا مگر مجبوری تھی۔

"ابا۔۔۔ اس بار تو سب کہتے ہیں ہماری فصل شاندار ہے پچھلے سال سے چار گنا زیادہ فائدہ ہوگا۔۔۔ اس بار میں سہراب کی سائیکل ضرور لوں گا وعدہ کریں۔" مٹی کے ڈھیلے پرے پھینک کر وہ ان کے سر ہو گیا تھا۔۔۔ یہ راگ وہ پچھلے دو ہفتوں سے الاپ رہا تھا۔

"ارے بھئی۔۔۔ وعدہ پکا وعدہ۔۔۔ لے دوں گا۔ اس بار تو فصل واقعی بہت اچھی ہے اللہ سوہنڑے نے خاص کرم کیا ہے۔۔۔ بیلا کی فیس بھی بھرنی ہے۔۔۔ صحن پکا

کرواتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اپنے منصوبے اپنے بیٹے کو بتا رہے تھے۔۔۔ بگلوں کے غول تالوں کے پانی سے نہا کر پیپل پر آکر بیٹھ گئے تھے۔۔۔ ایک پل کو لگا صدیوں پرانا وہ بوڑھا پیپل سفیدی سے سج گیا ہو۔

ہل چلنے کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ ہر کوئی اسٹیل کے ٹفن کھولے دوپہر کا کھانا کھانے میں مگن تھا کھٹے اچار کی خوشبو دور تک پھیل سی گئی تھی۔ جیدی مزے سے کھا رہا تھا۔ فاروق احمد کھانا کھا چکے تھے۔۔۔ دھریک کے درخت قطاروں میں لگے ہوئے تھے اماں دور سے پسینہ پونچھتی آرہی تھیں۔ قریب آکر بیٹھ گئی تھیں۔

"توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ کتنی گرمی ہے۔"

"موسم جو گرمیوں کا ہے تو گرمی تو ہوگی ہی۔۔۔" فاروق احمد نے پاس رکھے گھڑے سے پانی کا گلاس بھرا اور اماں کو تھما دیا تھا۔

"آئے ہائے جانے میری بیلی کیسی ہوگی۔۔۔ بھکر میں تو قیامت کی گرمی پڑتی ہے۔۔۔ اوپر سے قصبوں میں کہاں دھریک اور بکائن جیسا ٹھنڈا سایہ نصیب ہوتا ہے۔ خیر سے ایک سال تو کٹ گیا ہے اب ایک ہی باقی ہے۔۔۔ اللہ آگے بھی چنگا کرے۔" تبھی خیر دین کی وہی کنیزاں سامنے سے گزری تھی۔

"بھرجائی۔۔۔ کیا حال ہیں آج تو تینوں اکٹھے بیٹھے ہو۔" جیدی کو خفقان ہونے لگا تھا اس نے پیٹھ موڑلی تھی۔۔۔ کنیزاں کی بد نظری مشہور تھی اس کی نظر گھڑے میں چھید کردیتی تھی۔ اماں نے گلاس خالی کر کے مٹکے پر رکھ دیا تھا۔

"ٹھیک ہوں کنیزاں۔۔۔ بس گھر ویلی بیٹھی تھی تو ادھر آگئی۔۔۔" کنیزاں نے چمکتے خوشوں کے طویل پھیلے سلسلے کو دیکھا تھا۔

"سچ کہتی ہوں اس بار تو بڑی پیاری فصل ہے تم لوگوں کی اپنی بیلی کا جہیز تو اچھا سا بن جائے گا۔۔۔ خیر سے کہیں رشتے کا سوچا ہے؟" آخر میں انداز ذرا تشویشی ہو گیا تھا۔

"ارے نہیں بھئی۔۔۔ ابھی تو ہمیں دیر ہے۔۔۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔" اماں نے عاجزی سے کہتے چکن کے دوپٹے کو سر پر جمایا تھا۔

"کب تک دیر ہے۔۔۔ لڑکیاں تو بانس کے پودے کی طرح بڑھتی ہیں راتوں رات خبر ہی نہیں ہوتی۔۔۔ خیر اگر ارادہ ہو تو پہلے مجھے کہنا میری نظر میں کچھ اچھے رشتے ہیں۔" کنیزاں یہ کہہ کر چلتی بنیں اور اماں کو نئی فکر میں ڈال گئیں۔

کیا بھن بھینسوں کے ڈکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پکھی دانہ چگتے آسمان کی طرف نظر اٹھاتے مگر شاید نہیں جانتے تھے۔

"کچھ دعائیں کبھی قبول نہیں ہوتیں۔۔۔ وہ تو بس مصلحت کے تحت روک لی جاتی ہیں۔" پکھیوں کی دعائیں رک گئی ہیں۔ ☼ ☼

اگرم بگرم شمپک شو! کالے جن آجا ہو ہو۔۔۔ چھو منتر۔۔۔ جنتر منتر چھو۔

لکڑی کے بورڈ پر موم بتی جل رہی ہے کمرے میں پرفیومز کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔۔۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں اور باہر تاریک اور خوفناک رات کھڑی ہے۔۔۔ ہلکی ہوا سے کھڑکیوں کے پٹ ٹکرا جاتے تھے۔۔۔ خوف سے دل دھک دھک کر رہے تھے۔

وہ چاروں باجماعت موم بتی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں۔۔۔ کانچ کے گلاس الٹے رکھے تھے جن پر ان کے ہاتھ جمے ہوئے تھے۔۔۔ روشی اپنے بال بکھرائے جنتر منتر پڑھ رہی تھی اور وہ تینوں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔۔۔ روشی کا اطمینان قابل دید تھا۔

"ہائے کمینیو۔۔۔ اگر سچ میں جن آگیا تو۔۔۔؟" ریحانہ خوف سے مرجانے کی حالت میں تھی۔۔۔ بیلا متوحش سے بیٹھی تھی۔

"تمہارا ہی آئیڈیا۔۔۔ دفع ہو۔۔۔ تمہیں ہی شوق تھا منگیتر کا نام پتا کرنے کا اور شادی کا دن کنفرم کرنے کا۔" ریحانہ کو تاؤ آیا تھا۔ بیلا نے صدف کو دھمو کا جڑا تھا۔

"اللہ کے واسطے چپ کرو تم۔۔۔ ڈریکولا لگ رہی ہو۔" بیلا کے اپنے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ہوا چلی اور کھڑکیوں کے پٹ زور سے ٹکرائے۔ ریحانہ کی بے

ساختہ چیخ نکلی تھی۔۔۔ روشی نے سرخ آنکھیں کھولیں اور آواز بلند کی۔

"جن حاضر ہو۔۔۔" آواز کمرے میں بازگشت ہو گئی۔۔۔ صدف نے آیت الکرسی کا ورد جاری کر دیا تھا۔

"روشی۔۔۔ میرا گلاس ہل رہا ہے۔" بیلا نے دوپٹے سے پیشانی کا پسینہ پونچھا تھا بال بکھرائے بیٹھی روشی خوشی سے چلائی۔

"وہ آرہا ہے۔۔۔ جلدی جلدی اکٹھے ورد کرو۔۔۔ ورنہ وہ جلال میں آسکتا ہے۔"

"جلال میں آکر وہ کیا کرتا ہے؟" ریحانہ نے صدف کے ہاتھ سے فرائنگ پین جھپٹا اور اپنی گود میں رکھ لیا۔

"جلا کر بھسم کر دے گا۔"

"ہائے نہیں۔۔۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔۔۔ بھری جوانی میں موت ہائے۔ دہائی ہے دہائی۔۔۔" چہرہ پیلا پڑ گیا۔

اگڑم بگڑم شمپک شوود۔

کالے جن آجا ہو ہو۔۔۔ پھو منتر۔۔۔ پھو۔۔۔ پھو۔

وہ چاروں کورس میں ہل ہل کر ورد الاپ رہی تھیں۔۔۔ ہوا کھڑکی سے اندر آئی موم بتی کا شعلہ بھڑک گیا۔ ان کا سایہ طویل اور طویل تر ہو تا گیا۔۔۔ ریحانہ کے پسینے میں ڈوبے ہاتھ سے گلاس پھسل گیا۔ دل ڈوب سا گیا۔

"ہائے۔۔۔ میں مرگئی۔"

"کیا ہوا؟" روشی نے بالوں کا گھونسلا دائیں بائیں گھمایا تھا۔۔۔ تو کیا وہ آگیا؟ جس کا تھا انتظار وہ شاہکار آگیا۔

"میرا گلاس بھی ہل رہا ہے روشی۔۔۔ کمبخت عورت وہ سچ میں تو نہیں آگیا؟" خوف کی ڈگڈگی بجنے لگی ہے۔

"اسے سچ میں تو بلانا ہے۔۔۔ عقل سے پیدل لڑکی۔" روشی کو تاؤ آیا تھا۔۔۔ موم کے شعلے پر نظریں گاڑ دیں۔

"پانچ سیکنڈ کی خاموشی اس کے احترام میں۔۔۔ وہ آرہا ہے۔۔۔ اشارے مل رہے ہیں ہمیں۔" بیلا کا کلیجہ باہر کو آنے لگا تھا۔ خاموشی ہے۔۔۔ طویل موم کی لو پھڑ پھڑا رہی ہے۔۔۔ ریحانہ کی آنکھیں بند تھیں بیلا نے نظریں اٹھا کر دیکھا روشی "وجد" میں تھی بیلا نے حفاظتی اقدام کے طور پر فرائنگ پین ہتھیانے کی ٹھانی۔۔۔ مگر اس سے پہلے ہی۔

چٹاخ کی آواز گونجی روشی میٹرس پر لڑھک گئی بیلا نے بے ساختہ چیخ روکی تھی ریحانہ نے عزرائیل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ واضح سنی تھی۔ ہائے تو کیا بھری جوانی میں موت کو مجھ سے ملنا یاد آگیا؟ اے موت کچھ پل تو ٹھہر جا۔

"یہ کیسی آواز تھی یہ؟" روشی جنتر منتر بھول کر تھر تھر کانپتی پوچھ رہی تھی گلاس ادھر ادھر لڑھک گئے۔

"کچھ نہیں میں نے تالی بجا کر مچھر مارا ہے۔ بدتمیز کب سے کانوں میں بھیں بھیں کر رہا تھا۔" صدف نے چٹاخ کا عقدہ کھولا تھا۔

"میں سمجھی وہ سچ مچ آگیا۔" بیلا نے دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"اگر وہ آگیا تو چار حسیناؤں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جائے گا۔" ریحانہ نے بریکنگ نیوز بریک کی تھی۔

"کیوں نہ فیس بک پر اسٹیٹس اپلوڈ کریں۔" روشی نے آئیڈیا پیش کیا تھا۔۔۔ ایسا زرخیز ذہن اور آئیڈیا؟

"ہاں مجھے بھی ٹیگ کر دینا" بیلا نے بھی کار خیر میں شمولیت کی استدعا کی تھی موبائل روشن ہوا ہنگامی اسٹیٹس ہمیشہ صدف ہی اپلوڈ کرتی ہے اس نے کانپتے ہاتھوں سے لکھا تھا۔

"بھوت بلانے کی کوشش کامیاب مستقبل کی پیش گوئیاں اور بہت کچھ۔"

عفت نے آدھی رات کو نوٹی فکیشن اوپن کیا اور بیڈ سے گرتے گرتے بچیں۔۔۔ پنسل ٹارچ اٹھاتی وہ کاریڈور کی طرف بڑھنے لگیں۔ نازلی، عینی، نغمانہ، چشما تو عابدہ، سب ننگے پاؤں ان کے کمرے کی طرف بھاگیں۔۔۔ موٹی لیلیٰ دھڑام سے گری تھی۔

"کمینو۔۔۔ رکو ایک ساتھ چلتے ہیں۔" سارا کاریڈور

باہا ہو ہو سے گونج اٹھا ہے… بھاگتے دوڑتے قدم۔ چیخیں۔ روشی نے کان لگائے۔

"ایسی آوازیں… وہ کمینہ تو پوری فوج کے ساتھ آ رہا ہے۔"

"ہائے… جن کے تو بچے بھی لاتعداد ہوتے ہیں… "ابا بتایا کرتے تھے۔" بیلا نے جھرجھری لی تھی۔ جوق در جوق تو نہیں آ رہے۔"

"امی… پلیز مجھے بچا لیں۔" ریحانہ نے سسکی لی تبھی باہر زوردار آواز گونجی اور ہوا میں تیزی آگئی کھٹ کھڑاک کے ساتھ کھڑکیوں کے پٹ ٹکرائے تھے وہ چاروں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں… روشی کا دل چاہا نعرہ مستانہ لگا دے ایں؟ موم بتی کا شعلہ بجھنے لگا۔ اب بجھا کہ تب… دروازے کی چٹخنی جھٹکے سے کھلی… بالوں میں کرل ڈالے اور منہ پر ماسک لگائے وہ عفت تھیں۔

"بدتمیز عورت… جن بھائی کو بلاتا تھا۔ کالی کلوٹی آیا چڑیل بلا لی۔" ریحانہ نے روشی کو دہائی دی… پنسل ٹارچ دائروں میں گھومتی ان تک آئی تھی۔

"ارے میں ہوں اردو ادب پڑھتی ہو مگر قسم سے بڑی بے ادب ہو۔" بورڈ پر ہاتھ پڑا… کمرہ روشن ہو گیا… روشی کی وگ بیلا نے جلدی سے اتار کر پرے پھینک دی تھی… عفت صدمے میں آگے آئیں۔

"وہ چلا گیا…؟" افسوس صد افسوس… سارا ہجوم اندر گھس آیا تھا۔ لیلیٰ موٹی دروازے میں پھنس گئی۔

"روشی بتایا تو ہوتا میں کچھ پوچھتی۔" بھانت بھانت کی آوازیں… وہ چاروں ہکا بکا بیٹھی تھیں۔

"میری شادی کب ہوگی۔" "ہائے اللہ جی۔"

"میری بہن کی ظالم ساس کب جہنم واصل ہوگی پیچ پیچ۔"

"میرا بریک کب پیچ اپ میں بدلے گا۔" عفت نے روشی کو دیکھا اور پیار سے بولی۔

"پیاری لڑکی اگلی بار اسے بلانا تو پیشگی اطلاع کر دینا۔" دروازے میں پھنسی لیلیٰ چلائی تھی۔

"ہوسٹل کے نوٹس بورڈ پر نوٹس لگوا دینا۔" انگلش کی نغمانہ نے روشی کو رشک سے دیکھا تھا۔

"روشی تم تو بڑی گیانی بابا ہو یار… جنات تمہارے قبضے میں ہیں۔" آدھی رات کو سارے ہجوم کو اللہ کے واسطے دے کر دفان کیا گیا تھا تب کہیں جا کر سکھ کی سانس لی گئی تھی۔ روشی نے منرل واٹر کی بوتل منہ سے لگا لی تھی۔

"ساری کھڑکیاں دروازے بند کر دو… کہیں کم بخت بیچ میں نہ آجائے۔" ریحانہ نے فرائنگ پین اپنے سرہانے تکیے کے نیچے چھپا دیا تھا… تبھی کمرہ موبائل کی آواز سے گونج اٹھا تھا۔

"بیلا تمہارے گھر سے فون ہے۔" صدف نے ہانک لگائی… بیلا تولیے سے منہ پونچھتی آ رہی تھی دیوار گیر کلاک کو دیکھا تو وہاں رات کے دو بج رہے تھے۔

"اتنی رات کو کیوں کال کر رہے ہیں ابا… گاؤں میں تو اب تک سب سو جاتے ہیں ناں۔" بیلا نے یس کا بٹن دبایا تھا۔ اور دوسری طرف سے آتی آواز سننے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی ریحانہ نے کھڑکی کھلی ہی رہنے دی اور میٹرس پر لوشن کی بوتل لے کر بیٹھ گئی تھی… بیلا بول رہی تھی۔

"ہیلو جی ابا۔"

"بیلی میں… میں جیدی ہوں۔" دوسری طرف سے جیدی کی روتی آواز آئی تھی… پیچھے سے بے تحاشا شور تھا۔

"جیدی کیا ہوا تم رو کیوں رہے ہو؟" بیلا کے قدموں سے زمین کھسکنے لگی تھی۔

"بیلی وہ ہمارے ابا… ہمارے۔" بیلا نے جیدی کی بے ربط سی آواز سنی تھی فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا تھا وہ روتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی تھی ریحانہ، روشی اور صدف دوڑ کر اس کی طرف پہنچی تھیں لکڑی کے بورڈ پر پگھلی موم کا جما ہوا مادہ پڑا ہے… رات شہر میں مدغم ہوتی چلی گئی۔

کیا ہو گیا تھا؟ کیا ہونے والا تھا۔ (باقی آئندہ)

شازیہ ستار نایاب
وقت وقت کی بات
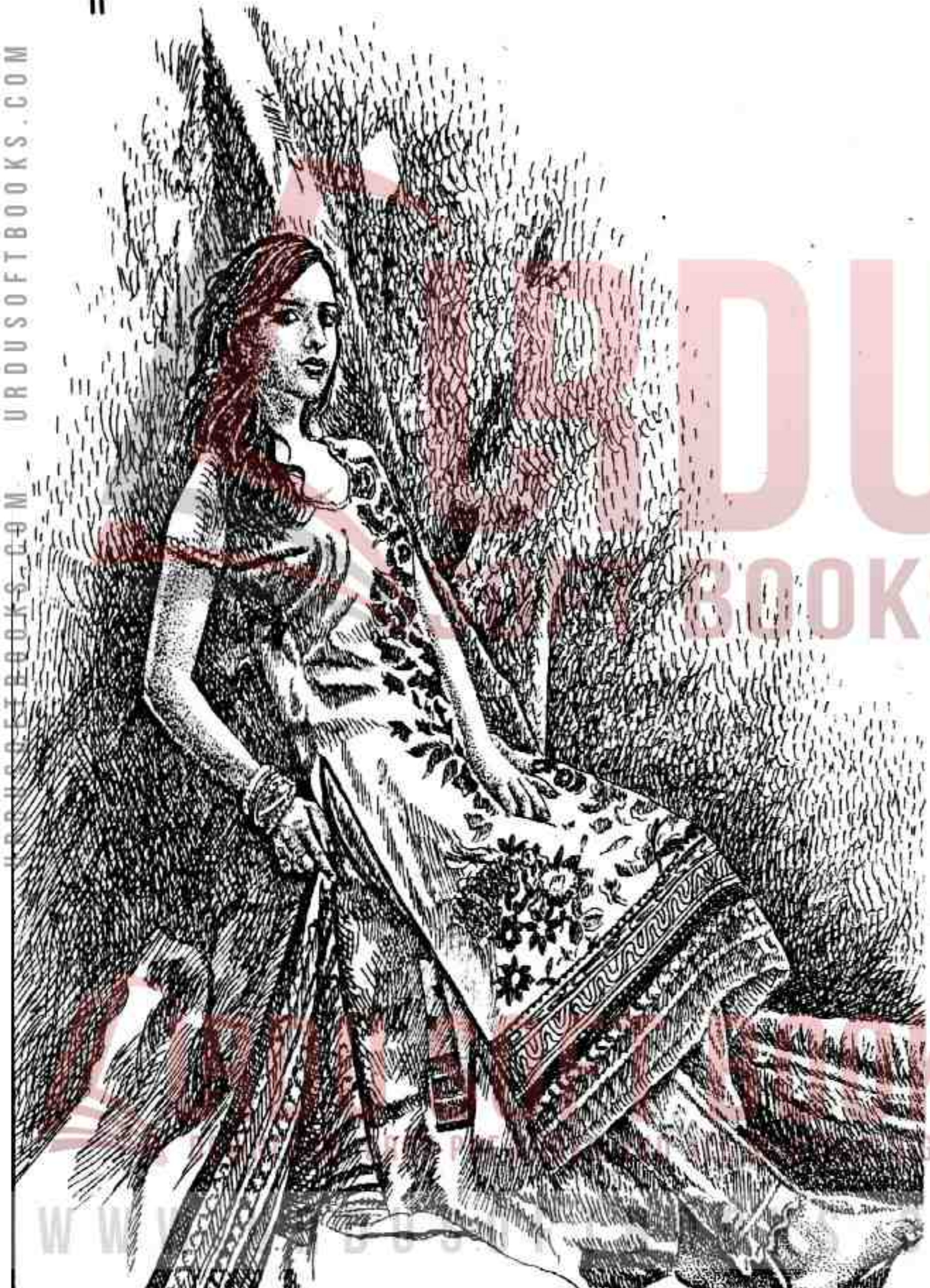
دوپہر کی دھوپ اپنی شدت کھو رہی تھی، لیکن اس کا غصہ اس کی جھنجلاہٹ ابھی سوا نیزے پر تھی۔ دماغ کھول رہا تھا۔ فشار خون بلند ہو رہا تھا۔ زبیر خاموشی سے بظاہر اخبار پڑھتے ہوئے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو زبیر نے ہلکا سا ہنکارا بھر کر اسے متوجہ کیا۔

"چائے ملے گی؟"

"لاتی ہوں۔" فضیلہ اپنے خیالات سے چونکی، چہرے کے زاویے ٹھیک کرنے کی شعوری کوشش کی اور چپل پاؤں میں اڑسنے لگی۔ زبیر نے اسے بغور دیکھا اور بولا۔

"اگر تم ابھی آرام کرنا چاہتی ہو تو ٹھیک ہے، کچھ دیر بعد چائے بنا لینا۔"

"میرے آرام کا خیال اس سے پہلے تو کبھی نہیں آیا۔" فضیلہ غصے سے بولی۔

"ایسا تو نہ کہو اکثر و بیشتر یہ خیال آجاتا ہے۔" زبیر نے کہا۔

"ہاں ابھی کچھ عرصہ پہلے سے آنے لگا ہے۔ ورنہ تو دن رات کرو تم کام والا معاملہ رہا ہے۔" فضیلہ تنکی۔

"چلو اب بہو آنے والی ہے، سارا کام اس کے سر پر ڈال کر خوب آرام کرنا۔" زبیر نے کہا۔

"کیسا آرام؟ اس کی ماں اور نانی نے تو مجھے بہت آرام کرائے تھے نا۔" فضیلہ تنک کر بولی اور چائے بنانے چل دی۔

چائے بناتے ہوئے وہ مسلسل سوچوں میں گم تھی۔ بیٹے کو کسی کے ساتھ شیئر کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اور پھر اس نند کی بیٹی کے ساتھ جس کی اس سے کبھی نہیں بنی، لیکن دوسری طرف وہاج کا واضح جھکاؤ بھی رامین کی طرف نظر آرہا تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھی کہ انوشہ اندر آئی۔

"مما۔۔۔" انوشہ نے پکارا۔ وہ خاموش سوچوں میں گم رہی۔ "مما۔۔۔ مما۔۔۔ آپ کیا سوچ رہی ہیں؟" پانی ابل ابل کر آدھا رہ گیا ہے۔ انوشہ نے دوبارہ پکارا۔

"ہاں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔" فضیلہ چونکی اور بے ربط الفاظ بولے۔

"مما آپ پریشان ہیں؟" انوشہ نے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میں کیوں پریشان ہوں گی۔" فضیلہ نے کہا۔

"آپ چھپانے کی کوشش نہ کریں، میں جانتی ہوں آپ بھائی اور رامین کی وجہ سے پریشان ہیں۔ لیکن مما رامین اچھی لڑکی ہے، پھوپھو جیسی نہیں ہے۔" انوشہ نے کہا۔

"ہونہہ۔۔۔ جیسی ماں، ویسی بیٹی۔" فضیلہ نے کہا۔

"نہیں مما، رامین آپی بالکل مختلف ہیں۔" انوشہ نے مخالفت کی۔

"کیا ہم بھی کچن کیبنٹ میں مخل ہو سکتے ہیں۔" صارم اور وہاج نے کچن میں آتے ہوئے کہا۔

"کچن کیبنٹ کے زیر بحث کون سا مسئلہ ہے، ہمیں بھی بتایا جائے۔" وہاج نے کہا۔

"آپ کی شادی کا مسئلہ زیر بحث ہے۔" انوشہ نے کہا۔

"شادی کا کیا مسئلہ ہے بھئی، اپنے وقت پر ہو جائے گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ موت اور بارات کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔" وہاج نے کہا۔ صارم اور انوشہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ فضیلہ نے دونوں کو گھور کر دیکھا۔

"دادی تمہاری خود تو مر گئیں اور اپنی خواہش مجھے مارنے کے لیے چھوڑ گئیں۔ اب تم ان کی نواسی سے شادی کرکے ان کی خواہش پوری کرو۔" فضیلہ نے کہا۔

"مما مری ہوئی دادی کی خواہش سے زیادہ اہم میری جیتی جاگتی ماں کی خواہش ہے۔ اس کا حکم ہے۔" وہاج نے کہا۔ فضیلہ کے ارد گرد جیسے پھول کھل اٹھے ہو، اس کے لب مسکرا دیے، اس نے اعتماد اور مان سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور بولی۔

"یہ بات ہے تو مت کرو رامین سے شادی۔"

"مما جو آپ کا حکم، بندہ تعمیل کرے گا۔ آپ کی خواہش آپ کی خوشی ہی میرے لیے اہم ہے۔" وہاج

نے کہا۔
"سچ کہہ رہے ہو۔" فضیلہ بے یقینی سے بولی۔
"بالکل سچ۔ میرے اور رامین کے درمیان کوئی عشق و محبت کا سلسلہ نہیں ہے کہ اگر اس سے شادی نہ ہوئی تو مر جاؤں گا یا پھر کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ بس بچپن سے ہی سنا تھا کہ رامین سے شادی ہوگی' اس لیے کسی اور کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔" وہاج نے وضاحت کی۔
"ہم جانتے ہیں کہ دادی اور پھوپھو نے آپ سے ناروا سلوک کیا' لیکن مما رامین آپی بہت اچھی ہیں وہ۔" صارم نے کہا۔
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔" فضیلہ نے گھورا۔
"مما ہم انہیں بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ پھوپھو جیسی نہیں ہیں۔" صارم نے کہا۔
"کیوں پھوپھو جیسی نہیں ہے۔ ان کی بیٹی ان جیسی ہی ہوگی۔" فضیلہ نے کہا۔
"مما جیسے انوشہ آپ جیسی نہیں ہے۔ دبو' جھینپو' سب کچھ خاموشی سے برداشت کرنے والی اور پھر دل ہی دل میں کڑھنے والی۔" وہاج نے شرارت سے کہا۔
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" فضیلہ نے کہا۔
"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مما زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب نہ پہلے جیسے سسرال رہے' نہ پہلے جیسی بہوویں۔ آج کی لڑکی نہ حق چھینتی ہے' نہ حق چھیننے دیتی ہے۔" وہاج نے کہا۔
"کیا تمہیں رامین اچھی لگتی ہے؟" فضیلہ نے پوچھا۔
"جی۔ اچھی لگتی ہے' لیکن آپ مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہیں اور آپ کی خوشی ہی میری خوشی ہے۔" وہاج نے محبت سے کہا۔ بیٹے کی اس بات نے فضیلہ کا دل خوشی اور فخر سے بھر دیا۔
"ویسے مما ایک اچھا موقع آپ کے ہاتھ لگ رہا ہے۔ رامین آپی کو بہو بنا کر لے آئیں' پھر گن گن کر بدلے لیجیے گا۔" انوشہ نے کہا۔
"بد تمیز۔ اپنی ماں کو ایسا سمجھ رکھا ہے۔" فضیلہ نے کہا۔
"کسی خوش فہمی میں نہ رہیے گا۔ رامین آپی آج کی لڑکی ہے۔ زیادتی برداشت نہیں کرے گی۔ یہ آپ کا زمانہ تھا' سہتے رہو' سسرال کی برائیاں کرتے رہو اور رہتے رہو۔" صارم نے شرارتی انداز میں کہا۔ فضیلہ چپ ہوگئی اور چائے کپوں میں انڈیلنے لگی۔
"مما آپ ٹینشن نہ لیں' بھائی نے کہہ دیا ہے نا کہ جہاں آپ چاہیں گی وہ وہیں شادی کرلیں گے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کی نظر میں جتنی بھی لڑکیاں ہیں ان میں رامین کو بھی شامل کریں اور پھر غیر جانبدار ہو کر فیصلہ کریں۔" انوشہ نے کہا۔
"لیکن مما یہ ذہن میں رکھیں کہ رامین بھائی کی بھی خواہش ہے' مگر وہ آپ کے لیے اپنی اس خواہش سے دستبردار ہوگئے ہیں۔" صارم نے وکالت کی۔ فضیلہ نے دونوں کو دیکھا اور خاموشی سے چائے پینے لگی۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں فضیلہ نے کئی لڑکیوں کو دیکھا' کئی کے متعلق سوچا' مگر وہاج کی آنکھوں میں رامین کے نام پر جلتے دیپ بجھانے کی ہمت نہ کرپائی اور رامین کو بیاہ کر لے آئی۔ رامین کے آنے سے تو گویا گھر میں رونق سی آگئی۔ انوشہ کا اکلاپا ختم ہوا تو صارم کو بھی تنگ کرنے' چڑانے اور اپنا کام کرانے کے لیے ایک بہن جیسی بھابھی مل گئی اور وہاج... وہ تو بے حد خوش تھا۔ ان سب کو خوش دیکھ کر فضیلہ بھی خوش تھی' لیکن کبھی کبھی سسرال سے منسوب ماضی کی یادیں پھانس کی طرح چبھنے لگتیں۔ باتیں گو معمولی تھیں' مگر ان پر سسرال کا ردعمل غیر معمولی تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر و بیشتر اپنا اور رامین کا موازنہ کرتی رہتی۔ کبھی بھنا جاتی' کبھی کڑھنے لگتی۔ حالانکہ اب نہ پہلے جیسا زمانہ تھا' نہ ویسے لوگ' نہ ویسے مسائل' لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھی اپنی ساس جیسا رویہ اپنا لیتی۔ یہ الگ بات کہ بدلے وقت نے اسے ویسی ساس بننے نہ دیا۔ اب اسی دن کی بات کو لیجیے۔

ہوا یوں کہ شادی کے چند روز بعد ہی تھکاوٹ اور بدلتے موسم نے اپنا اثر دکھایا اور وہ بیمار پڑ گئی۔ نزلہ' زکام اور بخار نے آگھیرا۔ صبح کمرے سے باہر نکلنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ زبیر چہل قدمی سے واپس آیا تو اسے لیٹا ہوا پا کر حیران ہوا۔

"کیا ہوا خیریت ہے۔"

"بس طبیعت کچھ خراب ہے۔ ابھی اٹھتی ہوں۔" فضیلہ نے کہا۔

"نہیں' تم آرام کرو میں ناشتا بھجواتا ہوں۔" زبیر نے کہا۔ وہ کچھ دیر تو لیٹی رہی۔ پھر اٹھ کر کچن کی راہ لی۔ امید واثق تھی کہ کچن بھائیں بھائیں کر رہا ہوگا۔ نئی نویلی دلہن سے اب کیا توقع رکھتی' لیکن کچن میں پہنچی تو منظر ہی عجیب تھا۔ انوشہ اور رامین ناشتا بنا رہی تھیں۔ صارم حلوہ پوری اور نان چنا لے آیا تھا۔ وہاج ٹرے میں اس کے لیے ناشتا رکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" فضیلہ نے پوچھا۔

"اوہ! ماما کیسی طبیعت ہے آپ کی۔۔۔ اور آپ کچن میں کیوں چلی آئیں۔ آپ کے لیے ناشتا بن گیا ہے' بس وہاج لانے ہی والے تھے۔" رامین نے کہا۔

"میں ناشتا یہیں۔۔۔ تم لوگوں کے ساتھ ہی کر لیتی ہوں۔" فضیلہ نے کہا۔

"گڈ یہ ہوئی نا بات' آجائیں ماموں ناشتا تیار ہے۔" رامین نے پکارا۔

"حلوہ پوری' نان چنے' فرنچ ٹوسٹ' آملیٹ' بریڈ' فرائی انڈا کیا لینا پسند کریں گی آپ؟" وہاج نے پوچھا۔

"تم تو ناشتے میں پراٹھا لیتے ہو' پھر یہ۔۔۔؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"جی ممّا' بھائی کے لیے پراٹھے بھی ہیں۔" انوشہ نے ایک ٹیڑھا میڑھا پراٹھا اٹھا کر دکھایا۔

"یہ پراٹھا بنایا ہے تم نے؟" فضیلہ نے گھورا۔

"ممّا اس کو پراٹھا بنانا نہیں آتا۔ یہ تو اس نے میرے لیے کوشش کی ہے۔ شکریہ رامین۔" وہاج نے کہا۔

"تو ریحانہ کو چاہیے تھا کہ اسے کچھ گھرداری سکھا دیتی۔ کھانا بنانا سکھا دیتی۔" فضیلہ نے اعتراض کیا۔

"ماما کھانا تو بنانا میں نے سیکھا ہے۔ بس روٹی اور پراٹھا ذرا گول نہیں بنتا۔" رامین نے کہا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ گول نہیں تو نا سہی بس کچا نہ ہو۔" وہاج نے کہا۔

"اور بھی غم ہیں زمانے میں کھانا بنانے کے سوا۔" انوشہ نے کہا۔

"واہ۔ واہ۔ کلام چور لڑکی۔" صارم چلایا۔ سب ہنسنے لگے اور ناشتا کرنے لگے۔

بے اختیار فضیلہ کی آنکھوں کے سامنے کئی سال پرانا منظر لہرا گیا۔ یہی جگہ تھی۔۔۔ یہی وقت۔۔۔ پندرہ سال کی عمر میں جب وہ بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو شادی کے آٹھویں روز اس کی ساس کی طبیعت خراب ہو گئی اور ناشتا بنانے کی ذمہ داری فضیلہ پر آن پڑی۔ پراٹھے کچھ اچھے نہیں بنے۔ آملیٹ تو ٹھیک تھا' مگر انڈے صحیح فرائی نہ ہوئے۔ اس کے ہاتھوں پر بھی چھینٹے پڑے۔ سب تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر اس کی نند نے ایک پراٹھا اٹھایا اور بولی۔

"یہ کس ملک کا نقشہ بنایا آپ نے بھابھی۔" زبیر ابھی ناشتا شروع ہی کرنے والا تھا کہ باقی سب گھر والے مذاق اڑانے لگے۔ پھر ریحانہ نے ایک ٹیڑھا میڑھا پراٹھا اٹھا کر زبیر کے سامنے رکھا اور بولی۔

"لیجیے افریقہ کا ادھ جلا نقشہ حاضر ہے' تناول فرمایے۔" زبیر نے ایک غصے بھرے نظر اس پر ڈالی اور ناشتا کیے بنا ہی دفتر چلا گیا۔

"پھوہڑ کہیں کی۔ ماں نے کچھ نہیں سکھایا' لے کے ہمارے سر منڈھ دیا۔ آج میرا بیٹا بھوکا ہی دفتر چلا گیا۔" ساس نے غصے سے کہا۔ وہ آنسو پیتی سر جھکائے ساس کی ڈانٹ اور باقی گھر والوں کی تحقیر بھری نظریں سہتی رہی اور یہ تو شروعات تھی۔ فضیلہ ماضی کی راہوں میں بھٹک رہی تھی۔ چہرے کے نقوش تن سے گئے تھے۔

"ماما یہ ناشتا کریں' ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" رامین نے

محبت سے کہا۔ وہ چونکی اور گہری سانس لے کر ناشتا کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆ ☆ ☆

فضیلہ محسوس کررہی تھی کہ رامین کو بھی ان ہی مسائل اور حالات و واقعات کا سامنا تھا جن سے وہ گزری تھی۔ مگر اب وقت بدل گیا تھا۔ رامین کھانا بنانے کی ماہر نہیں تھی' تو وہاج کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ دونوں اکٹھے وقت گزارتے' گھومتے پھرتے گھنٹوں کمرے میں بیٹھے میوزک سنتے' فلمیں دیکھتے' گرمیوں کی لمبی دوپہریں سو کر گزارتے۔ فضیلہ کو تو نہ کبھی دوپہر میں سونا نصیب ہوا اور نہ شوہر کے ساتھ وقت گزارنا' گھومنا پھرنا' ٹی وی دیکھنا' فضیلہ کا سونا ساس کو عیاشی لگتا تھا اور شوہر کے ساتھ وقت گزارنا فحاشی۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے بھی بہت سے مسائل حل کردیے تھے۔ جیسا کہ وہاج کمپنی کی طرف سے کینیڈا گیا تو فضیلہ کو وہ وقت یاد آگیا جب زبیر تین ماہ کے کورس پر انگلینڈ گیا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اجنبی سسرال..... جس کا ہاتھ تھام کر یہاں آئی تھی' وہ دور دیس جا بیٹھا تھا۔ اب تو ہر لمحہ اس کی منتظر ہوتی' ہر پل صرف یہ انتظار کہ کب فون آئے گا۔ لیکن تین ماہ اس کا انتظار انتظار ہی رہا۔ زبیر سے اس کی بات نہ ہوسکی۔ لاؤنج میں فون تھا۔ اس کی ساس ہی فون اٹھاتیں۔ سب گھر والے زبیر سے بات کرتے' ریحانہ فرزانہ فرمائشیں نوٹ کرواتے نہ تھکتیں ۔ زبیر اس کے متعلق پوچھتا تو کہہ دیتیں سو رہی ہے۔ اس روز وہ ساس کے حکم پر اسٹور صاف کررہی تھی۔ صفائی ختم کرکے باہر آئی تو ساس کے بولنے کی آواز سن کر ان کے پاس آگئی۔ وہ زبیر سے بات کررہی تھیں۔ اسے دیکھ کر دعائیہ کلمات کہہ کر فون بند کردیا۔

"زبیر ماشاءاللہ خیریت سے ہے۔" ساس نے بتایا۔

"میری بات کروا دیتیں۔" فضیلہ نے بالآخر کہہ ہی دیا۔

"کیسے کرا دیتی' میں اسے کہہ چکی تھی کہ تم سو رہی ہو۔" ساس نے کہا۔

"لیکن امی میں تو اسٹور صاف کررہی تھی' آپ ہی نے تو کہا تھا۔" فضیلہ نے کہا۔

"تو بی بی اسٹور صاف کرنے کی بھی خوب رہی' دسیوں گھنٹے گزر گئے۔

اسٹور صاف نہ ہوا۔" ساس نے کہا۔

"مگر امی..." وہ روہانسی ہوگئی۔

"چلو... اگلی بار فون کرے گا تو بات کروا دوں گی۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔ لیکن وہ اگلی بار کبھی نہ آئی۔ 80ء کی دہائی کا زمانہ تھا۔ بیرون ملک فون کرنا آسان کام نہ تھا۔ پی ٹی سی ایل سے کال بک کروائی جاتی' پھر گھنٹوں سے کال ملنے کا انتظار... اور پھر بھی ضروری نہیں کہ کال مل جائے۔ طویل انتظار اکثر اوقات رائیگاں ہی رہتا... وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔

جب زبیر تین ماہ بعد واپس آیا تو اس کا موڈ بے حد خراب تھا کہ تین ماہ فضیلہ نے اس سے بات کی' نہ اس کے والدین کا خیال رکھا' ہر وقت اپنے کمرے میں پڑی سوتی رہتی۔ وہ حیرت سے زبیر کو دیکھتی رہ گئی۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش کی تو زبیر نے ایک نہ سنی۔ وہ اٹھی اور کچن میں جاکر کام کرنے لگی۔ تھکاوٹ اس کے رگ و پے میں اتر رہی تھی اور جھنجلاہٹ اس کے چہرے کے نقوش بگاڑ رہی تھی۔ عورت کو چاہیے کیا ہوتا ہے۔ فراغت کے چند لمحے' شوہر کی محبت بھری اک نظر... جس سے فضیلہ محروم تھی۔ وہ جب کبھی میکے جاتی یا سہیلیوں سے ملتی تو باتوں کا اک پلندہ ہوتا تھا اس کے پاس۔ سارا وقت سسرال کی برائیاں کرتے کٹ جاتا۔ ایک ایک بات' ایک ایک واقعہ جسے اس نے خاموشی سے سہا ہوتا بیان کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی۔ اس کا سسرال نامہ سن کر ایک روز اس کی چھوٹی بہن بولی۔

"جب میکے آیا کرو تو اپنے ذہن کو ریلیکس رکھا کرو۔ اپنے ساتھ ساتھ ہم سب کو بھی اپنے سسرال پہنچا دیتی ہو۔ بعد میں جلنا کڑھنا ہوتا ہے تو برداشت مت کیا

کرو۔" بھائی کہتا۔

"امی آپ کے سسرال والے سیدھے جنت میں جائیں گے۔ آپ ان کی غیبت کر کر کے ان کے گناہ جھاڑ دیتی ہیں۔" امی کہتیں۔

"صبر سے کام لو۔ گھر صبر اور برداشت سے ہی بنتے ہیں۔" وہ کیا کرتی۔ سر اٹھانے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ تربیت دی گئی تھی۔ سو سہتی رہتی' کڑھتی رہتی اور پھر غیبتیں کر کے کتھارسس کر لیتی۔

اس روز صبح سویرے وہاج کا فون آگیا۔ پندرہ منٹ بات کرنے کے بعد اس نے رامین کے بارے میں نہ پوچھا تو فضیلہ نے خود ہی بتا دیا کہ رامین سو رہی ہے' اگر وہ کہے تو اسے جگا دوں۔

"نہیں امی۔ سونے دیں اسے' میں نے تو آپ سے اور بابا سے بات کرنے کے لیے فون کیا ہے۔" فضیلہ کا ڈھیروں خون بڑھ گیا اور کمینی سی خوشی بھی ہوئی۔ رامین اٹھ کر آئی تو فضیلہ نے اپنی ساس کی طرح اسے آڑے ہاتھوں لینے کی کوشش کی۔

"اب اٹھ رہی ہو' گیارہ بج رہے ہیں۔"

"جی مامی' بس آنکھ نہیں کھلی۔" رامین نے لاپروائی سے کہا۔

"وہاج کا فون آیا تھا' میں نے کہا بھی کہ تمہیں جگا دیتی ہوں' مگر اس نے منع کر دیا۔" فضیلہ نے اسے تپانے کی کوشش کی۔

"واہ کیا بات ہے جناب کی۔ ساری رات اسکائپ پہ مجھ سے بات کرتے رہے اور صبح سویرے آپ سے بات کر لی۔" رامین نے کہا۔ اف یہ ٹیکنالوجی کی ترقی۔ فضیلہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وقت کیا بدلا' اسے لگتا تھا کہ لوگ بھی بدل گئے ہیں۔ انوشہ کی شادی کی تاریخ لینے کے لیے اس کے سسرال والے آرہے تھے۔ فضیلہ چاہتی تھی کہ کھانا بہت اچھا ہو' سو کوفتے' بریانی' قورمہ' مٹن کڑاہی اور روسٹ بنانے کا فیصلہ کیا۔ میٹھے میں ٹرائفل اور گلاب جامن بنانے کا سوچا۔ انوشہ نے کوفتے بنائے۔ شومئی قسمت کوفتوں کی گریوی میں نمک کچھ تیز ہو گیا۔

"مما اب کیا کروں۔" انوشہ جھلا اٹھی۔

"اب اتنا وقت نہیں ہے کہ دوبارہ گریوی بنائی جائے' ایسا کرو رامین تم اس میں آٹے کی گولیاں بنا کر ڈال دو۔ نمک اتنا تیز نہیں ہے۔ آٹے کی گولیوں سے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" فضیلہ نے حل بتایا۔

"جی مامی میں ڈال دیتی ہوں۔" رامین نے کہا۔

"ہاں گولیاں ڈال کر جاؤ' اپنا حلیہ ٹھیک کرو۔ انوشہ تم بھی تیار ہو جاؤ' مہمان پہنچنے والے ہوں گے۔" فضیلہ نے کہا۔

"جی مامی!" رامین نے گولیاں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایک نظر ڈائننگ روم کے برتنوں پہ بھی ڈال لینا' سب ٹھیک ہے نا۔" فضیلہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے مامی۔ کچن میں کام ختم ہو گیا ہے۔ آپ بھی چینج کر لیں۔" رامین نے کہا۔

"بیٹا یہ کوفتے ٹرائی کرو۔ انوشہ بہت اچھے کوفتے بناتی ہے۔" زبیر نے انوشہ کے منگیتر کاشان سے کہا۔

"جی انکل! میں لیتا ہوں۔" کاشان نے کوفتے پلیٹ میں ڈالے اور ایک کوفتے کو کھانے کی کوشش کی' مگر اس نے ٹوٹنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ نرم اور لچکیلا تھا۔ رامین کی نظر کاشان کی پلیٹ پر پڑی اور پھر اس کے تاثرات پر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"بھائی یہ۔۔۔ یہ نہ کھائیں۔۔۔ یہ کوفتہ نہیں ہے۔" رامین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"کوفتہ نہیں ہے تو کیا ہے؟" فضیلہ نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ نمک تیز ہو گیا تھا تو مامی آپ نے کہا کہ آٹے کی گولیاں بنا کے ڈال دو تو نمک کم ہو جائے گا تو۔۔۔ تو یہ۔۔۔ وہ گولیاں ہیں۔" رامین نے انکشاف کیا۔

"رامین۔۔۔ تم نے وہ گولیاں نکالیں نہیں۔" فضیلہ نے صدمے سے کہا۔

"مامی آپ نے ڈالنے کو کہا تھا' نکالنے کو تو نہیں کہا تھا۔ پھر آپ نے مجھے تیار ہونے کے لیے بھیج دیا تھا

تو۔" رامین نے صفائی دی۔

"یہ آج کل کی بچیاں۔" انوشہ کی ساس نے قہقہہ لگایا۔ "بیٹا اسے سائڈ پہ کر کے تم کوفتہ لے لو اور دھیان سے اس بار کوفتہ ہی لینا۔"

"ویسے بیٹا کتنی گولیاں ڈالی تھیں' ایک تو نکل گئی۔" سسر نے پوچھا۔

"سوری۔۔۔ ماما نے بتایا ہی نہیں کہ گولیاں نکالنی بھی ہیں۔" رامین شرمندگی سے بولی۔

"رامین یہ کامن سینس کی بات تھی۔" فضیلہ نے دانت پیسے۔

"فضیلہ کیوں پریشان ہو رہی ہو اور بچی کو بھی کر رہی ہو۔ ان کی عمر میں ہم سے بھی تو ایسی غلطیاں ہوتی رہی ہیں۔" انوشہ کی ساس نے کہا۔ کاشان مسلسل ہنس رہا تھا۔

"بھابھی پہلے وقتوں میں جب داماد سسرال میں پہلی بار کھانا کھاتا تھا تو سالیاں مذاق کرتی تھیں۔ کبھی پانی کے گلاس میں نمک گھول دیا۔ کبھی سالن میں مٹھی بھر مرچیں جھونک دیں اور لڑکا چپ چاپ کھا پی جاتا۔ رامین نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ مگر کاشان اس زمانے کے داماد کے مروجہ اصولوں پر پورا نہیں اترا۔" انوشہ کے سسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ سب ہنسنے لگے اور کھانے میں مصروف ہو گئے۔ فضیلہ نے سب کے مطمئن اور مسکراتے چہروں پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے دل میں بھی سکون و اطمینان کی لہر اتر گئی' اس کی بیٹی کو کم از کم ان حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا' جن سے وہ گزری تھی۔

ورنہ یہی جگہ تھی' ایسا ہی منظر تھا۔ اس کی نند ریحانہ کی شادی کی تاریخ فکس کرنے کے لیے اس کے ساس' سسر آئے ہوئے تھے۔ فضیلہ سے قورمہ میں مرچیں زیادہ ہو گئیں اور مکس سبزیوں کی کٹنگ ریحانہ کی ساس کو پسند نہ آئی۔ تو انہوں نے میز پر ہی فضیلہ کو پھوہڑ کا خطاب دے دیا اور صاف کہا کہ ریحانہ کو گھر کے کام کاج اور سلیقہ سکھا کر بھیجنا۔ غضب خدا کا بہو ایسی بدسلیقہ ہے تو بیٹی کیا کرے گی۔ آہستہ لہجے میں انہوں نے جتا ہی دیا۔

"بس آنٹی غلطی سے مرچیں زیادہ ہو گئیں۔" فضیلہ نے کہا۔

"میں نے بتایا بھی تھا کہ ہم کم مرچ' مسالا کھاتے ہیں۔ پھر کیسے تیز ہو گئیں۔" انہوں نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ فضیلہ خاموش رہی۔ ان کے جانے کے بعد فضیلہ کی ساس اور ریحانہ نے اس کے وہ لتے لیے کہ الاماں کئی دن تک سب کے موڈ اور گھر کا ماحول خراب رہا اور یہاں ان لوگوں کے جانے کے بعد سب رامین اور انوشہ کو چھیڑتے رہے۔

"کاشان کے تاثرات دیکھے تھے کیسے تھے۔" صارم ہنسا۔

"ساس' سسر نے سوچا ہو گا کہ آج اگر کچھ سخت کہہ دیا تو ایسا نہ ہو کہ شادی سے انکار ہو جائے۔" وہاج نے کہا۔

"انکار نہ بھی ہوا تو ایسا نہ ہو کہ بعد میں بہو بیگم کھانا ہی نہ بنائے کہ آپ اتنی تنقید کرتی ہیں' اس کا مطلب آپ کو زیادہ اچھا بنانا آتا ہے۔ خود ہی بنالیں۔" صارم نے کہا۔

"آج کل کی لڑکیوں سے کچھ بعید نہیں۔" زبیر نے کہا۔

"ویسے رامین تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ حد ہوتی ہے یار۔" وہاج نے کہا۔

"جو کچھ نہیں کرتے' وہ کمال کرتے ہیں۔" صارم بولا' رامین نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا اور ہنسنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اس روز رامین سے ملنے ریحانہ اور اس کی جیٹھانی آگئیں۔ وہ تھوڑی دیر لاؤنج میں بیٹھیں۔ پھر رامین بولی۔

"مما آئیں میں آپ کو اپنا کمرہ دکھاؤں۔"

"ماں اور تائی کو چائے پانی کا تو پوچھ لو' پھر کمرہ دکھا دینا۔" فضیلہ نے ٹوکا۔

"تائی میں مما کو اور تائی جان کو اپنے کمرے کا ڈیکور

اور نئی سیٹنگ دکھا دوں' پھر چائے پانی' کھانا سب پوچھتی ہوں۔" رامین یہ کہہ کر چلتی بنی اور پھر اس کی واپسی نہ ہوئی۔

"کمال لڑکی ہے یہ۔ کمرے میں جا کر بیٹھ ہی گئی۔ مہمانوں کو کچھ پوچھا ہی نہیں۔ کر رہی ہوگی میری برائیاں۔" فضیلہ کڑھنے لگی۔ "میں کیا نوکر ہوں جو اس کی ماں اور تائی کی خاطریں کرتی پھروں۔" فضیلہ بڑبڑائی اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ پھر سوچا۔ بہت ہوگیا۔ بلا کر لاتی ہوں رامین کو۔ اپنے میکے والوں کی بھی کوئی خاطر کرے اور رات کے کھانے کا بھی کوئی انتظام کرے۔ امید واثق تھی کہ رامین اس کی بلکہ سارے سسرال کی برائیاں کر رہی ہوگی' اس لیے بنا آہٹ کے دروازے تک پہنچی اور رامین کی تائی کو کہتے سنا۔

"رامین تو خوش ہے نا۔ تیری ساس تیرے ساتھ ٹھیک ہیں نا۔"

"کم آن تائی جان' ساس کہاں کی وہ تو میری مامی ہیں۔" رامین نے کہا۔

"جی بھابھی' میری بیٹی میرے میکے میں ہے' میرے گھر میں۔ وہی آنگن' وہی در و دیوار۔ اور کمرہ بھی تو وہی ہے۔ میرا کمرہ۔" ریحانہ کے لہجے میں میکے کا مان تھا۔

"بڑا مان ہے' ابھی تک میکے کا۔ اب یہ تمہاری بیٹی کا سسرال ہے۔" تائی جان نے کہا۔

"تائی جان کیسا سسرال۔ میرا تو ننھیال ہے۔ میری مما کا میکا اور میکے کا یہ مان میری مامی نے برقرار رکھا ہوا ہے۔ اللہ انہیں لمبی عمر' صحت' تندرستی دے' کبھی احساس بھی نہیں ہوتا کہ میں سسرال میں ہوں یا مامی میری ساس ہیں' وہ تو پہلے کی طرح ہی میرا خیال رکھتی ہیں۔" رامین نے کہا۔

"تو سچ کہہ رہی ہے رامین۔" ریحانہ نے پوچھا۔

"جی مما! پتا نہیں آپ کو کیوں ان سے شکایتیں تھیں۔ حالانکہ وہ اتنی سوئٹ نیچر کی ہیں کہ میں آپ کو کیا بتاؤں۔ اور مامی کا بیٹا تو ہے ہی اچھا۔" رامین نے شرارت سے کہا۔

"اور باقی سب۔۔۔؟" تائی جان نے پوچھا۔

"سب بہت اچھے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں۔ مجھے اور وہاج کو ساتھ وقت گزارنے کا موقع دیتے ہیں۔ اصل میں مامی نے اپنے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ میں تو وہاج سے بھی کہتی ہوں کہ تم جتنے اچھے ہو' اس کے پیچھے مامی کی تربیت ہے۔" رامین نے کہا۔

فضیلہ کو عجب خوشی کا احساس ہوا' اس طرح تو کسی نے نہیں سراہا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔ ریحانہ اور اس کی جیٹھانی کی خاطر تواضع کا انتظام کرنے کے لیے۔

"مما نیچے چلتے ہیں۔ ممانی اکیلی کام کر رہی ہوں گی۔" رامین نے فضیلہ کو پلٹتے دیکھ لیا تھا۔

فضیلہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اس نے چولہے پر چائے کا پانی رکھا۔ کباب فرائی کرنے کے لیے رکھے اور فروٹ چاٹ کے لیے فروٹ کاٹنے لگی۔ اسی وقت رامین اندر آئی۔

"مامی آپ بیٹھیں جا کر' میں چائے بناتی ہوں۔" رامین نے کہا۔

"نہیں' تم جا کر بیٹھو آرام سے' میں کر لیتی ہوں۔" فضیلہ نے محبت سے کہا۔

"چلیں' مل کر کر لیتے ہیں' پھر آرام سے اکٹھے بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ رامین نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" فضیلہ مسکرا دی۔ وقت بدل چکا تھا۔

☆ ☆

بشریٰ ماہا

چلو اتنی تو وضاحت کر آئیں

گوٹھ شاہو کی بڑی حویلی کے بڑے کمرے میں اس وقت اگربتی کی مہک اور گہری خاموشی کا راج تھا۔ گاؤں بھر کی عورتیں اپنے بچوں کو دم کروانے اور بیٹی کے رشتے کی دعا کروانے اور اس طرح کے سیکڑوں کام کے لیے دعا کروانے پاک دامن بی بی کے پاس حاضر ہوتی تھیں۔ جب سے پاک دامن بی بی آنکھیں بند کیے کوئی سورۃ پڑھ رہی تھیں سب کی نظریں ان کے صبیح چہرے پر جمی تھیں جیسے جیسے جس کی باری آرہی تھی ویسے ویسے وہ عورت دعا کروا کر پانی کی بوتل پر دم کروا کر پچھلے دروازے سے باہر جا رہی تھی۔

"پاک دامن بی بی تو رج کے سوہنی ہیں۔ دیکھ رقیہ! سفید جوڑے میں بھی بنا ہار سنگار کے بھی کتنی پیاری لگتی ہیں۔ سچ پوچھ تو میں یہاں آتی ہی انہیں دیکھنے ہوں۔" شبو نے پاک دامن بی بی کو دیکھتے سرگوشی کی تھی۔

"شبو ماشاءاللہ بول۔ ماشاءاللہ بول۔ تجھے کیا پتا کہ یہ خوب صورتی تو ان کو بچپن سے رب سوہنے نے دی ہی تھی۔ لیکن رب سوہنے کے ذکر اور عبادت نے انہیں اور سوہنا بنا دیا ہے۔" ان کے لہجے میں عقیدت بول رہی تھی اور یہاں بیٹھی ہر عورت، بچے لڑکی کے دل میں ان کے لیے اتنی ہی محبت اور احترام تھا اور پاک دامن بی بی ایک نام نہیں تھا یہ ایک مرتبہ تھا۔ وہ رتبہ جو بڑی قربانی مانگتا ہے اور وہ مرتبہ جو بے حد خاص تھا اور ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

پاک دامن بی بی کی غلافی آنکھوں پہ پلکوں کی جھالر گری ہوئی تھی ان کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ کمرے میں بیٹھی ہر عورت کا دل عجب ہی لے میں دھڑک رہا تھا۔ اور اس وقت اس کمرے میں بے حد مقدس خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ کسی کی اتنی مجال نا تھی کہ اس خاموشی کو توڑ سکتا۔

بند آنکھیں پھر آہستہ سے کھلی تھیں اور ہلتے لب رکے۔ سامنے رکھی پانی کی بوتل ایک عورت نے جلدی سے آگے کی تھی۔ پاک دامن بی بی نے اس پر دم پھونک مار کر دم کیا اور پھر عورت کو تھما دی۔ وہ عقیدت سے بوتل لے کر اور پاک دامن بی بی کا ہاتھ تھام کر پیچھے چلی گئی تھی۔ اب سامنے بیٹھی عورتوں میں سے دوسری عورت اٹھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شبینہ اور زوار، پیر جلال شاہ کے دو ہی بچے تھے۔ شبینہ جسے دیکھ کر چاند کا گمان ہوتا تھا۔ رب نے اسے حسن کی تو دولت سے مالا مال کیا ہی تھا لیکن عاجزی اور اخلاق میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ بچپن میں ہی اس کی پیدائش پر اس کے تایا سائیں نے اس کا رشتہ اپنے چھوٹے بیٹے سجاول شاہ سے پکا کر دیا تھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کی وجہ سے بابا سائیں اور تایا سائیں دونوں ہی اس کے جی بھر کے لاڈ اٹھاتے تھے اتنی محبتوں نے بھی اسے مغرور نہیں بنایا تھا۔

بچپن میں جب اس نے اپنے بھیا زوار شاہ کو اسکول جاتے دیکھا تو اس کی شدید خواہش ہوتی تھی اسکول جانے کی لیکن ان کے خاندان میں اسکول جانے کا رواج نہ تھا اکلوتی بیٹی کی خواہش پر پیر جلال شاہ نے

حویلی میں ہی ایک استانی کا بندوبست کر دیا تھا اور صدا کی صابر شاکرا اپنے بابا سائیں کی اس مہربانی پہ بھی جھوم اٹھی تھی۔

"اللہ تعالیٰ ہماری ہر غلطی معاف کیوں کر دیتا ہے استانی جی۔" وہ تب پانچ سال کی تھی جب استانی صاحبہ نے اسے بتایا تھا کہ ہم معافی مانگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہر غلطی معاف فرما دیتے ہیں۔ اور اس کے معصوم ذہن میں یہ سوال آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کیوں معاف کرتے ہیں جب کہ اس کے بابا اور بھائی شاہ جی تو کبھی معاف نہیں کرتے اپنے ملازموں کو۔ ذرا سی غلطی پہ شاہ بھیا ڈرائیور کو بے عزت کر کے رکھ دیتے تھے۔

"وہ اس لیے بیٹا کہ وہ ہم سے پیار کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ تم مجھ سے مانگو میں عطا کروں گا' وہ رب سوہنا بہت محبت کرتا ہے اپنے بندوں سے۔"

"محبت یہ کیا ہوتی ہے۔" اس کا معصوم ذہن لفظ محبت پر اٹکا تھا۔

"محبت یہ سمجھو کہ جو ہمیں ہمارے گناہ اور غلطی کو معاف کردے۔" استانی نے اپنی سمجھ کے مطابق محبت کی تشریح بتادی تھی۔

"تو کیا جو بھی ہم سے محبت کرے گا وہ ہماری غلطیوں کو معاف کردے گا۔ استانی جی.....!" اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے پوچھا۔

"جی معاف کردے گا مگر اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ ستر ماؤں سے زیادہ۔ وہ بے حد غفور الرحیم ہے۔" وہ اسے عجز و انکساری سے بتارہی تھیں اور وہ دلچسپی سے سنتی ذہن نشین کرتی جارہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پھوپھو جان یہ دیکھیں میں آپ کے لیے کیا لایا ہوں۔" اس نے ایک خوب صورت ریپنگ میں بند گفٹ ان کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی شہر سے آیا تھا۔

"بیٹا تم جانتے ہو میں یہ کنگن نہیں پہن سکتی پھر کیوں لاتے ہو میری جان....." انہوں نے تحفہ کو کھولا تھا اور اس میں موجود خوب صورت جڑاؤ کنگن دیکھ کر کہا..... ساتھ ہی انہوں نے محبت سے اس کے گال پہ ہاتھ پھیرا۔

"بس کوئی بہانہ نہیں آپ جلدی پہن کر دکھائیں نا۔" وہ ضدی لہجے میں بولا تھا۔ اور پھوپھو کا ہاتھ پکڑ کر اور کنگن پہنا کر ہی دم لیا تھا۔

"کتنے پیارے لگ رہے ہیں آپ کے ہاتھوں میں کنگن۔" اس نے محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ خوش لگ رہا تھا۔

"بیٹا یہ میرے نہیں اب تمہاری دلہن کے ہاتھوں میں سجیں گے..... کیوں ستاتے ہو مجھے میری جان کیوں؟ کرلو نا اب کوئی لڑکی پسند..... بہت ارمان ہے تمہاری دلہن دیکھنے کا....." انہوں نے ہزار بار کہی بات دہرائی۔

"ابھی نہیں..... دل نہیں کرتا میرا ابھی..... کچھ دن اور آزادی کے گزار نے دیں پھر جس دن وہ مل جائے گی جس کو دیکھ کر میرا دل کہے گا احمد شاہ اسے تو تمہارے لیے ہی بنایا گیا ہے تو آپ کو اور دادا سائیں کو بتادوں گا۔" اس نے انہیں تسلی دی تھی۔

"اور کس دن ملے گی وہ؟" انہوں نے روٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"بہت جلد یہ سمجھیں جب اللہ کا حکم ہوا..... سب کے لیے دعا کرتی ہیں میرے لیے بھی کرلیا کریں نا.....!" وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

"کرتی ہوں احمد شاہ سب سے زیادہ تمہارے لیے ہی تو کرتی ہوں....." انہوں نے اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا..... آواز میں خود بہ خود افسردگی گھل گئی تھی..... وہ اس سے بے حد و بے شمار پیار کرتی تھیں..... وہ ہر وقت ان کے لب پہ رہتا تھا دعا کی صورت۔ اور ان کی تو جان تھی اپنے بھتیجے احمد شاہ میں۔

☼ ☼ ☼

محبت رشتوں کی نازک ڈور ہے جاناں
جو زور سے کھینچو گے تو یہ ٹوٹ جائے گی

"تایا سائیں دیکھیں نا مجھے یہ میتھ کا پرابلم سمجھ نہیں آرہا..... ادا سائیں بھی گھر نہیں ہیں اور بابا سائیں بھی..... اماں کا تو کہنا ہے انہوں نے کبھی اسکول کی شکل ہی نہیں دیکھی..... اب آپ ہی بتائیں یہ مجھے کون سمجھائے گا یہ سوال....." وہ ناراضی سے بولی۔

"ارے ہماری بٹیا رانی کیوں پریشان ہوتی ہے..... ہم ہے نا..... ہم سمجھائیں گے اپنی بیٹی کو یہ سوال....." انہوں نے لاڈ سے کہا اور ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھایا۔

ان کا گھرانہ اپنے خاندان کے دیگر گھرانوں سے تھوڑا سا مختلف تھا وجہ ان کا تعلیم یافتہ ہونا تھا..... ان کے لیے اپنی بیٹیاں بھی بیٹوں ہی کی طرح پیاری تھیں بس کچھ معاملوں میں وہ روایتی بن جاتے تھے۔ اور تایا سائیں نے اسے وہ حساب کا سوال منٹوں میں سمجھادیا تھا۔

"ٹھیک ہے سمجھ آگیا نا میری بیٹی کو سوال اور کوئی پرابلم تو نہیں نا تمہیں پڑھائی میں؟" انہوں نے اس کی پڑھائی کے بارے میں سوال کیا تھا؟

"پڑھائی میں تو کوئی مسئلہ نہیں تایا سائیں' بس یہی سمجھ نہیں آرہا تھا آپ بہت اچھے ہیں تایا سائیں۔"

اس کی بات کے جواب میں انہوں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دعا دی تھی۔ تایا سائیں میرا بہت خیال رکھتے ہیں اس کا مطلب وہ بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور مسکرا دی تھی۔ اور خوشی خوشی کتابیں سمیٹ کر کمرے میں چل دی۔

✡ ✡ ✡

تو مجھ کو ضروری ہر دم پیا
تو میری امانت تو یہ یاد رکھ پیا

"سانول یہ دیکھو نا میں تمہارے لیے گرما گرم دودھ لائی ہوں اماں تو مجھے دے ہی نہیں رہی تھیں کہہ رہی تھیں گرا دو گی لیکن ضد کر کے لے آئی ہوں۔۔۔" اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے شبینہ شاہ بلند آواز میں بولی تھی۔

"اچھا بینا ٹیبل پر رکھ دو' میں ذرا سا کام رہ گیا ہے وہ مکمل کر لوں پھر پی لوں گا۔" اس نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر بولا تھا۔

سانول اس سے دو سال ہی بڑا تھا اور دونوں میں بہت دوستی تھی۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ سانول کا تو دن ہی ادھورا رہتا تھا جب تک وہ سارے دن کی روداد بینا کو نا بتا دے۔ اور خود بینا کا تو وہ واحد دوست تھا ہی سانول۔۔۔ دوستی اور کزنز کے علاوہ ان دونوں کے درمیان جو ایک اور خوب صورت تعلق تھا اس سے۔ وہ دونوں ہی انجان تھے۔

"ایسے رکھ دو گی تو تم پینا بھول جاؤ گے اور دودھ ٹھنڈا ہو جائے گا اور ٹھنڈا دودھ تمہیں کہاں پسند ہے اس لیے تم ابھی پیو گے وہ بھی میرے سامنے" ضدی لہجے میں بولتی ہوئی اس کے سر پر آ کے کھڑی ہو گئی تھی اور دودھ کا گلاس وہاں ہی رکھ دیا تھا۔

"نہیں نہ یار ابھی بہت کام ہے تنگ نہ کرو۔ میں ٹھنڈا ہونے سے پہلے پی لوں گا نا۔" اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا اس کی نظریں کاپی پر تھیں اور انداز بے حد مصروف۔ اس نے لمحے بھر کے لیے سر اٹھایا اور گلاس واپس بینا کو پکڑا کر دوبارہ سے لکھنا شروع ہو گیا۔

مگر بینا بھی ضدی تھی۔۔۔ اس نے ایک بار پھر سانول کی طرف گلاس بڑھانا چاہا تھا اور اس ہی وقت سانول کا پین اٹھانے کے لیے بڑھتا ہوا ہاتھ گلاس کو لگا تھا جس سے نہ صرف اس کی کاپی پر دودھ گر گیا بلکہ بینا کے ہاتھ پر بھی گرم گرم دودھ گر گیا تھا۔

"سس۔۔۔" بینا نے درد کے مارے سسکی بھری اور ہاتھ منہ کے سامنے کر کے پھونک مارنے کی کوشش کی۔ درد کے مارے اس معصوم کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے تھے۔ سارا لمحوں کا کھیل تھا۔

"اُف۔۔۔ دکھاؤ ہاتھ۔۔۔ تم بھی نا۔۔۔" وہ کام کاپی سب کچھ نظرانداز کر کے اس کی طرف بنا اک لمحے کی بھی دیر کیے بڑھا تھا۔ "دیکھو کیوں ضد کرتی ہو۔۔۔ جلا لیا نا ہاتھ اب بیٹھو یہاں۔۔۔ میں فرسٹ ایڈ باکس لاتا ہوں۔۔۔" وہ پریشان سا بولتا تیزی سے باہر بھاگا۔

"دیکھو کتنا برا جلا ہے۔ اللہ کرے چھالے نا پڑیں۔۔۔" سانول نے اس کے ہاتھ پر آئنمنٹ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ بنا کچھ بولے اسے آئنمنٹ لگاتا دیکھتی رہی۔ چپ چاپ۔۔۔ آنسو تو نا جانے کب سے تھم چکے تھے۔ شاید تب جب سانول نے ہاتھ پکڑا تھا یا شاید تب جب اس نے محبت بھرے انداز میں ڈپٹا تھا۔

"بہت درد ہو رہا ہے بینا۔۔۔" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔

"نہیں اب نہیں ہو رہا۔۔۔ پہلے ہو رہا تھا مگر اب تم نے آئنمنٹ لگا دیا ہے نا اس لیے بالکل بھی درد نہیں ہو رہا" وہ تمھی سی نو روتے ہوئے بولی تھی۔

"تمہیں میں منع کر رہا تھا اس لیے ہی کہ گرم دودھ

سے تم جل بھی سکتی ہو۔۔۔ اب دیکھو نشان بھی پڑ جائے گا کتنی جلن ہو رہی ہوگی مگر تم۔۔۔ تمہیں تو ضد کرنی ہے۔۔۔ جلا لیا نا خود کو۔۔۔" اس نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہو جائے گا سانول شاہ لیکن تمہاری ساری محنت ضائع گئی' اب پھر سے تمہیں سب لکھنا پڑے گا اور صبح اسکول میں ٹیچر سے بھی ڈانٹ پڑ جائے گی۔ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری غلطی سے کل کلاس میں تمہاری انسلٹ ہوگی۔" اسے اپنے زخم سے زیادہ اس کی عزت کی فکر تھی۔ اور اس لیے ہی وہ اداس ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں بینا فکر نہ کرو اور کسی ٹیچر میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ پیر سانول شاہ کی انسلٹ کر سکے۔۔۔ تم پریشان نا ہو۔۔۔ غلطی تمہاری نہیں میری ہے۔۔۔ اگر میں تمہاری بات مان لیتا تو نہ تمہارا نقصان ہوتا نا میرا۔۔۔" اس نے منٹوں میں اس کی غلطی کو اپنے سر لیا تھا۔ اور وہ سر ہلا کر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ ہاتھ کی جلن تو اس کے لفظوں کی ٹھنڈک سے کب کی دور ہو چکی تھی۔

"سنو بینا۔۔۔" وہ جانے لگی جب سانول نے پکارا۔

وہ جاتے جاتے اس کی بات پر پلٹی۔

"اپنا خیال رکھا کرو اور اداس نہ ہوا کرو۔۔۔ تم پر جچتی نہیں ہے اداسی۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"سانول شاہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے میری ہر غلطی کو نظر انداز کر دیتا ہے اور خیال بھی رکھتا ہے اس کا مطلب وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ بہت محبت۔۔۔" اس کے معصوم دل نے سوچا تھا اور مسکرا دی تھی۔۔۔ محبت کی کلی پہلی بار اس کے دل میں تب پھوٹی تھی۔

☼ ☼ ☼

جہالت کے اندھیروں میں
تم نے الجھائی ڈور محبت جاناں

حویلی کے پچھلے برآمدے کے کونے والے کمرے سے آج پھر چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔۔۔ دبی دبی پر اذیت سے بھری دردناک چیخیں۔۔۔ جو سننے والے کا دل درد سے بھر دیں اور جن کا سوز سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔۔۔ بچپن میں وہ بہت ڈر جاتی تھی ان آوازوں سے۔۔۔ وہ دہشت کے مارے سہم جاتی۔۔۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ ان آوازوں کی عادی ہو گئی تھی۔ اب نا تو ان آوازوں سے خوف محسوس ہوتا تھا نہ ہی الجھن اور اب تو وہ جان بھی گئی تھی کہ یہ آوازیں کس کی ہیں مگر وہ درد جو پہلے محسوس ہوتا تھا ان آوازوں کو سن کر۔۔۔ بڑے ہونے پر اس درد کا احساس بڑھ گیا تھا۔۔۔ بچپن میں جب وہ عموماً" ان آوازوں کے بارے میں ماں سے سوال کرتی تو وہ ہمیشہ اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیتی تھیں۔۔۔ لیکن پھر ایک دن تایا سائیں اور بابا سائیں دونوں ہی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور اس کے بنائے سینڈوچ کی تعریفیں کر رہے تھے تو اس نے ڈرتے ڈرتے وہ سوال کر ہی دیا جو اسے کئی سالوں سے پریشان کر رہا تھا۔

"بابا سائیں۔۔۔ تایا سائیں آپ دونوں سے ایک بات پوچھوں اگر آپ دونوں خفا نہ ہو تو!" اس نے ڈرتے پوچھا۔

اور وہ دونوں اس کی بات سن کر مسکرا رہے تھے۔

ارے بھئی ہماری دھی رانی کو کب سے اجازت لینی پڑ گئی ہم سے کچھ پوچھنے کی۔۔۔ پوچھو بھئی "پوچھو ڈرو مت۔۔۔ تم میں تو ہماری جان ہے۔" بابا سائیں نے پچکارتے ہوئے کہا تھا۔

وہ حویلی کے پچھلے برآمدے کے بڑے کمرے میں سے اکثر رات کو چیخوں کی آوازیں آتی ہیں وہ کمرا تو پھوپھو جان کا ہے نا پھر ایسی آوازیں۔۔۔!" اس نے نا سمجھی سے پوچھا؟ "اماں سے پوچھتی ہوں تو ڈانٹ دیتی ہیں" اس نے بنا ان دونوں کے چہروں کو دیکھے اپنی بات جاری رکھی تھی۔

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔۔۔

"دھی رانی تمہاری پھوپھو کوئی عام عورت نہیں ہیں بہت خاص ہیں وہ۔۔۔ پاک دامن بی بی ہیں وہ۔۔۔

پاک دامن بی بی صرف اک نام نہیں، ہوتا یہ ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ جو نصیب والوں کو ملتا ہے اور جس کو ملتا ہے پھر سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ ہم تو بہت عام لوگ ہیں ہم بھلا کیسے ان چیخوں کا مطلب جان سکتے ہیں۔" ان کے انداز میں بے حد احترام اور عقیدت تھی جیسے وہ اپنے رسم و رواج سے بہت محبت کرتے ہوں۔

"مگر تایا جان۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ وہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ان چیخوں میں درد ہوتا ہے شکوہ ہوتا ہے اور بہت سی اذیت مگر بابا جان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا تھا۔ اور پھر ایک رات پھوپھو جان خاموشی سے رخصت ہو گئی تھیں اور بہت سے سوال اس کے معصوم ذہن میں مچل اٹھے تھے۔ اس وقت وہ محض پندرہ سال کی تھی۔ اس کے دسویں کے امتحانات سر پر تھے اور ابھی اس کا سارا دھیان ان پر تھا۔ اور پھر وقت گزرتا گیا ماہ و سال بدلتے چلے گئے اور پھوپھو بھی ایک پرانی یاد بنتی گئیں۔

☼ ☼ ☼

صبح بے حد خوش گوار تھی بہار کا آغاز ہو چکا تھا اور ہر طرف پھول اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ احمد شاہ ویک اینڈ گزارنے کے بعد آج واپس شہر جا رہا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ اپنی ہی ترنگ میں چلتا کی رنگ انگلی میں جھلاتا پورچ کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس کے چلتے قدموں کو کسی معصوم آواز نے روکا۔

"اداسائیں پلیز آپ مجھے ڈراپ کریں گے؟ آج میرا بہت اہم ٹیسٹ ہے اور بابا سائیں بھی گھر پہ نہیں ہیں۔۔۔" وہ شہوار شاہ تھی معصوم آواز دلکش چہرے والی اداس شہزادی۔۔۔ جس سے احمد شاہ کو شدید نفرت تھی۔ اس وقت وہ سفید اسکول یونیفارم میں تیار تھی اور سیاہ اسکارف میں سجے خوب صورت چہرے پہ روشن ان دو آنکھوں میں امید کے دیے جگمگا رہے تھے۔۔۔ پہلی بار شہوار احمد شاہ نے اس کے آگے مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا تھا۔

"آپ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔۔۔ کار اور ڈرائیور دونوں کی کمی نہیں۔۔۔ میں احمد شاہ ہوں کوئی عام انسان تو نہیں جو ہر کسی کو ڈراپ کرتا پھروں۔۔۔" وہ تنفر سے بولتا ایک جھٹکے میں اس کی امیدوں کو توڑ کر سامنے کھڑی اپنی سیاہ ہنڈا سوک کی طرف بڑھ گیا تھا مگر جاتے جاتے بھی اس نے شہوار کی آنکھوں میں چمکتے موتی دیکھ لیے تھے۔

گاڑی میں آ کر بیٹھنے کے بعد اس نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے لمبی سانس خارج کی تھی۔ اسے لگا تھا شہوار کی بے عزتی کر کے اسے دھتکار کر اسے اچھا لگے گا مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بے سکون ہی ہوا تھا۔ بچپن میں جب جب اس نے شہوار کو نظر انداز کر کے اسے تکلیف دینا چاہی تھی اسے خود ہی وہ تکلیف محسوس ہوئی تھی اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

"وہ ہے ہی میرے لیے ان لکی۔۔۔ تب ہی تو جب بھی اسے دیکھتا ہوں موڈ خراب ہو جاتا ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے سر جھٹکا اور زن کر کے اپنی گاڑی لے گیا تھا یہ دیکھے بنا کہ اس کی بات اور انداز نے شہوار کو کتنی تکلیف دی تھی۔

شہوار شاہ اس کے بابا کے تایا زاد بھائی کی بیٹی تھی اور بچپن ہی میں اس کی منگنی ہو چکی تھی جبکہ احمد شاہ اس سے اور اپنے بابا کے تایا زاد بھائی سے بے حد اور بے حساب نفرت کرتا تھا۔۔۔ شہوار اس سے دس سال چھوٹی تھی لیکن کبھی اس نے اس سے پیار سے بات کرنا تو دور پیار سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا اس کا بس چلتا تو وہ ان کو گھر سے نکال دیتا۔۔۔ مگر بس چلتا تب نا۔۔۔ صرف پیر احمد شاہ ہی نہیں بابا کے علاوہ حویلی کا کوئی بھی فرد اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ نجانے جو محبت دوسروں کے حصے میں آئی تھی وہ اسے کبھی نہیں ملی تھی اور یہ چیز اسے بہت تکلیف دیتی تھی لیکن وہ کیا کر سکتی تھی سوائے آنسو بہانے کے۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں شبینہ کے بڑے بھائی زوار شاہ کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں وہ بہت۔۔۔ بہت خوش تھی۔۔۔

سانول شاہ اور زوار شاہ کے ساتھ جا کے بھابھی کی ساری جیولری اور کپڑے اس نے خود پسند کیے تھے۔ اماں سائیں نے ہر چیز کی اسے اجازت دی تھی اکلوتے بھائی کی شادی کی خوشی اس کے انگ انگ سے ظاہر ہو رہی تھی۔۔۔ بھائیوں کی شادی کا ارمان تو ہر بہن کو ہوتا ہے اسے بھی تھا۔۔۔ ویسے بھی زوار اس کا اکلوتا بھائی تھا اس کی شادی کی ساری تیاریاں وہ خود کرنا چاہتی تھی۔ بالکل بہترین طریقے سے۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا تھا جب ادا زوار سائیں، رفیعہ بھابھی کو لے کر گھر آ گئے تھے۔۔۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں پورے حق سے اپنی دلہن بنا کر۔۔۔ بھابھی کے آ جانے سے گھر بھر میں خوشیوں کی اور محبتوں کی روشنیاں بھر گئی تھیں۔۔۔ روایتی بھابھی اور نند سے ہٹ کر ان دونوں کے درمیان بہت محبت اور پیار تھا بھابھی شہر کی پلی بڑھی اور چودہ جماعت پاس تھیں۔ اور یہ وہی تھیں جنہوں نے اس کے دل میں بھی کالج جانے کی خواہش پیدا کی تھی اور یہی خواہش لے کر وہ تایا سائیں اور بابا سائیں کے پاس گئی تھی اسے یقین تھا وہ اس کی خواہش کبھی رد نہیں کریں گے۔۔۔ بھلا ایسا کبھی ہوا ہی کب تھا کہ شبینہ شاہ کوئی فرمائش کرے اور وہ رد کر دی جائے۔

”تایا سائیں میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں مجھے کالج میں ایڈمیشن لینا ہے۔“ وہ پورے استحقاق اور لاڈ سے بولی تھی اس یقین کے ساتھ کے تایا سائیں کہیں گے میری بچی اگر ایسا چاہتی ہے تو ایسا ہی ہوگا۔ خواہش کا اظہار کرنے کے بعد وہ وہیں کھڑی ان کی ہاں کا انتظار کرنے لگی تھی۔ وہ کہاں جانتی تھی اس کی خواہش پہلی بار رد ہونے والی ہے۔

”دیکھو بیٹی تم پڑھنا چاہتی تھی ہم نے تم کو پڑھایا مگر اب اس سے آگے کی اجازت ہم نہیں دے سکتے تمہیں۔۔۔ ہمارے رسم و رواج اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ بیٹی کو گھر کی عزت کو۔۔۔ شہر میں پڑھنے بھیجا جائے۔“ انہوں نے دو ٹوک انداز میں فیصلہ سنا دیا تھا۔

”مگر تایا۔۔۔“ اس نے اپنے حق میں دلائل دینا چاہا۔

”بس۔۔۔“ اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی گئی۔ تایا سائیں نے ہاتھ اٹھا دیا تھا اس کا مطلب بات ختم۔ وہ روتی ہوئی آنکھوں میں آنسو لیے وہاں سے لوٹ آئی تھی۔۔۔ ناکام اور نامراد۔۔۔ خواہشوں کو حسرت بننے کا درد دل میں لیے۔

اس نے کھانا پینا سب چھوڑ رکھا تھا اور خود کو کمرے میں بند کر کے بیٹھی تھی۔ مگر آج پہلی بار کسی نے اس کی بھوک ہڑتال کو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ حیران تھی سب کے رویے پہ۔۔۔ پہلی بار اسے۔ اپنے گھر والے ظالم لگے تھے اور وہ ان سے بہت خفا تھی مگر کسی کو اس کی خفگی کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔

شام کو جب سانول شاہ گھر آیا اور اسے پوری حویلی میں کہیں بھی شبینہ شاہ نظر نہیں آئی تو اس نے رفیعہ بھابھی سے اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ انہوں نے اس کی خواہش اور بابا سائیں اور تایا سائیں کے انکار کے بارے میں بتایا۔

”شبینہ۔۔۔ شبینہ دروازہ کھولو یار۔۔۔“ وہ کھانے کی ٹرے لے کر سیدھا اس کے پاس پہنچا تھا۔۔۔ وہ صبح سے بھوکی ہے۔ یہ سوچ کر ہی اسے فکر ہو رہی تھی۔

”میں نہیں کھولوں گی۔۔۔ تنگ مت کرو سانول۔“ وہ غصے سے بولی۔

”اچھا تو تم اب مجھے بھی انکار کرو گی۔۔۔ میری بات بھی نہیں مانو گی۔۔۔“ وہ مان سے بولا تھا۔ ایک طرح سے یہ اموشنل بلیک میلنگ تھی۔ دس سیکنڈ بعد اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔ سانول نے مسکراتے ہوئے اس کے خفا چہرے پہ نظر ڈالی۔

”مجھے کھانا نہیں کھانا۔۔۔ تم یہ ٹرے کیوں لائے ہو۔“ وہ روٹھے لہجے میں گویا ہوئی۔

”کھانا کھاؤ۔۔۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کالج میں ایڈمیشن ضرور لے کر دوں گا۔ تمہیں مجھ پر یقین ہے نا بینا۔“ وہ اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”ایک تم پہ ہی تو یقین ہے۔۔۔“ وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"او کے پھر چلو شاباش اٹھو اور جلدی سے منہ دھو کے آؤ۔ دیکھو حشر کر دیا ہے تم نے رو رو کر اپنی آنکھوں کا۔" وہ خاموشی سے اس کی بات مان کر اٹھ گئی تھی اور منہ دھونے چلی گئی اس کے بعد وہ خوشی خوشی اس کے سامنے بیٹھی کھانا کھانے لگی تھی۔ اب وہ بالکل پرسکون تھی۔

"یار بندہ صلح ہی مار لیتا ہے صبح سے اب گھر لوٹا ہوں اور بنا کھائے پیئے تمہارے پاس بیٹھا ہوں اور تمہیں منا رہا ہوں لیکن مجال ہے کہ تم جھوٹے منہ ہی صلح مار لو۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا اور وہ بے اختیار شرمندہ ہوئی تھی۔

اور وہ پھر اس کے بنا کہے اس کے ساتھ ہی کھانا شروع ہو گیا تھا وہ اب بے فکر ہو گئی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی اب سانول شاہ سب سنبھال لے گا اسے اس پر اتنا ہی یقین تھا۔

پھر زوار بھائی کے گھر ایک پیارے سے بیٹے نے جنم لیا تھا جس کا نام شبینہ نے ضد کر کے احمد شاہ رکھا تھا۔ ان دنوں وہ احمد شاہ کے ساتھ اتنی مگن تھی کہ کالج میں داخلے کی خواہش بھی بھول گئی تھی لیکن سانول شاہ کو اپنا وعدہ یاد تھا ——— اور اس نے بابا سائیں اور چاچا سائیں کو کسی نہ کسی طرح منا ہی لیا۔

"بینا جلدی سے تیار ہو جاؤ تمہارا ایڈمیشن کروانا ہے، آج لیٹ ہو گئے تو سمجھو آج کا دن بھی ضائع ہو گیا۔" یہ سانول شاہ کی آواز تھی جو اسے جلدی تیار ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔

دلاور بھیا کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ اسے لے کر دوسرے گاؤں گئے ہوئے تھے جہاں ان کا میکا آباد تھا جبکہ زوار بھیا احمد شاہ اور بھابھی کو لے کر شمالی علاقہ جات کے سیر کو گئے تھے جبکہ بابا جان اور تایا جان زمینوں کے سلسلے میں مصروف تھے اور باقی رہ جاتا تھا سانول شاہ وہ بینا کو اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا اور اسی ہی وجہ سے اب اسے لے کر شہر کے کالج میں داخلہ کروانے لے جا رہا تھا۔

"اچھا بابا بس دو منٹ آ رہی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی سینڈل پہنتے ہوئے کہا اور اپنے گرد کالی چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر پورچ میں چلی آئی جہاں کار میں بیٹھا سانول اس کا منتظر تھا۔

پھر سانول شاہ نے شہر کے سب سے اچھے کالج میں اس کا داخلہ کرایا تھا اور وہ بہت خوش تھی۔ اس نے اپنے لیے سائنس چوز کی تھی اور سانول شاہ اس کے انتخاب پر بہت خوش ہوا تھا اب اس کا ٹیوٹر سانول شاہ تھا۔ شبینہ روز کالج سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتی اور پھر لان میں آ کر اپنی پسندیدہ جگہ پر بیٹھ جاتی اور پڑھائی میں مصروف ہو جاتی اور انہیں دنوں سانول شاہ بھی اپنی انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ شروع شروع میں شبینہ کو پڑھائی میں مشکل کا سامنا ہو رہا تھا لیکن پھر اب آہستہ سے سب ٹھیک ہوتا چلا گیا تھا۔ پر اب اسے اپنی پڑھائی کے لیے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ذہین تھی اور کچھ اسے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا دونوں چیزوں کی وجہ سے اس کی ہر مشکل آسان ہو گئی تھی پھر اک دن سانول شاہ اس کے پاس آیا تھا مٹھائی کا ڈبا لے کر۔ خوشی اس وقت سانول کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"یہ کس کے لیے ہے سانول شاہ۔" اس نے ہاتھ میں رس گلا پکڑ کر کہا۔۔۔ وہ حیران نظر آ رہی تھی۔

"میرا NED میں سلیکشن ہو گیا ہے یار اور میں یہ خبر سب سے پہلے اپنی سب سے اچھی دوست بینا کو سنانا چاہتا تھا۔" اس نے خوشی سے چہکتے کہا۔ کامیابی اور خوشی کی چمک نے اس کے چہرے کی خوب صورتی میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو آخر اللہ کے کرم سے کامیاب ہو ہی گئے۔۔۔ کب سے اسٹارٹ ہیں کلاسز؟" وہ بے اختیار خوش ہوئی تھی۔ وہ اس کی اول عمری کا ساتھی اس کی محبت اس کا سانول تھا اور اس کی کامیابی بینا شاہ کی ہی کامیابی تھی۔

"ان شاء اللہ جنوری سے۔ تم دعا کرنا اللہ یوں ہی

آگے کامیاب کرے۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

"آمین رب سوہنا تم کو ہر راہ میں کامیاب و کامران کرے شبینہ شاہ کی دعائیں سانول شاہ کے ساتھ ہمیشہ سے ہیں۔" اور پھر وہ چلا گیا تھا شہر قائد۔۔۔ کراچی۔۔۔ روشنیوں کے شہر۔۔۔۔ جہاں نئی راہیں نئی زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

زندگی کے شجر پر کئی موسم آئے گزر گئے۔ تین سال کا عرصہ کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا یونیورسٹی میں سانول شاہ کا 4th ایئر چل رہا تھا جبکہ شبینہ شاہ گریجویشن کے بعد اب کوکنگ کورس کر رہی تھی۔۔۔ شبینہ شاہ کو کتابوں سے عشق تھا۔ اب بس ایک شوق تھا کتابیں پڑھنا۔۔۔ اور سانول شاہ کو اس کے شوق کا پورا خیال تھا۔۔۔ سانول شاہ جب بھی شہر سے آتا تھا اس کے لیے مختلف بکس لاتا تھا جس میں ناولز اسلامی اور کوکنگ بکس شامل ہوتی تھیں اس کی زندگی اس کے خاندان کی دوسری لڑکیوں سے برعکس بہت الگ تھی کیونکہ اس کی زندگی میں سانول شاہ تھا جو اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا اور لڑنا بھی جانتا تھا۔۔۔ اگر یہ کہا جائے کہ شبینہ شاہ بے حد خوش نصیب تھی تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔۔۔ کیوں کہ تب تک اس کا نصیب سورج سا روشن اور چاند سا حسین تھا۔

تعلیم نے شبینہ کو آگہی کے نئے اسباق سے متعارف کروایا تھا۔۔۔ اور جیسے جیسے اسے شعور آتا گیا ویسے ویسے وہ اپنے گرد پھیلی جاہلانہ رسموں کو سمجھنے لگی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اس کے چاروں طرف جہالت کا تاریک جنگل پھیلا ہوا ہے۔۔۔ اور جس میں روز کسی نہ کسی کی زندگی رسموں کے نام پر قربان کر دی جاتی ہے۔۔۔ اپنے خاندان کی چلتی برسوں سے اک رسم قرآن سے نکاح جسے پہلے وہ کبھی جان سکی تھا اور نا ہی سمجھ سکی تھی لیکن اب اسے اس جہالت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے اسلام کا بہت اچھے سے مطالعہ کیا تھا مگر کہیں بھی اسے اس طرح کی رسموں کا حوالہ نہیں ملا تھا۔ وہ آواز اٹھانا چاہتی تھی ان رسموں کے خلاف مگر مجبور تھی اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت اس میں اب بھی نہیں تھی کیوں کہ وہ ایک کمزور اور بے بس لڑکی تھی۔ وہ بس اس پہ ہی شکر کرتی تھی کہ اس کی زندگی میں سانول شاہ تھا اور جب تک وہ تھا شبینہ شاہ کسی جاہلانہ رسوم کی بھینٹ نہیں چڑھ سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ بہت دنوں بعد حویلی آیا تھا؟ اور وہ نہیں جانتا تھا کہ گھر پہ کون سی قیامت اس کی منتظر ہے۔

وہ گھر میں جب داخل ہوا تو سب ہی ایک عجیب سی افراتفری میں پریشان اور بوکھلائے بوکھلائے پھر رہے تھے۔ خاموشی کو کوئی آواز توڑ رہی تھی تو وہ چچی جان کی سسکیوں کی آواز تھی۔ وہ چونکا تھا یہ سب دیکھ کر اور سن کر۔ اس کے دل کو فوراً کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ وہ سیدھا بابا جان کے پاس پہنچا تھا اور پھر جو خبر اسے بابا جان نے سنائی تھی اس خبر نے سانول شاہ کے ہوش ہی اڑا دیے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی اطلاع ملی تھی کہ نزار شاہ اور رفیعہ گاؤں سے شہر جاتے ایک بے حد حد خطرناک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو گئے تھے۔ رفیعہ بھابھی موقعے پر ہی دم توڑ گئی تھیں جب کہ نزار اسپتال لے جاتے راستے میں دم توڑ گئے۔ ان دونوں کے درمیان بہت محبت تھی وہ زندگی بھر کے ساتھی تھے اور موت نے بھی انہیں جدا نہیں کیا تھا۔ دلاور بھائی اور چچا جان ان دونوں کی ڈیڈ باڈیز لے کر آ رہے تھے جب کہ بابا تدفین کے انتظامات میں مصروف تھے۔

وہ شکستہ قدموں سے حویلی کے اندر زنان خانے میں آیا تھا۔ اس کی پہلی نظر چچی جان پہ پڑی تھی۔ انہیں بار بار غش پہ غش آ رہے تھے۔ جوان بیٹے بہو کا صدمہ ان سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ شبینہ اور نازیہ بھابھی دلاور شاہ کی بیگم انہیں سنبھالنے کی کوشش میں خود بے دم ہو رہی تھیں۔ شبینہ شاہ کی آنکھیں رو رو کے سرخ ہو چکی تھیں۔ جبکہ چچی جان

ایک بار پھر بے ہوش ہو چکی تھیں۔
وہ فوراً" آگے بڑھا تھا انہیں سنبھالنے۔ پانی کے چھینٹے مار کے انہیں وہ ہوش میں لایا تھا۔
ہوش میں آتے ہی پھر سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی تھی۔
"سانول پتر میرا زوار شاہ چلا گیا؟ میری رفیعہ چلی گئی۔ میرا احمد شاہ یتیم ہو گیا۔" وہ سانول سے لپٹ کر دھاڑیں مار کے رو رہی تھیں۔
"چچی جان پلیز سنبھالیں خود کو۔" وہ انہیں دلاسا دیتے بولا۔
"کیسے سنبھالوں میں خود کو۔ تم ہی بتاؤ کیسے سنبھالوں....؟" وہ ایک بار پھر سسک سسک کے رو پڑی تھیں۔
اور اس کے خود کے بھی تو آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ زوار شاہ سے وہ بھی تو بے حد محبت کرتا تھا۔ ایک بھائی دوست سب کچھ ہی تو تھا وہ سانول کا۔ لیکن اسے خود کو کمزور نہیں پڑنے دینا تھا۔ اسے سنبھالنا تھا خود کو۔ سب کی خاطر۔
زوار شاہ اور رفیعہ شاہ کے جسد خاکی سپرد خاک کر دیے گئے تھے۔ چچا سائیں یک دم بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ احمد شاہ جو ابھی محض پانچ برس کا تھا؟ ماں اور باپ دونوں کا ہی سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ معصوم تو پہلے بھی سنجیدہ تھا اب تو بالکل چپ ہی ہو گیا تھا۔
شبینہ شاہ نے اپنے بھتیجے کو گلے سے لگا لیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ احمد شاہ یتیم نہیں ہے۔ اس کی ماں بھی اب میں ہوں اور باپ بھی۔ میرے اکلوتے بھائی کی نشانی مجھے دنیا میں سب سے پیاری ہے۔ سب سے عزیز ہے۔ اور پھر شبینہ نے احمد شاہ کی پرورش میں خود کو بھی بھلا دیا تھا۔ احمد شاہ پہلے بھی اسے پیارا تھا مگر اب تو وہ اس کی زندگی بن گیا تھا۔ دو مہینے گزر چکے تھے اس سانحے کو اور شبینہ شاہ احمد شاہ میں اس قدر کھو چکی تھی کہ وہ یہ بھی نہ محسوس کر سکی کہ کچھ بدل گیا ہے؟ کچھ بدل رہا ہے۔ سانول شاہ بدل گیا تھا۔ سانول نے اس سے ایک لفظ بھی تسلی کا نہیں بولا تھا جب کہ اس پر اتنی بڑی قیامت گزر چکی تھی۔ محبت ہوتی ہی ایسی ہے جانے بوجھے ہم خوش فہمی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

انجینئرنگ کا آخری سال تھا جب سانول شاہ کی زندگی میں وہ آئی تھی جسے دیکھ کر اس کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا تھا۔ وہ بھی ایک عام سا دن تھا سورج کی تپش بھی روزانہ کی ہی طرح حدت سے بھرپور تھا ہوا بھی ویسی ہی نمی لیے ہوئی تھی مگر بس ایک اس کی آمد نے ہر چیز کا احساس بدل ڈالا تھا۔ رمشا شاہ محمد حسن کی اکلوتی لاڈلی بیٹی تھی.... اپنے کالج ٹور پر NED آئی تھی اور جس کو دیکھتے ہی سانول شاہ کا دل اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔ رمشا شاہ کی بادامی آنکھوں نے جانے کیسا سحر پھونکا کہ سانول شاہ سب کچھ بھول گیا اور رمشا شاہ جو آئی تو خالی ہاتھ تھی مگر جاتے جاتے پیر سانول شاہ کا دل لے گئی تھی۔ سانول کا چین و سکون تباہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کے دوست رمشا شاہ کے حوالے سے تمام معلومات اس کے پاس لے کے آگئے تھے۔ پھر ایک دن اس کی مراد بر آئی۔ وہ ڈالمین مال آیا ہوا تھا۔ کچھ شاپنگ کرنی تھی اسے۔ اور تب ہی سیکنڈ فلور پہ اسے رمشا حسن نظر آئی تھی۔ ہاتھ میں شاپنگ بیگز پکڑے اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی جس سے وہ باتیں کرتی چلی رہی تھی۔
وہ بے اختیار ایک لمحے کی دیر کیے بغیر اس کے پیچھے بھاگا۔
"ایکسکیوز می مس رمشا حسن۔" انداز ایسا تھا کہ اگر وہ آواز نہیں دے گا تو رمشا کھو جائے گی۔
رمشا اس کی آواز پہ پلٹی سانول کو دیکھتے اس کے چہرے پہ پہلے حیرت اور پھر شناسائی کے رنگ جھلملائے تھے۔
"اوہ.... سانول شاہ.... السلام علیکم۔" وہ خوش گوار حیرت سے اس سے مل رہی تھی۔
"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ رمشا۔" اس نے

خیریت دریافت کی۔

"جی الحمدللہ۔ میں اچھی ہوں۔" وہ شرارت سے بولی۔

"بے شک۔ اس میں کوئی شک نہیں۔"

"ان سے ملیے یہ میری کزن اور بھابھی بھی ہیں۔ فاطمہ۔ اور فاطمہ بھابھی یہ سانول شاہ ہیں۔ ان سے میری ملاقات NED میں ہوئی تھی۔" رمشا نے تعارف کا مرحلہ نپٹایا۔

"نائس ٹو میٹ یو بھابھی۔" سانول شاہ خوش اخلاقی سے مسکرایا۔

"رمشا اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم ایک کپ کافی ساتھ میں پی سکتے ہیں۔ اس کی کوشش تھی وہ رمشا کو اپنی نظروں کے سامنے سے اوجھل نا ہونے دے اس لیے جھٹ کافی کی دعوت دے ڈالی۔

"اوہ سوری لیکن مجھے کافی بالکل پسند نہیں لیکن۔ اگر آپ چاہیں تو ہم برگر کنگ سے نگٹس اور فرنچ فرائز ضرور کھا سکتے ہیں۔" وہ دوستانہ انداز میں مخاطب تھی۔

کافی سے انکار پہ سانول شاہ کے چہرے پر پھیلتے افسردگی کے رنگ شاید رمشا دیکھ چکی تھی۔ اس لیے اس نے سانول کو مایوس نہیں ہونے دیا تھا۔ اور سانول وہ تو فوراً" خوش ہوا تھا۔ وہ پہلی ملاقات جو اتفاق تھی محض آخری ثابت نہیں ہوئی تھی۔ رمشا کے چہرے پہ بکھرے دھنک کے رنگ سانول شاہ کو بتا گئے تھے کہ محبت کے اس سفر میں وہ اکیلا نہیں۔ رمشا بھی اس کی ہم سفر ہے۔

فوڈ کورٹ میں بیٹھے سانول شاہ نے اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے رمشا کو اپنے دل کا حال بھی بتا ڈالا تھا۔ پھر اس کے بعد ہونے والی ملاقاتوں میں سانول شاہ کو بھی رمشا نے اپنی محبت کا یقین دلا دیا۔

☆ ☆ ☆

"سانول آپ اپنے پیرنٹس سے کب بات کریں گے' بابا میری شادی کرنا چاہتے ہیں' اب آپ جلدی سے اپنے پیرنٹس سے بات کریں ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دوسرے کو کھو دیں۔" وہ دونوں آج کافی دنوں بعد ملے تھے جب رمشا نے اس سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ سانول شاہ پہلے ہی سے انگیجڈ ہے۔ ورنہ وہ کبھی اس سفر میں اس کی ہمسفر نا بنتی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی پریشانی سے بے خبر اسے اپنی پریشانی بتا رہی تھی۔

"تم ٹینشن نا لو یار' میں آج ہی حویلی جا کے بات کرتا ہوں تم پریشان نا ہوا کرو تم پیر سانول شاہ کی محبت ہو اور سانول شاہ کو اس کی محبت سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" اس نے پریقین لہجے میں کہا تھا اور رمشا قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔

رمشا شاہ اگر سانول شاہ پہ آنکھیں بند کر کے یقین کرتی تھی تو یہ یقین اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ سانول کی محبت تھی ہی ایسی خالص اور شدید۔

رمشا کو حاصل کرنے کے لیے سانول شاہ ہر حد سے گزرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ اس کی محبت نے سانول کے ارادوں کو مزید جلا بخشی تھی اور اگر سب خاکستر کر کے بھی اسے رمشا کو حاصل کرنا پڑتا تو وہ کر گزرتا۔ وہ سانول شاہ تھا۔ اپنے حق سے دستبردار ہونا اور کمپرومائز کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

آج احمد شاہ کے ماموں اس سے ملنے آئے ہوئے تھے اور ساتھ ڈھیر سارے گفٹس لائے تھے' وہ شدید محبت کرتے تھے احمد سے' اپنی لاڈلی بہن کی اکلوتی نشانی سے انہیں بہت پیار تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے احمد شاہ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اور اسی وجہ سے شبینہ شاہ نے احمد شاہ کا بیگ بھی تیار کر دیا تھا۔ احمد شاہ کی جدائی کا سوچ کر ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے' اپنے اکلوتے بھتیجے میں اس کی جان تھی۔ اور ویسے بھی شبینہ شاہ تو سراپا محبت اور ایثار تھی۔ بے حد حساس۔ بھائی بھابھی کی موت کے بعد وہ مسکرانا بھول گئی تھی مگر اس کے باوجود اس نے بھی اپنے بھتیجے اور

ماں باپ کو اداس نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ عام لڑکی نہیں تھی وہ تو بہت خاص اور محبت کرنے والی لڑکی تھی۔

"پھوپھو جانی آپ کیوں رو رہی ہیں؟" پانچ سالہ احمد نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرا شہزادہ پہلی بار مجھ سے دور جا رہا ہے نا' اسی لیے آنکھوں میں آنسو آگئے۔" اس نے احمد شاہ کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ روئیں گی تو پھر میں نہیں جاؤں گا' میں ابھی ماموں جان کو منع کرکے آتا ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا تھا۔ خود اسے بھی تو پھوپھو جانی سے بے حد پیار تھا۔

"ارے نہیں میری جان... آپ جاؤ! اور خوب انجوائے کرنا۔" اس نے ایک بار پھر اسے پیار کیا اور انگلی پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ دروازے میں کھڑے سانول شاہ جو کہ شبینہ شاہ کو رشتے پہ انکار کرنے کی درخواست کرنے آیا تھا نے یہ منظر خاموشی سے دیکھا تھا اور پھر اس کے ذہن میں ایک شاندار منصوبہ بنا تھا۔

"بابا جان' چچا جان' آپ چاہتے ہیں نا کہ میں شبینہ سے شادی کرلوں تو میں تیار ہوں' لیکن میری... ایک شرط ہے۔" اس وقت وہ دلاور شاہ' چچا جان اور بابا جان کے سامنے بیٹھا تھا۔ آج ان سب نے اس سے رشتے کی بات کرنے بلایا تھا اور جس کے جواب میں سانول نے اپنی شرط رکھ دی تھی۔

"شرط؟ کیسی شرط؟" وہ دونوں چونکے۔

"میں شبینہ کے ساتھ احمد شاہ کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا' اسے مجھ سے شادی کرنے کے لیے احمد شاہ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ چاہیں تو آپ احمد کو اس کے ماموں کے حوالے کردیں چاہیں تو اپنے پاس' لیکن شادی کے بعد میں اور میری بیوی یہاں نہیں رہیں گے اور نا ہی احمد کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔

پھر سب نے اسے بہت سمجھایا تھا' لیکن اس کا فیصلہ نہیں بدلا تھا۔ بدلتا بھی کیسے اس کے پاس تو بس یہ ہی راستہ تھا اسے تو شبینہ سے شادی کرنی ہی نہیں تھی۔ اس نے شبینہ کو ہمیشہ ایک کزن اور دوست کی حیثیت سے دل میں جگہ دی تھی۔ محبت تو اسے رمشا شاہ سے تھی۔ شبینہ کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے رویے میں آنے والا بدلاؤ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ وہ عزیز از جان رشتوں میں سے ایک کو چننا مشکل ہی نہیں جان لیوا تھا۔ چند دنوں بعد احمد شاہ بھی واپس آگیا تھا۔ اسے بھی اس بات کی خبر تھی کہ اس کے پیارے چاچو سانول شاہ اس سے اس کی پھوپھو کو چھین رہے ہیں۔

"احمد چندا' آپ اتنی جلدی کیوں واپس آگئے' ماموں کے گھر مزا نہیں آیا میری جان کو؟" وہ اس کی گود میں سر رکھ کے لیٹا ہوا تھا جب اس نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"مزا آیا تھا' بہت سارا آیا تھا' لیکن آپ میرے بنا اکیلی ہوگئی تھیں اور اداس بھی اس لیے میں ضد کرکے واپس آگیا۔" وہ محبت سے پھوپھو کو دیکھتے بولا۔

"اچھا آپ کو کس نے بتایا کہ میں اکیلی ہوگئی ہوں اور اداس بھی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میرے دل نے۔" اس نے اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور اس کی معصومیت پہ اسے ڈھیروں پیار آیا۔

"پھوپھو جانی ایک بات پوچھوں آپ خفا تو نہیں ہوں گی؟" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"آپ کی پھوپھو جانی آپ سے کبھی خفا نہیں ہوسکتی چندا جو پوچھنا ہے پوچھو۔"

"سانول چاچو کہہ رہے تھے کہ آپ مجھے چھوڑ کے ان کے ساتھ بہت دور چلی جائیں گی۔"

"پھر آپ نے کیا کہا ان سے چندا؟"

"میں نے کہا آپ جھوٹ بول رہے ہیں' میری پھوپھو بہت اچھی ہیں وہ مجھے چھوڑ کے نہیں جاسکتیں۔"

"میں نے ٹھیک کہا نا پھوپھو؟" وہ اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جی ٹھیک کہا آپ نے، میں آپ کو چھوڑ کے کبھی کہیں نہیں جاؤں گی۔" اس نے روتے ہوئے اسے گلے لگالیا۔

☆ ☆ ☆

"سانول شاہ، مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے اگر آپ کے پاس ٹائم ہو تو۔" وہ لان میں بیٹھا چائے پی رہا تھا جب وہ آئی تھی۔

"ہاں بیٹھو، کہو کیا کہنا ہے، کھڑی کیوں ہو؟" آج بہت عرصے بعد وہ اپنے پرانے لہجے میں بات کر رہا تھا۔

اس کے انداز نے شبینہ شاہ کو ہمت دی۔

"سانول آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں، آپ جانتے ہیں میں احمد کے بغیر نہیں رہ سکتی پھر یہ شرط کیوں رکھی آپ نے۔" اس نے نم لہجے میں کہا تھا۔

اس میں کیا مشکل ہے، احمد کو نہیں چھوڑ سکتی تو مجھے چھوڑ دو۔" اس نے آسانی سے کہا تھا۔

"میں محبت کرتی ہوں آپ سے سانول، بچپن سے اب تک آپ کا نام میرے ساتھ رہا ہے، اب کیسے چھوڑ دوں، آپ ایسے نہیں تھے سانول، آپ بدل گئے ہیں۔" وہ رو دی تھی۔

"محبت سو واٹ، میں نہیں کرتا تم سے محبت اور چھوڑ میں نہیں رہا فیصلہ تمہارے ہی ہاتھ میں ہے۔" اس نے سفاکی سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں اگر آپ سے میری شادی نہیں ہوئی تو میری ساری زندگی، زندہ درگور ہو جائے گی۔ مجھے جاہلانہ رسومات کی بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔"

"زندہ درگور... نہیں مجھے نہیں لگتا ایسا ہوگا بلکہ تمہارا رتبہ بڑھ جائے گا، ہر کوئی تمہارے فیصلوں کا محتاج ہوگا، کوئی تمہارے سامنے سر نہیں اٹھا سکے گا۔ تم کمزور نہیں رہو گی، بلکہ پاور تمہارے ہاتھ میں رہے گی۔"

"تمہیں گنوا کے مجھے کوئی پاور، کوئی طاقت نہیں چاہیے سانول۔" وہ آنسوؤں سے ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔

"تو ٹھیک ہے، احمد کو چھوڑ دو پھر۔" وہ جذبات سے عاری لہجے میں کہہ کر چلا گیا۔

وہ شخص جو ہمیشہ سے اس کا تھا اب اس سے دور جا رہا تھا۔ کہنے کو فیصلہ اس کے ہی ہاتھ میں تھا، مگر درحقیقت اس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسل گیا تھا اور وہ خود اس داسی کی طرح ہو گئی تھی جس نے ساری عمر اپنے دیوتا کو منانے میں صرف کر دی تھی اور پھر اسے پتا چلا دیوتا تو اس کا تھا ہی نہیں اس کا سفر تو محض ایک سراب نکلا۔ وہ تو مجھ سے محبت کرتا ہی نہیں ہے... وہ تو کسی اور راہ کا مسافر ہے... اگر میں اس کے لیے سب کچھ چھوڑ دوں تب بھی وہ میرا نہیں ہو سکتا... اس کی منزل تو تب شاید کوئی اور ہی ہے... میری جگہ بہت پہلے ہی کسی نے لے لی ہے... زندگی میں تنہا ہونا کیا ہوتا ہے شبینہ شاہ نے تب جانا تھا۔ مشکل سے ہی صحیح، مگر پھر شبینہ شاہ نے ایک فیصلہ کر ہی لیا تھا اور اب وہ کچھ مطمئن تھی۔ اس نے احمد شاہ کو نا چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا اور سانول شاہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

سب بہت پریشان تھے۔ اماں جی پہلے بیٹے کی جدائی اور اب بیٹی کی بربادی کا غم برداشت نہ کر سکی تھیں اور ایک شام خاموشی سے خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ شبینہ پہ یہ خبر قیامت بن کے ٹوٹی تھی۔ ابھی بھائی کا غم کم نہ ہوا تھا کہ جان سے پیاری ماں بھی چھوڑ کر چلی گئی، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اسے خود کو سنبھالنا ہی تھا۔ اب اسے اپنے آنسو خود صاف کرنے تھے۔ اسے اپنا سہارا خود بننا تھا۔ اس دن ایک مضبوط اور بہادر شبینہ شاہ نے جنم لیا تھا۔

اس شام اماں کے چالیسویں پہ سب مہمان آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگے۔ سانول شاہ بھی کراچی جانے کے لیے نکل رہا تھا تب ہی شبینہ شاہ نے آخری بار اس ستمگر کو پکارا تھا۔

"سانول شاہ۔" سانول نے پلٹ کر شبینہ کی طرف دیکھا اور عجلت میں گویا ہوا۔

"ہاں بولو جلدی، کیا کام ہے، میرے پاس وقت

نہیں ہے' تمہارے پاس پانچ منٹ ہیں' جو کہنا ہے کہہ لو۔" اور وہ جو بہت کچھ کہنا چاہتی تھی اس نے آنکھوں سے بس آنسو نکلے تھے' وہ جو بھی اس کی آنکھوں میں ایک آنسو دیکھ کر تڑپ اٹھتا تھا آج اس کے آنسو اس کو کوفت میں مبتلا کر رہے تھے۔

وہ تین منٹ تک روتی رہی تھی اور پھر کہا بھی تو بس اتنا کہ "اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں نے اپنی محبت تمہیں معاف کی' تمہاری محبت پہ خود کو قربان کیا۔ جاؤ جی لو اپنی زندگی سانول۔۔۔" وہ چلی گئی تھی بس اتنا کہہ کر۔ اور پہلی بار اس نے بات ختم کی تھی پہلی بار سانول کے دل نے شبینہ کے لیے کچھ الگ سا محسوس کیا تھا وہ کتنی ہی دیر تک گم سم سا کھڑا رہا تھا۔ کچھ بے حد قیمتی شے کھونے کا احساس ہو رہا تھا۔ جب کہ اپنی اپنی کیفیت میں مگن وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ کونے میں کھڑا احمد شاہ یہ منظر ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن میں محفوظ کر رہا تھا۔ اس کے دل میں سانول شاہ کے لیے نفرت ہی نفرت بھر گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اور پھر محض بیس سال کی عمر میں اس کا نکاح قرآن سے کردیا گیا تھا۔ پتا نہیں اس کا نکاح کرا گیا تھا یا اسے زندہ درگور کیا گیا تھا۔ سرخ رنگ کے قیمتی جوڑے میں سونے اور ہیرے کے بیش قیمتی زیورات پہنے کسی بھی قسم کے میک اپ کے بغیر بھی شبینہ شاہ بے حد حسین لگ رہی تھی اس کا چہرہ چاند کو مات دے رہا تھا۔ وہ رخصت ہو کر اس ہی کمرے میں آئی تھی جس کمرے سے ایک عرصے تک وہ خوف زدہ رہی تھی۔ اس کی بے بسی کو کوئی محسوس کرتا تو سینہ درد سے بھر جاتا' مگر سب ہی ایک دوسرے سے نگاہ چراتے پھر رہے تھے۔ سب کی آنکھوں کا تارا تھی وہ۔

بابا جان اور تایا جان کے درمیان فاصلہ آگیا تھا' وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے نگاہ ملانے سے قاصر تھے۔ گھر بھر کی جان' رونق پھیلاتی' لاڈلی شبینہ کو ناچاہتے ہوئے بھی اس ظالم رسم کی بھینٹ چڑھا دیا گیا جو ان کے خاندان میں برسوں سے چلی آرہی تھی۔ پہلی بار ان سب کو اپنی یہ رسمیں یہ رواج برے لگے تھے' جس نے ایک ہنستی بستی لڑکی کی زندگی اجاڑ دی تھی۔ بہن کی چیخیں نظر انداز کرنے والے بھائیوں کی جب اپنی بیٹی خاموشی سے اس خوب صورت قبر میں قید ہوئی تو ان کا سینہ درد اور تکلیف سے شق ہو گیا۔ اس خاندان کی روایات تھیں کہ اگر کسی لڑکی کا رشتہ خاندان میں نہ ہوتا یا ٹوٹ جاتا' اس کا نکاح قرآن سے کردیا جاتا تھا۔ اور اس لڑکی کی ساری زندگی ایک کمرے میں اللہ کی عبادت میں گزرتی تھی۔ اور اب یہ روایت شبینہ شاہ کو نگل گئی تھی۔

تایا جان نے سانول شاہ سے قطع تعلق کرلیا تھا جب کہ سانول شاہ نے شہر آکر رمشا حسن سے شادی کرلی تھی۔ محمد حسن' سانول سے بہت متاثر ہوئے تھے اور پھر اکلوتی بیٹی کی خواہش سے ہار کر انہوں نے سانول شاہ کو اپنا داماد بنالیا تھا۔

"ہم حویلی کب جائیں گے سانول۔۔۔" ان کی شادی کو ایک مہینہ گزر گیا تھا جب رمشا نے سانول شاہ سے یہ پوچھا تھا۔

"کبھی نہیں۔" اس نے صاف انکار کردیا تھا۔ "اب ہماری دنیا یہی ہو' سمجھ لو میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔"

"آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" وہ چونکی۔

"تم سے شادی میں نے اپنی کزن کو ٹھکرا کر کی تھی اور کزن بھی وہ جو ہماری حویلی میں سب کی لاڈلی تھی' میرے رشتہ توڑ دینے پہ اس کا نکاح قرآن سے کردیا گیا تھا اور بابا جان نے مجھے حویلی سے نکال دیا تھا۔"

"کیا؟ تم پہلے سے انگیجڈ تھے؟ تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی' او خدایا یہ مجھ سے کیسا جرم سرزد ہو گیا؟ میں نے اپنی خوشیوں کی خاطر کسی کے ارمانوں کا خون کردیا' سانول آپ اتنے سنگدل کیسے ہوسکتے ہیں؟" سانول کی بات نے رمشا شاہ پہ بجلیاں گرادی تھیں۔ تکلیف اور ندامت نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا' شرمندگی تھی کہ بڑھتی جارہی

تھی اور اس تکلیف میں اضافہ تب ہوا تھا جب بابا جان کی اچانک طبیعت خراب ہونے پہ وہ حویلی پہنچے تھے۔ بابا جان نے ان کو معاف کرتے ہوئے حویلی میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ ان کی حالت بہت خراب تھی، اپنی لاڈلی کے غم میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور تب ہی ایک دن وہ دنیا کے دکھوں سے نجات حاصل کر کے اپنے اگلے سفر کو سدھار گئے اور تب شبینہ شاہ ان کے آخری دیدار کے لیے اپنے کمرے سے باہر آئی تھیں اور وہ آنسو جو سانول کے جانے کے بعد اس کی آنکھوں میں پتھر ہو چکے تھے وہ بند توڑ کر اس کی آنکھوں سے نکل پڑے تھے۔ وہ دل کھول کے روئی تھی۔ رمشا اس کا درد اپنے سینے میں محسوس کر رہی تھی، وہ اس کو دیکھ کر حیران تھی، وہ لڑکی تو حسن اور خوب صورتی کی مثال تھی، ملائی سی رنگت، جھیل سی گہری آنکھیں اور پلکوں کی گھنی باڑ، موتیوں سے دانت، رمشا شاہ کو اس کے سامنے اپنا آپ بہت ہلکا محسوس ہوا اور سانول نے اسے ٹھکرایا تھا۔

محبت رنگ و نسل نہیں دیکھتی، دیکھتی ہوتی تو شبینہ شاہ آج اجڑی اور ویران نہ ہوتی۔۔۔ محبت تو بس کسی شکنجے کی طرح ہمارے وجود کو اپنے حصار میں قید کر لیتی ہے اور پھر ہم لاکھ کوشش کریں ساری عمر خود کو اس سے آزاد نہیں کرا سکتے۔"

وہ لوگ اب مستقل حویلی میں رہائش پذیر تھے، ہر گزرتے دن کے ساتھ رمشا کے احساس جرم میں اضافہ ہو رہا تھا، وہ خود کو شبینہ کی خوشیوں کا قاتل سمجھ رہی تھی اور رمشا کا جب بھی شبینہ سے سامنا ہوتا وہ مسکرا کے ملتی، وہ بہت اعلا ظرف تھی، شبینہ شاہ اپنی خوشیوں کے قاتل کے لیے ہی دعا کرتی تھی۔

شادی کے دو سال بعد رمشا شاہ نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا، لیکن خود اپنی زندگی ہار گئی۔ اس دن سانول شاہ پھوٹ پھوٹ کے رویا تھا، اسے اس دن احساس ہوا تھا کہ محبت کو کھونا کیسا ہوتا ہے، اپنی زندگی ہار دینا کیسی تکلیف دیتا ہے، اسے شبینہ کی تکلیف کا احساس ہوا تھا، جب کوئی اپنا چھوڑ جاتا ہے تو زندگی ایک سزا لگتی ہے۔ جینے کی وجہ ختم ہو جاتی ہے اپنا ہونا بھی کسی سزا سے کم نہیں لگتا۔ اپنا وجود زندہ لاش لگنے لگتا۔ دل ویران تپتا صحرا بن جاتا ہے جس میں ہر وقت یادوں کے بھانبڑ جلتے ہیں۔ اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ رمشا کی نشانی در شہوار کے لیے، وہ غرور طنطنہ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا کہیں ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔ اب اس کا عروج رخصت ہو چکا تھا شاندار شخصیت ڈھے چکی تھی اب بس پرانی یادوں کے نشان تھے۔

☼ ☼ ☼

چند آرزوئیں

حسرتوں کے کچھ مزار

موت سے وقتی فرار

اور کیا ہے زندگی۔۔۔

اور پھر شہوار بی ایس سی کے آخر سال میں تھی جب یہ خبر شہوار شاہ کے اوپر بلاسٹ بن کر گری تھی۔ اور اس کا وجود دھجیوں میں بکھر گیا تھا۔ جسم سے جان نکلنا کسے کہتے ہیں کوئی شہوار شاہ سے پوچھتا۔ مخدوم شاہ جو کہ شہوار کا منگیتر ایک حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ شہوار کی زندگی کی جوت بھی مخدوم شاہ کی صورت کے ساتھ ہی بجھ گئی تھی۔ وہ کون سے ناکردہ گناہ تھے جن کی سزا خدا اسے دے رہا تھا۔ اس کی زندگی میں خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا اور جو تھوڑا بہت سکون تھا وہ مخدوم کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا اور اللہ آدمی سے ان کے گناہوں کا اس کے ظلم کا بدلہ ضرور لیتا ہے۔ اللہ کے گھر دیر تو ہو سکتی مگر اندھیر نہیں۔۔۔ ظالم کو اپنے ظلم کا حساب دینا ہی ہوتا ہے۔

آج بیس سال بعد تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرانے جا رہی تھی۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ کل ظلم کرنے والا سانول شاہ تھا اور آج ظلم سہنے والی اس کی لاڈلی نور نظر تھی۔ آپ ظلم کرتے وقت کیسے بھول جاتے ہو کہ آپ کے ظلم بھلا دیے جائیں گے۔ دنیا کی عدالتوں میں تو ناانصافی ہو سکتی مگر اللہ کی عدالت میں کبھی بھی نہیں۔ آج ایک اور بچی نام نہاد رسم کے نام پر قربان کی

جارہی تھی اور سانول شاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اسے اس ظلم سلوک سے بچاسکے۔ وہ جان گئے تھے یہ قدرت کا انصاف تھا اور ان کے گناہوں کی سزا جواب ان کی بیٹی کو بھگتنی تھی۔

کون کہتا تھا کہ معاشرہ بدل چکا ہے وقت بدل چکا ہے۔ بیٹیاں کل بھی دفنائی جاتی تھیں بیٹیاں آج بھی دفنائی جاتی ہیں' کبھی عزت کے نام پہ تو کبھی نام نہاد روایات کے نام پہ' بس طریقے بدل گئے تھے' وقت وہی تھا۔ احمد شاہ اس وقت اپنی عزیز از جان پھوپھو کے پاس بیٹھا تھا جب اسے ملازم کی زبانی اس ظلم کی خبر ہوئی اور وہ طنزیہ ہنس دیا تھا۔

"پھپھو' وقت اپنا آپ دہرا رہا ہے' کل جو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا آج ان کی بیٹی کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

"احمد شاہ! یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو' اگر شہوار کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی تب بھی تم یہی کہتے' مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔" شبینہ شاہ احمد شاہ کی بات کاٹتے ہوئے بولی تھیں۔

"پھپھو جان میری بہن کیا' اگر شہوار کی جگہ زرینہ یا امینہ بھی ہوتیں تو میں یہ برداشت نہ کرپاتا' لیکن یہاں بات شہوار کی ہے اور میں سانول شاہ سے جڑے ہر رشتے سے نفرت کرتا ہوں۔" وہ نفرت سے بھرپور لہجے میں بولا۔

"مت کرو ایسی بات احمد شاہ! تم میری تربیت کو ذلیل و رسوا کر رہے ہو' ایسی باتیں کرکے اپنے آپ کو مت گراؤ میری نظروں میں۔" وہ ناراض ہوئی تھیں۔

"آپ بھول گئیں' لیکن میں نہیں بھولا ہوں پھپھو' ایک ایک لفظ یاد ہے مجھے جو انہوں نے کہا۔"

"جب ہمارے نبی نے عفو و درگزر کا سبق دیا ہے تو ہم ان کے امتی کیوں بدلہ لینے کا سوچتے ہیں' اگر تمہارا علم تمہیں معاف کرنا نہیں سکھاتا تو کیا فائدہ ایسے علم کا' برائی بدلہ لینے میں نہیں معاف کرنے میں ہے' اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو جاؤ اور روک لو وہ ظلم جو اس معصوم پہ ہو رہا ہے' روک لو احمد شاہ' ایک اور شبینہ شاہ زندہ درگور ہو جائے گی' بچالو اسے۔" وہ رو دی تھیں۔

"آپ جانتی ہیں اسے بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔"

"نکاح۔"

"ہاں میں جانتی ہوں اور اس لیے ہی تم سے کہہ رہی ہوں روک لو یہ سب۔ تمہیں اپنی قسم دیتی ہوں کہ اپنا لو درشہوار کو احمد شاہ' اپنا لو۔ اس بچی نے ساری زندگی اس جرم کی سزا کاٹی ہے جو اس نے کیا ہی نہیں اب اور نہیں۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ان کے انداز میں التجا تھی اور احمد شاہ کے لیے شبینہ شاہ کی ہر بات حکم کا درجہ رکھتی تھی' پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ انکار کرتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ان کے حکم پہ سر جھکا دیا تھا۔ اس شخص کی بیٹی کو اپنی عزت بنالیا تھا جس سے وہ شدید نفرت کرتا تھا۔ یہ سب قدرت کے فیصلے تھے۔ انوکھے اور نرالے' مگر حکمت سے بھرپور۔ وہ انسان ہوتے ہیں جو کسی کے جرم کی سزا کسی اور کو دیتے اللہ تو بہت بڑا انصاف کرنے والا ہے وہ غلط فیصلے نہیں کرتا۔

اور پھر قرآن کے سائے میں درشہوار سانول شاہ کو احمد شاہ کے سنگ رخصت کردیا گیا۔ زندگی بڑی ناقابل اعتبار شے ہے' اس میں وہ کچھ ہو جاتا ہے۔ جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ سانول اچھی طرح سے جانتے تھے کہ احمد شاہ ان سے اور درشہوار سے کتنی نفرت کرتا ہے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ نفرت بے سبب نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے اس کی پھپھو اور اس کے ساتھ ماضی میں کیا تھا اس کے بعد وہ اس نفرت کے حق دار تھے۔

"کانٹوں کے بیج بو کے اگر کوئی گلاب کی امید کرتا ہے تو اس سے احمق اور کوئی نہیں ہوتا۔" احمد شاہ نے آج ان کی بیٹی کی زندگی پہ جو احسان کیا تھا نہ جانے اس کا صلہ وہ کیسے وصول کرنے والا تھا۔ زندگی میں آنے والی مشکلات کا انہیں اندازہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

دسمبر کے آخری دن تھے سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دور تک پھیلی دھند کو دیکھ کر اسے اپنی زندگی کا گمان سا ہوا تھا۔ اس کی اپنی زندگی بھی ایسی ہی ہوگئی تھی۔۔۔ تاریک اور غیر واضح۔

آج اس نے پھپھو جان کی خاطر شہوار سانول شاہ کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا تھا' لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ اسے زندگی میں کبھی بھی اس کا جائزہ مقام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ چاہتا تو بھی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنے اہم منصب پہ فائز ہونے والی لڑکی سے نہ تو اسے کوئی انسیت تھی اور نہ ہی لگاؤ۔ اس کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا اب تہس نہس کردے۔ اسے آج بھی وہ وقت یاد تھا جب سانول شاہ اس کی پھپھو جان اور ان کی محبت کو ٹھوکر مار کر چلا گیا تھا۔ اس انسان نے اس کی پیاری پھپھو کی زندگی کو جہنم بنایا تھا۔ وہ کبھی معاف نہیں کرسکتا تھا نہ ہی بھول سکتا تھا۔ کیسے بھول جاتا ان اذیت ناک لمحوں کو۔ پھوپھو کی خالی اور تنہا زندگی کو فراموش کرنا۔ کہاں اتنا آسان تھا۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ صوفے پہ بے خبر سو رہی تھی۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا' وہ جو اس گمان میں تھا کہ جب وہ کمرے میں جائے گا تو وہ دلہن بنی گھونگھٹ میں بیٹھی ملے گی تو ایسا کچھ نہ تھا۔

"ہنہ تو محترمہ پہلے سے ہی اپنی اوقات جانتی ہیں۔۔۔ اچھی بات ہے' بہت اچھی۔۔۔" اس نے تنفر سے سوچا اور فریش ہونے چلا گیا وہ گرم پانی سے غسل کرنے کے بعد جب کمرے میں آیا تو قدرے اچھا اور پرسکون محسوس کررہا تھا۔ تولیے سے بال سکھاتے اس کی نظر بے اختیار صوفے پہ سوئی شہوار کی طرف اٹھی تھی۔ کتنی اچانک وہ اس کی زندگی میں آگئی تھی اور اب اس ہی کے کمرے میں پرسکون سی سو رہی تھی۔ وہ ٹرانس میں چلتا اس تک آیا تھا۔ وہ سوتے ہوئے بہت معصوم لگ رہی تھی۔ اگر وہ سانول شاہ کی بیٹی نہ ہوتی تو وہ اس پہ فخر محسوس کرتا۔ وہ پریوں سی حسین تھی اور سب سے بڑھ کر اس کی معصومیت۔ اس کی پاکیزگی اس کی سنجیدگی سب کچھ ہی اس میں خاصہ تھا۔۔۔ لیکن سارا مسئلہ ہی یہی تھا کہ وہ سانول شاہ کی بیٹی تھی۔ اگر وہ سانول شاہ کی بیٹی نہ ہوتی تو آج اس اچانک ہونے والی شادی کو بھی وہ دل سے تسلیم کرچکا ہوتا۔ احمد شاہ کی دل کی سلیٹ بالکل صاف تھی اور اگر حالات نارمل ہوتے تو اس کی زندگی کے ساتھ دل پہ بھی شہوار کا نام لکھا جاچکا ہوتا' مگر حالات نارمل نہیں تھے۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ بالکونی میں کھڑی دھوپ سینک رہی تھی۔ وہ اس کو نظرانداز کرکے فریش ہونے کے لیے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو ناشتا ٹیبل پہ لگا ہوا تھا۔ وہ جب نہانے گیا تھا تو تب ہی ملازمہ رکھ گئی تھی۔ وہ ناشتا کرنے نہیں آئی وہیں بالکونی میں کھڑی رہی نہ ہی اس نے بلایا تھا وہ اب بھی بالکونی میں اسی پوزیشن میں کھڑی تھی۔

"لگتا ہے مرحوم منگیتر کی یاد بڑی شدت سے آرہی ہے۔" طنز کرنا اس کی عادت نہ تھی' لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی وہ طنز کرگیا تھا۔ وہ ایک دم سے جھٹکا کھاکے مڑی اور سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا' لیکن بولی کچھ نہیں۔۔۔ وہ اگر تیر چلانا جانتا تھا تو شہوار بھی برداشت کرنا جانتی تھی۔

"اے سنو! ادھر آؤ تم۔" احمد شاہ کو اس کا نظرانداز کرنا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ اس لیے سختی سے بولا تھا۔ اس بار بھی وہ بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے سامنے آکے کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"میں نے بیٹھنے کا کہا تھا کیا' چپ چاپ کھڑی ہوجاؤ۔" وہ چلا کے بولا تھا اور وہ خفت زدہ ہوکے فوراً کھڑی ہوگئی۔

"اور اب جو میں بول رہا ہوں کان کھول کے سن لو میں بات دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ یاد رہے۔" وہ طیش سے بولا۔۔۔ اسے شہوار کا سہا ہوا انداز اچھا لگ رہا تھا۔

"صبح تم اٹھ کر سب سے پہلے میری پھپھو جان کی

خدمت کروگی ان کی کسی بات سے کبھی انکار کیا تو سمجھو اس دن تمہاری خیر نہیں ہے۔ حویلی میں کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کروگی ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ بلا ضرورت تمہیں تم کمرے سے باہر نہ ملو' پھپھو جانی کی دیکھ بھال آج سے تمہاری ذمہ داری ہے' دادا جان کا ہر طرح سے خیال رکھوگی۔ صبح دوپہر اور شام کا کھانا بنانا تمہاری ذمہ داری ہوگی۔ ملازموں کو میں آج ہی ساری ڈیوٹی سمجھادوں گا اور خبردار اگر تم کبھی میری پھپھو جان کے سامنے اونچا بولنے کی کوشش کی اور سب سے اہم بات اب تم اپنے باپ سے کوئی تعلق نہیں رکھوگی' سمجھو وہ تمہارے لیے مرچکا۔ تم اب میری بیوی ہو یعنی اب تم درشہوار احمد شاہ ہو اور تمہارا تعلق' تمہاری محبت' تمہاری نفرت سب میری مرضی سے ہوگا۔ باقی رہا میں تو میری طرف سے تم پہ کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔ سوائے اس کے کہ میری فیملی کو خوش رکھوگی۔ آج ہمارے ولیمے کی تقریب ہے' یہ لو پہن کے تیار ہوجانا۔" تمام احکامات دیتے ہوئے ایک خوب صورت جوڑا اس کی طرف اچھالا۔

آخری بات' میری زندگی میں تمہاری اہمیت صرف اتنی ہے کہ تم میری پھپھو جان کی خواہش ہو' اس کے سوا کچھ نہیں۔ یاد رکھنا تم۔" وہ انگلی اٹھا کے یاددہانی کراتے ہوئے بولا۔

"جی یاد رکھوں گی یہ صرف ایک احسان عظیم تھا مجھ پر جس کی قیمت مجھے ساری زندگی چکانا ہوگی۔" وہ سرد لہجے میں کہتی روم سے نکل کر اسٹڈی میں چلی گئی۔ اور وہ غصے سے دروازہ گھورتا رہ گیا تھا۔ دل تو چاہا رکھ کر چماٹ لگادے مگر یہ سب اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ عورت پہ ہاتھ کمزور مرد اٹھاتے ہیں اور وہ کمزور تو نہیں تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ سی گرین شرارے میں نفاست سے کیے گئے میک اپ میں بے حد حسین لگ رہی تھی' ولیمہ کی تقریب میں اس کے باپ کے علاوہ سب موجود تھے

امینہ اور زرمینہ سفید کامدار فراک پہنے کسی ریاست کی شہزادیاں لگ رہی تھیں۔ بہت سی نظروں نے انہیں سراہا تھا۔ سب خوش تھے سوائے دلاور شاہ' احمد شاہ اور شہوار شاہ کے۔ دلاور شاہ کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ وہ احمد شاہ کو اپنا داماد بنانا چاہتے تھے۔ ولیمہ کی تقریب شان دار طریقے سے اختتام پذیر ہوئی اور وہ واپس شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کے جانے کے بعد شہوار نے سکون کا سانس لیا تھا۔ صوفے پہ اتنے دن سو سو کر کمر ہی اکڑ گئی تھی اب اس کے جانے کے بعد یہ شاندار کمرہ شہوار کا تھا۔ وہ ایمانداری سے سوچتی تو اس کی زندگی پہلے سے بہت بہتر ہوچکی تھی۔ شبینہ پھپھو اور دادا سائیں دونوں ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ اور احمد شاہ کے حوالے سے سب ہی عزت کرتے۔ احمد شاہ کا کمرہ ہر آسائش سے مزین تھا۔ اب اس کا وقت پہلے سے بہتر گزرتا تھا۔

اس کی صبح بی بی جان کو سلام کرکے ہوتی تھی۔ وہ بہت اچھی تھیں' بہت محبت کرنے والی' اس کا زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزرتا تھا' اسے ایک دم سے ہر چیز اچھی لگنے لگ گئی تھی۔ جس کی اسے اتنے سالوں سے تلاش تھی وہ پیار کرنے والی گود اسے شبینہ شاہ کی چھاؤں میں مل گئی تھی۔ ان کے ساتھ نے شہوار کے اندر کی تلخی کو بہت کم کردیا تھا' اسے وہ اچھی لگتی تھیں سراپا محبت' جبکہ دادا جان بھی اسے پوتیوں کی طرح پیار کرتے تھے' وہ اس کے لاڈ اٹھاتے نا تھکتے تھے۔ اس گھر کے سب ہی فرد سراپا محبت تھے سوائے اس کے جس کے نام کے ساتھ جڑ کے وہ اس گھر میں آئی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی جو محبت اسے اپنے سگے دادا نے نہیں دی تھی وہ آج احمد شاہ کے دادا سے مل رہی تھی۔

حویلی کے دو پورشنز تھے' وہ یہاں نہیں آتی تھی۔ احمد شاہ کے رویے کی وجہ سے۔ جبکہ امینہ اور زرمینہ آتی رہتی تھیں اور احمد شاہ بھی ان دونوں سے بہت پیار کرتا تھا' ان کے لاڈ اٹھاتا تھا۔ جب کہ شہوار کے گھر میں اس کے تایا جان اور تائی کی نظروں میں شہوار کے لیے ہمیشہ نفرت و حقارت ہوتی تھی۔ تایا جان اسے

دیکھ کے منہ پھیر لیتے تھے۔ اور دادا جان نے بھی نفرت نہیں کی تھی تو محبت بھی نہیں دی تھی۔ وہ آج تک ان کے رویوں کی وجہ نا سمجھ پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان کی شادی کو دو مہینے گزر چکے تھے، مصروفیت کے باعث وہ اب تک حویلی نا جا سکا تھا۔ آج شام اسے حویلی جانا تھا تو وہ شاپنگ کے لیے باہر نکلا۔ اس کی عادت تھی کہ حویلی جانے سے پہلے امینہ اور زرمینہ کے لیے تحائف ضرور لے کے جاتا تھا۔ اب بھی وہ اسی مقصد کے لیے مارکیٹ آیا تھا، شاپنگ کرتے ہوئے اسے شہوار کا خیال بھی آیا۔ اسی خیال کے تحت اس نے شہوار کے لیے بھی ضرورت کی چیزیں خرید لیں، جو بھی تھا وہ اس کی ذمہ داری تھی اور اپنی ذمہ داریوں سے وہ کبھی منہ نہیں موڑتا تھا۔ وہ جس وقت حویلی پہنچا شام ہو چکی تھی۔ وہ سیدھا دادا جان کے کمرے کی طرف بڑھا تھا۔

"یہ چائے بنائی ہے تم نے، جاہل لڑکی ۔۔۔ کوئی چیز ڈھنگ سے بنانی آتی بھی ہے تمہیں۔" کمرے سے دلاور شاہ کے زور سے چلانے کی آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ اور اسی وقت کمرے سے چائے کا کپ زور سے پھینکنے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے جو منظر تھا اسے دیکھ کے اس کی آنکھوں میں چنگاریاں جلنے لگی تھیں۔

شہوار شاہ اسے دیکھ کے اور سہم گئی تھی ۔۔۔ اب یہ بھی سب کے سامنے مجھے بے عزت کریں گے۔ اس نے دل میں سوچا۔ جبکہ دلاور شاہ جو اس پہ چلا رہے تھے اسے بے عزت کر رہے تھے اچانک تھم سے گئے تھے۔

وہ دو منٹ تک خاموشی سے دیکھتا رہا تھا اور پھر غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولا۔

"تایا جان بس کریں ۔۔۔ آپ مت بھولیں کہ آپ اس وقت شہوار احمد شاہ سے مخاطب ہیں ۔۔۔ میں سب برداشت کر لوں گا مگر یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ کوئی میری بیوی کو بے عزت کرے پھر چاہے وہ میرے تایا جان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اب شہوار احمد شاہ ہے میری عزت اور آپ اس کی نہیں میری بے عزتی کر رہے تھے۔" وہ غصے سے بولا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کے کمرے سے باہر لے گیا۔

شہوار کا خوف اک دم ہی آنسو بن کے بہنے لگا تھا اور کمرے میں پہنچ کر اس نے اس سے ہاتھ چھڑایا تھا اور خود کو اسٹڈی روم میں بند کر لیا تھا۔ اور وہ تاسف سے دیکھتا بیڈ پہ گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اس کے انداز میں افسوس تھا جو بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی اور وہ اس کی عزت کا محافظ ۔۔۔ لیکن اس نے کیوں اسے ایسے ہی چھوڑ دیا تھا کیوں اس کی خبر نہیں لی تھی ۔۔۔ وہ فریش ہو کر پھوپھو جان کے پاس گیا۔

"پھوپھو میں شہوار کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟" سلام دعا اور خیر خیریت کے بعد وہ کافی دیر خاموش رہا اور جب بولا تھا تو بے ساختہ اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے تھے۔ اور پھوپھو خوشی سے جھوم اٹھی تھیں۔

"لے جاؤ شاہ بیٹا ۔۔۔ وہ تمہاری بیوی ہے ۔۔۔ تمہاری ذمہ داری ۔۔۔ ان دو مہینوں میں جس طرح اس نے میرا اور بابا جان کا خیال رکھا ہے میں بتا نہیں سکتی بہت اچھی بچی ہے وہ بہت معصوم ہے اور سچ پوچھو تو تمہارے لیے میں اتنی اچھی لڑکی چراغ لے کر بھی ڈھونڈتی تو نہ ملتی۔" وہ تو اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"او چھا بس کریں یہ شہوار نامہ پھپھو میں اتنے دنوں بعد آیا ہوں میری تو فکر نہیں آپ کو بس اپنی لاڈلی کے گن گائے جا رہی ہیں۔" اس نے ناراض ہونے کی ایکٹنگ کی تھی۔ اور پھپھو اس کے انداز پہ مسکرا دی تھیں۔ وہ اب دل سے خوش تھیں اور احمد شاہ کی طرف سے مطمئن بھی انہیں یقین تھا شہوار بہت جلد احمد شاہ کے دل میں بھی جگہ بنا لے گی۔ اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حویلی کے سناٹے قہقہوں میں ضرور

بدلیں گے۔

☆ ☆ ☆

سنو!!
تمہاری شکایت کرتے ہوئے
میں اللہ کے سامنے رو پڑی
تو تمہارا کیا حال ہوگا؟
کبھی سوچا؟

رات کے دس بج رہے تھے جب وہ روم میں آیا تھا اور اسٹڈی کا دروازہ ہنوز بند دیکھ کر اسے تشویش ہوئی تھی اس نے دروازہ بجایا لیکن کوئی جواب نہیں آیا تو اس کی فکر میں اضافہ ہوا اس نے پھر بجایا۔ "شہوار دروازہ کھولو۔" اندر سے اس دفعہ بھی کوئی جواب نہیں آیا لیکن تھوڑی دیر بعد دروازہ کھل گیا تھا وہ شام سے لے کر اب تک رو رہی تھی اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہوگئی تھیں اسے روتی ہوئی لڑکیاں کبھی بھی اچھی نہیں لگتی تھیں لیکن اس وقت شہوار کے آنسوؤں نے اسے اپنی طرف کھینچا تھا۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لایا۔

"تم دو منٹ میں ہاتھ منہ دھوکر آؤ میں ابھی آتا ہوں اور یاد رہے میں واپس آؤں تو تمہیں فریش دیکھوں اگر ایسا نہیں ہوا تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔" وہ اسے وارننگ دے کر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اس کی واپسی کھانے کی ٹرے کے ساتھ ہوئی تھی وہ اسے آج بار بار چونکا رہا تھا۔

"چلو آؤ کھانا کھاؤ۔" اس نے ٹرے صوفے کے سامنے رکھے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے کہا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے کھانے سے انکار کیا۔

"شہوار میں نے تمہیں پہلے دن ہی سمجھایا تھا کہ میں بات دہرانے کا قائل نہیں ہوں۔" اس کی یہ بات سن کے چار و ناچار اسے اٹھ کے آنا پڑا۔ اسے بہت زور کی بھوک لگی تھی لیکن آج وہ پہلی بار احمد کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی اور اسی وجہ سے نروس ہو کر اس سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا اور شاید وہ یہ بات سمجھ گیا تھا تب ہی اس نے ایک پلیٹ میں کھانا ڈال کے اس کو حکم دیا تھا کہ دس منٹ کے اندر اسے ختم کرو سمجھ گئی ناں دس منٹ کے اندر اندر۔" اس نے تحکم سے کہا۔

اور پھر کھانا کھا کہ جو بڑے مزے سے اٹھنے لگی تھی احمد شاہ کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔

"اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ یہ برتن میں کچن میں رکھ کے آؤں گا تو یہ تمہاری بھول ہے شہوار میڈم جلدی سے انہیں رکھ کے آئیں اور ہاں میرے لیے ایک کپ کافی بھی بنا کے لے آئیے گا۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا اور وہ پیر پٹختی روم سے باہر آگئی تھی۔ آج پہلی بار اسے احمد شاہ۔ بہت بہت پیار آیا اسے وہ۔ بہت اچھا لگا تھا اس کی فکر کرتا احساس کرتا۔ اپنے لیے لڑنا سب بہت بہت اچھا لگا تھا۔۔۔ پہلی بار اس نے شہوار کی بھی فکر کی تھی۔

وہ اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی وہ کافی پی رہا تھا جب اس نے کافی پیتے پیتے اس سے سوال کیا تھا۔

"بابا سائیں تم پہ اتنا غصہ کیوں ہوئے تھے؟" اور وہ اس کے اس سوال پہ چونک گئی تھی۔

"وہ پہلی بار نہیں ہوا تھا وہ اکثر یا یہ کہہ لیں ہمیشہ سے مجھ پہ یوں ہی غصہ کرتے آئے ہیں وجہ مجھے آج تک نہیں پتا نہیں چل سکی تو آپ کو کیا بتاؤں۔" وہ تلخی سے بولی اور وہ اس کے انداز پہ چونک گیا تھا۔

"تو پھر آج اتنا کیوں روئی تھیں اگر وہ ہمیشہ سے ہی تم پہ غصہ کرتے آئے ہیں تو؟"

"میں ان کی وجہ سے نہیں آپ کی وجہ سے روئی ہوں۔"

"میری وجہ سے؟ لیکن میں نے تمہیں کچھ نہیں بولا۔" وہ حیرانی سے کہتے ہوئے اٹھا تھا۔ اور وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی اور پھر بولی۔

"حویلی میں بابا جان کے علاوہ مجھ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی لیکن بابا کی محبت میں بھی کبھی اتنی طاقت

نہیں تھی کہ وہ مجھے حویلی میں میرا جائز مقام دلوا سکتے۔ بچپن سے تایا جان مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ موڑ لیتے اور تائی جان وہ امینہ اور زرمینہ کو کبھی بھی میرے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی تھیں اور آپ جب بھی ہمارے پورشن میں آتے تھے امینہ اور زرمینہ کے لیے گفٹس لاتے تھے ان سب سے محبت کرتے ان کے لاڈ اٹھاتے اور کبھی میں آپ سے کوئی فرمائش بھی کردیتی تو آپ غصے سے مجھے جھڑک دیتے جبکہ دادا جان نہ نفرت کرتے تھے اور نہ محبت۔ ان ہی محرومیوں کے ساتھ میں کب بڑی ہوگئی پتا ہی نہیں چلا اور پھر ایک دن پتا چلا بچپن سے۔ جس سے میرا رشتہ جڑا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا اور رسم کے مطابق میرا نکاح قرآن سے کردیا جائے گا۔ میں بہت روئی بہت فریاد کی بابا سے لیکن سب بے بس تھے اپنی نام نہاد سومات کے آگے اور پھر اچانک آپ آگئے مجھے اس زندان سے نکالنے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ میرے نام کے آگے احمد شاہ کا نام بھی جڑ سکتا ہے۔ اس شخص کا نام جس کی نظروں میں ہمیشہ میں نے اپنے لیے نفرت دیکھی ہے لیکن شاید تقدیر اسی کو کہتے ہیں جو سوچتے بھی نہیں ہیں وہ ہوجاتا ہے۔ آج جب تایا مجھ پہ غصہ ہورہے تھے اس وقت آپ کی آمد کا کسی کے گمان میں بھی نہیں آیا تھا اور آپ کو دیکھ کر میں اور خوف زدہ ہوگئی تھی کہ اب آپ بھی مجھے سب کے سامنے بے عزت کردیں گے لیکن جب آپ نے اس طرح سب کے سامنے میرے حق میں بات کی میرے لیے لڑے مجھے اس بات نے رلا دیا کیونکہ پہلی بار کسی نے مجھے سپورٹ کیا تھا اور آنسوؤں کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا بھرم ٹوٹ گیا آپ کے سامنے مجھے لگا جیسے میں دو کوڑی کی ہوگئی ہوں۔۔۔" وہ ایک بار پھر رونا شروع ہوچکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کہ اس کے آنسو صاف کیے تھے اور کہا تھا۔

"ہاں یہ سچ ہے میں تم سے نفرت کرتا ہوں وجہ تمہارا باپ ہے تمہارا حوالہ۔ جس نے تمہاری ماں سے شادی کرنے کے لیے میری جان سے پیاری پھپھو کی زندگی عذاب بنادی آج تم انہیں جس حالت میں دیکھتی ہو اس کی وجہ تمہارا باپ سانول شاہ ہے۔ لیکن وہ آج بھی اس کے حق میں دعا ہی کرتی ہیں۔" اس نے شہوار کو آج ساری بات بتادی تھی جس سے وہ انجان تھی۔۔۔

"اور رہی تحائف کی بات تو میں صرف اپنے سے جڑے رشتوں کا ہی خیال رکھتا ہوں شہوار احمد شاہ۔۔۔ تب میرے لیے آپ صرف اجنبی تھیں لیکن آج بے شک آپ سے میں محبت نہیں کرتا مگر ایک مضبوط رشتہ تو جڑ ہی گیا ہے ہمارے درمیان اس لیے اس رشتے کا احساس کرکے آج میں تمہارے لیے بھی کچھ لایا ہوں۔۔۔" اس نے شاپنگ بیگز اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"خیر اب مجھے لگتا ہے گفٹس والی شکایت تو دور ہوگئی ہوگی۔" وہ شرارت سے بولا تھا۔ اور اس سے مذاق کرتے خود احمد شاہ کو بھی اپنے اوپر حیرت ہوئی تھی۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔" شہوار خجل ہوتی اٹھ گئی تھی جبکہ احمد شاہ خود اپنے رویے پہ حیرت زدہ تھا۔

☼ ☼ ☼

شہوار، زرمینہ اور امینہ کو اپنے ساتھ لے کر احمد شاہ واپس کراچی آگیا تھا زرمینہ اور امینہ کا ایڈمیشن کالج میں ہوگیا تھا دونوں بہت خوش تھیں جبکہ شہوار کا ایڈمیشن بھی اس نے یونیورسٹی میں کروادیا تھا۔

انہیں یہاں آئے چھ مہینے ہوگئے تھے اس دوران وہ صرف ایک بار حویلی گئے تھے اب امینہ کی سالگرہ آرہی تھی تو امینہ اور زرمینہ دونوں نے احمد شاہ سے اجازت لے کر گھر میں ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کرنے کا پلان بنایا تھا اسی غرض سے احمد شاہ دونوں کو شاپنگ کروانے لے جارہا تھا۔

"شہوار بھابھی آپ بھی چلیں ناں ہمارے ساتھ؟" زری نے اسے بھی آفر کی تھی۔

"نہیں زری تم لوگ جاؤ میرا موڈ نہیں ہے۔" اس

نے سہولت سے انکار کر دیا تھا۔

وہ جب سے کراچی آئی تھی کبھی بھی ان لوگوں کے ساتھ باہر نہیں گئی تھی اسے عجیب لگتا تھا کسی کے ساتھ اس طرح جانا۔۔۔ کیونکہ آج تک احمد شاہ نے اسے کبھی خود سے ساتھ چلنے کا نہیں کہا تھا وہ فاصلے جو حویلی میں ان کے درمیان تھے وہ کچھ اور بڑھ گئے تھے وہ جب صبح یونیورسٹی جاتی تھی تب احمد شاہ سو رہا ہوتا واپس آتی تو اسے پہنچتے پہنچتے چار بج جاتے تھے تب تک احمد شاہ ان دونوں کو ڈراپ کر کے لنچ کر کے واپس آفس جا چکا ہوتا جبکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی تھوڑی دیر سونے کے بعد وہ ڈنر کی تیاری کرتی شام کا کھانا ہمیشہ وہی بناتی تھی۔ احمد شاہ شام کو آفس سے آنے کے بعد جم چلا جاتا اور اس کے بعد کھانا کھایا جاتا۔۔۔ کبھی زرمینہ اور امینہ کو وہ مختلف جگہوں پہ گھمانے لے جاتا اور کبھی اپنے کمرے میں بیٹھ کر آفس کا کام کرتا رہتا۔۔۔ ان دونوں کے درمیان عرصہ ہو گیا تھا بات چیت ہوئے۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ان کی ملاقات کئی کئی دن بعد ہوتی تھی احمد شاہ کے سارے کام وہ خود کرتی کپڑے دھونے سے لے کر الماری میں سیٹ کرنے تک اسے اچھا لگتا تھا اس کے کام کرنا اور احمد شاہ تو اسے یہاں لا کر خود تو جیسے ہر ذمہ داری سے بری الذمہ ہو گیا تھا۔ جب وہ سب کچھ جان گئی تھی تو اسے اب احمد شاہ سے کوئی شکایت نہیں تھی اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس کا نام اس کے نام سے جڑا ہے۔۔۔ یہی وجہ تھی اس نے ان دونوں کو ساتھ چلنے کے لیے انکار کر دیا تھا۔

”احمد بھائی یہ دیکھیں کتنا پیارا ہے ناں؟“ زرمینہ نے ایک بے حد خوب صورت سوٹ کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ وہ دونوں احمد شاہ کے ساتھ بازار آئی تھیں ڈارک گرین کلر کا وہ سوٹ جس پر سلور کام ہوا تھا اسے بھی بے حد پیارا لگا تھا۔

”اچھا تو ہے لیکن تم دونوں پہ یہ سوٹ نہیں کرے گا بھاری کام ہے۔ میرڈ خواتین کے لیے اچھا ہے۔“ احمد شاہ نے دونوں کو سمجھایا۔

”ہاں جی بھائی ہم جانتے ہیں اور ہم دونوں نے آپ کو اسی لیے متوجہ کیا ہے جناب۔۔۔ شہوار بھابھی کے لیے کچھ لینا نہیں ہے کیا آپ نے؟“ دونوں نے شرارت سے کہتے اس کی توجہ شہوار کی طرف دلائی۔

”او ہاں۔۔۔ یہ رنگ شہوار پہ بہت خوب صورت لگے گا۔“ وہ ستائش سے بولا تھا۔ اور پھر وہ سوٹ احمد شاہ نے شہوار کے لیے پیک کروا لیا۔ وہ لوگ واپس دیر سے لوٹے ڈنر انہوں نے باہر ہی کر لیا۔

”اچھا بھائی مجھے آپ کو ایک اور بات بتانی تھی۔۔۔ کل بابا اور اماں آ رہے ہیں ناں۔۔۔ پارٹی میں تو ہم کچھ دنوں کے لیے ان کے ساتھ حویلی جانا چاہتے ہیں۔۔۔ کالج کی چھٹیاں ہیں۔۔۔ بس اب آپ کی اجازت چاہیے۔“ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے زرمینہ نے کہا۔ امینہ شاپنگ کا سامان لے کر اپنے روم میں چلی گئی۔

”ضرور جاؤ لیکن اپنی اسٹڈیز کو نا بھول جانا“ پوری توجہ سے اسے سنتے ہوئے تاکید کی۔

”او کے بھیا تھینک یو۔“ وہ فورا“ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے زری کیا ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟“ احمد شاہ نے انگلیوں سے سر کو دباتے ہوئے کہا۔۔۔ اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا۔۔۔

”ضرور بھائی ابھی بنا کے لائی۔۔۔“ وہ اٹھ کے کچن میں آئی جہاں شہوار پہلے سے موجود تھی۔۔۔ کل ہونے والی پارٹی کی تیاریوں میں مصروف۔۔۔

”بھابھی بھائی کے سر میں بہت درد ہو رہا ہے آپ پلیز انہیں ایک کپ چائے اور ساتھ پین کلر دے دیں۔۔۔ وہ لاؤنج میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں“ وہ کہہ کر رکی نہیں۔ تھی فورا“ چلی گئی مجبورا“ چائے بنا کر اسے ہی لے جانا پڑی وہ لاؤنج میں نہیں تھا وہ اس کے روم کی طرف چل دی۔۔۔ احمد شاہ کے کاموں کی وجہ سے وہ اس کے روم میں کئی دفعہ گئی تھی لیکن اس کی موجودگی میں پہلی دفعہ آئی تھی۔۔۔ وہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا

دروازہ کھلنے کی آہٹ پہ اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور پھر اٹھ کے بیٹھ گیا۔

"یہ ٹیبلٹ لے لیں۔" اس نے پانی کا گلاس اور ٹیبلٹ اس کی طرف بڑھائی جو کہ اس نے لے لی اور چائے پینے لگا۔

"رکو۔۔" وہ روم سے جانے لگی تھی جب اس نے اسے آواز دے کر روکا وہ پلٹی اور سوالیہ نظروں سے احمد شاہ کو دیکھا وہ بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔۔۔

"یہ سوٹ آج شاپنگ کرتے ہوئے ہمیں بہت پسند آیا سوچا تمہارے لیے لے لوں اگر تمہیں پسند آئے تو کل فنکشن میں پہن لینا۔" اس نے یہ کہتے ہوئے شاپنگ بیگ اسے تھمادیا جسے اس نے حیرت اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ تھام لیا۔

"اگر تمہیں برا نا لگے اور زحمت بھی نا ہو تو کیا کچھ دیر میرا سر دبا سکتی ہو؟ بہت درد ہو رہا ہے۔۔" وہ تھکن سے چور آواز میں بولا۔ نگاہیں شہوار کے چہرے پہ جمی تھیں۔ شہوار نے اثبات میں سر ہلادیا تھا اور آہستہ آہستہ چلتی اس کے بیڈ پہ آکر بیٹھ گئی تھی۔

وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا پھر بھی اس کا سر دباتے وہ بہت بری طرح نروس ہو رہی تھی پہلی بار وہ اس کے اتنے قریب تھا کہ وہ اس کی دھڑکنیں بھی سن سکتی تھی۔۔۔ خود اس کا دل بھی بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اسے عجیب سا لگ رہا تھا جبکہ وہ پر سکون انداز میں آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ اس کی یہ بے نام سی قربت بھی شہوار کو بے قرار کر چکی تھی۔ ایک نیا سا احساس تھا جو اس وقت شہوار کو محسوس ہو رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں احمد شاہ سو گیا تھا شہوار نے اسے اچھے سے کمبل اوڑھایا اور لائٹ بند کر کے باہر آگئی۔ دل کی دھڑکنیں ابھی تک بے ترتیب تھیں اسے اپنی ہی کیفیت پہ الجھن ہوئی تھی جبکہ وہ ہر بات سے بے خبر گہری نیند سو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج صبح وہ جلدی اٹھ گئی تھی ورنہ تو اب تک گھر کے کاموں میں مصروف تھی کچن کی بطور گھر کی ساری ذمہ داری اس پہ تھی۔۔۔ سارے گھر کو اس نے اور احمد نے پھر سے سیٹ کیا تھا اور اب کچن کا کام ختم کر کے وہ اپنے روم میں آئی تھی۔

مہمانوں کے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا اب اسے تیار ہونا تھا جبکہ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ سب چھوڑ کے ایک لمبی نیند لے کر پر سکون ہو جائے۔ اب وہ بری طرح تھک گئی تھی۔ لیکن تھکاوٹ کو پس پشت ڈال کے وہ شاور لینے چلی گئی۔ نہانے کے بعد اب وہ خود کو فریش محسوس کر رہی تھی۔

اس نے ہلکا سا میک اپ کیا اور بالوں کی فرنچ ٹیل بنائی کانوں میں سلور کلر کے جھمکے پہن کے اس نے خود کو آئینے میں دیکھا اور مطمئن ہو کر باہر آگئی مہمانوں کو ویلکم بھی اسی نے کرنا تھا۔ اس کے روم سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلی نظر اس پہ احمد شاہ کی پڑی تھی وہ کچھ دیر کے لیے اس سے نظریں ہٹا نہیں پایا تھا شادی کے بعد پہلی دفعہ اس نے شہوار کو اس روپ میں دیکھا تھا ورنہ وہ عام روٹین میں سادہ ہی رہتی تھی۔ اس نے وہی سوٹ پہنا تھا جو کل وہ اس کے لیے پسند کر کے لایا تھا۔۔۔ ڈارک گرین کلر میں اس کی دودھ جیسی رنگت دمک رہی تھی۔

"ماشاء اللہ بھابھی آپ تو آج چودہویں کا چاند لگ رہی ہیں۔" اس کی محویت کو امیمہ کی آواز نے توڑا تھا۔۔۔ اور پھر وہ سر جھٹک کر کاموں میں مصروف ہو گیا۔ وہ جلدی سے احمد شاہ کے روم میں آئی مصروفیت میں وہ اس کے کپڑے نکالنا تو بھول ہی گئی تھی اس نے جلدی سے احمد شاہ کے لیے وائٹ شرٹ اور بلیک ویسٹ، پینٹ نکالی تھی ابھی وہ اس کے شوز نکالنے ہی لگی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہوا ایک نظر شہوار پہ ڈال کے شاور لینے چلا گیا۔ وہ اس کی چیزیں سیٹ کر کے باہر آگئی حویلی سے سب لوگ آچکے تھے شادی کے بعد آج پہلی بار سانول شاہ اس کے بابا اس کے گھر آئے تھے وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن پھر اس کی خوشی پہلے حیرت اور پھر پریشانی میں بدل گئی۔

پھوپھو جان کے علاوہ سب ہی لوگ آئے تھے وہ باری باری سب سے ملنے لگی سب نے اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازا اسے بہت خوشی ہوئی احمد شاہ کے حوالے نے اسے بہت معتبر کردیا تھا سب کی نظروں میں۔ وہ جس شخص کے نکاح میں تھی وہی اس کا سب سے مضبوط حوالہ تھا سانول شاہ اس کی اندر کی کیفیت سے بے خبر اسے خوش دیکھ کر اندر تک مطمئن ہوگئے وہ ابھی تک اس مشکل میں تھی کہ باپ سے ملے یا نہیں جب ملازمہ نے اسے اس مشکل سے نکال دیا۔

"بی بی جی آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔" اور وہ ان سے معذرت کرتی وہاں سے چلی آئی تھی۔

"جی آپ نے بلایا؟" وہ حیرت میں گھری اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ وہ شرٹ کے بٹن لگا رہا تھا۔

"ہاں سنو میری گرین کلر کی ٹائی تو ڈھونڈ دو مل نہیں رہی مجھے۔" وہ شیشے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے بولا۔ اس نے الماری کھولی تو سامنے ہی گرین ٹائی موجود تھی پتا نہیں احمد شاہ کو کیوں نہیں ملی اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ وہ ٹائی اس کی طرف بڑھا کے جانے ہی لگی تھی جب اس نے پرفیوم اسپرے کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو شہوار؟"

"جی وہ حویلی سے سب پہنچ چکے ہیں اور....." اس نے تذبذب کا شکار ہوتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"وہ سانول شاہ یعنی تمہارے بابا جان بھی آئے ہیں ان کے ساتھ... یہی کہنا چاہ رہی ہوں ناں؟" احمد شاہ نے اس کی بات مکمل کی تھی۔

"جی آپ کو کیسے پتا..." وہ حیران ہوئی...

"کیونکہ میں نے ہی انوائٹ کیا ہے انہیں' میری ناراضی اپنی جگہ لیکن وہ تمہارے بابا جان ہیں اور میں ایک بیٹی کو اس کے باپ سے الگ کرنے کا گناہ نہیں کرسکتا۔ میں کیا اتنا ظالم لگتا ہوں تمہیں...؟ میری پرورش جن ہاتھوں نے کی ہے ان میں محبت ہی محبت تھی... میں نے جب تمہیں تمہارے ابا سے ملنے سے منع کیا تھا تب میں غصے میں تھا اور میرا غصہ جائز بھی تھا۔" وہ لب بولتے بولتے بالکل اس کے قریب آگیا۔ اس کے پرفیوم کی مہک شہوار کی سانسوں کے ذریعے اس کے وجود کو مہکائے جا رہی تھی اور احمد شاہ کو پتا نہیں کیا ہوا تھا وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پرفیوم سے اس کے پورے وجود کو معطر کردیا جیسے وہ اس کو اپنی مہک سے مہکانا چاہ رہا ہو۔ وہ پہلے تو اس کی اس حرکت پہ حیران ہوئی اور پھر ایک دم اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں موجود اس کی مسکراہٹ دیکھ کے نہ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ الٹے قدموں بھاگی تھی۔ آج احمد شاہ کا ہر انداز نرالا اور بہت ہی دلفریب تھا۔ اس کی نگاہیں شہوار سے باتیں کر رہی تھیں وہ شرما کر واپس جا رہی تھی جب اسے احمد شاہ کی آواز نے روکا۔

"سنو۔ پیاری لگ رہی ہو آج۔ ایسے ہی رہا کرو۔" اور وہ اس تعریف پہ بے اختیار شرم سے سرخ ہوگئی تھی۔ احمد شاہ اس کے چہرے کے ان رنگوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

سالگرہ کی تقریب بے حد شاندار رہی تھی سب نے شہوار کو اور اس کی کوکنگ کو بہت سراہا تھا۔ اور خوشی سے اس کی ساری تھکن اتر گئی تھی اک نیا جوش اور طاقت اس کے اندر بھر گئی.... زرمینہ اور امینہ واپس حویلی جا چکی تھیں اور وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں تھی دن بھر کی مصروفیات اور تھکاوٹ کے باوجود نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کبھی کبھی ہوتا ہے ناں ایسا کسی کا ایک جملہ ایک تعریف آپ کی ساری تھکاوٹ دور کردیتا ہے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شکوے شکایت تو احمد شاہ سے بہت پہلے ہی ختم ہوچکے تھے لیکن آج وہ خود کو اس کی مشکور محسوس کر رہی تھی۔ وہ نا جانے کیوں آج خود کو اسے سوچنے پر مجبور محسوس کر رہی تھی۔ اور اسے احمد شاہ کو سوچنا بہت بہت اچھا لگ رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ سانول شاہ کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا کجا اسے

اپنے گھر میں برداشت کرتا لیکن جس طرح شہوار خاموشی سے اس کا اور اس کے گھر والوں کا خیال رکھتی تھی ان سے محبت کرتی تھی اور سب سے بڑھ کر اس کا خیال رکھتی تھی تو کچھ ذمہ داری اس کی بھی بنتی تھی۔ اور پھر وہ امینہ اور زرمینہ کے سگے چچا تھے۔ وہ ان کی خوشی بھی ادھوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر پھوپھو جان کا کہنا تھا۔

"احمد سانول شاہ کو معاف کردو۔ میں نے اس شخص سے بہت محبت کی ہے۔ اور ہمیشہ سے اس کی خوشیوں کی دعا مانگی ہے۔ لیکن اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پتا ہے کیا' اللہ ہمیں آزماتا ہے۔ کبھی محبت دے کے کبھی چھین کے اور پھر مجھے اس شخص کی محبت نے میرے رب سے قریب کردیا' دیر سے ہی سہی مجھے سمجھ آہی گیا کہ انسان سے محبت مانگو گے تو وہ خوار ہی کرے گی' بس رب تعالیٰ ہے جو بندے کے ایک قدم چل کے آنے پہ ہی اس پہ مہربان ہو جاتا ہی اس کے گناہ بھلا دیتا ہے۔ جب کہ انسان تو کبھی کبھی ہمارے ناکردہ گناہوں کی ہی سزا ساری عمر دیتے رہتے ہیں ہم لوگ جب محبت کرتے ہیں تو محبوب کو اس قدر چاہتے ہیں کہ اسے ہی خدا بنا لیتے ہیں اس کی خوشی میں ہنسنا اس کی خوشی میں رونا' اس کے لیے کچھ بھی قربان کرنے پہ تیار ہم اپنے رب کو بھول ہی جاتے ہیں اور پھر جب وہ جدا ہوتا ہے تو ہمیں رب یاد آتا ہے اور یا تو محبت رب سے ملا دیتی ہے یا پھر جدا کردیتی ہے۔

سانول شاہ کی محبت میرے خون میں شامل تھی' بچپن سے اس کا نام اپنے نام کے ساتھ سنتی آئی تھی' پھر کیسے ممکن تھا کہ مجھے اس سے محبت نہ ہوتی۔ لیکن وہ میرے نصیب میں ہی نہیں تھا اور جب اللہ نے اسے میرے نصیب میں لکھا ہی نہیں تھا تو وہ کیسے مجھے مل جاتا۔

اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا' قصور تو ہم لوگوں کا ہوتا ہے ہمارے بڑوں کا جو اپنے بچوں کو کم عمری میں ہی ہمیشہ کے لیے رشتوں میں باندھ دیتے ہیں سو بیٹا تم سب بھول جاؤ؟ مجھے بڑی امیدیں ہیں تم سے" تم کو اس حویلی سے تمام فرسودہ رسموں کا خاتمہ کرنا ہے۔ تمہیں نئی شروعات کرنی ہے۔ پرانی رنجشوں کو دل میں جگہ دیے رکھو گے تو کبھی آگے نہیں بڑھ سکو گے۔ شہوار کو خوش رکھو احمد شاہ' وہ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ عمر بھر کی ہم سفر ہے' تمہاری خوشیاں اور تمہارے دکھوں کی ساتھی ہے' تمہارے نام سے جڑی ہے' اور تم ہی ہو جو اسے مقام دلاؤ گے۔" اور اس لیے ہی اب وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا' جو غلطیاں ہوگئی تھیں انہیں سدھارنے کی ذمہ داری ان دونوں پر ہی تھی۔ نئی شروعات ان کو ہی کرنی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج زرمینہ اور امینہ کو حویلی گئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا' اسے شدید بوریت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اب اس گھر میں وہ فارغ بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے سوچا کیوں نہ کوئی ناول ہی پڑھ لیا جائے' اور یہ ہی سوچ کے وہ اسٹڈی میں آگئی تھی۔ احمد شاہ مطالعہ کا بہت شوقین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی اسٹڈی میں بہترین کتابوں کا ایک بہت بڑا کلیکشن تھا۔ وہ سعدیہ راجپوت کا ناول عشق آتش نکال کے وہیں موجود صوفے پر بیٹھ گئی تھی' یہ ناول وہ پہلے بھی کافی بار پڑھ چکی تھی اور یہ اس کے فیورٹ ناولز میں سے ایک تھا۔ وہ اس ناول کو پڑھنے میں اتنی مگن تھی کہ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا احمد شاہ کب اسٹڈی میں آیا' وہ اس کے متوجہ کرنے پہ چونکی تھی۔

"حویلی سے زری کا فون ہے شہوار' وہ تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔" اس نے موبائل فون اس کی طرف بڑھایا تھا' جسے شہوار نے تھام لیا تھا۔

"بات کرلو۔ تو فون مجھے دے جانا' ایک امپارٹنٹ میسج آنے والا ہے میرا؟" وہ یہ کہہ کر روم سے باہر چلا گیا تھا۔

"السلام علیکم کیسی ہو زری؟ اتنے دنوں بعد فون کیا ہے تم نے۔" وہ خفا ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"وعلیکم السلام ہم ٹھیک ہیں الحمدللہ آپ سنائیں

کیسی ہیں؟ ہم تو حویلی آکر اتنی بزی ہو گئی تھیں کہ فون کرنے کا ٹائم بھی نہیں ملا تھا۔ اور آپ بھی تو بھول گئی تھیں، آپ نے بھی فون نہیں کیا۔" اس نے شکوہ کیا۔
"یار تمہیں پتا ہے میرے پاس سیل فون نہیں ہے۔ پھر کیسے کرتی میں کال۔" اس نے وجہ بتائی۔
"ویسے میں تم دونوں کو بہت مس کر رہی ہوں۔"
"بھابھی ہم بھی تو آپ کو بے حد مس کر رہے ہیں۔ اور فون نہیں ہے تو کیا ہوا شاہ بھائی ہیں نا ان سے لے لیا کریں۔"
"مجھے شرم آتی ہے ان سے مانگتے ہوئے۔" اس نے ہچکچاتے وجہ بتائی تھی۔ اور دوسری طرف فون پہ اس کا بے ساختہ قہقہہ گونجا تھا۔
"شاہ بھائی آپ کے شوہر ہیں۔ کوئی غیر انسان نہیں جو آپ شرماتی ہیں۔ آپ کا پورا حق ہے ان پہ۔ شرمائیں گی تو کیسے دل کی بات کہیں گی۔" زری نے محظوظ ہوتے کہا۔
"دل کی بات کہی نہیں جاتی زری۔ یہ محسوس کی جاتی ہے، ویسے مانگ کے ملے اس کا کیا مزا۔" وہ بھی آج موڈ میں تھی۔
"ایک بات کہوں شہوار بھابھی، آپ خوش تو ہیں نا، آپ کو شاہ بھائی سے کوئی شکایت تو نہیں ہے نا۔" اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا کیونکہ احمد شاہ اور شہوار دونوں ہی اسے بے حد عزیز تھے؟ اور ان دونوں کی خوشی اس کے لیے بہت اہم تھی۔
"ہاں یار خوش ہوں، لیکن کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے شاہ کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوئی ہے، میں ان پہ زبردستی مسلط کر دی گئی ہوں، ہر کسی کی کچھ خواہشات ہوتی ہیں، مجھے لگتا ہے جیسے مجھے اپنا کر ان کی بہت سی خواہشات ادھوری رہ گئی ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہی خواہش کی تھی کہ میرا ہمسفر مجھے چاہے کچھ نا دے لیکن محبت اور عزت ضرور دے۔ شاہ نے مجھے عزت تو دی ہے لیکن مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے محبت کبھی نہیں کر سکیں گے، اور زبردستی کے رشتوں میں محبت ہو بھی کیسے سکتی ہے۔" اس نے افسردہ لہجے میں اپنے دل کی بات کہی تھی۔ اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ فون لینے کے لیے آیا احمد شاہ اس کی تمام گفتگو سن کر خاموشی سے چلا گیا تھا۔
"نہیں شہوار بھابھی آپ غلط سوچ رہی ہیں۔ میں نے دیکھی ہے بھائی کی آنکھوں میں آپ کے لیے محبت اور ایک دن ضرور آئے گا جب آپ کو وہ محبت محسوس ہو جائے گی۔"
"اچھا تم یہ بتاؤ امہنہ کیا کر رہی ہے بات کراؤ اس سے۔" اس نے بات بدلی۔
"وہ تو کافی دیر ہوئی سو گئی ہے، بہت یاد کر رہی تھی آپ کو۔"
"اچھا کافی دیر ہو گئی ہے... شاہ سیل فون کے لیے... ویٹ کر رہے ہوں گے۔ تم اپنا خیال رکھنا اور سب کو سلام دینا۔ اللہ حافظ۔" اس نے کال کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اور موبائل فون واپس کرنے احمد شاہ کے روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کبھی یوں بھی آ مری آنکھ میں کہ مری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات نواز دے مگر اس کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا رحیم و کریم ہے تجھے یہ صفت بھی عطا کرے
تجھے بھولنے کی دعا کروں تو مری دعا میں اثر نہ ہو
مرے بازوؤں میں تھکی تھکی ابھی محو خواب ہے چاندنی
نہ اٹھے ستاروں کی پالکی ابھی آہٹوں کا گزر نہ ہو
یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھے خرابے کی روشنی کبھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو
وہ فراق ہو کہ وصال ہو تری یاد مہکے گی ایک دن
وہ گلاب بن کے کھلے گا کیا جو چراغ بن کے جلا نہ ہو
کبھی دھوپ دے کبھی بدلیاں دل و جاں سے دونوں قبول ہیں
مگر اس نگر میں نہ قید کر جہاں زندگی کی ہوا نہ ہو
کبھی دن کی دھوپ میں جھوم کے کبھی شب کے پھول کو چوم کے
یوں ہی ساتھ ساتھ چلیں سدا کبھی ختم اپنا سفر نہ ہو

مرے پاس مرے حبیب آ ذرا اور دل کے قریب آ
تجھے دھڑکنوں میں بسالوں میں کہ بچھڑنے کا کبھی ڈر نہ ہو
"شہوار بیٹھو۔۔۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہے۔" وہ فون لوٹانے آئی تھی جب احمد شاہ نے اس کو وہیں روک لیا تھا۔

"جی کہیں!" وہ وہیں صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری۔" اس نے بات کا آغاز کیا تھا۔۔۔

"جی اچھی جارہی ہیں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کسی ہیلپ کی یا ٹیوشن وغیرہ کی ضرورت تو نہیں۔۔۔"

"جی نہیں ابھی تو ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہوئی تو میں آپ کو بتادوں گی۔۔۔"

"اور مجھ سے کوئی شکایت۔۔۔" اس نے اچانک سوال کیا تھا۔ شہوار کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اچانک سے کچھ ایسا سوال کرسکتا ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کیا کہے۔۔۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں شہوار۔۔۔ کوئی شکایت ہے تو بتاسکتی ہو۔۔۔" اس نے اپنا سوال دہرایا تھا۔۔۔

"آپ سے کیسے شکایت ہوسکتی ہے۔۔۔ آپ نے اتنا سب کچھ مجھے دیا ہے کہ میں ساری زندگی بھی آپ کا شکر ادا کروں بھی تو کم ہے۔۔۔" اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا تھا' وہ کبھی بھی اس کی طرف دیکھ کر اس سے بات نہیں کرسکتی تھی' وجہ کیا تھی وہ نہیں جانتی تھی بس اسے دیکھ کر وہ بولنا بھول جاتی تھی۔

"اچھا کیا دیا ہے میں نے تمہیں کہ تم ساری زندگی بھی شکر ادا نہیں کرسکتی ہو۔" اس نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"عزت' مقام اور سب سے بڑھ کر آپ نے میری زندگی ایک جاہلانہ رسم کی بھینٹ چڑھنے سے ہی بچائی ہے۔" وہ معصوم انداز میں کہتی گئی۔ اور وہ جو اس سے بہت کچھ کہنا چاہ رہا تھا اس کے لفظوں کو سن کر بہت دیر تک بول ہی نہیں پایا تھا۔

شہوار نے اس کی خاموشی کو محسوس کرکے ایک دم نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے دونوں کی نظر ملی تھی اور دوسرے ہی پل۔ شہوار نے نگاہ جھکادی تھی۔

"شہوار' زری اور امینہ دونوں اب حویلی میں ہی رہنا چاہتی ہیں۔۔۔ انہوں نے آج یہ ہی بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ حویلی میں موجود لوگوں کو ان کی ضرورت ہے۔ وہ وہاں تنہا ہیں اور وہ انہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی ہیں۔ اور وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کا مائگریشن وہیں کے کالج میں کرادوں۔ کل اس ہی وجہ سے میں ان کے کالج جارہا ہوں اس کے بعد مجھے تمہیں کسی سے ملوانے جانا ہے تم تیار رہنا۔" اس نے تفصیل سے ساری باتیں شہوار کو بتائی تھیں اور وہ جو یہ سن کر ہی کہ زرمینہ اور۔۔۔ امینہ اب حویلی میں ہی رہیں گی اداس ہوگئی تھی اس کی دوسری بات پہ چونکی تھی۔

"کس سے ملوانے لے جائیں گے آپ۔" اس نے سوال کیا تھا۔۔۔

"وہ سرپرائز ہے اب چاہو تو تم جاسکتی ہو۔" اس نے گویا بات ختم کردی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ کار کی فرنٹ سیٹ پہ بیٹھی تھی' عجیب لیکن حسین احساسات نے اسے اپنی لپیٹ میں لیا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اسے کہاں لے جارہا ہے کار شہر سے باہر رواں رواں تھی اور پھر گاڑی میں پھیلی خاموشی نے اسے بہت جلد گہری نیند میں سلادیا تھا۔ اسے نہیں پتا چلا تھا کہ وہ کتنی دیر تک سوتی رہی ہے احمد شاہ کی آواز نے اسے جگایا تھا۔

"شہوار اٹھو۔۔۔ ہم پہنچ گئے ہیں منزل پہ۔" اسے ۔۔۔ آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی تھی اور اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول دی تھیں اور اب ڈرائیونگ سیٹ پہ موجود احمد شاہ کو دیکھ کر اسے بہت شرمندگی ہوئی تھی۔۔۔ وہ فوراً" سنبھل کر بیٹھی تھی۔ احمد شاہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"آئم سوری مجھے دھیان نہیں رہا کب نیند آگئی۔" وہ شرمندہ لہجے میں سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ کہتی سیدھی اس کے دل میں اتر گئی تھی۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے پہلی بار مسکرا کر اسے جواب دیا تھا۔ وہ حیران ہوئی تھی۔ کیا یہ مسکراتا بھی ہے۔ اور اس کی حیرانی میں اضافہ تب ہوا تھا جب احمد شاہ کے کار سے نکل کر اس کی طرف کا دروزہ کھولا تھا اور وہ باہر نکل کر سامنے موجود حویلی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے مسل کر اور پھر بند کر کے کھولا تھا۔ لیکن اب بھی وہ پر شکوہ حویلی اس کے سامنے تھی۔ اس نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا اور وہ اس کے انداز پہ مسکرا رہا تھا۔ گویا آج اس نے اسے حیران کرنے کی قسم کھالی تھی۔ وہ اتنی سالوں بعد ایک بار پھر اس حویلی میں تھی جہاں اس کی ماما جان نے اپنے بچپن سے جوانی تک کا سنہرا دور گزارا تھا۔ یہ اس کی ماما جان کی حویلی تھی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں اس کے بہت قیمتی اور پیارے رشتے تھے اس کی آنکھوں میں خوشی میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ وہ شاید اس کی زندگی کا بہترین دن تھا۔ نانا، ماموں جان، فاطمہ آنٹی اس کے کزنز اشعر بھائی سب بہت خوش ہوئے تھے اس سے مل کے۔ اور سب کے اصرار پر احمد شاہ نے یہیں رکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم بہت لکی ہو شہوار..... اوا احمد شاہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں اف میں تمہیں بتا نہیں سکتی میں کتنی امپریس ہوئی ہوں ان سے ڈیشنگ پرسنالٹی اوپر سے اتنے کیئرنگ ہتم بہت خوش قسمت ہو شہوار بہت زیادہ اللہ نظر بد سے بچائے۔ اور تم یوں ہی ہنستی مسکراتی رہو۔" یہ اس کی ماموں زاد بہن توبیہ تھی جو کہ احمد شاہ سے بہت متاثر ہوئی تھی اور محبت بھرے لہجے میں اس کی تعریف کر رہی تھی۔ شہوار کو بہت خوشی ہوئی تھی اسے لگا تھا جیسے وہ ایک دم بہت معتبر ہو گئی کہ احمد شاہ کی تعریف اسے اپنی تعریف لگی تھی۔ اور پھر وہ کافی دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں۔

"اچھا چلو مجھے تو اب بہت نیند آ رہی ہے پلیز روم دکھاؤ میرا۔" شہوار نے نیند سے سرخ آنکھوں سے کہا تھا اور پھر توبیہ۔ اسے اس کے روم کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تھا اور ٹھٹک کر وہیں رک گئی تھی۔ سامنے بیڈ پر احمد شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر کہ شاید غلط کمرے میں قدم رکھ دیا واپسی کا ارادہ کیا تھا۔

"اس حویلی میں ہمیں ایک ہی روم شیئر کرنا ہو گا۔ اگر تم یہ سمجھ کر باہر جا رہی ہو کہ تم غلط روم میں آگئی ہو تو لوٹ آؤ۔" اس نے واپس باہر جانے کے لیے قدم اٹھائے تھے جب اس کی آواز نے اس کے قدم وہیں روک دیے تھے اور وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی آئی تھی۔

"تھینک یو سو مچ۔ شاہ آج کا دن میری زندگی کا سب سے حسین دن تھا۔ میری زندگی میں یہ دن لانے کے لیے آپ کا بہت شکریہ۔" اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھی کہہ رہی تھی۔ احمد شاہ نے ہاتھ میں موجود سیل فون ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور اب وہ اس کی طرف متوجہ تھا۔

"شہوار تم میری زندگی کا حصہ ہو۔ میری شریک حیات۔ تمہاری خوشی میری خوشی سے الگ نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں شکریہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سب تمہارے قریبی رشتے ہیں اور تمہارے حوالے سے یہ میرے لیے بھی اتنے ہی معتبر ہیں۔ تم میری زندگی میں بہت اچانک آئی تھیں اور تب میں تمہیں کچھ خاص پسند بھی نہیں کرتا تھا پھر آہستہ آہستہ تم کب میرے دل میں اترتی چلی گئیں پتا ہی نہیں چلا کل رات جب تم زری سے باتیں کر رہی تھیں تب کچھ باتیں میں نے سن لی تھیں۔ تمہارے باتوں نے مجھے اندر تک جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور پھر ساری رات میں نے بہت سوچا اور اب مجھے لگتا ہے میں نے تمہیں نظر انداز کر کے بہت غلط کیا ہے۔ تم جو مجھ سے جڑے ہر رشتے کو محبت اور عزت دے رہی ہو تو میرا بھی فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں عزت اور محبت دوں۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ مجھے تم سے کب کیسے اور

کیوں محبت ہوئی۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ تمہاری محبت میرے وجود میں لہو بن کر دوڑتی ہے۔ ہر سانس کی ہر لے میں تم ہو۔ زندگی میں کچھ بھی نہ ہو تب بھی تمہارا ساتھ میری زندگی گلزار بنا سکتا ہے۔ تم میری زندگی میں آنے والا سب سے حسین اتفاق ہو شہوار... احمد شاہ۔ اور اس کا احساس مجھے کل رات ہوا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس کے قریب بیٹھا محبت کا اظہار کر رہا تھا۔

"میں نے یہ ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں تھاما تھا۔ دھوپ ہو یا چھاؤں آندھی ہو یا برسات میں ہر پل ہر لمحہ تمہارے ساتھ کھڑا رہوں گا۔ شہوار چاہے ساری دنیا تمہارا ساتھ چھوڑ دے، لیکن احمد شاہ تمہارا ساتھ مرتے دم تک نبھائے گا۔" اور اس کے اظہار پہ شہوار نے پرسکون ہو کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا تھا اور احمد شاہ نے محبت سے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار ڈال دیا تھا اور محبت کے اس اظہار پر شہوار احمد شاہ کا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ محبت کی بھینی بھینی خوشبو سے کمرہ مہک اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

گلابی جوڑے میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی احمد شاہ کی نظریں بار بار بھٹک کر اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں اور شاید وہ بھی پوری فرصت سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ گزرے کچھ سالوں میں ان دونوں کے درمیان محبت جیسے خوب صورت جذبے نے جنم لیا تھا اور پھر اس محبت نے شہوار اور احمد شاہ دونوں ہی کی زندگی میں حسین رنگ بھر دیے تھے۔ رنگوں نے اپنی بہار ان کی زندگی میں بھر دی تھی۔ ہر گزرتا دن ان کے رشتے کو مزید مضبوط کر رہا تھا۔ شہوار احمد شاہ کا محبت بھرا ساتھ پا کر پہلے سے بھی زیادہ حسین ہوتی چلی گئی تھی اور احمد شاہ وہ تو بے حد خوش تھا شہوار کی ہمراہی میں۔ اس کی محبت نے شہوار کی زندگی کے ہر خلا کو پر کر دیا تھا۔ وہ ایک بہترین شوہر تھا۔ اس وقت بھی وہ بڑے پیار سے وقتاً فوقتاً شہوار کے کنفیوز چہرے پہ نظریں مرکوز کیے جا رہا تھا اور اس کے یہ انداز شہوار کو بری طرح کنفیوز کر رہے تھے اس نے توجہ ہٹانے کے لیے اپنی چوڑیوں سے کھیلنا شروع کر دیا تھا۔

آج زرمینہ اور امینہ کا نکاح تھا۔ زرمینہ شہوار کے ماموں زاد بھائی اشعر کی دلہن بن چکی تھی جبکہ امینہ احمد شاہ کے بیسٹ فرینڈ ویزان علی کی دلہن بن گئی تھی۔ سب بہت خوش تھے احمد شاہ نے حویلی سے ہر جاہلانہ رسم کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اب کوئی لڑکی اس جاہلانہ رسم کی بھینٹ نہیں چڑھنی تھی۔ اندھیرے چھٹ گئے تھے شہوار ایک پیاری سی بیٹی علینہ شاہ کی ماں بن گئی تھی۔ اس کے علاوہ شہوار اپنا ایم ایس سی بھی مکمل کر چکی تھی اور اب اس نے گاؤں میں ہی گرلز کالج کھول لیا تھا۔ شبینہ شاہ بھی بہت خوش تھیں۔ ان کی تربیت رنگ لائی تھی اندھیرے دور ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے سانول شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور شبینہ شاہ ان کا ہر گناہ معاف کر چکی تھیں۔ دلاور شاہ بہت خوش تھے ان کی بیٹیاں بہترین گھروں میں رخصت ہو رہی تھی انہیں اب شہوار شاہ سے کوئی شکایت نہ تھی دیر سے ہی صحیح مگر زندگیاں معمول پہ آ گئی تھیں۔ اب گھڑی شاہ کی حویلی میں صرف خوشیوں کی گونج سنائی دیتی تھی آج جو سورج حویلی کے فلک پہ روشن ہوتا تھا اس کی کرنیں بہت روشن اور پر امید تھیں۔

"ممّا! بابا جانی آپ کو بلا رہے ہیں..." اسٹیج پہ چار سالہ علینہ شاہ جو کہ ایک بے حد پیاری اور معصوم بچی تھی... نے آ کر باپ کا پیغام دیا تھا۔ اس کا دل ایک دم دھڑکا تھا ان کی شادی کو چھ سال گزر چکے تھے، لیکن وہ آج بھی احمد شاہ کے سامنے جاتے ہوئے اتنی ہی کنفیوز ہوتی تھی جتنی پہلے گزرے سالوں میں احمد شاہ نے اسے بے حد محبت اور عزت دی تھی۔ ہر وہ چیز جس کی اسے ضرورت ہوئی وہ بن کہی پوری کر دیتا تھا۔ اس نے کبھی اس سے اپنی خواہشوں کا اظہار نہیں کرنا پڑا تھا وہ بن کہے سب جان لیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسوؤں کی نمی بھی اسے برداشت نہیں

تھی۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین شوہر تھا اور اپنی بیوی کو خوش رکھنا جانتا تھا۔

"کیا ہے یار کتنی دیر لگادی کب سے ویٹ کررہا ہوں تمہارا۔" احمد شاہ نے شہوار کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کہا تھا۔

"حد ہے۔ اتنے سارے گیسٹ بیٹھے تھے۔ ان کے بیچ آپ کی لاڈلی نے مجھے باآواز بلند آپ کا پیغام دیا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے مجھے کتنی شرم آئی تھی۔" اس نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا شرم کیوں آئی تمہارا شوہر ہوں۔ محبت کرتا ہوں تم سے بے حد۔ جب چاہوں بلا سکتا ہوں۔ کسی کو کیا اعتراض۔" اس نے شرارت سے کہا تھا۔

"اچھا یہ بتائیں کام کیا تھا۔" اس نے ہار مانتے ہوئے بلانے کی وجہ پوچھی۔

"کام کوئی بھی نہیں۔" اس نے معصومیت سے بولا تھا۔

"پھر بلایا کیوں آپ نے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"تمہیں دیکھنے کے لیے۔ اب اتنی خوب صورت لگو گی اور ہم پہ پہرے بٹھاؤ گی یہ تو ٹھیک نہیں ہے نا۔" اس نے شہوار کا ہاتھ پکڑ کر اسے خود سے قریب کیا تھا۔

"شاہ۔"

"جی شاہ کی جان۔"

"مجھے جانا!!! ہے۔"

"ہمم۔ چلی جانا۔ لیکن پہلے یہ تو بتادو کہ تم مجھے دیکھ کر نروس کیوں ہو رہی تھیں۔؟" وہ اس وقت فل شرارتی موڈ میں تھا۔ کبھی کبھی شہوار کو حیرت ہوتی کہ کیا یہ وہ ہی سنجیدہ سا احمد شاہ تھا۔

"اب آپ سب کے سامنے اس طرح دیکھیں گے تو میری جگہ کوئی بھی ہوتا وہ ایسے ہی نروس ہوتا۔" اس نے منہ بنا کر کہا تھا۔

"وہ تو جناب کسی اور کو دیکھنے کی اجازت ہے۔" وہ چہک کر بولا۔

"جی نہیں دیکھ کے تو دکھائیں آپ۔" وہ پورے حق سے بولی تھی اور خفا بھی ہوئی تھی اور اس کے انداز پہ احمد شاہ نے جاندار قہقہہ لگایا۔

"اچھا تو ایک نظم سناتا ہوں۔ صرف تمہارے لیے۔" وہ شوخ ہوا تھا۔

"جی نہیں مجھے نہیں سننی آپ اور تنگ کریں گے۔"

"پکا یار نہیں کروں گا سن لو نا۔"

"اچھا سنائیں۔" اس نے ہار مانی اور اس کے برابر ہی بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی مگر احمد شاہ وہاں سے اٹھا اور زمین پہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر شہوار کے مخروطی اور نرم ملائم ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیا تھا اور پھر محبت اور فسوں خیز آواز میں بولا۔

سنو اے ہمسفر میری۔
مجھے تم سے یہ کہنا ہے۔
مجھے تم سے محبت تھی
مجھے تم سے محبت ہے۔ میرے دن رات میں تم ہو۔
میری ہر بات میں تم ہو
خوشی کے جتنے موسم بھی
تمہارے ساتھ دیکھے ہیں
میرے جیون کا حاصل ہیں
تمہارے نام کے جگنو
تمہارے لمس کی خوشبو۔
تمہارے پیار کا جادو
میری رگ رگ میں شامل ہے
میں اپنی ذات کے چاہے
کسی موسم میں میں رہتا ہوں
ہر اک موسم تمہارا ہے
تمہارا ساتھ پیارا ہے
میرے ہر پل میں رہتی ہو
جو میرا دل ہے پاگل سا
اسی پاگل میں رہتی ہو۔
سنو تم سے یہ کہنا ہے
کہ تم میری محبت سے کبھی بدگمان مت ہونا
کہ میری زندگی کے سب راستے
جو سچ پوچھو تو
تم تک آتے ہیں
میں تم سے دور رہ جاؤں
یوں اب ممکن نہیں جاناں
سنو عہد محبت کی اب تجدید کرنی ہے
پرانی بات ہے لیکن
مجھے پھر بھی یہی کہنا ہے
مجھے تم سے محبت تھی مجھے تم سے محبت ہے
ہر اک موسم تمہارا ہے
تمہارا ساتھ پیارا ہے
سنو اے ہم سفر میری۔

احمد شاہ غزل ختم کر چکا تھا۔ لیکن اس کا فسوں شہوار کے چاروں طرف اب بھی پھیلا ہوا تھا اس کا گمبھیر لہجہ اس کا محبت بھرا انداز اس کی نگاہوں کا طلسم اس کا ہر ہر اک انداز محبت کی داستان بیاں کرتا تھا۔ وہ ہر لمحہ اس کی ہمراہی میں رب کا شکر ادا کرتی اسے اپنے نصیب پہ رشک ہوتا۔ اسے شاہ کی نظریں خود پہ محسوس ہوتیں تو وہ خود ہی سے محبت کرنے لگتی۔۔۔ وہ خوش قسمت تھی کہ زندگی کی راہوں میں احمد شاہ کی محبت اس کی ہمسفر تھی زندگی کے اندھیرے چھٹ گئے تھے وہ رب کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا کہ اسے ایسے ہمسفر سے نوازا گیا تھا جو محبت اور احساس کی دولت سے مالا مال تھا۔ اب ان کی گھر کی اور خاندان کی کوئی لڑکی جہالت کی بھینٹ نہیں چڑھتی تھی۔ وہ خوش تھی یہ سوچ کر کہ اس کی زندگی اس کی جان علینہ شاہ کا مستقبل روشن اور حسین تھا۔ صرف خوشیوں سے بھرا۔ زندگی کی نئی شروعات ہو چکی تھی۔ اب ہر راہ پھولوں سے سجی اور ہر لمحہ محبت تھا۔

☼ ☼

بقیہ: مقابل ہے آئینہ

ج: "بالکل بھی نہیں ہوتا جی۔"

س: "وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟"

ج: "ایسا کوئی کام نہیں جو آپ کرو اور دنیا کچھ نہ کہے چاہے وہ اچھا ہو یا برا دنیا اپنے مطلب کی بات نکال ہی لیتی ہے۔"

س: "آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟"

ج: "تو میں وہیں مر جاؤں گی ایک منٹ میں یا پھر اتنی ڈراؤنی چیخ ماروں گی کہ کتا خود ہی مر جائے گا (ہاہاہا)۔"

س: "آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟"

ج: "محض الفاظ ورنہ اس کا وجود نہیں ہے دنیا میں۔"

س: "کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟"

ج: "ان لوگوں کی جن کی وجہ سے میں سب دھوکے بازوں کو پہچان سکتی ہوں اور اس شخص کی جس کی وجہ سے سب نے اپنے چہروں سے نقاب اتارے۔"

س: "اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟"

ج: "جی نہیں۔"

س: "ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

ج: "شاید ہی کوئی ڈرامہ ہو جو میں چھوڑ دوں (ہاہاہا)۔"

س: "اگر دوست ناراض ہو جائیں تو کیسے مناتی ہیں؟"

ج: "میری فرینڈز کہتی ہے تمہیں منانا نہیں آتا تو مناتے مناتے خود ناراض ہو جاتی ہوں۔"

س: "حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟"

ج: "جب بچوں کے ساتھ کھیلتی ہوں۔"

س: "زندگی سے کیا سبق سیکھا؟"

ج: "یہی سبق سیکھا کہ انسان آپ کے ساتھ تب تک اچھا برتاؤ کرتے ہیں، جب تک ہم کرتے ہیں اگر ذرا سا پٹڑی سے اترے تو زمانہ ہمیں روند دیتا ہے ساری خوشیاں چھین لیتا ہے۔"

س: "ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟"

ج: "ایک فیصد بھی یقین نہیں رکھتی۔"

س: "کوئی ایسی بات، جو ہمیشہ ذہن میں رہتی ہے؟"

ج: "یہی کہ لوگ دوسروں کے ساتھ برا کرتے وقت یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہ خود کتنے پانی میں ہیں۔"

س: "کوئی آخری بات؟"

ج: "آخری بات یہی کہ وقت کے ساتھ سمجھوتہ نہ کریں لوگوں کے ساتھ کریں۔ انہیں اندھا کرنے کے بعد ہاتھ میں لاٹھی دینے کا احسان بھی مت کریں۔"

☆ ☆

القرآن..... زکواۃ

ارشاد باری تعالیٰ۔

"اور جو لوگ اس مال میں۔۔۔ جسے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انہیں عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں (اور اس کی زکوۃ ادا نہیں کرتے) وہ یہ سمجھ لیں کہ۔۔۔ ایسا مال ان کے حق میں خیر نہیں ہے بلکہ یہ ان کے لیے شر ہے۔۔۔ اور عنقریب (قیامت کے دن) ان کے گلے میں بخل سے جمع کیے ہوئے مال کا طوق پہنایا جائے گا۔" (آل عمران۔180)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کر کے رکھتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے' ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو (34) جس دن اس دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا' پھر اس سے ان لوگوں کی پیشانیاں اور ان کی کروٹیں اور اور ان پیٹھیں داغی جائیں گی' (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا! اب چکھو اس خزانے کا مزا جو تم جوڑ جوڑ کر رکھا کرتے تھے (سورۃ التوبہ۔ آیت نمبر 35'34)

احادیث..... زکواۃ

حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو عورت بھی اپنے گلے میں سونے کا ہار ڈالے گی (اور اس کی زکواۃ ادا نہ کرے گی) تو اس کی گردن میں قیامت کے دن اسی جیسا آگ ہار پہنایا جائے گا اور جو عورت بھی اپنے کان میں سونے کی بالی پہنے گی (اور اس کی زکواۃ نہیں دے گی) تو قیامت کے دن اس کے کان میں اسی جیسی آگ کی بالی پہنائی جائے گی۔ (ابو داود' نسائی' ترغیب ص ۲۷۲ ج ۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس شخص کو اللہ نے مال دیا ہو' پھر وہ اپنے مال کی زکواۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اس کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں آئے گا جو (شدت زہر سے) گنجا ہو گا اور اس کی آنکھوں پر دو سیاہ نقطے ہوں گے' یہ سانپ اس کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا' پھر وہ اس شخص کی باچھیں پکڑ کر کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں' میں تیرا خزانہ ہوں۔" (بخاری و مسلم' ترغیب ص ۳۴۹ ج ۱)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا

☆ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ حق کو باطل پر ترجیح دو خواہ حق سے تمہارا نقصان اور باطل سے فائدہ ہو۔

☆ بے شک اگر تم نے خواہش کو اپنا حاکم بنایا تو وہ تم کو بہرا اور اندھا کر دے گی۔

☆ ہر قسم کے شبہات تجھے حیرت و گمراہی میں ڈال دیں گے۔

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑپکا

تقسیم عمل

مسلمانوں میں چونکہ قحط الرجال تھا اس لیے جس شخص میں لوگ قیادت اور رہنمائی کی صلاحیت اور قوت دیکھتے اس سے ہر قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے تھے یعنی چاہتے تھے کہ جو شخص شاعر ہو وہی لیڈر بھی ہو' وہی صوفی بھی ہو' عالم بھی ہو' سپاہی بھی ہو۔

نتیجتاً "وہ اس قول کو نظر انداز کر کے" ہر کسے را بہر کارے ساختند" اقبال سے طنزاً" کہا کرتے تھے کہ تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر ہے جب

Watch Us On
YouTube

خالص شہد کی پہچان
Health Care Club

چہرے کی جھُریوں کا
بہت ہی آسان علاج
YouTube
Health Care Club

اس قسم کا سوال مولانا محمد علی جوہر نے اٹھایا تو علامہ اقبال نے کہا۔

"سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہو حق کرتے ہیں' وجد میں آتے ہیں' ناچتے ہیں' مضطرب ہوتے ہیں' بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر یہی کیفیت قوال پر طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں۔ میں گاتا ہوں' تم ناچتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کردوں" علامہ اقبال نے اسی طرح مزاحیہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے اسی طرح افراد میں بھی تقسیم عمل ہے۔ (آثار اقبال)

فضہ نور۔۔۔ روہڑی

کوزے میں دریا

☆ اگر آپ اچھے ہیں تو اسے ثابت کرنے میں وقت ضائع نہ کریں۔

☆ توبہ کا خیال خوش بختی کی علامت ہے کیونکہ جو اپنے گناہ کو گناہ نہ سمجھے وہ بد قسمت ہے۔

☆ انسان خاک کا بنا ہے اگر اس میں خاکساری نہیں تو اس کا کچھ ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

عابدہ غوری۔۔۔ کوٹ چھٹہ

لیلیٰ

کہنا سوال میاں مجنوں نوں
تیری لیلا تے رنگ دی کالی اے
دتا جواب میاں مجنوں نے
تیری اکھ نہ ویکھن والی اے
قرآن پاک دے ورق چٹے
اتے لکھی سیاہی کالی اے
چھڈ وے بلھیا دل دے جھگڑا
بے کی کالی کی گوری اے

(بلھے شاہ)

قرآن کریم میں ریاضیاتی معجزہ

☆ لفظ "دنیا" اور "آخرت" دونوں مساوی طور پر 115 دفعہ ہی دہرائے گئے ہیں۔

☆ لفظ "شیطان" 88 مرتبہ جبکہ "ملائکہ" یعنی فرشتے کو بھی 88 دفعہ ہی دہرایا گیا ہے۔

☆ لفظ "ایمان" 25 دفعہ اور لفظ "کفر" بھی اتنی مرتبہ ہی استعمال ہوا ہے۔

☆ لفظ "جنت" اور لفظ "جہنم" یکساں تعداد میں یعنی 77 مرتبہ دہرائے گئے ہیں۔

☆ لفظ زکوٰۃ یعنی پاک کرنا' کو قرآن مجید میں 32 دفعہ دہرایا گیا ہے۔ جبکہ لفظ "برکاۃ" یعنی برکت کو بھی 32 دفعہ ہی استعمال کیا گیا ہے۔

☆ لفظ "خمر" یعنی شراب پینے والا' بھی 6 مرتبہ ہی دہرایا گیا ہے۔

☆ لفظ "لسان" یعنی زبان کو 25 دفعہ لکھا گیا ہے اور لفظ "خطاب" یعنی بات یا کلام' کو بھی 25 مرتبہ ہی دہرایا گیا ہے۔

☆ لفظ "منفعۃ" یعنی فائدہ اور اس کے متضاد لفظ "خسران" یعنی "خسارہ نقصان" کو بھی یکساں طور پر 50'50 مرتبہ ہی دہرایا گیا ہے۔

☆ لفظ "مصیبۃ" یعنی تکلیف یا غم 75 مرتبہ استعمال ہوا ہے اور لفظ "شکر" یعنی شکر گزار ہونا' حق بات کو ماننا بھی 75 مرتبہ ہی دہرایا گیا ہے۔

افشاں سمیع۔۔۔ کراچی

اچھی اور سچی باتیں

○ مرد اگر دین دار ہو جائے تو دین گھر کی دہلیز تک پہنچ جاتا ہے اور اگر عورت دین دار ہو جائے تو دین نسلوں تک پہنچ جاتا ہے۔

○ جب عقل مند عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو اس کی عقل جوان ہو جاتی ہے اور جب جاہل عمر رسیدہ ہو جاتا ہے تو اس کی جہالت جوان ہو جاتی ہے۔

○ ہر میٹھی چیز میں زہر ہے سوائے شہد کے اور ہر

بشریٰ محمود

فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

امجد اسلام امجد کی نظم

خواب ٹوٹ جاتے ہیں،

خواب ٹوٹ جاتے ہیں
بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
دوست دار لہجوں میں سلوٹیں پڑتی ہیں
اک ذرا سی رنجش سے
شک کی زرد ٹہنی پر پھول بدگمانی کے
اس طرح سے کھلتے ہیں
زندگی سے پیارے بھی
اجنبی سے لگتے ہیں غیر بن کے ملتے ہیں
عمر بھر کی چاہت کو آسرا نہیں ملتا
خاموشی کے وقفوں میں
بات ٹوٹ جاتی ہے اور سرا نہیں ملتا
معذرت کے لفظوں کو روشنی نہیں ملتی
لذت پذیرائی پھر کبھی نہیں ملتی
خواب ٹوٹ جاتے ہیں
واہموں کے سائے سے عمر بھر کی محنت کو
پل میں ٹوٹ جاتے ہیں
اک ذرا سی رنجش سے
ساتھ چھوٹ جاتے ہیں بھیڑ میں زمانے کی
ہاتھ چھوٹ جاتے ہیں
خواب ٹوٹ جاتے ہیں

دانیہ عامر، کی ڈائری میں تحریر

احمد فراز کی نظم

عقیدت،

میں کتنی وارفتگی سے اُسے سنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
مری زندگی کی حکایتیں تھیں
میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنہیں میری آرزو تھی میری طلب تھی

کہ جن سے میری محبتوں کا رہا تعلق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں
میں کہہ رہا تھا
کہ ان میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر انہیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں
میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے لبوں سے سنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سنتی رہی
کہ جیسے میرے لبوں پہ
کسی مقدس ترین صحیفے کی آیتیں تھیں

ثریا شاہ، کی ڈائری میں تحریر

مصطفیٰ زیدی کی غزل

جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو مل گئی دلِ شاہانہ چھٹ گیا

کوئی تو غمگسار تھا کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھٹ گیا

دنیا تمام چھٹ گئی پیمانے کے لیے
وہ مے کدے میں آئے تو پیمانہ چھٹ گیا

کیا تیز پا تھے دن کی تمازت کے قافلے
ہاتھوں سے رشتۂ شبِ افسانہ چھٹ گیا

اک دن حساب ہوگا کہ دنیا کے واسطے
کن صاحبوں کا مسلکِ رندانہ چھٹ گیا

سیدہ لوبا سجاد، کی ڈائری میں تحریر

فرحت عباس شاہ کی غزل

تمہارا پیار مرے چہار سو ابھی تک ہے
کوئی حصار مرے چار سو ابھی تک ہے

بچھڑتے وقت جو تم سونپ کر گئے تھے مجھے
وہ انتظار مرے چار سو ابھی تک ہے

تو خود ہی جانے کہیں دور کھو گیا ہے مگر
تری پکار مرے چار سو ابھی تک ہے

میں جب بھی نکلا مرے پاؤں چھید ڈالے گا
جو خار زار مرے چار سو ابھی تک ہے

میں اب بھی گرتے ہوئے پانیوں کی قید میں ہوں
اک آبشار مرے چار سو ابھی تک ہے

کوئی گمان مجھے تم سے دور کیسے کرے
کہ اعتبار مرے چار سو ابھی تک ہے

فرزانہ تبسم، کی ڈائری میں تحریر

صوفی تبسم کی غزل

یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقفِ اضطراب
یہ کیا کہ ایک دل کو شکیبا نہ کر سکو

ایسا نہ ہو یہ درد بنے دردِ لا دوا
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کر سکو

شاید تمہیں بھی چین نہ آئے مرے بغیر
شاید یہ بات تم بھی گوارا نہ کر سکو

کیا جانے پھر ستم بھی میسر ہو یا نہ ہو
کیا جانے یہ کرم بھی کرو یا نہ کر سکو

اللہ کرے جہاں کو مری یاد بھول جائے
اللہ کرے کہ تم کبھی ایسا نہ کر سکو

میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو

شگفتہ سلیمان

اِرم کمال ______ فیصل آباد

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے ہی تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

ثمرہ، اقرا ______ کراچی

تیری یادوں سے بچ کر نکلوں مجھے ترکیب دے کوئی
میری جانب سے ہر رستہ تیری جانب نکلتا ہے

سیدہ نسیبت زہرا ______ کھروڑ پکا

اس سمت سمیٹوں تو بکھرتا ہے ادھر سے
دکھ دیتے دیتے یار نے دامن نہیں دیکھا

نفقہ نور ______ روہڑی

چاہت بھرے وہ لفظ اور ہر لفظ میں دعا محسن
مقروض کر دیا ہمیں کسی کے خلوص نے

گیلانی سسٹرز ______ کھروڑ پکا

پھر یوں ہوا کہ ساتھ تیرا چھوڑنا پڑا
ثابت ہوا کہ لازم و ملزوم کچھ نہیں

سیدہ ثریا سجاد ______ کھروڑ پکا

چاہت کے کشکول اٹھا کر، رنج و الم کے ڈھول بجا کر
در در پھرنا ٹھیک نہیں ہے سنو محبت بھیک نہیں ہے

حنا کرن ______ پتوکی

صرف اسے اتنا کہہ دینا وصی
میں اس کے بغیر تنہا نہیں ادھورا ہوں

حفصہ ثمر بٹ ______ گجرات

کبھی شکووں کا تھا سلسلہ کبھی راحتوں میں گزر گئے
وہ جو دن تھے میرے شباب کے تیری چاہتوں میں گزر گئے
کبھی رازداں نے ستم کیا، کبھی خود رقیب سے جا ملے
وہ جو لمحے تھے میرے پیار کے وہ رقابتوں میں گزر گئے

نادیہ، بخمہ ______ گلستان جوہر

شہرِ صنم میں ایسی بھی یہ زندگی رہی
اس سے گریز کیا خود سے بھی اک بے خودی رہی
مجھ کو وہ ڈھونڈتا رہا میرے وجود میں
اندر میں کر اس کی ذات کے اندر چھپی رہی

نسرین یوسف ______ شیخوپورہ

رفاقتوں میں وقار کھونا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
یہ دن میں سونا شب میں روتا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
جو بیچ دریا میں چھوڑ آتے تو بات اتنی سی آتی ان پر
یہ اس کا ساحل پہ لا ڈبونا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

صدف عمران ______ کراچی

میری خاموشیوں کا راز مجھے خود نہیں معلوم
نہ جانے کیوں لوگ مجھے مغرور سمجھتے ہیں

فضہ یوسف ______ فیصل آباد

وہ مجھ کو چھوڑ کے جس آدمی کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

ندا طارق ______ کراچی

تو جو آیا ہے ذرا سوچ کے ملنا مجھ سے
پھر نہ ہو جائے تجھ سے نقصان مجھے

سدرہ عاصم ______ کراچی

عشق کیا نہیں جاتا ناداں
ایسے ہی بس ہو جاتا ہے

مدیحہ فہمید ______ کراچی

ملاقات ٹھہری تھی ہو کا عالم تھا
اپنے سینے میں ____ صدا دل تھا
اب عمر لعنت گزار کہانی ہے
ہاں کبھی مسئلہ دل تھا

ثمینہ تاج ___ کراچی
اپنے نصیب کا تو مل ہی جائے گا یارب
وہ چیز عطا کر جو تقدیر میں نہیں

مریم ___ لاہور
پھر کبھی لوگوں کی باتوں میں نہیں وہ
دیکھ لینا مجھ سے مل کر ٹھیک ہو جائے گا وہ
صلح تو کرے گا آ کے مجھ سے لیکن اس کے بعد
جب ملے گا بس یہی احسان جتائے گا وہ

حورین سلمان ___ شیخوپورہ
جو لگ چکی ہے گرہ دل میں کھل نہیں سکتی
تو لاکھ ملتا رہے ہم سے دوستوں کی طرح

ماہم شہباز ___ گوجرہ
سزا کے طور پر ہم کو قفس ملا جالب
بہت تھا شوق ہمیں آشیاں بنانے کا

انیلا ادریس ___ کراچی
وفا کے وعدے وہ سارے بھلا گیا چپ چاپ
وہ میرے دل کی دیواریں ہلا گیا چپ چاپ
غم حیات کے تپتے ہوئے بیاباں میں
وہ ہم کو چھوڑ کے تنہا چلا گیا چپ چاپ

عمرہ عاقب ___ کراچی
نہ جانے کون سا فقرہ کہاں رقم ہو جائے
دلوں کا حال بھی اب کون کس سے کہتا ہے
مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

آسیہ جاوید ___ علی پور چٹھہ
زندگی کی دھوپ میں اس سر پہ اک چادر تو ہے
فکر دیواریں شکستہ ہوں، پر اپنا گھر تو ہے
جو بھی آئے گا یہاں دستک تو دے کر آئے گا
اک عدد دیوار تو ہے، اک حصارِ در تو ہے

عائشہ ___ گوجرہ
کچھ خاص نہیں بس اتنی سی ہے داستان محبت میری
ہر رات کا آخری خیال، ہر صبح کی پہلی سوچ ہو تم

کنزیٰ، سائرہ انمول ___ پھپھوکی ملیاں
سجدوں میں گزار دوں اپنی ساری زندگی فراز
اک بار وہ کہہ دے مجھے دعاؤں سے مانگ لو

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ___ کراچی
بیٹھا ہو گا کہیں جھوٹوں میں وہ جھوٹا بن کر
کوئی سچا بھی اگر جھوٹ کے اس دور میں ہے

آمنہ محمد نوید ___ پھپھوکی ملیاں
لمحوں میں قید کر دے جو صدیوں کی چاہتیں
حسرت رہی کہ اپنا بھی کوئی ایسا طلب گار ہو

سعدیہ، مریم ___ کراچی
ہجر لازم ہے تو پھر وصل کا وہ وعدہ کیسا
بعد خزاں کی رُت پہ بہاروں کا ارادہ کیسا
زخم دے کر تو تم درد کی شدت پوچھو
درد تو درد ہے تھوڑا یا زیادہ کیسا

صائمہ نجمی ___ کراچی
آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اسماء تبسم ___ واہ کینٹ
ننھی میں چہکتی ہوئی چڑیا کی طرح ہے
شوکیس میں رکھی ہوئی گڑیا کی طرح ہے
باہر سے جو بے خوف و خطر لگتی ہے اختر
اندر سے وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح ہے

حبیبہ خان، ظہیرہ ممتاز جوکھیو ___ کراچی
اگر ہم حسرتوں کی قبر میں ہی دفن ہو جائیں
تو پھر کتبوں پہ لکھ دینا محبت مر نہیں سکتی
پرانے رابطوں کو پھر نئے وعدے کی خواہش
ذرا اک بار تو کہنا محبت مر نہیں سکتی

نازیہ کنول نازی ___ ہارون آباد
درد ہی درد ملے بھیک میں الفت کی ہمیں
پیار جس سے کیا ہم نے جسے چاہا لوگو
زندگی تھی تو کبھی چین سے جینے نہ دیا
بعد مرنے کے زمانے نے سراہا لوگو

کڑوی چیز میں شفاء ہے سوائے زہر کے۔

علم وہ نہیں جو تم نے سیکھا علم تو وہ ہے جو تمہارے علم و کردار سے نظر آتا ہے۔

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

ماں

ایک شخص کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ماں کو گالیاں دیتا ہے۔ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو بلوایا اور حکم دیا کہ پانی سے بھری ہوئی مشک لائی جائے۔ پھر وہ مشک اس کے پیٹ پر خوب کس کر بندھوا دی اور اس کو کہا کہ اسے اسی مشک کے ساتھ چلنا پھرنا بھی ہے اور کھانا پینا بھی ہے اور سونا جاگنا بھی ہے۔ ایک دن گزرا تو وہ بندہ بلبلاتا ہوا حاضر ہوا کہ اس کو معاف کر دیا جائے وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پانی آدھا کر دیا مگر مشک بدستور اس کے پیٹ پر بندھی رہنے دی۔ مزید ایک دن بعد وہ بندہ ماں کو بھی سفارشی بنا کر ساتھ لے آیا کہ اس کو معاف کر دیا جائے اور مشک کو ہٹا دیا جائے وہ دو دن سے نہ تو سو سکا ہے اور نہ ہی ٹھیک سے کچھ کھا سکا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کی ماں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس نے تجھے پیٹ کے باہر نہیں.... بلکہ پیٹ کے اندر اتنے ہی وزن کے ساتھ نو ماہ اٹھا کر رکھا ہے۔ نہ وہ ٹھیک سے سو سکتی تھی اور نہ ٹھیک سے کھا سکتی تھی' پھر تو اسے موت کی سی اذیت دے کر پیدا ہوا اور دو سال تک اس کا خون پیتا رہا اور جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس کے لیے تیرے منہ سے گالیاں نکلتی ہیں۔ اگر آئندہ یہ شکایت موصول ہوئی تو تجھے نشان عبرت بنا دوں گا۔

ثنا شہزاد۔۔۔ کراچی

خواہشیں اور مقاصد

چھوٹے ذہنوں میں ہمیشہ خواہشیں اور بڑے ذہنوں میں ہمیشہ مقاصد ہوا کرتے ہیں۔ (خلیل جبران)

کام

اشفاق احمد اپنے مضمون چھوٹا کام میں لکھتے ہیں۔
میں نے بابا جی سے پوچھا کہ انبیاء کو بکریاں چرانے کا حکم کیوں دیا جاتا تھا۔ تو بابا جی نے فرمایا کہ انہیں چونکہ آگے چل کر زندگی میں نہ ماننے والے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان کا کفار سے واسطہ پڑتا تھا۔ اس لیے ان کو بکریوں کے ذریعے سے سکھایا جاتا تھا کیونکہ دنیا میں جانوروں میں نہ ماننے والا جانور بکری ہی ہے اپنی مرضی کرتی ہے۔

فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ گجرات

اللہ کی مصلحت

1 : اللہ کے ہر فیصلے پر مطمئن رہو بے شک اللہ وہ نہیں دیتا جو آپ کو اچھا لگے بلکہ وہ دیتا ہے۔ جو آپ کے لیے اچھا ہوتا ہے۔

2 : دشمن سے ہر وقت بچے رہو لیکن دوست سے اس وقت بچو جب وہ آپ کی بے جا تعریف کرے۔

3 : کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کسی مسلمان کی عزت پر حملہ ہے۔

سیدہ لوبا سجاد۔۔۔ کہروڑ پکا

یادوں کے کنول

وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار فقط خواب ہی خواب
جو بھی رت آئے کھلا کرتے ہیں
تیری یادوں کے کنول
تیری جدائی کے گلاب

(امجد اسلام امجد)

حورین زینب۔۔۔ کہروڑ پکا

میسجز

ایک لڑکے کی منگنی ایک بہت خوب صورت لڑکی سے ہوئی وہ دونوں دن رات ایس ایم ایس پر باتیں کرتے رہتے تھے پھر ان کی شادی ہو گئی۔
لڑکا لڑکی کا گھونگھٹ اٹھا کر بولا "تم واقعی بہت خوب صورت ہو تمہیں کیا گفٹ کروں؟"
لڑکی شرماتے ہوئے بولی۔
"او لے ہفتے لاول پنڈی' اسلام آباد تلیں تھوب دھومیں دیں۔"

بے بی

طلاق کے مقدمے میں ایک خوب صورت عورت نے جج کو بتایا۔
"ہم دونوں شادی کے بعد ایک سال تک بے حد خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے مگر پھر بے بی کے آنے کے بعد روز بہ روز ہماری زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔"
جج نے پوچھا "بے بی لڑکا ہے یا لڑکی؟"
عورت نے جواب دیا "اٹھارہ سال کی حسین دوشیزہ ہے' ایک ماہ پہلے ہمارے سامنے والے مکان میں آکر رہنے لگی۔"

ارم کمال۔۔۔۔ فیصل آباد

مقصد

انگریزی کی کلاس میں استانی نے جان سے کہا کہ وہ ڈائریکٹ آبجیکٹ (براہ راست مقصد ظاہر کرنے والا) کوئی فقرہ سنائے۔
جان نے کہا۔ "مس! ہر شخص کا خیال ہے کہ آپ بہت خوب صورت ہیں۔"
استانی شرم سے گلابی ہو کر لمحہ بھر کے لیے ساری گرامر بھول گئی اور بولی۔ "شکریہ جانی! بہت اچھا فقرہ ہے۔"
پھر پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ اس میں براہ راست مقصد کیا ہے۔"
"مس! اگلے ماہ کے رپورٹ کارڈ میں اچھے نمبر حاصل کرنا" جانی نے معصومیت سے جواب دیا۔

عائشہ جنجوعہ۔۔۔ تونسہ شریف

انعام

سردار نے امرود لیے تو اس میں سے کیڑا نکلا۔
سردار نے دکان دار سے کہا "اس میں کیڑا نکلا ہے۔"
دکان دار نے کہا "سردار صاحب یہ تو اپنے نصیب کی بات ہے۔ کیا پتا اگلی بار موٹر سائیکل نکلے۔"
سردار نے فوراً کہا "پانچ کلو اور دے دو۔"

ثریا شاہ۔ کہروڑ پکا

قابل دید

ایک سرمایہ دار نے پاگل خانے کی انتظامیہ کو ایک بڑا تالاب تیار کرنے کے لیے معقول رقم دی۔ اس کی خواہش تھی کہ پاگل خانے کے ذہنی مریض پیراکی اور مچھلی کے شکار کا حقیقی لطف اٹھائیں۔ تالاب کی تعمیر کے چند ہفتے بعد اس نے ایک منتظم سے پوچھا "مریضوں نے تالاب کو پسند کیا۔"
"بے حد پسند کیا جناب" منتظم نے کہا۔ "کچھ تو کئی کئی گھنٹے نہاتے ہیں کچھ تیرتے رہتے ہیں۔ اور کچھ

مریض دن بھر ڈور ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انتظامیہ سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ تالاب میں کچھ مقدار میں پانی اور دو چار مچھلیاں بھی ڈلوا دی جائیں۔"

فوزیہ ثمریٹ۔۔۔ گجرات

کہکشاں کی اولاد

ایک پڑھا لکھا شہرزدہ نوجوان چھٹی پر گاؤں آیا اور اپنے دیہاتی والد کو اپنے ساتھ تفریح کے لیے مرغزار لے گیا۔ وہاں پھولوں سے لدے ہوئے ایک وسیع سبزہ زار میں دونوں نے مل کر خیمہ نصب کیا، گھومے پھرے، کھانا کھایا اور شب بسری کے لیے خیمے میں سو گئے۔

رات گئے باپ نے بیٹے کو گہری نیند سے جگایا اور کہا "اوپر دیکھو۔۔۔ کیا نظر آرہا ہے۔"

بیٹے نے گہرا سانس لے کر کہا "تاروں بھرا آسمان ۔۔۔ میرے علم فلکیات کی رو سے اس پراسرار آسمان میں اربوں ستارے، لاکھوں کہکشائیں اور نظام بکھرے ہوئے ہیں۔۔۔ ہمارا علم ابھی تک پوری طرح ان کا احاطہ نہیں۔۔۔!"

باپ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے بیٹے کو ایک تھپڑ رسید کر کے غصے سے کہا "ابے کہکشاں کی اولاد! کوئی ہمارا خیمہ چرا کر لے گیا ہے اور ہم کھلے آسمان تلے پڑے ہیں؟"

کہکشاں انجم۔۔۔ فیصل آباد

لاعلاج

ایک عورت نے ایک دن اپنے شوہر کا موبائل چیک۔ لڑکیوں کے نام کچھ اس طرح سیو کیے ہوئے تھے۔

آنکھوں کا علاج۔۔۔

باتوں کا علاج۔۔۔

دل کا علاج۔۔۔

بیوی نے نہایت غصے میں اپنا نمبر ڈائل کیا تو اسکرین پر آیا۔ "لاعلاج"۔

ارم طاہر۔۔۔ گجرات

کما کر

فقیر "کچھ دے دو"
آدمی "ٹماٹر کھاؤ"
فقیر "کھانا ہی دے دو"
آدمی "ٹماٹر کھاؤ"
فقیر "اچھا روٹی ہی دے دو۔"
آدمی "ٹماٹر کھاؤ۔"

فقیر نے حیرت سے کہا "آخر ٹماٹر ہی کیوں کھاؤں۔"

آدمی کی بیوی بولی "یہ تو تتلا ہے کہہ رہا ہے کما کر کھاؤ۔"

صدف کنول۔۔۔ قصور

غیب کی آواز

ایک آدمی گلی میں جا رہا تھا کہ اچانک آواز آئی "رک جاؤ"

آدمی رکا ہی تھا کہ اس کے آگے ایک اینٹ آکر گری۔ اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

کچھ دن بعد وہ سڑک پار کرنے لگا تھا کہ پھر وہی آواز آئی۔

"خبردار! یہیں رک جاؤ"

وہ رک گیا اور اسی وقت ایک گاڑی اس سے ایک انچ آگے سے گزر گئی۔

آدمی کو پچھلا واقعہ یاد آگیا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔ "کون ہو تم"

"آواز آئی "تمہارا نگران فرشتہ۔"

آدمی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے بولا۔

"حضرت آپ میرے نکاح کے وقت کہاں چھپ گئے تھے؟"

صبا خان۔۔۔ بہاولپور

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

کرائے کا مکان

بیمار پڑنے کے صدہا نقصانات ہیں مگر ایک فائدہ بھی ہے' وہ یہ کہ اس بہانے اپنے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ بہت سی کڑوی کسیلی باتیں جو عام طور سے ہونٹوں پر لرزہ کر رہ جاتی ہیں' بے شمار دل آزار فقرے جو "خوفِ فسادِ خلق" سے حلق میں اٹک کر رہ جاتے ہیں' اس زمانے میں یار لوگ نصیحت کی آڑ میں "هوالشافی" کہہ کر بڑی بے تکلفی سے داغ دیتے ہیں۔ پچھلے سنیچر کی بات ہے۔ میری عقل داڑھ میں شدید درد تھا کہ ایک روٹھے ہوئے عزیز جن کے مکان پر حال ہی میں قرض کے روپے سے چھت پڑی تھی لقا کبوتر کے مانند سینہ تانے آئے اور فرمانے لگے۔

"ہیں آپ بھی ضدی آدمی! لاکھ سمجھایا کہ اپنا ذاتی مکان بنوا لیجیے مگر آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

طعنے کی کاٹ درد کی شدت پر غالب آئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بھائی! میری عقل تو اس وقت کام نہیں کرتی۔ خدارا! آپ ہی بتایئے۔ کیا یہ تکلیف صرف کرایہ داروں کو ہوتی ہے؟"

ہنس کر فرمایا۔ "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کرائے کے مکان میں تندرستی کیونکر ٹھیک رہ سکتی ہے۔" کچھ دن بعد جب انہی حضرت نے میرے گھٹنے کے درد کو بے دودھ کی چائے پینے اور رمی کھیلنے کا شاخسانہ قرار دیا تو بے اختیار ان کا سر پیٹنے کو جی چاہا۔

(مشتاق احمد یوسفی۔۔۔۔ چراغ تلے)

دانیہ عامر۔۔۔ کراچی

کلاس فیلوز

میں اپنے اسکول فیلوز کے ساتھ تقریباً" پچاس برس کے وقفے کے بعد۔۔۔ پہلی بار ملنے سے سخت گھبراتا ہوں۔۔۔ بلکہ شدید ناپسند کرتا ہوں کہ کسی محفل میں' شادی کی تقریب میں ایک صاحب پتا نہیں کہاں سے نمودار ہو کر یک دم مجھ سے لپٹ جاتے ہیں۔ میں انہیں زبردستی الگ کر کے انہیں دیکھتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک' نہ منہ میں دانت' نہ پیٹ میں آنت بابا جی سر ہلا رہے ہیں' جوان کے ہلانے سے نہیں خود بہ خود ہلتا جا رہا ہے اور وہ کہتے ہیں۔

"اے مستنصر تو نے مجھے پہچانا نہیں؟" میں انکار میں سر ہلاتا ہوں تو وہ میرے کندھے پر زوردار دھوپ رسید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اوئے ہم دونوں کلاس فیلو تھے مسلم ماڈل اسکول میں چھٹی جماعت میں یاد نہیں؟" مجھے شدید دھچکا لگتا ہے کہ اگر یہ میرے کلاس فیلو ہیں تو میں بھی اسی نوعیت کا بابا ہو چکا ہوں تو ایک بزرگ سا اور میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہوں۔

(مستنصر حسین تارڑ)

صدف سمیع۔۔۔۔ کراچی

جان سے پیارا

"مجھے معلوم کرنا ہے دادا! دل بند ہو جانا کسے کہتے ہیں۔ آپ کو بتانا ہی پڑے گا مجھے۔"

"جب۔۔۔ جب جان سے پیارا کوئی تکلیف میں ہو میری بچی" دادا کو بولنا پڑا۔ "اور جان سے پیارا کون ہوتا ہے؟" "تم ہو مجھے جان سے پیاری۔۔۔ تم" ان کی اپنی آواز

کانپ کر رہ گئی۔

"ہونہہ دل تب بند نہیں ہوتا جب جان سے پیارا تکلیف میں ہوتا ہے 'یہ دل تب بند ہونے لگتا ہے جب کوئی جان سے پیارا جان چھڑا لیتا ہے۔ جب وہ خود سے دور کر دیتا ہے... جب وہ منہ پر تھپڑ مار دیتا ہے اور جب وہ... جب وہ کہتا ہے "جاؤ کنج سے تم میرے لیے مر گئیں" اور جاننا چاہیں گے کیا ہوتا ہے جب وہ کہہ دیتا ہے تو مر جانے کو دل چاہتا ہے... دل چاہتا ہے حلق میں ہاتھ ڈال کر سانسیں کھینچ لیں اور زندگی سے جڑا ان کا تعلق کاٹ ڈالیں' جسم چیر کر دل باہر نکال پھینکیں اور رگوں کو چھید کر ان میں دوڑتا خون بہا ڈالیں۔"

(سمیرا حمید۔۔۔ یارم)
رمشا سجاد۔۔۔ اوکاڑہ

محبت

دنیا کی ہر نئی محبت اپنی جگہ خود بناتی ہے۔ کوئی بھی نئی محبت پچھلی محبت کے اثرات کو نہیں مٹا سکتی' نہ ہی اس کی جگہ لے سکتی ہے۔ شاید محبت کی مثال بھی بہتے پانی جیسی ہے' جو ہر بار اپنا راستہ خود بناتا ہے۔

(ہاشم ندیم)
فائزہ کرن۔۔۔ پاکپتن

اولاد کی ضرورت

اولاد کو صرف اچھی ماں چاہیے ہوتی ہے۔ ان کو اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ وہ کتنی اچھی مصورہ کتنی اچھی مصنفہ یا کتنی اچھی اداکارہ ہے اور دنیا نے اس کو کہاں بٹھایا ہوا ہے اور ماما جان! ایک انسان اور جانور کی ماں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ پیدا تو جانور بھی کر لیتا ہے بچہ۔ مگر جانور تربیت نہیں کر سکتا' وہ اولاد پیدا کر کے چھوڑ دیتا ہے اور مریم بھی یہی کر رہی ہے۔ اس کو زینب میں کوئی دلچسپی نہیں۔ کورنس اور میں اس کو پال رہے ہیں۔ ایسی ماؤں کے پیروں کے نیچے تو کوئی جنت تلاش کرنے نہیں جاتا اور جنت کسی دوسری دنیا میں نہیں ملتی۔ اچھی ماں اپنی اولاد کو اس دنیا میں جنت دے دیتی ہے۔ اولاد کو جینے کا گر سکھا دیا تو آپ نے اس کی زندگی جنت بنا دی۔

(عمیرہ احمد۔۔۔ لاحاصل)
شازیہ اعجاز۔۔۔ فیصل آباد

گدھا

گدھے دو قسم کے ہوتے ہیں' دو ٹانگوں والے اور چار ٹانگوں والے آج تک ہمارے ہاں گدھے سے کوئی خاص کام نہیں لیا گیا۔ صرف دوسروں کو گالیاں دینے کے کام آتا ہے شادی میں بھی ہم گھوڑوں پر بیٹھتے ہیں۔ گدھے پر اس لیے نہیں بیٹھتے کہ لڑکی والوں کو دولہا پہچاننے میں دشواری نہ ہو۔ ہمارے ایک مشہور صحافی کے گھر جو تصویر لگی ہوئی ہے اس میں موصوف گدھے پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی بچیاں ہر آنے جانے والے کو بتاتی رہتی ہیں کہ انکل ان میں جو اوپر بیٹھے ہوئے ہیں وہ ہمارے ابو ہیں۔ گدھوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیس سال بعد بھی بولیں تو ڈھینچوں ہی بولیں گے اور یہ دنیا کی ہر زبان میں کر سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر یونس بٹ۔۔۔ افراتفریح)
فوزیہ ثمروٹ۔۔۔ کراچی

بے بسی

بعض اوقات زندگی میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب غیر حاضران دیکھی اشیاء اچانک پیدا ہونے والی غیر یقینی صورت حال اچھے خاصے مضبوط اعصاب کے مالک کو بھی اتنا بھی بے بس اور لاچار بنا دیتی ہے کہ انسان خود اپنی ذات کے اڑتے بکھرتے پرزوں کو بھی یکجا کرنے کی کوشش میں ہانپنے لگتا ہے۔

(فاخرہ گل۔۔۔ میرے ہمنوا کو خبر کرو)
نعیمہ خان۔۔۔ لاڑکانہ

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جارہے ہیں۔

ذوالقرنین

سیدہ نگہت نقوی..... فیصل آباد

س۔ ارے کہیں آپ رشوت تو نہیں لیتے... جتا دیجیے کیا روانہ کروں... دیکھیے اس مرتبہ جواب نہ دیا تو ہم بالکل نہیں بولیں گے؟

ج۔ رشوت کے بغیر بھی تو کوئی بات بن سکتی ہے۔

روبینہ جبیں..... لاہور کینٹ

س۔ اب پتا چلا ہمارے سوال کہاں گول ہو جاتے ہیں یہ سب عینک کا کیا دھرا ہے ہمارے جواب عینک اتار کر دیا کرو۔

ج۔ سوال ہی نظر نہیں آرہا۔

س۔ اوہو یاد آیا کہ تمہاری شکل کافی جانی پہچانی معلوم دیتی ہے۔ دراصل تمہاری صورت ہمارے سابقہ نوکر سے کافی ملتی جلتی ہے جو پچھلے اپریل سے غائب ہے کہیں تم وہی تو نہیں؟ اگر یہ سچ ہے تو تم فوراً "گھر" پہنچ جاؤ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ تمہیں نوکری پر دوبارہ بحال کر دیا جائے گا۔

ج۔ مسمی ذوالقرنین کو اس خط کے ساتھ واپسی کا کرایہ نہیں ملا اسی لیے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا جارہا ہے۔

شازیہ تاج..... جیکب آباد

س۔ دل ٹوٹ جائے تو جینے کا مزا چلا جاتا ہے اور اگر کسی کا اعتماد ٹوٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟

ج۔ سیاپی پینے کا مزا چلا جاتا ہے۔

حنا یوسف..... گجرات

س۔ سنا ہے اگر کالی بلی سامنے سے نکل جائے تو برا ہوتا ہے اگر کالا آدمی نکل جائے تو کیا ہوتا ہے؟

ج۔ اچھا ہوتا ہے۔

س۔ فرض کیجیے آپ کو پوری دنیا کی حکومت اور بادشاہی مل جائے تو آپ سب سے پہلے کیا کریں گے؟

ج۔ فرض ہی تو نہیں کر سکتا۔

روبینہ شاہین..... گجرات

س۔ دلہن رخصتی کے وقت اتنا روتی کیوں ہے؟

ج۔ دوسرے گھر پر راج کرنے کے خیال سے نندوں اور ساس پر حکم چلانے کے خیال سے شوہر نامدار کو تصور میں چلاک پاکر۔

زہرہ شہناز..... رحیم یار خان

س۔ تصویر میں آپ نے وگ پہنی ہے یا آپ کے اصلی بال ہیں؟

ج۔ اصلی بالوں کی وگ ہے۔

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

امید کرتی ہوں کہ بفضل خدا خیریت سے ہوں گی' کافی عرصے بعد حاضری دے رہی ہوں جگہ ملے گی یا۔۔۔

اپریل کا کرن 12 تاریخ کو ملا' ٹائٹل آنکھوں کو بھلا لگا۔ حمد اور نعت سے دل و دماغ کو منور کیا۔ عاصم محمود سے ملاقات کچھ خاص نہیں لگی البتہ عیشاء نور سے خوب مزا رہا۔ "مقابل ہے آئینہ" میں تسنیم شریف نام کے الٹ ہی رہیں' لیکن بہت انجوائے کیا۔ "مقابل ہے آئینہ" کے سوالات چینج کرکے بہت اچھا کیا' کیا میں بھی اس میں شرکت کر سکتی ہوں؟ سب سے پہلے "من مورکھ کی بات نہ مانو" پڑھی کہانی میں کچھ جمود سا آگیا ہے ہمیں تو حور یہ کے لیے بابر بالکل منظور نہیں۔ بہرحال دیکھیں اب آسیہ جی کیا کرتی ہیں۔ یاسمین نشاط کی "پچھلی" نے دماغ ساکت کردیا عورتیں اپنی اتنی تذلیل کیسے کرتی ہیں۔ فاخرہ گل کا "گواہ ہیں سرمئی شامیں" میں مینا کا کردار خوب رہا۔ مصباح علی کا "مجبور نشیمن" میں جب میں کوڈے کوڈے ڈوب گئی تو باقی آمنہ نے سارا حسن کر رکھ دیا "دائرہ زیست" کا طرز تحریر اور اسلوب ہمارے معاشرے کا آئینہ دار تھا۔ "راپنزل" میں کہانی الجھ کر رہ گئی ہے۔ نینا اور سمیع حلق سے نہیں اتر رہے جب کہ سمیع انڈرسٹنڈ بھی نہیں ہے خاور کے لیے دل دکھتا ہے۔ "دلوں کی محبت" کا ہیپی اینڈ لبوں پر مسکان بکھیر گیا اور ایک بات یہ کہ عورت کی دشمن خود عورت ہے بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ صدف آصف کی "جینا" نے حقیقت پسندی کا طمانچہ کیا کھینچ کر سکندر کے مارا کہ مزا ہی آگیا۔ ویسے گاؤں میں ایسی لڑکیاں ہوتی ہیں۔۔۔ دیگر تحریروں میں "حصار محبت" اور "چوڑیاں" سبق آموز تحریریں رہیں۔ شمارے کی سپر ب لوراے دل تحریر "جینا!" ہی رہی لیکن آئندہ کا تڑکا اسے تھوڑا بدمزا بنادیتا ہے۔ دیگر مستقل سلسلے بھی لاجواب اور بے مثال تھے۔

ج۔ ارم کمال آپ کی "نامے میرے نام" کی محفل میں شرکت کرنے سے ہمیں بے انتہا مسرت ہوئی' امید کرتے ہیں کہ اب آپ ہر ماہ ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔ "مقابل آئینہ" میں آپ ضرور شرکت کر سکتی ہیں۔

سفینہ خورشید۔۔۔ کوٹری

اس دفعہ کرن کی ماڈل بہت پیاری تھی۔ کرن پڑھتے پانچ ماہ ہوگئے ہیں۔ "راپنزل" میں ہیرو کون ہے اور ہیروئن کون بتا کر آسانی کریں۔ "من مورکھ" بہت زبردست جارہا ہے۔ "گل کہسار" زبردست اینڈ ہوا۔ پلیز اس بار کرن میں تھوڑی سی جگہ عطا کریں۔ فشا محسن خوش آمدید۔ باقی پورا کرن ماشاء اللہ زبردست ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خوب خوب ترقی دیں ہمارے کرن کو آمین۔

ج۔ پیاری سفینہ کرن پڑھنے کا بہت شکریہ۔ آپ نے مختصر سا خط لکھا ہے امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ تمام کہانیوں پر بھرپور تبصرہ کریں گی۔ ہر کہانی کا ہیرو اور ہیروئن اس کے مرکزی کردار ہوتے ہیں۔

انعم خان۔۔۔ پشاور

مجھے خط لکھنے پہ مجبور ولاچار کسی کہانی نے نہیں بلکہ "مقابل ہے آئینہ" کی مہمان تسنیم شریف نے کیا۔ واہ واہ! کیا جوابات دیے ہیں۔ معذرت کے ساتھ عرض کروں گی کہ آپ کا حال تو اللہ ہی جانے کہ کس دل سے دیے ہیں جوابات مگر ہم قارئین کو جان سے بے حال ضرور کردیا ہنسا ہنسا کر۔۔۔ ہم ہم ہم۔۔۔ خیر اتنا بھی نہیں ہنسیں۔۔۔ خیر ایک بات آپ کی کہی کہانی میں گری ہمارے دل کی وہ یہ کہ واقعی ہم اپنی حقیقت کو اپنے دشمن کی وجہ سے جان لیتے

ہیں۔ اچھا لگا آپ کے بارے میں جان کر۔ اللہ صحت دے آمین۔

اب بات کہانیوں کی جائے تو "من مورکھ کی بات نہ مانو" آسیہ مرزا کی زبردست تحریر ہے۔ تھوڑی تھوڑی دل کو لگتی ہے۔ اب بس ذرا بابر کو شریف بنائیں۔ مکمل ناول ریحانہ آفتاب کا "دلوں کی محبت" اچھی اسٹوری تھی۔ ذرا عام کہانی کو ہٹ کر بنانے کی اچھی کوشش تھی۔ ناولٹ میں "بیلا" اچھا جارہا ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے اسٹوری میں منتظر رہیں گے۔

"کرن کرن خوشبو" ہمیشہ کی طرح دلچسپ تھا اور "کچھ موتی چنے" ہیں میرا موسٹ فیورٹ ہے۔ کرن ادارہ اور لکھنے والی تمام مصنفات زبردست ہیں کیونکہ آپ یہ سب ہمارے لیے ہی کرتے ہیں۔ آپ سب کے لیے دل سے دعا گو۔ اللہ ہم سب کو ایمان کی روشنی اور اس پر قائم رہنے کی ہدایت دے آمین۔

ج۔ انعم "کرن" کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کرنے کا بے حد شکریہ۔ یہ آپ لوگوں کی رائے ہوتی ہے جنہیں مدنظر رکھ کر کرن کو بہتر سے بہتر کرنے میں ہم کامیاب ہورہے ہیں۔

یاسمین کنول۔ نامعلوم

اپریل بہاروں کا مہینہ ہے اور کرن کے سرورق کی ماڈل ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے سجائے بہار کا احساس دلاتی اچھی لگ رہی ہے۔

مستقل سلسلوں میں "مجھے یہ شعر پسند ہے" اور "یادوں کے دریچے سے" کا سلسلہ سب سے زیادہ پسند ہے ہرچند کہ باقی سلسلے بھی خوب ہیں۔ افسانوں میں یاسمین نشاط کی "پچھلی" اچھی لگی۔ ماہم علی کی "چوڑیاں" پسند آئی جبکہ "حصار محبت" متاثر کن تحریر رہی۔ فاخرہ گل کا ناولٹ "سرمئی شامیں" زبردست رہا۔ طیبہ عنصر مغل نے بھی اچھا لکھا۔ عاصم محمود سے ملاقات اچھی رہی۔ ریحانہ آفتاب کی دلوں کی محبت بہت پسند آئی۔

ج۔ یاسمین جی! آپ نے ہر کہانی کے بارے میں اپنی رائے سے آگاہ کیا، لیکن ہماری سلسلہ وار کہانیوں کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ ہمیں امید ہے کہ اگلی بار ان کے بارے بھی آپ ہمیں ضرور آگاہ کریں گی۔

اقراء ممتاز۔ سرگودھا

ٹائٹل گرل بہت پسند آیا۔ اس دفعہ کا سارا شمارہ زبردست تھا۔ چلو جی شکر ہے کہ "مقابل ہے آئینہ" کے سوال تو تبدیل ہوئے کیا فنٹاسٹک سوال ہیں؟ عاصم محمود سے ملاقات زبردست رہی۔ "مقابل ہے آئینہ" میں تسنیم شریف کے جوابات بڑے زور کے لگے۔ مکمل ناول "دلوں کی محبت" ریحانہ آفتاب کا ناول فنٹاسٹک تھا کہ کوئی سحرش کی طرح اتنا خود غرض بھی ہو سکتا ہے۔ جیت ہمیشہ سچ کی ہی ہوتی آئی ہے کوئی جتنا بھی چالاک اور لالچی کیوں نہ ہوں اذہان حیدر کا پریشے کے لیے لڑنا اور اس کی کیئر کرنا بہت اچھا لگا۔ ناولٹ "بیلا" منشا محسن علی کا ناولٹ بہت مختلف سا ہے اس ناولٹ کی یہ لائن بہت پسند آئی کہ ڈائری پر اتاری "تم گاؤں کی لڑکیوں کے لیے بارش کا پہلا قطرہ ہو اب آگے دریا بھی بنے گا جب تم کامیاب لوٹوگی" واقعی محنت کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی جو جتنی محنت کرتا ہے اسے اتنا ہی پھل ملتا ہے۔ منشا علی نے صحیح لکھا ہے کہ رزلٹ سنتے وقت جان سولی پر لٹکی ہوتی ہے۔ دائرہ زیست "طیبہ عنصر مغل" کا ناول حقیقت کے بہت قریب لگا۔

شرف الدین خالو نے نازو اور بانو کی عزت اپنے ماں باپ کے سامنے کھونے نہ دی۔ شرف الدین جیسے لوگ اس دنیا میں بہت تھوڑے ہیں۔ افسانے "چوڑیاں" "ماہم علی" کا افسانہ بھی زبردست تھا۔ ارم کو شکر ہے تھوڑی دیر سے ہی سہی لیکن عقل آہی گئی۔ "پیار محبت سیاست" امبر فاطمہ کا افسانہ بھی اچھا تھا، لیکن نام بہت عجیب تھا۔ کرن رسالہ جنوری 2017ء سے بہت ترقی کر رہا ہے۔ کرن کا معیار بہت بلند ہوتا جارہا ہے۔ یہ سب رائٹروں کی محنت اور آپ کی محنت کا ثمر ہے۔ خدا اس رسالے کو اور ترقی دے (آمین) یہ آپ سے پیار ہی ہے کہ اس دفعہ ہماری ٹیوشن میں پارٹی تھی پھر بھی میں بچوں سے تھوڑا سا ٹائم نکال کر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ اگر آپ کرن میں ایک اور صفحہ کھول لیں جس میں ہم قارئین ایک دوسرے سے دوستی کرسکیں۔

ج۔ اقراء جی! ان شاء اللہ ہم آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم اپنی مصنفات کے بہت شکرگزار ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم اپنی قارئین

ہماری امیدوں پر پورا اتر رہے ہیں۔ کرن کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

دانیہ عطا۔۔۔ شہید چوک

اس ماہ کا کرن خلاف توقع بہت جلدی مل گیا حیرت در حیرت۔ سب سے پہلے خطوط کا سلسلہ پڑھا پھر اسمار ننس کا راز دل موہ لیا کرن کی دن بہ دن بڑھتی کامیابی میں ایڈیٹرز اور رائٹرز بہت محنت کر رہے ہیں جو دکھائی بھی دینے لگی ہیں عرصہ پہلے کرن چھوڑ چکی تھی مگر کچھ رائٹرز نے اب باندھ لیا جیسے تنزیلہ جی آگئیں بہت ہی خوب صورت لکھ رہی ہیں نیناں کی سمیع کے ساتھ جوڑی والا ٹرن ایک دم حیران کن مزا آگیا۔ "من مورکھ" مجھے خاص متاثر نہیں کرپایا۔ آسیہ عرصہ بعد آئیں مگر وہی اپنا ایک ہی اسٹائل مکمل ناول میں "مصباح علی" جلوہ گر ہوئیں پہلے تو اچھا لکھتی رہیں اب قسط وار میں دیکھیں کیا کرتی ہیں تجسس برقرار ان کا تعلق کس شہر سے ہے؟۔ "ریحانہ آفتاب" کا لفظ لفظ رومانس میں ڈوبا ہوا۔ افسانوں میں "صدف آصف" کا بہت اچھا لگا۔ انہوں نے ایف بی پر بتایا تھا یہ آسٹریلیا چلی گئی ہیں تو کیا آگئی۔

ج۔ دانیہ! مصباح علی کا تعلق سرگودھا شہر سے ہے جی صدف آصف آسٹریلیا میں ہیں اور وہیں سے آپ قارئین کے لیے کہانیاں بھیجتی ہیں۔ آپ ہمیں یہ بتائیں کہ "بیلا" آپ کو کیسا لگ رہا اور کرن کی کہانیوں پر تبصرہ لکھتیں تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔ ادھورا سا لگا آپ کا خط۔

روبینہ آرائیں۔۔۔ جھنگ

اللہ پاک کے نام سے شروع کرکے خیریت کی دعائیں مانگتے ہوئے خط کی ابتدا کرتی ہوں۔ جس پر تبصرہ کرنے کو سب سے پہلے دل چاہا وہ ہے مصباح علی۔۔۔ کچھ عرصہ سے میں دیکھ رہی ہوں جب ان کا نام لسٹ میں آجاتا ہے تو اک بحث چل پڑتی ہے رسالے میں گھروں میں اور F.B پر بھی کیونکہ ان کے لکھنے کا انداز جکڑ لیتا ہے۔ "مجبور نشیمن" نے کرداروں کی بھرمار سے گھما ڈالا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مصباح اپنے سابقہ ریکارڈ کی طرح ان سب کے ساتھ انصاف کرپائیں گی۔۔۔؟ کیونکہ بہت سے لوگوں کی کہانی اور رویے ہیں۔۔۔ اگلی قسط کے لیے بے چینی و بے تابی۔۔۔

دوسرا ناول "دلوں کی محبت" بھی معذرت کے ساتھ۔۔۔ وہ عجیب سی کہانی لگی۔ کہنے کو بہت سے لفظ کلبلا رہے ہیں لیکن میں نے ریحانہ صاحبہ سے معذرت ہی کرلی۔۔۔ نشا محسن کی "بیلا" اچھی لگی لیکن بھئی مصنفہ سے زبردستی مزاح مت لکھوائیں ایسے لگ رہا ہے کسی کو مار مار کر کہو کہ اب ہنس کے دکھاؤ۔۔۔ افسانوں میں "پیار، محبت اور سیاست" امبر فاطمہ نے بہت ہی اچھا لکھا۔ بھئی درست پیار محبت اپنی جگہ ہوتا ہے، لیکن سیاست اپنی جگہ۔۔۔ مگر ہم لوگ ہر چیز میں سیاست ایسے ٹھونستے ہیں جیسے چھوٹے سے غلاف میں بڑا سا تکیہ کتنا مضحکہ خیز لگتا ہے بالکل ایسے ہی ہر چیز میں سیاست فٹ نہیں آتی تو ہر چیز کو اپنی جگہ پر ہی رہنا چاہیے۔ بہت خوب امبر۔

"چوڑیاں" ماہم علی کا بہت ہی زبردست اے ون لگا۔ لڑکیوں کو ارم کی طرح نہیں ہونا چاہیے، کسی کا منہ لال دیکھ کر اپنا تھپڑوں سے کرلیں اور بعد میں پتا چلے کہ اس کا منہ لال نہیں اسے الرجی تھی۔۔۔ پھر وہی حال ہوتا ہے جو ارم کا ہوا۔ شرمساری میں۔۔۔ بہت سبق آموز تھا ویری گڈ۔۔۔ باقی شمارہ اچھا تھا اور ہاں تنزیلہ ریاض نے راینزل کو جو موڑ دیا ہے نیناں اور سمیع والا۔ اف، اف تعریف کے لفظ نہیں۔ مبارک ہی مبارک۔

ج۔ روبینہ جی! آپ نے خط لکھا اس کے لیے ہم بہت شکر گزار ہیں لیکن آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ آپ کو سبق آموز کہانیاں پسند ہیں۔ رومینس اور مزاح آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ اسی لیے ہم "کرن" میں مختلف موضوعات پر مبنی کہانیاں شائع کرتے ہیں کہ ہماری سب قارئین ہم سے بندھی رہیں اور سب کو اپنی پسند کا کچھ نہ کچھ کرن میں پڑھنے کے لیے مل جائے۔

ثریا۔۔۔ میانوالی

سب سے پہلے کرن کی ٹیم کو سلام اور مدرز ڈے مبارک ہو۔ خدا سے دعا ہے میری کہ سب کی ماؤں کی طویل عمر ہو۔ آمین۔ قدر کریں جن کی مائیں ہیں اور صبر کریں جن کی نہیں ہیں۔ اب آتے ہیں شمارے کی جانب پہلے "حمد و نعت" پڑھی پھر انٹرویو پڑھے۔ اس کے بعد آسیہ کے ناول کی طرف بڑھے۔ زبردست۔ میں تو اس کہانی کو حوریہ کی وجہ سے پڑھتی ہوں اور شاید اب حوریہ

کی شادی باہر سے ہو جائے پھر۔ "راپنزل" پڑھا۔ اتنے موڈ 'خاور' کا اظہار محبت نینا سے اور نینا کی شادی سمیع سے پلیز زری کا ہیرو سامنے لائیں اور اس دفعہ شہرین کا کہیں بھی ذکر نہیں تھا۔ مکمل ناول ریحانہ آفتاب کا "دلوں کی محبت" اچھا لگا۔ دوسروں کے لیے سبق آموز ناول تھا۔ ناولٹ کوئی بھی اچھا نہیں لگا۔ افسانوں میں عبیرہ لطیف اور ماہم علی کے افسانے نمبرون رہے۔ باقی سب سلسلے اچھے تھے۔ ایک فرمائش ہے گلوکار رحیم شاہ اور جواد احمد کا انٹرویو شائع کریں اور خط کے لیے دوسرا پیج استعمال کر سکتی ہوں کیونکہ ایک تو تھوڑا ہوتا ہے اور مزے کی بات اس مرتبہ کرن 12 ڈیٹ کو مل گیا تھا۔ ورنہ تو 14'13 ہی کو دیدار نصیب ہوتا ہے۔

ج۔ ثریا جی! آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ آپ دوسرا صفحہ کیا تیسرا بھی استعمال کرکے اور ہمیں اپنی بھرپور رائے سے آگاہ کرسکتی ہیں۔

زرمینہ خان۔۔۔ ایبٹ آباد جھل کھڈ

میں پچھلے ماہ بھی خط لکھنا چاہ رہی تھی "فرح بخاری" کے ناول کے لیے مگر کچھ کاموں میں الجھ کر رہ گئی۔ سو انہیں مبارک ہو ہمارے علاقے پر لکھنے کا شکریہ اور اس بار خط لکھنے پر بار بار اکسایا مصباح علی کے "معمور نشین" نے۔ مصباح اپنی کہانیوں کے نام ایسے سوچ کر رکھتی ہیں جیسے لوگ اپنے بچوں کے نام چھان پھٹک کر اور سب سے مختلف رکھتے ہیں۔ صرف کہانی کا نام ہی کیا بلکہ کہانی بھی مختلف لگ رہی ہے۔ حبل ذکا نے تو پہلی قسط سے ہی دل مٹھی میں لے لیا۔ کیا اس کی ہیروئن زینب ہے اور روائیہ وہ تو بالکل معصوم بلی لگی۔ بہت سارے کردار ایک سے بڑھ کر ایک اور مفت میں آسٹریلیا کی سیر۔ واہ مصباح واہ!۔ دوسرا ناول "دلوں کی محبت" ریحانہ آفتاب نے لکھا۔ کہانی کے اعتبار سے بہت اچھا لگا، مگر بہت فلمی انداز میں لکھا۔ اذہان بطور شخصیت اچھا تھا، مگر بہت ہی بے دھڑک اور بے باک ہو جاتا تھا۔ ویسے کہانی پسند آئی۔ ناولٹ میں "سرمئی شامیں" رنگ نہیں جما سکی لیکن "بیلا" منشا محسن علی کا واہ جی واہ۔ بیلا کو بہت ذہین اور بہادر سا بنا کر اائیں۔ پلیز منعم علی سے کہیے اس کے ساتھ کچھ برا مت کرے۔

افسانوں میں عبیرہ لطیف کا "مثالی بہو" تاب آف دی لسٹ رہا۔ فضا کی طرح ہر بہو سوچتی ہے کہ اچھی طرح رہے، لیکن سسرال والے اس قابل ہوتے ہی نہیں کہ زیادہ منہ لگایا جائے۔ "مچھلی" بھی پسند آیا۔ باقی افسانے ٹھیک تھے۔ ہاں خاص طور پر "مقابل ہے آئینہ" میں تسنیم شریف کے جواب کورے جواب لگے (میں کیوں کوئی ڈھنگ کا جواب دوں) والا انداز ہنسنے پر مجبور کر گیا۔ ہاں آپی ایک اور بات میں جھل کھڈ میں رہتی ہوں۔ ایبٹ آباد کے پاس ہے اچھا خاصا موسم ٹھنڈا ہے۔ مصباح سے یہ پوچھنا وہ جھل کھڈ آئی ہیں۔ میرا انہیں سلام اور راحت جبین، رخسانہ نگار اور ثمرہ بخاری سے بھی کچھ لکھوائیں پلیز۔۔۔

ج۔ زرمینہ جی! آپ کی فرمائش ہم نے نوٹ کرلی ہے اور آپ کا پیغام مصباح علی سید تک پہنچا دیا گیا ہے۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا بہت شکریہ۔

ریحانہ آفتاب۔۔۔ چکوال

حد ہوگئی بھئی بے مروتی کی طوطا چشم بھی کچھ دیدہ چشم رکھتا ہوگا، مگر دنیا تو اس سے بالکل برعکس۔۔۔ پھپھو کو خواہ مخواہ بدنامی کا ڈھول ڈال رکھا ہے۔ کم بھتیجی بھی نہیں ہوتی۔ میں اس وقت اپنی بھتیجی زینی کا رونا رونے لگی ہوں۔ اچھے بھلے رسالے چھوڑ دیے تھے۔ گھر کے کاموں میں جی لگا لیا، مگر اٹھارہ سالہ زینی مجھ سے اٹھارہ سال بڑی بننے کی کوشش کرتی ہے آئے دن پیکیج لے کر دماغ چاٹ لیتی۔ فلاں کا ناول آگیا۔ فلاں کا افسانہ تھوڑا سا پڑھ لو مزا آئے گا۔ پھر ظالم نے نشان لگوا کر بھیجنے شروع کردیے۔ پھپھو صرف یہ والا پڑھ لو۔ کسی وقت بڑے بتاتے تھے یہ پڑھو یہ چھوڑ دو۔ اب بچے بتانے لگے۔ چلو مان لی، پڑھنے لگے۔ کم بخت عادت پڑ گئی۔ مہینہ شروع ہونے پر یاد دلائے گئے وقت اچھا کٹ جاتا، مگر یہ کیا بھئی تین دن پہلے چٹا کورا جواب دے دیا۔ اب کے کرن اپنا خود منگوالیں "مصباح علی" کا ناول شروع ہوا ہے۔ میں نے جمع کرنا ہے۔ زینی نے ایسے ایسے نقشے کھینچے منگوانا ہی پڑا۔ اب اللہ کے واسطے میری رقم حلال کردینا۔ باقی قسطیں بھی اچھی لکھ کر۔ بہت ہوا تو 60 کا گا۔ اب ذرا تنزیلہ کی بھی خبر لے لوں۔ جن کی آمد نے ہی مجھے زبردستی کرن پڑھنے پر مجبور کیا۔ اب جو تنزیلہ سامنے ہوں تو کون ظالم نگاہ چرائے۔ پڑھا دل و جان سے پڑھا۔ نینا، سلیم، خاور، سمیع، شہرین سب اپنی اپنی

فٹ۔

ارے یاسمین نشاط نے خوب "مچھلی" لکھ ڈالی۔ کیا روپ دکھایا عورت کا۔ دوبار پڑھا۔ توبہ توبہ کیسی کیسی عورتیں ہیں اس تالاب میں۔ باقی افسانے اچھے تھے خاص کر "جینا"۔ واہ بھئی شاداں کی بیٹی۔ جینا جیتی رہو اور سکندر بھی شریف تھا شرافت دکھا گیا۔

ج۔ ریحانہ! آپ نے ایک مزاج سے بھرپور خط لکھا پڑھ کر مزا آیا، لیکن شکریہ ہم آپ کی بھتیجی زینی کا ادا کریں گے کہ اس نے آپ کو کرن پڑھنے پر مجبور کیا۔

صبا خان..... بھاولپور

اس دفعہ کا کرن دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ اپنے پسندیدہ رائٹر وہ بھی ایک ساتھ سچ میں فوراً ہی پڑھنے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے تو حسب عادت سلسلے وار ناول پڑھے۔ منہ سے بہترین کا لفظ نکلا۔ اس کے بعد ناولٹ کی باری آئی۔ سب سے اچھا طیبہ عنصر کا "دائرہ زیست" لگا۔

منشا محسن علی کا ناولٹ "بیلا" بہت خاص نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کہانی کو بلاوجہ ربڑ کی طرح کھینچا جا رہا ہو۔ مکمل ناول میں مصباح علی سید سبقت لے گئیں۔ افسانوں کی باری آئی تو جلدی سے سارے پڑھ ڈالے۔ سب اپنی اپنی جگہ اچھے لگے مگر یاسمین نشاط کی "مچھلی" بہت عمدہ رہی اس کے بعد صدف آصف کا "جینا" مختلف انداز میں لکھا گیا ایک بہترین افسانہ ہے۔ باقی کے سلسلے بھی خوب صورت تھے۔

ج۔ پیاری صبا! کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ اب کی دفعہ آپ کافی عرصے بعد اپنے تبصرے کے ساتھ شامل ہوئی ہیں۔

جیا علی..... ملتان

میں پہلے کرن نہیں پڑھتی تھی مگر جب سے سہیلیوں سے اس کی تعریف سنی تو شعاع، خواتین کے ساتھ اسے بھی خریدنا شروع کر دیا اور اب ہر مہینے اسے خریدنا لازمی ہو گیا ہے۔ اپریل کا پرچا ہاتھ میں آیا تو پہلے ٹائٹل دیکھا بہت ہی اچھا لگا۔ اس کے بعد "حمد و نعت" کو عقیدت و احترام سے پڑھا۔ فہرست پر نگاہ دوڑانے کے بعد اپنا پسندیدہ ناول "رابنزل" کی قسط پڑھتی چلی گئی مزا آگیا۔ تنزیلہ جی کی کیا بات ہے۔ مکمل ناول بھی اچھے ہیں۔ ناولٹ ابھی سو سو لگے۔ "بیلا" کچھ اتنا خاص نہیں لگا۔ افسانے بھی پسندیدگی کی سند حاصل کر بیٹھے۔ مجھے سب سے زیادہ امبر فاطمہ کا "پیار، محبت اور سیاست" اور صدف آصف کا "جینا" پسند آئے۔ خاص طور پر "جینا" کی ہیروئن کے انداز دل کو بھا گئے۔

امید ہے کہ میرا خط ردی کی ٹوکری میں نہیں جائے گا۔ اگر نہ چھپا تو سچ میں کرن کے دفتر کے آگے دھرنا ہو گا۔ ہاہا ہا

ج۔ پیاری جیا! بالکل بے فکر ہو جائیں کیونکہ ردی کی ٹوکری جیسی کوئی چیز ہمارے پاس نہیں۔ کرن کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ جیا آپ ہر ماہ خط لکھ سکتی ہیں اور آپ کا خط ہر ماہ شائع ہو گا۔ بس ہمیں آپ کا خط 2726 تاریخ تک مل جانا چاہیے۔

فوزیہ ثمروث، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس..... گجرات

سرورق اچھا لگا، مگر ناک کی بالی ہمارے دل کو بھا گئی کسی زمانے میں ہمیں بھی شوق تھا، اداریہ کی باتیں ہمیشہ کی طرح اچھی لگیں۔ "حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم" دل و ذہن کو مسرور کرتی ہیں۔

شاہین صاحب بہت اچھے اچھے لوگوں سے متعارف کروا رہی ہیں جس کے لیے ان کا بہت شکریہ۔ "مقابل ہے آئینہ" یہ تو اچھا کیا کہ سلسلے کے سوالات تبدیل ہو گئے اور یہ کہ تسنیم شریف آئیں اور چھا گئیں۔ واہ! کیا خوب صورت ہر سوال کا جواب دیا۔ اتنا پر مزاح بہت مزا آیا۔ سب سے پہلے آسیہ جی کو پڑھا چلیے یہ تو اچھا ہوا۔ فضا نے

نصیر سے صلح کر لی۔ کب تک پرانی محبت وہ بھی یک طرفہ محبت کا ماتم مناتی۔ بابر کو تو بس اللہ ہی پوچھے گا ناں۔ کیا آسیہ جی بابر کو مومن کرنے والی ہیں ویسے ایسا تو بہت کم دیکھنے میں آیا ہے بابر جیسے لوگ کہاں اپنا قبلہ درست کرتے ہیں ان سے تو ان کا قبلہ ان کے فرشتے ہی کرواتے ہیں جب یہ لوگ ان کے ہاتھوں لگتے ہیں۔ قسط کے اینڈ پے تو شاک ہی لگا، کیا بابر حوریہ کو مجبور کر کے اس سے نکاح کرے گا۔ خدارا یہ ظلم نہ کرنا اور یہ لائبہ کس مرض کی دوا ہے۔ اس بار میں نے رسالہ طبیعت سے پڑھا ہے اس لیے تبصرہ بھی ایسے ہی ہو گا۔ افسانے "مچھلی" خوب لگا۔ ہم

جس محلے میں گئے ہیں وہاں ایسے عورتیں اکثر بستی ہیں کوئی دریچہ بھی والا نہیں جس سے پتہ کہ بھاؤ تاؤ نہ کریں پھر آپس میں ہی نعشے لگاتی ہیں مقابل کو خوش کرتی ہیں۔ سونے پہ سہاگہ بجلی چلی جائے تو ہر چھوٹا بڑا ممبر (انسانوں کا) اپنے اپنے دروازوں کی دہلیز پر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں کی ذات کے بخیے ادھیڑے جاتے ہیں۔ "**مچھلی**" سے آگے مصباح علی تھیں اور یہ ہمیں باقیات پہ رکھ رہی تھیں اس لیے میں نے بھی سوچا اگلے ماہ پوری تحاریر وصول کی جائیں۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر ایک ماہ کے لیے اجازت لی۔ "مہجور نشیمن" سے۔ قرۃ العین کے "حصار محبت" میں آگہی افسانہ تھا بلکہ ایک سبق تھا ان بیویوں کے لیے جو شوہر سے غافل ہو جاتی ہیں خود کو سنوارتی سجاتی نہیں ہیں اور ان لڑکیوں کے لیے بھی جو دوسروں کے شوہروں کے سامنے خود کو فری کا برا سمجھ کر پیش کرتی ہیں۔ "دائرہ زیست" یہ ناولٹ بھی دلچسپ رہا۔ جیسا دیس ویسا بھیس والا معاملہ تھا۔ آپ جس طرح کا ماحول دیں گے اولاد کو وہ ویسا ہی ریٹرن آپ کو دے گی۔ پھر "راپنزل" کو پڑھا۔ اس قسط میں تشنگی رہ گئی۔ کہیں بھی نینا اور سمیع کی شادی کا قصہ نہیں تھا۔ کونین کو اگر محبت راس نہیں آتی تو پھر بے چارے خاور کی محبت کو ہی قبول کر لیتی۔ اگر شادی کے بعد بھی خاور سے ہی حال دل کہنا تھا تو کیا تھا جو خاور کے دل کو آباد کر دیتی۔ یہ قصہ زلیخا یوسف اگر جلد ہی کھول دیتیں تنزیلہ جی تو اچھا تھا نا اب تجسس ہی ہے کہ کیوں ویران دل کو اور ویران کیا ہے نینا نے۔ "پیار محبت اور سیاست" خاص متاثر نہ کر سکا۔ "دلوں کی محبت" بھی اچھی تحریر تھی۔ ایک طرف تو عورت کو ظالم دکھایا گیا۔ فاطمہ جیسی بھی عورتیں ہیں نیک محبت کرنے والا شوہر کی وفادار۔ بحرش اور حمیرا کی سیاست کیا خوب دماغ پایا ہے دونوں نے۔ اذہان حیدر نے خوب مقابلہ کیا دونوں کی سیاست کا۔ "جینا" افسانہ بھی اچھا لگا یہ نواب اور وڈیرے عورت کو بکاؤ مال کیوں سمجھ لیتے ہیں۔ عبیرہ لطیف کا "مثالی بہو" افسانہ بہت مزے کا تھا۔ ایک بات تو طے ہے۔ عورت کی سیاست بڑے بڑے سیاست دانوں کو مات دیتی ہیں۔ ماہم علی کی "چوڑیاں" بھی پسند آئی اور سچ ہے مگر دور نے حاضر میں یہ ہی چل رہا ہے۔ کسی کا منہ لال دیکھ کر اپنا بھی لال ہی کرنا ہے چاہے تماچے مار مار کر ہی لال کرنا پڑے۔ "کرن کرن خوشبو" میں ارم بشیر کی خوشبو پسند آئی اور سیدہ لوبائی یادوں کے دریچے اس ماہ کی شاعری بڑے کمال کی تھیں اور زیادہ بھی تھیں۔ سلسلے تمام اچھے لگے۔ "کرن کا دسترخوان" ٹھیک ہی تھا۔ "کچھ موتی چنے ہیں" بہت اچھا جا رہا ہے۔ پلیز اسے جاری رکھنا۔

ج۔ فوزیہ جی! آپ کا کہانیوں پر بھرپور تبصرہ پڑھ کر مزا آیا۔ کچھ آپ کے دل کی باتیں جاننے کا موقع بھی ملا وہ ہم نے شائع نہیں کیں اس لیے کہ وہ تو ہمارا اور آپ کا تعلق ہے اور بغیر اوون کے کیک بنانے کی ریسپی ان شاء اللہ اگلے ماہ ہم ضرور دیں گے۔

فائزہ بھٹی۔۔۔ پتوکی

اس بار کا کرن 14 کو ملا۔ میرے ہاتھ میں 16 کو آیا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہ تھا۔

فہرست سے ہوتے ہوئے "من مورکھ کی بات نہ مانو" تک گئے اوہ شکر ہے فضائی بی کے بھی کچھ پلے پڑا۔ نصیر جیسے مرد اس معاشرے میں نایاب ہیں۔ حوریہ اپنی خیر مناؤ بابر اتنی جلدی تجھے نہیں چھوڑے گا۔ آسیہ مرزا کی مکمل سپورٹ حاصل ہے بابر کو "راپنزل" تنزیلہ ریاض عجب الجھاوؤں میں الجھاتی جا رہی ہیں۔ نینا کی اماں کیا کہوں بٹی کا دکھ نظر میں نہیں آتا اور نینا بھی پھر کم نہیں کرتی (خون کا اثر) خاور خواب دیکھنا چھوڑ دے بھئی۔ اس دنیا میں خوابی بندے کی کوئی جگہ نہیں۔ نینا جب شادی کر لی تو خاور سے ملنے کا مطلب ایویں دنیا کو باتیں بنانے کا موقع فراہم کرنا۔ مٹی پاؤ پچھلے تعلقات پر۔۔۔۔۔

یہ تا کرن والوں کو پتا ہے۔ اپنے قارئین کو کس طرح باندھے رکھنا ہے۔ ایک کہانی ختم نہیں ہوتی دوسری شروع "دنگل کہسار" سے دل کو بہلا کر ابھی بیٹھے ہیں کہ "بیلا" نے جکڑ لیا ہے۔ ویسے بھی بیلا تو اپنی کلاس فیلو نکلی اچھی تو لگے گی نا۔ ایک اچھی کہانی کا اضافہ ہوا ہے۔

"منعم" منہ کے بل گرنا پسند فرماؤ گے۔ بیلا ڈٹی رہو۔ کان نہیں دھرنا الٹی سیدھی باتوں پر' بات سنو دل کو بھی سنبھالے رکھنا۔ خوار نہ کر دے کہیں۔

"مہجور نشیمن۔" مصباح علی اچھا اضافہ کہانی بہت خوب صورتی سے رواں دواں تھی کہ سوچا دیکھ لیں کہیں "باقی آئندہ" کا پھندا نہ تیار رکھا ہوا۔۔۔ پھر ہوا بھی

وہی۔ غبارے سے ہوا نکل خس کر کے بیٹھ گئے۔ ایک اچھی کہانی جس کے پورا ہونے کا انتظار شدت سے جاری.....

"سرمئی شامیں" اس کہانی میں ہماری مثال اس مسافر کی تھی جو منزل سے بے پروا راستے کی دل فریبوں سے لطف اندوز ہونے کو ٹرین میں بیٹھا ہو پھر جب اس مسافر کو اگلے ہی اسٹیشن پر اترنے کا حکم ہو تو جو حالت اس کی تھی وہ میری۔ اچھی بھلی چلی کہانی کو ایک دم ہی بریک لگا دیا۔ شروع سے لگ رہا تھا کالی چائے پی' سارا مزا ہی کرکرا ہو گیا' ویسے اللہ کی بنائی مخلوق پر بے لاگ تبصرہ کرنا ہم انسانوں نے خود پر فرض کر رکھا ہے۔ چاہے اس فرض کو نبھاتے نبھاتے اندھے کنویں میں گر جائیں "دائرہ زیست" ایک اصلاحی اسٹوری' خوابوں خیالوں میں رہنے والی مخلوق کے لیے اچھا سبق تھا اس میں۔ لڑکیوں کو تو رہنا ہی حقیقت کی دنیا میں چاہیے۔

"دلوں کی محبت" اذہان کا کردار جاندار تھا۔ اپنے فیصلے خود کرنے والا کبھی نہ ڈرنے والا' مگر ایک بات تھی کہ وہ بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ مگر ایک بات یہ بھی ہے وہ اتنا منہ پھٹ نہ ہوتا تو پھر منہ ہی دیکھتا لوگوں کے ہوتا کچھ نہ تھا اس سے..... افسانے کوئی نہیں پڑھے۔ (ٹائم نہیں تھا جی) "تمام بڑے نام ہیں فضہ نور روبزی۔ تم نے اور ریحانہ جی نے میری کمی کو محسوس کیا اچھا لگا۔ (ریحانہ جی شکریہ) مسئلہ یہ تھا کہ ہر بار لکھ کر رکھ دیتی شاید کوئی اللہ کا بندہ شہر چلا جائے۔ مگر ان دنوں میں کوئی اللہ کا بندہ بننے کو تیار نہ ہوا۔ ہمیں اپنے خطوط آپ کی نظر کرنے پڑے اور آپ نے "اس ماہ کا خط" والا سلسلہ کیوں بند کر دیا۔

ج۔ فائزہ جی آپ کا دلچسپ خط پڑھ کر مزا آیا۔ کہانیوں کو پسند کرنے کا اور ان پر الگ انداز میں تبصرہ کرنے کا بے حد شکریہ لگتا ہے کہ ہمارے سپلیمنٹ میں دیئے گئے ٹوٹکے آپ کے کام آ رہے ہیں جو آپ انڈا تیل استعمال کر رہی ہیں۔

مشعل جمیل..... گوجرانوالہ

میں کرن کی محفل میں دوسری مرتبہ آئی ہوں۔ اب آتے ہیں تبصرے کی طرف عاصم محمود کا انٹرویو اچھا رہا۔ عظیم شاہ نور سے پہلے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔ لہٰذا اسو سوا انٹرویو رہا۔ آسیہ مرزا بہت خوب لکھ رہی ہے۔ لیکن پتا نہیں کیا ہے بابر کو پڑھ کے مجھے کیوں خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ ہیرو لگ رہا ہے ناول کا شاید۔ "ڈراپنڈی" سب سے شاندار کہانی۔ مصباح علی کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ اچھی ہی ہو گی کیونکہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ "دائرہ زیست" معاشرے کی المناک اسٹوری لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ لڑکیاں بچ جائیں۔ لیکن نازو اور بانو کا بچ نکلنا سکون کا سانس خارج ہوا۔ "بیلا" فشا محسن علی کی کہانیاں پڑھی ہیں میں نے اور پسند بھی آئی لیکن پتا نہیں بیلا کیوں نہیں پسند آ رہی۔ افسانے میں ٹاپ آف دی لسٹ "مصار محبت" لگا۔ بہت خوب لکھا۔ "پچھلی" کچھ خاص پسند نہیں آئی۔ "مثالی بہو" مزے کی تھی اسٹوری۔ "چوڑیاں" پچھلی کہانیوں سے ملتی جلتی کہانی۔ امیر فاطمہ نے بھی اچھا لکھا اور آخر میں "جینا" اس کے بارے میں یہی کہوں گی نہیں سیکھا میں نے جینا جینا۔ پسند نہیں آیا یہ افسانہ۔ باقی کرن کے سارے سلسلے کمال کے ہیں۔ آپ سے یہ پوچھنا ہے کیا "دردل" ناول کتابی شکل میں آ گیا ہے؟ ٹائٹل کی آخری بات۔ میں نے کرن خریدا اور سب کچھ پڑھ لیا۔ اس کے بعد بازار گئی تو بک شاپ پہ دور سے خوب صورت ٹائٹل نظر آیا۔ میں پریشان ہو گئی کہ اتنا خوب صورت ٹائٹل کس رسالے کا لگ گیا۔ جب پاس گئی تو کرن کا ٹائٹل تھا۔ جو کہ میرے پاس رسالہ تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا ہمیشہ دور کی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ پاس کی نظر ٹھیک ہو تو بھی نظر نہیں آتا۔ بہت خوب صورت ٹائٹل ہے۔

ج۔ مشعل جی آپ کے خط لکھنے کا بے حد شکریہ امید ہے کہ اب آپ قریب کی چیزوں پر بھی غور فرمائیں گی۔ اور آپ کو نام بدلنے کی ضرورت نہیں۔ اب اپنے نام سے خط لکھیے گا ضرور شائع ہو گا۔